



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before
taking it out. You will be res-
ponsible for damages to the book
discovered while returning it.

DUE DATE

C/ No.

Acc. No. _____

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

[illegible]

طبع و نشر کے لیے دستیاب شدہ رسائل میں سب سے زیادہ پچھلے

فہرست مضامین

جلد ۲۲ ۱۹۳۶ء ۶۱۹۳۶

نمبر	مضامین	نمبر	مضامین	نمبر	مضامین
۲۸	حضرت امجد میرٹھی	۱۳	آرزو	۱	فہرست مضامین
۲۹	مولانا خواجہ احمد فاروقی	۱۵	پولین کے مکتوبات محبت	۲	مذہبات
۳۲	حضرت مابد شاہ جہاں پوری	۱۶	رباعیات	۳	سبیل کا اشار
۳۳	آزاد انصاری مالک لوی	۱۷	آفتاب	۴	تخلیقات عالیہ
۳۴	مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشق	۱۸	عارف و اہتمام الدولہ بہادر	۵	مخلوق کیمبر
۳۸	مولانا جگر مدنی بسوانی	۱۹	فنون میں الخ	۶	حبیب غزل
۳۹	چوہدری عبدالوہاب خالصا	۲۰	ضمیر کی آواز	۷	مسکرات تہر
۴۰	سیدل محمد صاحب بالذہری	۲۱	جذبات نقضا	۸	تیر کی تلاش
۴۸	مولانا عبدالحکیم صاحب ناظم	۲۲	ہارول الرشید اور شاربیان	۹	شود لہذا
۵۱	مولانا عبدالحکیم صاحب ناظم	۲۳	غزل	۱۰	مالگیر کے مضامین
۵۲	مولانا بشارت کریم صاحب خزنی	۲۴	پیمان مستحکم	۱۱	کیسے لکھیں؟
۵۶	لطیف انور صاحب گورد پوری	۲۵	انوار سخن	۱۲	کلام محمد
۵۷	مشتہرین اصحاب	۲۶	اشتمارات	۱۳	انجیل
	فرمائیے		ضرور ملاحظہ		عالمگیر کا
					روسی نمبر

مکتبہ جامعہ

اگر آپ کو اپنے محل کی تنظیم مزید بہتر کرنے کے لیے اسلامیہ دینی کا با تصویر رسالہ ملے گا
 طلب فرمائیے۔ قیمت سالانہ پندرہ سالگرہ نمبر ۲۵۰۰ روپیہ فی ۱۹۳۶ء
 ملے گا ہے۔ مکتبہ جامعہ اسلامیہ دینی۔ قسودل بارغ۔ دہلی

مکتبہ جامعہ

مکتبہ جامعہ اسلامیہ دینی کا با تصویر رسالہ ملے گا

حافظ محمد عالمگیر صاحب

کے اکلوتے نو نظر کا، راج ۱۹۳۶ء کو ایک سید مختصر حالات کے بعد انتقال ہو گیا۔
اگرچہ روسی نمبر کا کام تاریخ تک تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن اس کا ناگہانی صدمہ کے سبب اس کی فوری اور قطعی تکمیل ناممکن ہو گئی۔ اس لئے اب انشاء اللہ تعالیٰ یکم اپریل کو روسی نمبر کے وی۔ پی کی روانگی کا سلسلہ شروع ہو گا اور غالباً ۱۰ اپریل تک عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کے نام وی۔ پی بھیج دیئے جائیں گے۔

کسی صاحب کو اگر کسی وجہ سے روسی نمبر کی خریداری منظور نہ ہو تو وہ دفتر کو اطلاع دیدیں تاکہ دفتر بلا وجہ وی۔ پی وغیرہ کے اخراجات کا زیر بار نہ ہو۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور لکھئے۔

عالمگیر کا روسی نمبر بلا مبالغہ روسی لٹریچر کی جان ہے تقریباً تمام مشہور روسی مفکرین کے مضامین اور افسانے عالمگیر کے "روسی نمبر" میں

موجود ہیں۔

مینا زمند، منیجر عالمگیر لاہور،

ملاحظات

نوجوان بھائی کی دائمی مفارقت اور ناگہانی موت کا غم ابھی شدید نہیں ہوا تھا کہ موت کے جرم ہاتھ نے میرے دل پر ایک اور چرکا لگایا۔ آہ! دل و جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ جانے کو تیار نہیں۔ آہ! یہ جاگزا آخر کس طرح والہ قلم کروں کہ میرا اکلوتا نور نظر ہمیشہ ہمیش کے لئے مجھ سے رخصت ہو گیا۔ بڑی آندوں، بڑی تمنائوں اور التجاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے پیش قدمیت۔ یہ پیش بہادری عطا فرمائی تھی اور میں ابھی جی بھر کر اسے دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ موت کا پیغام آ گیا۔

روئے گل سیر ندیم و بہار آخر شد

خدا تعالیٰ کی مشیت اور اس کی مصلحتوں کے سامنے تسلیم غم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور میں درد و کرب اور رنج و الم کے ان احساسات کے باوجود جو ایسے نواتع پر نمودار تھے بس انسان کے دل کو مضطرب اور متعطل کر دیتے ہیں خدا کے بزرگ و برتر سے تو فیضِ مہربان کا طالب ہوں اور سو آگے بڑھ کر کہ جسے عطا فرمایا ہوگا؟

اس جگہ کا مدد میں جن صاحب کے خود شریف لاکر یا خطوط کے ذریعہ میرے ساتھ انھار ہمدردی فرمایا ہے میں ان سب کا شکریہ گزار ہوں۔ چونکہ اپنی پریشانی کی بنا پر فردا فردا تمام گرامی ناموں کے جواب میں نہیں لکھ سکا ان لئے ان سطور کے ذریعہ اجاب کرام کی خدمت میں اپنے دلی جذبات و تشکر پیش کرتا ہوں۔

پنجاب کے تقریباً تمام اسلامی اخبارات نے اس غم انگیز اطلاع کو شائع کر کے جن مخلصانہ الفاظ میں میرے ساتھ انھار ہمدردی کیا ہے اس کے لئے میں بہت ہی تشکر گزار ہوں۔

عالمگیر کے تمام ناظرین کرام ہے۔ بالاجہ آند و مند ہوں کہ وہ درگاہ رب العزت میں میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اطمینان قلب اور ذہنی سکون عطا فرمائے۔ میرے مصائب و پریشانیوں ختم ہوں۔ وہ خط پوشش و عطا پاش ذات مجھے اب امتحانِ انہما میں نہ ڈالے۔ تفکرات اور یاوسیوں کی گستاخ و تازیکی دور ہو۔ میری آندوں اور تمنائوں کے خزان دیدہ گمش میں روح افزا بار کا دور دورہ ہو۔

اللہ دیکھئے نہ الم نور قطہ رکا،
نہ جانے ہے آنکھوں کو قلب و سر کا

یہ واقعہ ہے کہ ان جانگزا اثرات کو جو اس حادثہ کے بعد میرے دل و دماغ پر مرتب ہوئے ہیں کما حقہ الفاظ کے ذریعے ظاہر کرنا میرے لئے قطعی ناممکن ہے۔ میں بہر حال مدافعتی بھٹائے الہی اور اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہوں۔

اسی بچہ حادثہ کے ساتھ ایک اور غیر دشت اثر بھی سن لیجئے عالمگیر کے نام ناظرین کرام غالباً مولانا آصف بھاری کے اہم گرامی سے واقف ہونگے۔ آپ اعتبار الملک حضرت منظر خیر آبادی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ گذشتہ خاص نمبر ۳۳ میں آپ کا ایک بلند پایہ تحقیقی مضمون طوفانِ نورجی ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

اب مولانا آصف کے الفاظ میں ہی مذکورہ بالا خبر کو ملاحظہ فرمائیے۔

مدیر محترم انیسلم قادیان

عزیز و محترم باغیچہ کمالی، ۶ رزی انوار کے روضہ بجاہر و سل انتقال کر گئیں فرزند عزیز مولوی ابو یوسف عتی ندوی کے بعد بھی خیر نہیں جنس نعم الہدیٰ سمجھ کر اپنا کلیہ بھٹکا کیا گواہ امرت آباد بھی جن گئیں آپ سمجھتے یہ کون خضرانہ تھیں وہی خضرانہ فوج کے بہترین مضامین آپ ملک اور مہربان کے مختلف اخبارات و رسائل میں ملاحظہ فرمائیے ہیں۔ مرحوم نے چھوٹی سی عمر میں اپنے لائق خالق و اشقیق والد کی بدولت عوامی استعداد و قابلیت پیدا کر لی تھی اور کی بہت حد تک انہیں بے اثر مہربانہ انہیں کچھ اور مہلت و جی۔

پس ان صاحب صاحب بن بھاری کی خدمت میں اس جگہ جگہ جگہ پر اپنی اور عالمگیر کے تمام ناظرین کی طرف سے جذبات ہمدردی پیش کرتا ہوا امت بدعا ہوں کہ خدا نے قادر و قہم مرحوم کو جو رحمت میں عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل۔

رومی خبر بھی پریشانیوں کے سبب پورے طور پر مکمل نہ ہو سکا۔ اب ناظرین کرام کی طرف سے اس مضمون کی شکایتیں آنی شروع ہو گئی ہیں کہ ہمیں اب تک صبر و ضبط رکھنے کا وہی پتہ نہیں پونگا جو ہمارے تمام حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ یکم اپریل کو تمام خیر و خیرات کے اسمائے گرامی پر رومی خبر کی روشنی کا سلاش شروع ہوگا اور غالباً سلا پر اپریل تک تمام دی پتہ بھیجے جاسکے گا۔ حافظ محمد عالم غنی

سہیلی کا اشار

"لیلا! میں تمہیں نہیں بھول سکتی۔"
 "یہ کیا بات؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟"
 "نہیں۔ میں تم سے بالکل مختلف ہوں۔"
 "آخر میں بھی تو جاؤں! تم میں کون سی بات نئی ہے؟"
 "یہ سچیں! آئندہ معلوم ہو جائیگا۔"

میرے تباہی میری شادی کے لئے بہت بچپن تھے۔ جب تک میں تھی تھی
 کوئی بات ہی نہیں تھی مگر جبکہ میں جوان ہوئی تھی ماں کے اور گھر والوں کی
 آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی۔ آخر کنگ پوس کے زمیندار امکانت کنگ کے شہ کے
 دے کرشن سے میری شادی ہو گئی۔ اب وہ بچپن کی باریں خواب بن چکی ہیں
 بیکے جوازادی اور بیکری تھی وہ جاتی رہی۔ میں پہلے میک تھی اور بچپن
 کی شوفیاں میرے اند کوٹ کوٹ کر بھری تھیں مگر اب بات کسے کسے بھی
 میں شربایا کرتی۔

اب تو وہ پیش و آرام یاد آ کر ٹری ٹکیٹ دیا کرتا تھا۔ ایسا محسوس
 ہوتا تھا گویا مجھے کسی دوسری دنیا میں قید کر دیا گیا ہے۔ ات بہت سارے کی بکھا
 نندوں کی جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔ میں نے کبھی کسی کی بات بھلا کر اٹھائی تھی
 میری سسرال میں کسی چیز کی کمی تو تھی نہیں۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ میرے
 شوہر خود زمیندار تھے۔ مکان سے قریب ہی ایک باغ بھی موجود تھا۔ قصبہ میں کوئی
 محل اور عالی شان عمارتیں ہماری موجود تھیں۔ روپے پیسے کی بیاں بھی کی نہیں تھی
 مگر ایک بیوی کو جو خوشی چاہئے وہ میر نہیں تھی۔ میرے شوہر فوجی رہتے تھے
 آج کل کے زمینداروں کو عموماً جو تعلیم دی جاتی ہے وہ انہیں مل چکی تھی لیکن
 اسے کیا کیا جانے اپنی بیوی کے ساتھ ان کا سلوک بے حد تکلیف دہ تھا۔ وہ
 عورت کو مرد کی محبت تھتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں بیوی کی کوئی وقعت ہی

میرے عزیز رشتہ دار مجھے باریں لایا کرتے تھے۔ ایک رئیس گھرانے کا چشم و
 چراغ تھی بچپن سے نانوغم میں پرورش پائی تھی۔ روپہ اور دولت میری بھال
 میں کوئی وقعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ گھر میں میرے بھائی اور دوسرے بچے موجود تھے
 مگر میری والدہ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتی تھیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ
 ہمارے خاندان میں مدت سے کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بڑی تمناؤں اور
 آرزوؤں کے بعد میں پیدا ہوئی تو ابتدا سے ہی میری پرورش و پرداخت میں ہر
 شخص انتہائی توجہ اور اہمیت دیتے تھے۔

میرے والدین مجھے ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے محکمے بچوں کے
 ساتھ کھیلنے کو نہ بھی دیتے تھے صرف میرے پردوس کی لڑکی رامی مالبہ مجھ سے
 بچنے چلی آتی تھی۔ اسی کے ساتھ میں اپنے گھر میں لایا کرتی تھی اور چونکہ میرے گھر کے
 آدمی اس لڑکی کے عادات سے مطمئن تھے اس وجہ سے مجھے بھی اجازت مل
 گئی تھی کہ جب کبھی میرا جی گھرایا کرے تو اس کے مکان پر ہوا یا کر دوں۔ میں
 اکثر رامی کے گھر جا کر کھیلا کرتی۔ ہم دونوں گڑیوں کا بیاہ کیا کرتے۔ ہمانوں
 کی دعوت کے لئے چھوٹی چھوٹی ہنڈیوں میں چاول پکاتے اور بالکل ماس طرح
 خوش خوش رہا کرتے گویا ہمارے مکان پر واقعی کوئی شادی ہوئی ہے۔

اسی طرح دونوں سے پہننے اور نہنوں سے پہننے ہوتے گئے۔ اب مجھ میں کچھ
 سنجیدگی پیدا ہو چلی تھی۔ پہلے تو رامی سے کسی کسی بات پر لڑائی بھی ہوا کرتی تھی
 مگر اب ہم دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے لگے تھے۔ کبھی ایسا
 بھی ہوتا رامی مجھ سے آئندہ زندگی کے متعلق کوئی نہ کوئی بات پوچھ بیٹھتی۔

"لیلا! تمہاری جب شادی ہو جائیگی تو بھلا ہیں کیوں یاد کرو گی؟"

"چھٹی ہوئی ہو بھلا رامی میں تمہیں کوئی بھول سکتی ہوں۔"

"نہیں بہن! پرانے گھر میں ہم کے کوئی لڑکی کسی کو یاد نہیں رکھتی۔"

"تو رامی تم مجھے بھول جاؤ گی۔"

یہی میں ہر چند کوشش کرتی کہ کسی نہ کسی طرح انہیں خوش رکھ سکوں۔ مگر میری تمام کوششیں بیکار رہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

اول اول تو وہ مجھ سے بڑے تنگ سے پیش آئے۔ نئی نئی انگلیں تھیں بیوی کوئی عجیب چیز معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان کی طبیعت کا یہ جوش کرشمی کا ابال ثابت ہوا۔ وہ چار دن کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہیں مجھ سے نہ کوئی ہمدردی ہے نہ محبت۔ ان کی ہل سے میں کسی حال میں رہوں۔ میں اس کے ظلم۔ زندگی جانیں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔ مگر میں اس حال پر صبر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر مجبور تھی کیا کرتی مگر کا ایک ایک آدمی میرا دشمن تھا اور کسی کو بھی مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

میری شادی سے تھوڑے دن ہی بعد رامی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے بچی قریب کے ایک تھانے میں سب اپنا کرتے تھے۔ شادی ہو جانے کے بعد چونکہ میں اور رامی ایک ہی شہر میں تھے اس وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے چلی آتی تھی۔ ایک روز جو وہ میرے پاس آئی تو میں بہت اداس بیٹھی تھی۔ میں نے اب تک رامی پر اپنے دل کا حال ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر آج وہ مجھ کو گریں ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں مجھ سے اصرار کر کے پوچھنے لگی۔

"لیلا یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے سچ بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے۔"

"کچھ نہیں، رامی۔"

"اچھا، لیلا مجھ سے سچی بات چھپاؤ گی۔"

"رامی، تو میری بچپن کی رازدار ہے تو مجھ سے کیا بات چھپ سکتی ہے؟"

"اچھا تو دیکھو سچ بتاؤ گی کیا مذہب نے کچھ کہدیا یا اس تانا تار میں نہیں ہمارے بھائی صاحب سے کچھ ان بن ہو گئی معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں رامی کسی کا قصور نہیں میری تقدیر کا قصور ہے۔"

"لیلا بہن! دیکھو ہم سے نہ چھپاؤ۔"

رامی نے کچھ اس طرح اصرار کے ساتھ مجھ سے کہا کہ مجھے اپنے دل کا حال

کتنے ہی بن پڑی۔ رامی کچھ دیر تک تو چپ بیٹھی رہی اس کے بعد اس نے کہا

"لیلا میں اس وقت جاتی ہوں۔ تم میری فکر نہ کرنا اب میں اس وقت

لوگ جب تمہاری شکلات دور ہو جائیگی۔"

میں نہ معلوم کون زیادہ اصرار بھی نہ کر سکی۔ رامی میرے پاس چلی گئی۔

میری اپنی دمن کی کپی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اسی دن سے میرے شوہر کی نقل و حرکت کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ خود تو بھلاہ کیا دیکھا کہ کر سکتی تھی اس نے اپنے شوہر سے سارا حال کہلایا۔ وہ پولیس میں تھے وہی دن میں انہوں نے معلوم کیے کہ تباہ کیا کہ وہ کرشن کنک تانا می طوا کت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

رامی نے میرے شوہر کے متعلق جب ساری باتیں معلوم کر لیں تو اس نے ایک کپی بن کی طرح مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے اپنے آپ کو خطر میں ڈالنے سے بھی گریز نہ کیا وہ ایک دن چھپر کنک کنک کے مکان پر پہنچی۔ اور اس سے کہا۔

"کنک تانا تم مجھے نہیں جانتیں۔ نہ معلوم کون کی ضرورت ہی ہے۔"

لیکن تم ایک عورت ہو اور میں جانتی ہوں کہ عورت کا دل عورت کی تکلیف و مصیبت

کا اندازہ کر سکتا ہے۔ میں اپنی ایک بہن کی دکھ بھری زندگی سے متاثر ہو کر تمہارے

پاس تک آئی ہوں۔ شاید اس کی مصیبت تمہیں بھی متاثر کر سکے اور تم بھی میری

طرح اس کی ہمدردی پر تیار ہو جاؤ۔"

کنک تانا حیران تھی کہ ایک شریف عورت اس کے گھر پر آکر اس کے سنوٹانی

دل سے ہمدردی کی اپیل کر رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"کنک تانا! یہ نہ پوچھو میں کون ہوں۔ ہاں یہ مجھ کو کہ میں کیا چاہتی ہوں

تم نے میری ایک بہن کی امانت چھین رکھی ہے۔ اس کا شوہر دجے کرشن تھا جسے

قبضہ میں ہے۔ تم نے اس کے آندوں بھرے دل پر بھلیاں گرا رکھی ہیں۔ تم

چاہو تو اس کی موجودہ المناک زندگی کو خوشحال بنا سکتی ہو۔ کنک تم دنیا میں آؤ

دجے کرشن حال کر سکتی ہو مگر لیلا کو کوئی دجے کرشن اس کے بعد نہیں مل سکتا۔"

کنک سب کچھ سمجھ گئی۔ رامی نے اسے میرا نام بھی بتا دیا اسے یہ بھی معلوم ہو گیا

کہ دجے کرشن کی بیوی کا نام لیلا ہے۔

رامی نے جو کنک کا دل نرم ہونے دیکھا تو اس نے اپنے کئی ہزار روپے کے

زیور اس کے قدموں پر ڈال دیئے۔ کنک یہ تمہارے میاں اور مجھ سے کوئی

دھوکہ کرنے سے پہلے تمہارے۔ میں تمہارے نرم دل کو دیکھ رہی ہوں۔ تمہاری

جگہاں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ تم میرا پیغام ہمدردی قبول کرنے کو تیار ہو۔ کنک نے

ہر چند اصرار کیا مگر رامی نے وہ زیورات واپس نہیں لئے۔

ایک روز ایک بچہ کے ذریعے مجھے کنگ کا ایک خط ملا۔ "بن لیلا" میں
تھوڑی گھبراہٹ ہوئی۔ اپنا قصور معاف کرنے کے لیے اسے پاس تک آنا چاہتی ہوں کج
شام کو مجھے اپنے ہائیں باغ میں کنگ کی اجازت دیجئے میں اس احسان کے بدلے میں
کہ تم میرا قصور معاف کر دو تب میں وہ نسخہ بنا دوں گی جو مجھے کرشن کو اماندہ ہمیشہ کے لئے
تھا اور صرف تمہارا ہی بنائے رکھے۔ تمہاری خطا وار کنگ،

میں اول اول تو پہچانی ہی نہیں کہ یہ کنگ کون ہے مگر اس کے خط کے آخری فقرہ
نے مجھے شوق دلایا کہ میں اس سے ضرورتوں اور دیکھوں وہ کون سا نسخہ ہے جس کے
استعمال سے میں دس کرشن کے دل پر قابو پا سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کنگ
نے میرا کیا قصور کیا ہے لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے میرا کوئی قصور بھی
کیا ہے تو میں اسے اس وجہ سے بالکل معاف کر دوں گی کہ اس کے ذریعے سے مجھے
وہ نسخہ حاصل ہوا جو اب ہے جس سے میری تمام عمر کی مصیبت دور ہو جائیگی اور میرا
شوہر ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائیگا۔ میں بڑی بے صبری سے شام کا انتظار کرنے لگی
اور کنگ کے ذریعے سے میں نے کنگ بھیجا کہ میں اس کی منتظر ہوں۔

شام کو میرے ہی گھر کے کام کاج سے بٹ کر میں برابر کے باغ میں چلی
گئی۔ کوئی بیس منٹ بھی نہ ہوئے ہونگے کہ سامنے سے ایک خوبصورت عورت
آتی نظر آئی قریب آنے پر معلوم ہوا یہ عورت اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنی
معلوم ہوتی تھی اس نے نئے فیشن سے بالوں کو آماستہ کر رکھا تھا۔ چہرے پر لہو
اور کریم لگا ہوا تھا آنکھوں میں خاص طریقہ سے سرمہ کی تحریر بنایاں کی گئی تھی،
اس کی ہر ایک حرکت سے انداز و نمکنت چمکتی تھی۔ میں حیران تھی کہ آج یہ
کون عورت مجھ سے ملنے آئی اسے تو میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں مگر اس کے بہیم
مسکراتے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے پہچان گئی ہے اور کسی غرض سے میرے ہی
پاس آئی ہے۔

اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا اور اپنا ہینڈ بیگ پاس رکھ کر میرے قریب
بیچ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک میں اور وہ دونوں خاموش رہے ایسا معلوم ہوتا تھا،
وہ میری طرف سے سلسلہ گفتگو شروع کئے جانے کی منتظر ہے میری طبیعت میں اس
خاموشی سے خود ایک الجھن سی پیدا ہو رہی تھی۔ آخر میں نے کہا۔

"آپ کون ہیں یہاں کس غرض سے آئی ہیں؟"
"کیا آپ کو میرا بیان آتا گاوار ہوا۔ میں تو آنے سے پہلے کپ کی اجازت
بھی لے چکی ہوں۔"

"اچھا اب میں بھی، کوہن کنگ مجھے کیا کہنا ہے؟ میں نے نہ پہچان
سکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں بہن! کہنا تو مجھے نہیں آپ کو ہے۔ مجھے تو اپنی خطا معاف کرنا ہے۔
تم نے ایسی کون سی خطا کی۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں میں نے آپ کے شوہر مجھے کرشن پر محبت
کے دوسرے ڈالے انہیں تم سے متفر کیا۔ یہ قصور ہی کیا کہہ ہے؟"

"لیکن کنگ ادا اب کیا چاہتی ہو؟" میں نے سختی بھرتے ہوئے کہا۔
میرے ان لفظوں سے کنگ کا دل بھر آیا اس نے میرے گے میں نہیں
ڈال دیں۔ "بن لیلا" میں خطا داہوں۔ میں نے تمہارا قصور کیا میرا قصور
معاف کر دو۔ خدا کے لئے میری خطا معاف کر دو۔"

مجھے سارا حال معلوم ہو کر غصہ ضرور آیا تھا لیکن اس کی ان باتوں سے
میں زیادہ دیر تک ناراض بھی نہ رہ سکی۔ عورت کا دل ہی کیا۔ وہ کتنی ہی خطا
اور میرا رکیوں نہ ہو دو لفظوں میں پانی پانی ہو جاتی ہے۔ میں نے مسکراتے
ہوئے کنگ سے کہا۔

"کنگ میرا نام تمہیں کس نے بتایا؟"
"لیلا میں سب کچھ بتا دوں گی لیکن پہلے یہ کہہ دو کہ میں تیرا قصور معاف کیا۔"
"اچھا کنگ، اگر تم نے کوئی قصور بھی کیا تھا تو میں نے اسے معاف کیا گزرتا
مگر کیا لیلا؟"

"وہ نسخہ؟"
"کون سا نسخہ.... میں کوئی جیکم ہوں۔"

"دیکھو نہیں نے تمہارا کنگ کر دیا تو پھر تم وعدہ سے بھرنے لگیں۔"
"نہیں نہیں مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ لیلا میں تمہیں وہ نسخہ بتا کر بلا تجرہ کر اگر
پھر جاؤں گی۔"

اُس نے مڑ کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس کے اندر سے دو تین قسم کی
نیشیاں اور ڈبیاں نکالیں۔ خوشبو اور فلک کے مارے میرا دماغ مسموم کیا۔
میں سوچنے لگی، دیکھو اب کیا کرتی ہے؟

اس نے کہا۔ "لیلا دیکھو میں اس وقت کچھ کر رہی تھی تمہارے فائدے
کے لئے تم مخالفت نہ کرنا۔ یہ معلوم کیوں میں اس کا کہنا تھی۔ مسکراہٹ
اب بھی میرے ہونٹوں پر طاری تھی اور میں کبھی کسی اس سے دور ہٹ جاتی

اس بات تو یہ ہے کہ اگر وہ خود اپنی خوشنویسی سے میرے چچی کی بابت سارے حالات کا پتہ نہ لگالیتے تو رامی کو بھی میری امداد کرنا دشوار ہوتا۔

رامی سچ بہت خوش نظر آتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی بھی سبیلی بیلا کی نہ کر کے اس نے اپنے دل پر سے زبردست بوجھ اتار دیا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اب تک میرے چچی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ رامی اسی سب کی بیوی ہے جو ان کا دوست بن کر ان کے سارے بھید معلوم کرتا رہا ہے جب میں نے انھیں ان سب حالات سے مطلع کیا تو وہ بہت تعجب ہوئے اور اسی سے کہنے لگے۔ "رامی میں نہیں جانتا تھا کہ دنیا میں تم جیسی بھی اور فدا و غور میں بھی موجود ہیں۔ تم نے اپنی سبیلی بیلا پر نہیں بلکہ مجھ پر کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ تمھارے شوہر نے بھی اس ڈرامے میں وہ پارٹ کیلئے کہ میرا کوئی جان نثار دوست ہی ایسا کام کر سکتا تھا۔"

رامی میں سب کو خوش دیکھ کر گھر جانا چاہتی تھی لیکن چچی یہ کہہ کر اسے روک لیا کہ ابھی تمھارا اور تمھارے ساتھ کنگ کا بچہ بہت شکریہ ادا کرنا ہے۔

میں نے رامی اور کنگ کو کوئی روز جمانے کا حکم دیا کہ وہ رامی کے شوہر کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ اور میری بیوی کے پاس ایک دوسرے سے کنگ کے ہلوگوں کے سامنے اس بات کا اعلان کر لیا کہ آئندہ وہ پاکیزہ زندگی بسر کریں گی۔

اس واقعہ کو مدت گزر چکی۔ اس وقت سے میرے چچی مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے ہیں۔ اب بھی جب کبھی کنگ ہمارے یہاں آتی ہے تو ہمیں خوب خوب چھیڑا کرتی ہے۔

میں نے میرے چچے کو قریب بٹھا لیا تھی۔

اس نے میرے چہرے پر ایک خاص قسم کا کرم لگایا۔ پوچھ لگایا۔ میری آنکھوں میں اپنے ہاتھ سے سر نہ لگایا۔ میرے بال کول کرنے میں سے سنوارا۔ اور جب مجھ اپنی پسند کے موافق سجاوٹی تو ہینڈ بیگ میں سے آئینہ نکال کر میرے سامنے رکھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کنگ آنکھوں سے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو زمین پر گر پڑا۔

مگر فرق نظر کرنے لگا اب میں وہ پہلی بیلا نہیں تھی۔ میں ابھی کنگ سے باتیں ہی کر رہی تھی کہ ایک طرف سے میرے چچی آتے آتے نظر آ گئے۔ میں انھیں دیکھ کر گھبرا گئی میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اتنے میں کسی نے میرا ہاتھ پکڑا۔ رامی میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"رامی تم کہاں؟"

رامی اس کا جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ میرے شوہر نے کہا۔ "رامی نے تو یہ تمام خدا سے مرتب ہی کیا ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی کنگ آئی اسی کے بلاتے ہوئے ہیں اور تم آئے ہیں۔"

"مگر بھائی اس سلسلے کھل میں خاص پارٹ تو آپ نے ہی کیا ہے۔" رامی ہنس کر کہنے لگی اس کے ہونٹوں سے پھول جھڑپے تھے۔

میرے منہ سے نکل گیا۔ "رامی تیرے انیار نے میری زندگی سنواری۔"

میں اب تک یہی سمجھتی تھی کہ اس تمام ڈرامے میں زیادہ تر رامی اور اس کے بعد کنگ کا ہاتھ کام کرتا رہا لیکن جدید معلوم ہوا کہ رامی کے شوہر نے بھی کچھ کم پارٹ نہیں کیا۔

میکو کے دو جام

"اندھی پھولوں والی لڑکی" صبح کا سنا وقت تھا میری خیابان چمن میں تانہ لہلاتے ہوئے پھولوں کی محبت سے سست بیٹھا تھا۔ دنیا نے محبت میں کوہیا ہوا۔ اس وقت ایک سین لڑکی بھائی کے قہر میں پیش کیے آئی۔ وہ محبت کا تمغہ۔ ایک پھولوں ہار کول کے تپے میں لٹا ہوا تھا۔ میرا دل سرتوں سے لہرز پڑ گیا اور میں نے اس کے اپنے گے میں پر لیا۔ لیکن میری آنکھوں کو بڑے گور ہرست پہنچ گئے۔ وہ پیکر من بن کر سامنے کھڑی ہی۔ میں نے اس صدف کے دست نازک کو چوم لیا۔ اے گل گوار سن! میں تیری محبت کے پھولوں کا تمھارے ہند کرتا ہوں مگر افسوس ان پھولوں کی طرح تو بھی اندھی ہو اور میں جانی کر تیرا تمھارے کتنا خوبصورت اور دلکش ہے۔

لہذا وال لطیف درد۔ اے دنیا! میں تیرے چمن سے ایک پھول چن لایا اس کو جوش سرستیں اپنے پھلتے ہوئے دل کی آغوش میں لیکر زور سے چھینچا۔ مگر اس نکتہ پھول میں جہنم نہ تھا اس نے میرے دل میں چھو کر ایک لطیف زخم پیدا کر دیا۔ جب دن ختم ہو گیا اور رات کی تاریکی نے اپنا قبضہ دنیا پر چایا تو میں نے دیکھا کہ وہ دلکش پھول جو صبح کے وقت آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشا تھا اب مرجھا کر اپنی پہلی دلکشی کو کھچا۔ لیکن میرے زخم خندہ دل میں وہ درد خندہ باقی تھا۔ اے دنیا! تیرے چمن میں اور بہت سے پھول اپنی دلکش رعنائیوں اور خوشگوار بھنی بھنی خوشبو کو لئے ہوئے کھیل گئے۔ مگر میری نگشت کا ناز ختم ہو گیا۔ اب میرے پاس وہ میرا دلکش گلاب نہیں ہے۔

ہاں! صرف وہ لطیف درد اس دل مدد چاک میں اب تک باقی ہے۔ (ترجمہ از زبان میگو)

فوتی حیدری۔ اسلامیہ کالج دہلی،

تخیلاتِ عالیہ

از معنی القاب العجائب میر اکبر نواب اعانت جنگ میں اللہ وہا دم قبالہ (امیرِ گلہ)

کس طرح شامِ جدائی ہو سحر سے واقف	میرے نالے ہی نہیں رنگِ اثر سے واقف
تیری نظروں میں ہے میرے دل بیتا گھر	دل ہے میرے اندازِ نظر سے واقف
قریبِ غیر نے اب رنگِ جمایا اپنا	اب ہوئے آپ محبت کے اثر سے واقف
فتنہ پر دازِ زمانے میں ہمیں ہیں مشہور	خیر سے آپ کے دشمن نہیں شر سے واقف
پہنچتے کیوں ہیں مرا آبدِ پانی کا سبب	کیا نہیں آپ محبت کو شر سے واقف
آشیانے کے عوض کنجِ قفس ہے معلوم	بدلے لکشن کے ہوں صیاد کے گھر سے واقف
مدولے ضبطِ فغاں المدولے ضبطِ فغاں	ہونہ جائیں وہ کہیں سوزِ جگر سے واقف
آج کیا بات ہے کیوں در پہ لگا ہے میلہ	کل شمعِ غیر تری را ہگزر سے واقف
دوستِ دشمن کی خبر لوچھتے کیا ہو مجھے	بینبر ہوں نہیں آپ اپنی خبر سے واقف
زیرِ دیوار مجھے دفن کیا ہائے غضب	ہو گئی خلقِ خدا آپ کے در سے واقف
ہیں جو نا فہم انھیں قدر مری کیا ہو معین	ہوتے ہیں اہل ہنر اہل ہنر سے واقف

مغل فن تعمیر

از جناب ابو عبد اللہ محمد صاحب حیدر آباد دکن

تو ہی ان کی مقدس خاک کے مال نہیں۔ زندگی میں یہ عمارت بارہ درجہ کی ملاقا اور مرنے کے بعد اس کا مقصد مقبرہ میں بدل ہو جاتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ مقبرہ بن جانے کے بعد اس کی دیواریں مطربان رنگ خور کے پرسوز نغموں سے بھر گئیں۔ گو بختیں اور چل پھل اور قہقروں کے بجائے پر عظمت سکون اور غنائی طاری ہو جاتی تھی۔ اکبر احمد جاگیر کے زمانے میں فن تعمیر بڑی حد تک ہندی اثرات کے تحت رہا۔ خصوصاً بابر اور ہمایوں کے ایرانی فن تعمیر کے نظائر قائم کو دیکھنے کے باوجود دور اکبری میں اس قسم کے رجحانات بالکل خلاف توقع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایرانی تقاطق کو قطعاً نظر انداز نہیں کر دیا گیا اور نقش نگار اور نگاروں کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن پھر بھی ہندی اثرات بڑی جگہ پر فطرت سیکری کی تعمیر میں کار فرما رہے۔ ہندی عمارت ایرانی طرز اور خصوصیت سے اس قدر آشنا ہو گئے کہ اجنبیت کا فرق بالکل مٹ گیا۔ ایرانی آرائشی محاسن اور تعمیری نزاکتوں کو ہندی خواص تعمیر کے ساتھ مخلوط کر کے انھوں نے ایک نہایت ہی ارفع داعی مخلوط طرز تعمیر کی ابتداء کی۔ اس کی ایک بنیاد مثال فتح پور سیکری کی مسجد کا بلند دروازہ ہے جس کو اکبر نے اپنی فتوحات دکن کی یادگار میں تیار کروایا۔ زمانے نے اس کو دنیا کی ایک بہترین عمارت تسلیم کر لیا ہے۔ دروازہ خود ایک مکمل عمارت ہے جس میں کئی وسیع اور مختلف چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ فتح پور سیکری کی دیگر عمارات کی طرح یہ بھی سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور اس میں محض سنگ تراشی اور مرمر چڑھانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ معصوری اور نقاشی کی عدم موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کی تعمیر ہندی ہاتھ کی بہت زیادہ مرہونِ منت ہے۔ اس کا نقشہ اس میں شک نہیں کہ ایرانی ہے لیکن طرز تعمیر ایرانی عمارات سے بالکل مختلف ہے۔

ہندوستان میں فن تعمیر ابتدا ہی سے کافی ترقی یافتہ تھا لیکن دور مغل میں اس کو جو فروغ ہوا اس کی مثال ساری تاریخ ہند میں نہیں ملتی تو کی فراوانی اور شاہی سرپرستی نے وہ سب کچھ کر دیا جو اس کو انتہائے کمال پر پہنچانے کیلئے ناگزیر تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ مغلوں نے ایرانی طرز تعمیر سے ہندوستان کو روشناس کئے کہ ہندی فن تعمیر پر بہت بڑا احسان کیا۔ ہندی ایرانی اصول کے اختلاط نے فتح پور سیکری کو پیدا کیا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نظیر نہیں رکھتا۔ یوں تو اس سے پہلے بھی آثار و عمارتوں نے کئی عمارات تعمیر کروائیں لیکن زمانے کے ہاتھوں ان میں سے بہت کم محفوظ رہ سکیں۔ پانی پت میں کابل باغ والی مسجد جو ہارنے اپنی عظیم الشان فتح پر تیار کروائی۔ اس جلیل القدر بادشاہ کی ایک ہی یادگار ہے جو اب تک باقی ہے۔ ہمایوں نے بھی اس فن کی سرپرستی کی اور اپنے دار الخلافہ کی آرائش کیلئے کئی عمارتیں بنوائیں۔ مگر بابر اور ہمایوں کی عمارات زمانہ مابعد کے لئے ایک سرسری تمہید تھیں۔

اکبر کے زمانہ سے ایک جدا گانہ مستقل فن تعمیر شروع ہوا۔ جو دور جہانگیری کے اختتام تک چلتا رہا۔ دلی میں ہمایوں کا مقبرہ جس پر پندرہ لاکھ روپیہ صرف ہوئے لیکن جس کی تعمیری نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں شاید اکبر کا پہلا کارنامہ ہے۔ لیکن یہ اس کی ابتدا اور ہمایوں ہی کے زمانے میں ہوئی۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ اکبر کے مقبرے کی تعمیر خود اسی نے شروع کی اور اس کی تکمیل جہانگیر کے ہاتھوں ہوئی۔ مغل بادشاہوں کی شاید یہ خاندانی روایت تھی کہ وہ اپنے مقبروں کی تعمیر اپنی زندگی ہی میں کر دیا کرتے تھے فرگوسن صاحب خیال ہے کہ یہ لوگ اپنے مقبرے کچھ اس طریقے کے بناتے تھے کہ زندگی بھر تو وہ ان کی تفریح اور عیش گاہ کا کام دیں اور جب وہ اس دنیا سے چل بسیں

کی نگرانی کی۔ شاہ دارے (شاہ پرہ) میں جولاہور سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر ہے شہنشاہ جہانگیر سنگ سرخ کے مقبرے میں جو اس کی پرستار نور جہاں نے اس کے لئے تیار کروایا اب دی نیند سو رہا ہے لیکن قوم کی لاپرواہی اور تغافل نے اس کو بہت سخت نقصان پہنچایا۔ وہ نہ نور جہاں کی محبت کی یادگار دنیا میں آج اتنی خستہ نہ ہوتی۔

شاہ جہاں کے زمانے سے فن تعمیر کی تاریخ میں بالکل ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اکبر اور جہانگیر کے برخلاف اس عہد میں ہندی رجحانات مفقود ہو گئے اور ایرانی اثرات نے ان کی جگہ لے لی۔ تدریجاً تعمیریں اتنے زبردست انقلاب کی نظر جو اس قدر قلیل عرصہ میں ہوا ہو یا اس میں فرق کی مثال جو اکبر کے وجہ اور نفیس ایچ اور شاہ جہاں کے انتہائی نازک اور لطیف طرز میں ہے شکل سے یلگی۔ لہذا فتح پور سیکری اور شاہ جہاں کے دلی اور اگرہ کی عمارات اس فرق کو ظاہری طور پر واضح کر دیتی ہیں۔ اول الذکر کی تعمیریں بہت زیادہ سنگ سرخ کو دخل ہے اور دلی اور اگرہ کے شاہ جہاںی عمارات سفید مرمر کی ہیں جن پر پیش قیمت جواہرات جوئے ہوئے تھے۔ یہ طرز شاہ جہاںی کی خاص خصوصیت ہے۔ شاہ جہاں کے مزاروں کا مقصد فن تعمیر میں نئے تجربات کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا نصب العین یہ تھا کہ ایک مکمل تصویر کو پتھر میں منتقل کر دیا جائے۔ جہانگیر کے معبود اور شاہ جہاں کے مزار اور سنگ تراش مجرمانہ تھے۔ شاہ جہاں دلی سے پھول توڑ کر ان کو دیدیتا تھا کہ پتھر میں ایسا پھول تراش دیا جائے اور اس حکم کی تعمیل میں صرف اتنا فرق ہوتا تھا کہ اس شے ہوئے پھول میں بونہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ جہاں کی عمارات خیام کی ربا عیات ہیں۔ برنیر کے جیسا غلط گویا چاہ بھی یہاں سر جھکا کر یہ کہتا ہے کہ "مگر اتفاقاً ہندی ہو گیا ہو لیکن میں یہ فیصلہ کن طور پر کہتا ہوں کہ یہ یادگار (تاج) اس بد صورت پتھر کے ڈھیر سے جس کو ابراہام معر کہا جاتا ہے کہیں زیادہ عجائب روزگار میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔" لہذا ڈسٹن سالون صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ ناممکن ہے

کہ ان اجزائے مذاق کی صحیح قدر قیمت کا کوئی اندازہ لگائے جس نے منہ پتھر اور سنگ مرمر میں یہ خوبی پیدا کر دی کہ وہ منلوں کی لا قیمت بیروں سے زیادہ جگہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پورا منہ فن تعمیر دلفریب آرائش سے ہے۔۔۔۔۔ منہ شاہ جہاںی ایک خاص نزاکت سے ہے کہ مختلف دیگر حصص اس انتہائی خوبصورتی سے مرکز کے لئے ناگزیر بنائے جاتے ہیں کہ کوئی ایک حصہ دیکھنے والے کی آنکھ کو اصل عمارت سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں کر سکتا۔ فرگوسن صاحب لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی کسی اور عمارت کی نہ اس قدر زیادہ تعداد ملی گئیں اور نہ اس کثرت سے کسی اور کو بیان کیا گیا لیکن اس پر بھی یہ تقریباً جان ہے کہ ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو نہیں دیکھا یہ بتایا جائے کہ تاج کیا چیز ہے صرف اس لئے نہیں کہ اس کی تعمیر میں بلا کی نزاکت اور خوبصورتی کوٹ کوٹ کر رکھی گئی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس کا نقشہ بہت پیچیدہ ہے۔۔۔۔۔

تاج محل اتنی لاتعداد خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے اور اس اعلیٰ ترین قابلیت سے ایک حصہ کو دوسرے کا لازم و ملزوم بنایا گیا ہے کہ سب مل کر ایک ایسی مکمل چیز ہو گئی ہے جس کی نظیر صفحہ ہستی پر نہیں ملتی اور جو ان لوگوں کو بھی محو حیرت کر دیتی ہے جو عالم طور پر تعمیری نزاکتوں اور دلفریبیوں سے بے بہرہ ہیں۔ صاحب سوموف ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "تاج اس قسم کی دوسری چیز پیش کرنے کے لئے ساری دنیا سے سوال کر سکتا ہے۔ اس کی خوبصورتی بہت ممکن ہے کہ اعلیٰ ترین نہ ہو لیکن جو کچھ بھی ہے وہ لا جواب، بی نظیر اور لاثانی ہے۔" بیس ہزار مزدوروں کی بائیس سال تک مسلسل محنت اور پچاس لاکھ روپے کے صرفے کے بند یہ عظیم اشان کام تکمیل کو پہنچا اور بیس سال تو کچا اگر

3. *Rural Painting of The Bombay Art-School*

by W. E. Gladstone Solomon Page 48,

4. *The History of Eastern and Indian*

architecton by Fergusson Page 313

5. " " " " " "

6. *The Six Voyages of John Taveuni Baptista*

Trawlain India Part II Book I Page 50

7. *Amedotes of Aurangzail and Historical*
essays by Saricar Page 148

8. *The History of Eastern and Indian*

architecton by Fergusson Pages 307
308

9. *Constable and Smiths edition*

of bernier Page 299,

ایک ہزار برس کی محنت کے بعد بھی یہ نبتا تو رہتی دنیا تک انسان اپنی صنعت پر فخر کر سکتا۔ محنت خاں اور میر عبدالکیم کی خاص نگرانی میں تاج تیار ہوا دنیا کو ان دو شاعر دماغ سمجھانے کے نام اساتذہ ہو کر لینا چاہئے۔

قلعہ اگرہ کی موتی مسجد گو دیگر شاہجہانی عمارات کی طرح شاندار اور پُر آرائش نہیں ہے لیکن مسجور کن تناسب، انتہائی پاکیزگی اور لطیف ترین نزاکت میں اس کی مثال دنیا بھر میں نہیں ہے۔ ہارول کے الفاظ میں ممتاز محل کے مقبرے اور موتی مسجد میں بہترین مغل تصاویر کی ساری الوکی نزاکتیں پائی جاتی ہیں۔ دیواروں پر جوئے ہوئے جواہرات اعلیٰ ترین مغل نقاش اور بہترین متعلق کے کارناموں کی جلی کھار ہے ہیں۔

موتی مسجد جالیاتی مذاق قصیمہ کا ایک نایاب نمونہ ہے۔ جس کو بنانے سے شاہجہاں کا شاید یہ مقصد تھا کہ غیر مسلم مسجد کو دیکھ کر ہی مسلمان ہو جائیں۔ دلی کی جامع مسجد کا نقشہ بھی موتی مسجد کے جیسا ہی ہے۔ گو جامع مسجد، موتی مسجد بڑی ہے اور وہ خوبصورت مینار بھی یہاں ہیں لیکن سنگ مرمر کے عجیب و غریب ملاپ کی وجہ سے وہ کیفیت اور نزاکت اس میں نہیں پائی جاتی جو موتی مسجد میں ہے۔ پھر بھی بہت کم مساجد دنیا میں اس پایہ کی ملتی ہیں۔ قلعہ دلی کا محل نہ صرف مشرق بلکہ دنیا کا خوبصورت ترین محل ہے جس سے حقیقت میں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مکمل شاہی محل کسے لے کیا گیا چیزیں ناگزیر ہوتی ہیں لیکن اب اس میں لے دیے اندر داخل ہونے کا راستہ نوبت خانہ، دیوانہ خانے خاص و عام اور دو ایک دیگر حصے باقی رہ گئے ہیں، محلہ اکسار احصہ تباہ ہو گیا اس میں بین باغ کے دربار اور کوئی تیرہ یا چودہ دربار تھے جو بالکل فنا ہو چکے اور آج دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے خوبصورت

اور شاندار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بقیہ حصے بھی بہترین ہیں لیکن فوجی رہائش گاہ کے بیچ میں ایک تو یہ بالکل بے سنی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف آدھی سے زیادہ ان کی خوبصورتی نائل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے بے نظیر جواہرات کوڑے کرکٹ میں ڈال دیے گئے ہیں۔ اسی محل میں وہ مشہور دیوان خاص ہے۔ جو شاہجہانی عمارات میں سب سے زیادہ پر تکلف اور پُر آرائش مانا جاتا ہے اس میں کلام نہیں کہ اگرہ والے دیوان خاص کی نزاکت اس میں نہیں پائی جاتی لیکن تعمیر کی محاسن اور آرائشی خوبیاں آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہی وہ دیوان ہے جس کی چھت پر یہ لکھا ہے۔

الفر دوس بر دے زمین است

ہیں است وہیں است ہیں است

اور شاہجہاں کے اس عوی کی تردید ذرا مشکل ہی ہے جب شاہجہاں اپنے اس دیوان کو فردوسِ ارضی کہتا تھا تو شاید تاج کے بدلے جنتِ سماوی بھی بول نہ کرتا۔ اور اس کا یہ انکار بڑی حد تک حق بجانب تھا۔

مورنگ زیب کا راز تعمیری نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ قدرتی طور پر اورنگ زیب شاہجہاں کی زبردست شخصیت کے سایہ میں آگیا۔ اس نے دلی کے محل میں چند اضافے کئے اور عام طور پر اس زمانہ میں بھی دارالخلافہ میں اور باہر بڑی بڑی عمارتیں تیار ہوئیں لیکن "تاج" اور موتی مسجد کے آگے بھلا انہیں کوئی کیا پوچھے گا۔

To Indian architecture by E. B. Havell
Page 215, 216 - 6, The History of Eastern and
Indian architecture by Ferguson Page 312

آرشد عارفی

عجیب غزل

رو کر جینا ہے جنی بال
گو یا دل کی رائے بحال
دل بیت میں ہے فی الحال
دیکھیں کیا ہوا کی ساز
اس نے بھیجا ہے رومال
جینا ہے تو نہیں کر جی ،
اس کا کوچہ ہے اور میں ،
الفت کا انجام بخیر ،
پچھلی سال حبدا تھا کوئی
لکھ کر میرا نام اسے شاد

تو اور پوچھے سینرا حال
ساتی کی مستانہ چال
دل کا داغوں سے وہ حال
رس اور انگوروں کا رس
کشتی ڈوبے فیکر نہیں
آگ لگا پھر پانی ڈال
نظریں زخمی دل پا مال
مفلں لیکن مالا مال
زاہد کی اب شکی رال
جو سب کا وہ اپنا حال

محسوساتِ مآہر

از شاعر حیات "مولانا منظور حسین صاحب مآہر القادری"

ہوا اس تخیل سے وہ جلوہ آرا	نگاہیں پکاریں کہ بس کھنڈارا
ترتیب ہے کبے کوئی غم کا مارا	ادھر بھی نگاہِ کرم کا اشارا
بڑی کشمکش میں ہے بیمارِ الفت	نہ جینے کی ہمت نہ مرنے کا یارا
اٹھا ایک طوفانِ ناکامیوں کا	ذرا آرزو کا لیا تھا ستارا
مرے دل کی اندرے بیتیاری	ہتھیلی پہ ہو مضطر جسے پارا
مری بے خودی کی مجسم ضمانت	ترمی دھ بھری انکھڑیوں کا نظارا
خبر لے! کہ اب منتشر ہو رہی ہے	ترے غم نے جس انجمن کو سنوارا
زمانہ جسے زندگی جانتا ہے	وہ ہے چشمِ فطرت کا بہم اشارا

میری زندگی کا خلاصہ ہے مآہر

وفا کا سفینہ محبت کا دھارا

برکی تلاش

از مولانا سید شبیر حسن صاحب تیس جید آبادی

لڑکی پیسے پیسے کے محتاج ہو جائیگی۔

مادام نے اس کی موت پر ماتم نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے اور بھی دوست اور چاہنے والے تھے جو اس کو اس مصیبت سے بچا سکتے تھے اور آڑے وقت میں دستگیری کر سکتے تھے اس لئے اس نے تباہی سے بچنے کی خاطر اس طرح کچھ آدنی پیدا کر لی مگر ایسے گذران کہتے ہیں کہ اس کی تمام امیدیں تقریباً منقطع ہو چکی تھیں۔ صرف ایک آس باقی تھی۔ اور وہ اس کی بیٹی کا حسن۔ اسی پر اس کے روشن مستقبل کا دارومدار تھا۔ اگر اس کی بیٹی کا کوئی اچھا خریدار مل گیا تو اس کی بھی زندگی سُدھر جائیگی۔ اور پھر وہ دوسری شادی کر لے گی۔ لڑکی کا حسن و عشوہ و انداز غصہ کبے تھے۔ کئی کئی ہفتے تک وہ گھر سے باہر نہ نکلتی۔ جب اس کی ماں سے لوگ وجہ پوچھتے تو وہ کہتی کہ لیلین بہت بھولی اور شرمیلی واقع ہوئی ہے اور وہ اس کو کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی مادام نے اپنے کھوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے قدم قدم پر مقابلہ کیا اور اپنے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے خوش آئند خیالات باندھتی تھی۔ لیلین نے دوشیزگی کے منازل طے کر کے شباب کے عالم میں قدم رکھا ایسا مکمل شباب، ایسی کافر جوانی، جو تصور ات سے بالاتر ہو۔ اس کے من پر قدسی بھی رشک کریں اور پرپایا شرم جانیں۔ وہ فردوس کا نوشتہ گفہ پھول جس کو دنیا کے ناپاک ہاتھوں نے مس نہ کیا ہو۔ وہ اچھوتا حسن جو ہر ران انسان کے گندے جذبات سے آلودہ نہ ہوا ہو؟

اس دُور سے کہ دیہاتی اور ہلکے لوگوں میں مل کر لیلین کا تلفظ نہ بگڑ جائے اور بیرس کی طرز معاشرت کہیں بھول نہ جائے مادام نے ان کی صورت سے دور رکھا۔ چونکہ اس میں اتنی استقامت نہیں تھی کہ اس پر کوئی استانی یا سحر رکھتی اس لئے وہ خود اس کو تربیت دینے لگی۔ وہ اس کی خاطر سب کچھ

وہ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا۔ اس کی غنید چھت پر انگور کی بیل چڑھی ہوئی تھی جہاں سے سمندر کا دلغریب منظر نظر آتا تھا۔ لیکن برائے میں پہنچنے پر گھرویران سا معلوم ہوتا تھا۔ اندر ایک وحشت سی طاری تھی گویا کسی کی حالیہ موت سے اجاز ہو گیا ہے۔ آس پاس تناور درخت تھے اور مکان کے سامنے کاچین دم توجہی کے باعث سوکھ گیا تھا۔ دورویہ سرو کے تحت ساکت و صامت کھڑے ہوئے تھے۔ مکان کا اندرونی حصہ اور بھی بھیانک تھا۔ بڑے بڑے صندوق کھلے پڑے تھے۔ صوفوں کی گدیاں سیلی اور پٹری ہوئی تھیں۔ ان میں کی روئی باہر نکل آئی تھی۔ بعض بعض جگہ بے ترتیب پیوند بدلیغی کا پتہ دے سہتے۔ کرسیاں اور میز گر دالود، تصویریں وصول واد شے سے پٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کڑی نے جالے مان دیئے تھے۔ ملاقاتی کمرے میں ایک پرانا بایو رکھا ہوا تھا جس کے نغے سوئے تھے اور جس کے سر نیچے کیلئے تڑپ رہے تھے۔ ہال کے وسط میں ایک لمپ لٹکا ہوا تھا جس کی چمنی سیاہ پڑ گئی تھی۔

ایسے بے رونق گھر میں حسین مادام ڈی میرلک زندگی کے باقی ماندہ دن گزار رہی تھی وہ ایسی گڑیا کے ماند تھی جس کو بچوں نے تھک کر پھینک دیا ہوا وہ اس سے لاپرواہ ہو گئے ہوں یا اس پھول کے ماند تھی جس کو بھونرے نے خوب چوس کر چھوڑ دیا ہو۔ لیکن اب بھی اس کا ضیاء پاش حسن شہنشاہ کی مذہبی آنکھوں کو خیرہ کر سکتا تھا اور دل میں محبت کی آگ روشن کر سکتا تھا۔

نفسو خیرج لوگوں کی طرح اس نے اور اس کے شوہر نے تمام سرمایہ ختم کر دیا تھا اور ڈی میرلک جیسے باہمت شخص نے بد بختی اور منہسی کا مقابلہ نہ کر کے زہر کھا کر خود کشی کر لی۔ اسے یہ بھی خیال نہ ہوا کہ اس کی بیوی اور

(-پیان)

اُردو و ب زبان کو ہر کمال
دیکھتے ہیں چاہے ہی
آج ہی درالہ علی کی بی بی
فرما لے جسے سالانہ چندہ دھرت
چارو پنے چارے علاقہ
میں

شورِ مجاہدانہ!

مولانا انظر ام تری

ایسری اچھی گرنہ ہوتا نہ آج میرا کوئی ٹھکانہ
طلسم الفاظ میں الجھ کر رہا نہ واعظ کو شوقِ معنی
اٹھ اور کر غورِ حال روشن میں اپنے مستقبلِ سیر پر
یہاں بجا رہا ہے اور دہلی وہاں ہر انگورہ اور طہال
فقیہہ و ملاہیں مالِ افتاف کیلئے وقف جنگ لیکن
رہے نہ نظمِ زمانہ قائم اگر تمنا ہو سب کی پوری
تری سترتِ فزا جوانی، مرا شبابِ لال پرو
نقطہ ہوا الفاظ کی لڑائی و گرنہ ہیں ایک شیخ و پیش
شبِ سترت میں بھی نہ سوئی چین کی نیند میری نظر

کہ دیکھتا ہوں دُفِیس ہوا کے کاندھوں پر آشیانہ
دگر نہ مکتب کے بام و در سے بھی اٹھتا شورِ مجاہدانہ
کہ صبحِ امروز کی شعاعوں میں شامِ فردا کلبہ فنا
یہ شوقِ راحت کلبہ ہے نتیجہ - وہ حاصلِ جوشِ غازیانہ
جہاد دیں گا ہو وقت تو انتظارِ مہدی کا ہے ہنہ
کہ ہر بشر چاہتا ہے میرا غلام ہو کر رہے زمانہ
جو یہ ہے ہنستی ہوئی کہانی، تو وہ ہے روتا ہوا فسانہ
یہ جس کو کتا ہے باغِ جنت وہ اس کو کتا ہے بادہ خانہ
کہ کھاکے اٹھا ہوں خوابِ راحت میں حوادث کا تازیانہ

توں کی نظریں دلِ مسلمان کو دیکھ کر کہہ ہی ہیں انظر
ہمارے ہوتے ہوئے رہے کیوں خدا کے انوار کا ٹھکانہ

عالمگیر کے حضور میں!!

از جناب محمد نذیر خاں صاحب بھوپالی

”ہر شخص جو تعصب سے دور رہ کر غور کرے، مآثران فیہ پرچہ کے
گاکہ مورخ محمد پرا لزام گمانے میں حق بجانب نہیں ہیں۔ میں خود اس وقت تک
کو تمام الزاموں کے جوابات دینے کے لئے تیار ہوں۔“

”ہم کو یقین دلایا گیا ہے کہ ریاست گولکنڈہ کے استیصال کی وجہ جو
جو کہ ایک شیعہ ریاست تھی سخت مذہبی تعصب ہے۔ میں نے الزامات میں
سب بڑا واقعہ زیر بحث لاتے ہوئے کہا۔“

”اس بد قسمی کا تو کوئی علاج نہیں کہ دہی کا ردائیاں جو تمام ملکوتوں
اور فرمانرواؤں کیلئے طرۂ امتیاز ہیں میرے لئے ذلت و بدنامی کا موجب ہوں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چہرہ ہائیں ہوتا

خود مغلوں کا سب سے زیادہ نیک دل اور غیر متعصب بادشاہ شانی ہندوستان کو
ہضم کر کے زبدا پار کی مسلم ریاستوں پر بھی صرف وسعت حکومت کے شوق
میں ہاتھ صاف کرے تو کوئی بھی مخالفہ تعقیب نہ ہو بلکہ اسے اعظم کا خطاب
دیا جائے اور جب اسی مکمل اور ناتمام کام کو میں اپنے باپ دادا کے نقش قدم
پر چل کر مجبوراً پورا کروں تو ظالم۔ غاصب۔ غیر سیاست دان اور متعصب سمجھا جاؤں۔
میری تخت نشینی کے وقت دکن کی ریاستوں میں سے صرف دو
یعنی بیجا پور اور گولکنڈہ باقی تھیں۔ سکندر شاہ والی بیجا پور نے میرے خلاف سمجھا
کو مدد دی اور میرے بار بار متنبہ کرنے پر بھی اس کو کچھ احساس نہ ہوا اس لئے
مجبوراً میں نے بیجا پور کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن سکندر
نہایت عزت کا برتاؤ کیا اس کو سکندر خاں کا خطاب اور غلط غلام دیا۔“

۱۷ جلال الدین محمد اکبر ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء

میں کا مہینہ اور شام کا وقت تھا۔ ہم چند دوست اور لنگ آباد سے
بغرض شکار، موٹر پر روانہ ہوئے۔ اور بہت جلد غلہ آباد پہنچ گئے اور ڈاک
جنگل میں قیام کیا۔ رات کے گھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کو باتوں میں
مشغول چھوڑ کر چاندنی رات میں تفریح کے لئے چل کھڑا ہوا اور عالمگیر کی
دوای خواجگاہ کی طرف جانا کھجا ہاں ہر طرف خاموشی عاری تھی۔

ایک ضعیف العمر شخص سنگ مرمر کے فرش پر نماز پڑھ رہا تھا۔ اس
کے کپڑے اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے میں نے لباس سے اس کو شناخت
کیا کہ وہ خاندان مغلیہ کا مشہور تاجدار مہند تھاجو آج کل ہندوستان کے
بچہ بچہ کے نزدیک موروثی الزام ہے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔
میں نے اس کو سلام کیا۔ میرے پاس گنگو شروع کرنے کا اس سے
بہتر کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

”بیٹھو“ اس نے سلام کا جواب دیکر اس قدر مہمی آواز میں جہت
دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی کما اور خاموش ہو گیا۔

میں بیٹھ گیا اور بات چیت کرنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی رہا تھا
کہ شاید میرے قیافہ سے میرے دل کا حال تاثر کر اس نے کہا۔ ”معلوم ہو رہوں
کو مجھ پر بھی الزامات لگانے اور فرقہ دارانہ اکھاڑوں کے لئے مواد فراہم کرنے
میں کیا مزا ملتا ہے؟“

”تو کیا اس سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ الزامات جو آپ پر لگائے
جاتے ہیں غلط ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

۱۷ محمد علی الدین اور عزیز عالمگیر ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۵ء

اور اس کے درباریوں کو بھی جاگیریں دیں۔ کیا میرا یہ طرز عمل قابلِ اقرار ہے؟
میدر آباد کا حال سنو! یہاں کا بادشاہ ابوالحسن (تانا شاہ) تھا۔ اس کی
حیثیت پستی سے تمام امور ریاست میں ابتری پھیل گئی تھی۔ اس کے وزیر مادنا
نے مسلمانوں پر سخت ظلم کئے۔ ابوالحسن نے بمبھاکا میرے خلاف مدد کی اور صرف
یہی نہیں بلکہ جب میں نے بیجا پور کا محاصرہ کر رکھا تھا تبھی اسے ساز باز کی اور
میرے خلاف فوج بیکر بڑھائیں۔ (شہزادہ) محمد منظم کو اس کی سرکوبی کیلئے
مقرر کیا۔ اس نے جنگ سے حتی الامکان بچنا چاہا اور آسان سی شرائط صلح پیش
کیں۔ ابوالحسن کے شرائط صلح منظور نہ کرنے پر محمد منظم نے مدتِ ستاری پر گنوں
کی داپہی کو صلح کی شرط قرار دیا لیکن اس میں بھی سے ناکامی ہوئی۔

تم خود انصاف کرو کہ اگر وہ بادشاہ میں انتظام کی قابلیت
مطلقاً نہیں۔ عیاشی دربار اور امر اور میں میلی ہوتی ہے۔ دُزیرِ اعظم اور داری
ایسے تعصب ہیں جو مسلمانوں کو ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ مرہٹوں کو فوج اور خزانہ
سے سلطنت منیہ کے خلاف مدد دی جا رہی ہے۔ تیموری علاقوں کو غارت کیا
جا رہا ہے۔ تاہم جنگ سے حتی المقدور گریز کیا جا رہا ہے اور معمولی شرائط صلح پیش
کئے جاتے ہیں اگر نو شیر و ایل بھی ہوتا تو کیا کرتا؟ وہی جو میں نے کیا۔ لہ
فتح گو گنڈہ کے بعد اس کو شانہ اعزاز کے ساتھ نظر بند کر دیا۔ اس کا
جو مال ضبطی میں آیا اس میں کروڑوں روپیہ کے جواہرات اور طلائی ظروف تھے
اس سے ظاہر ہے کہ خراج ادا کرنے میں بے زری کے جو غددہ پیش کرتا رہا۔
سب مصنوعی تھے اور میں نے صلح نامہ کی یہ شرط پوری نہ ہونے کی وجہ سے
فوج کشی کی تو یہ مظلوم کو بلا وجہستانا تھا بلکہ خود کشی کی منہاجی جو اس وقت
اندیش کو بھگتی پڑی۔

وہی مورخ جو ان تمام واقعات کی تصدیق کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ
میں نے اپنے سفیر کو ابوالحسن سے سخت کلامی کرنے کی ہدایت کی کہ وہ بھی مجبور
ہو کر سختی سے جواب دے اور اس سے ایک قیمتی الماس طلب کیا کہ وہ انکار کرے
اور اس طرح جنگ کے لئے مجھے بہانہ مل جائیں۔ خود کرو کہ مرہٹوں سے ساز

لے عالمگیر نامہ لے یعنی مادنا وزیر کو معزول اور قید کیا جائے۔ میرم درائے گیر
وغیرہ علاقوں سے جو عسبیاں دہائے گئے تھے دست برداری کر لی جائے اور مقررہ خراج
کی باقیات ادا کر دی جائے۔

سے شبلی

ہے نعمت خاں اور خانی خاں،

دباز۔ میرے مقبوضات پر تصرف، مسلم آزاروں کا دوبارہ پر تسلط، ملک کی
جانشینی منق و فجور کی انتہا اور عام مسلمانوں کی ذلت و خواری تو حید و آباد
پر حملہ کرنے کی سند نہیں بن سکتیں لیکن سفیر کے ساتھ سخت کلامی اور الماس
دینے سے انکار وہ جرائم ہیں جن کی بنا پر میں حملہ کر سکتا تھا اور پھر مجھے کسی
قسم کا الزام نہ دیا جاتا۔ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس طویل تقریر
کو ختم کیا۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ اپنے خود اپنی سلطنت برباد کی کیونکہ دکن کی ریاستیں
مرہٹوں کو دیئے ہوئے تھیں ان کا دباؤ لگایا تو مرہٹے قوت پکڑ گئے۔
تو کیا لوگ اس سے بالکل ناواقف ہیں کہ یہ ریاستیں مرہٹوں کی
باجگزار بن گئی تھیں اور اگر میں ان کو فتح نہ کر لیتا تو آج مثل بڑودہ اور گوالیار
نے وہاں بھی مرہٹوں کا پرچم لہراتا نظر آتا۔

سم

ایک انگریز مورخ کا یہ قول کہ جب سیداجی دہلی کے قریب پہنچا
تو ایک کٹر دروہ کا سردار اس کی پیشوائی کیلئے بڑے سنگ کے نیچے رام سنگ کے ساتھ
بیٹھا گیا اور جب وہ حاضر دربار ہوا تو اس کی بات بھی نہ پوچھی گئی اور تیسرے درجہ
کے سرداروں میں بلا امتیاز کھرا کر دیا گیا۔ یہ کس حد تک صحیح ہے؟ میں نے
دوسرا الزام بیان کیا۔

رام سنگ اس سپہ سالار کے سنگ کا بیٹا تھا جو امر میں سب سے زیادہ
ممتاز تھا چونکہ سیداجی بڑے سنگ کے توسط سے آیا تھا اس لئے اس کے استقبال
کے لئے رام سنگ سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا جو اپنے باپ کا قائم مقام تھا
مخلص خاں کو اس لئے بھیجا تھا کہ یہ خیال ہو کہ تعصب کی وجہ سے کوئی مسلمان
درباری نہیں بھیجا۔ استقبال کا اہلی رکن رام سنگ تھا نہ کہ مخلص خاں۔ سیداجی کو
پہنچا داری منصب دیا گیا جسے مورخ نے تیسرے درجہ کا منصب بتلایا ہے لیکن
کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ اس وقت خود بڑے سنگ (سپہ سالار) دلیر خاں اور وزیر
اعظم فاضل خاں کا منصب بھی پنچزاری ہی تھا۔ اس کے باپ کو بھی تو
یہی منصب ملا تھا۔ رانائے ادے پور کو بھی تو سب سے پہلے یہی منصب
ملا تھا۔ کیا وہ پہاڑی چوہا ادے پور کے ہماروں سے بھی زیادہ مغرور درجہ

لے مائر عالمگیری

لے الغنم

لے مائر الامراء

انگریزوں کو ملے ہیں کہ عالمیہ نے عاجز ہو کر خود اسے صلح کی کوشش کی ہے۔ کیا تم میں اتنی عقیدت نہیں کہ یہ سمجھ سکو کہ وہ تاریخی صبح ہو گئی جو کہ اسی زمانہ میں لکھی گئیں یا وہ ہو کہ انہیں تاریخوں کا لہجہ ہے؟ کیا اس واقعہ کا انہوں نے کسی سنگہ تیار کچ سے حوالہ دیا ہے؟

”اور یہ بیان کس حد تک صحیح ہے کہ رمانے نے خود ہی عرصہ بعد شرائط صلح پر پانی پیہ دیا ہے؟“

”بالکل غلط اسوائے ایک انگریزوں کے کسی اور نے بھی اس واقعہ کو لکھا ہے۔“

”اور کیا اس واقعہ کے بعد راجپوتوں سے ہمیشہ کیلئے علیحدہ ہو گئے؟“
”یہ بھی غلط ہے، دکن کی جنگوں میں جے سنگھ، بیہیم سنگھ، ان سنگھ وغیرہ کی راجپوت سرداریوں کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف لڑے۔“

”ہندوؤں کے ساتھ یہ ظلم کہ ان کے ریس بند کرانے، تھانے تڑوانے مذہبی میلے موقوف کرانے بحاصل مایہ کئے اور ان کو سرکاری ملازمتیں دیں مذہبی تعصب نہیں تو اور کس بات ہے؟“

”میرا صرف یہ تجربہ ہے کہ میں ہندوؤں کے محبوب شہزادہ داراشکوہ کو ہندوستان کا بادشاہ نہ ہونے دیا اور کوئی سلوک تو ایسا نہ تھا جو اس سے بہتر ان کے ساتھ روا نہ رکھا گیا ہو میری تخت نشینی کے وقت سلطنت منیچہ تقریباً ہندو بن چکی تھی۔ ہندو مسلمانوں کے بچوں کو اپنی مذہبی تعلیم دیتے تھے لہذا میں نے اس قسم کے مدارس بند کرادیے۔ وہ منادر جو اعلیٰ حضرت کے اس فرمان کے باوجود کہ آئندہ سے کوئی مابدا بلا اجازت شاہی تعمیر نہ کئے جائیں بنائے گئے تھے اور وہ بت خانے جو حکومت کے باغیوں کے خفیہ جلسوں کا کام دیتے تھے تڑوانے گئے جس میں میرا مقصد عین وہی تھا جو ہنری ششم بادشاہ انگلستان کا تھا تھاہوں کو تڑوانے میں اور خود مختار زمانہ میں ترکی میں مصطفیٰ کمال کا ان سازش کے اووں کی تخریب عمل میں لانے کا تھا۔ ورنہ مذہبی تعصب کے انہار کا یہاں دکن میں کافی موقع تھا جہاں میں پچیس سال رہا اور یہاں توالو اور ایسے ہی دیگر منادر کی بھی کمی نہیں تھی۔ میلوں، نوج رنگ اور گلے بجانے کو محرب اخلاق سمجھ کر میں نے بند کر دیا۔ جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بعض مذہبی میلے بھی تھے۔ اس میں تعصب کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ مذہبی حکومت

۱۰ الفسٹن ولین پول ۱۲۰۰۰۰ ۱۵۰۰۰۰ ۱۵۰۰۰۰ ۱۵۰۰۰۰ ۱۵۰۰۰۰

میں اخلاقی شان باقی رکھنا چاہتا تھا اس لئے میری شرعی محاصل معاف کر دیئے اور جذبہ جو ذہن ہا جائز تھا وہ بارہ جاری کر دیا۔ واقعہ کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔ ہر معمول خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز ادا کرنے والوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ یہ بھی سراسر ہمتان ہے کہ ہندوؤں کو عہدے نہیں دیئے۔ فوجوں کی افسری۔ قلعوں کی قلع داری اور ضلع کی نظامت سے بڑھ کر قابل اعتماد اور کیا عہدے ہو سکتے ہیں؟ ان تمام عہدوں پر عام طور سے ہندو مقرر تھے۔ ہندوؤں کو جاگیریں بھی دیں۔ آج بھی کئی ہندو جاگیرداروں کے پاس میری دی ہوئی اسناد نکلیں گی۔

۵

”اب صرف ایک سب سے اہم واقعہ اب طلب کیا ہے یعنی باپ اور بڑے بھائی کے ساتھ جو رہاؤ کیا گیا وہ کس حد تک مناسب تھا۔“

”واقعہ تو ظاہر ہے ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا باؤنا کے جلی دستخطوں سے احکام جاری کرنا دارالسلطنت کی خبروں کو مجھے، آپ کو، پانچ سے روکنا۔ میرے سفیروں کو نظر بند کرنا۔ میری جاگیر ضبط کرنا۔ باپ کو بدعنوان کرنا۔ بھائیوں اور بہنوں سے لڑائے کی کوشش کرنا۔ جنگ کی حالت میں میری فوج کو واپس بلا کر مجھے دکن کی ریاستوں کے سامنے ذلیل کرنا اور پھر پھر خلاف کثیر فوج روانہ کرنا ایسے افعال ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہ ہو سکتے ہیں اور جن سے درگزر کیا جاسکے؟“

”میں تو صرف یہاں پناہ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا چنانچہ جنگ کے بعد مجھے قلعہ میں ملنے کے لئے طلب کیا گیا لیکن شکستہ خاں اور روشن آرا ز چھوٹی بہن کے ذریعہ سے اور بعد میں خود اعلیٰ حضرت کے محمد فیصل اللہ سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ میرے ساتھ دوستی کے پردہ میں دشمنی کی جاگلی تو مجبوراً شہر پر قبضہ کر لیا۔ پھر بھی جہاں آماجیم (بڑی بہن) کے مسبب شہر حضرت سلاطین کی قیدی کے لئے جارہا تھا کہ چند مسمد افسروں نے اطلاع دی کہ محل میں مسلح ترکیبیں میسے قتل کے لئے متعین کی جا چکی ہیں اور چاہا کہ میں وہاں نہ جاؤں۔ لیکن میں پھر بھی ہائے کے لئے بالکل تیار تھا جبکہ مجھ کو ایک لہجی کے ذریعہ حضرت اقدس کا خط ملا جس میں انہوں نے داراشکوہ

۱۱ ان محال کی قدر تقریباً ستر تھی۔ ۱۲ جنگ سبکو گڑھ

۱۳ ۱۶۰۰ ۱۷۰۰ ۱۸۰۰ ۱۹۰۰ ۲۰۰۰

صرف اسی وجہ سے تشہیر کی گئی ورنہ اس کو دہلی لانے کے بجائے کسی غیر معلوم جگہ پر بھی مہینہ کیلئے غائب کیا جاسکتا تھا۔

شہزادہ شجاع کی تباہی و بربادی کا الزام بھی تو آپ ہی پر لگایا جاتا ہے۔ اس نے میری، گرہ کی مدد موجودگی سے غلط فائدہ اٹھانا چاہا اور سب کھانی میں خود قلعہ میں گیا بلکہ میر جلد اور محمد سلطان کو اس کام پر مقرر کیا اور وہ اس وقت بھی اپنی اس غلطی کا اعتراف کر کے صلح کی خواہش ظاہر کرتا تو مشرقی موافقتیں اس کو دینے جاتے لیکن اس نے فوج جمع کر کے میر جلد سے مقابلہ کرنا چاہا اور آخر کار فرار ہوا۔ ارچنگ (ارکان) کے راجے اس کی خاطر دارا کی لیکن اس نے کہاں بھی ساؤتھ کر کے اس کے تخت پر رقبہ حاصل کرنا چاہا اور قتل ہوا اس طرح اپنی بربادی کا وہ خود باعث ہو رہا ہے۔ یہ پریوں الزام لگایا جاتا ہے۔

”ور کیا مراد ایسے جانا ز اور معصیح بھائی کو بھی یہی مسئلہ سنا چاہئے تھا؟“

”اس نے مصاحبوں کی باتوں میں اگر اپنی بادشاہی کے منصوبے بانڈنا شروع کر دیے اور خود کو تنہا سلطنت کا حاکم سمجھنے لگا تھا جو کہ شرائط صلح کے خلاف تھا صلح سر کی پہلی شرط کو میں نے فتح کے بعد ۱۰ پورا کر دیا تھا اور دوسری شرط یعنی جنگ پنجاب کا بل دشمن کے لئے لکھ دیا کہ تخت سلطنت کے فیصلہ کے بعد عمل میں آئے لیکن اس کی جلد بازی نے کام بگاڑ دیا۔ اس پر بھی میں اس کے قتل کیلئے تیار نہیں تھا صرف اس کو اپنے بھائی بل کر گرفتار کر دیا (نہ تو اس کو شراب پلائی اور نہ کسی سفینہ کو اس کے بھانسنے کے لئے بھیجا) اور کہہ دیا کہ یہ گرفتاری وقتی ہے اگر اس نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا کہ اب وہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا تو اس کو آزاد کر دیا جائیگا اور معاہدوں کے مطابق صوبوں کا مالک بنا دیا جائیگا۔ لیکن اس نے قلعہ گوالیار سے جہاں وہ قید تھا بھاگنے کی کوشش کی وہ اس پر بھی میں نے اس سے کوئی باز پرس نہ کی لیکن جبکہ علی نقی کے چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے قتل کا مقدمہ دائر کیا اور میرے منع کرنے اور گوالیار کے قاضی کے خوفناک لینے پر زور دینے کے باوجود وہ راضی نہ ہوا تو میں مجبور ہو گیا لیکن میں اس قتل سے خوش نہ تھا۔“

یہ یعنی مال عینیت کا ایک ثلث جو کہ بیس لاکھ روپیہ نقد کی صورت میں مراد کو ادا کیا گیا۔ خانی خاں۔ خانی خاں بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ چھوٹا لڑکا ”مغضوب نظر بادشاہی ہوا اور دوسرے لڑکے کے ساتھ عنایات کی گئیں کیونکہ اس نے باپ کے قتل کا دعویٰ کرنے سے انکار کیا تھا

کو اطمینان دلایا تھا کہ تم دہلی سے آگے نہ بڑھو، ہم قلعہ فیصل کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ملاقات کا ارادہ منویٰ کر دیا لیکن اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے سے پھر بھی گریز کیا۔ میں نے ایک لمحہ کیلئے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ یہ جنگ اس قدر کے خلاف ہے بلکہ میرا مقصد تو صرف ان کو داراشکوہ کے پنجے سے نجات دلانا تھا لیکن انہوں نے میرے تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور نہ صرف دارالبلکہ شجاع اور اور خود میرے بیٹے محمد سلطان سے میرے خلاف خط و کتابت کرتے رہے اس لئے مجبوراً تخت پر قبضہ کرنا پڑا۔ لیکن پھر بھی ان کے شاہانہ اعزاز و اکرام میں کمی نہ آنے دی ان سے اکثر امور سلطنت میں اسے لی اور اس پر عمل بھی کیا۔ یہ بھائی صاحب توان میں اپنی کج طبعی اور بدتریری کی وجہ سے حکومت کرنے کی قابلیت نہ تھی۔“

”لیکن قتل کرنا ہی کیا ضروری تھا کیا کسی مجبورہ جگہ قید نہیں کیا جاسکتا تھا؟“

”میں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کر کے رائے طلب کی (یہ کہ غلط ہے کہ مجلس رائے فتویٰ سے فتویٰ طلب کیا گیا) اور کثرت رائے پر عمل کرتے ہوئے قتل کا حکم دیدیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی زندگی میں ملک کو امن و امان نصیب نہ ہونا بلکہ ہر طرف سازشوں کا بازار گرم رہتا اس لئے سیاسی معصیتیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں وہی طریقہ اختیار کروں جو خود جہاں پناہ سے مجھ کو درپیش ملا تھا۔“

”ابن کناہیت کہ دشمن شہزادہ نکندہ“

”اچھا تو قتل سے پہلے بازار میں سے گزرا کر ذلت کرنے کی کیا وجہ تھی؟“

”شاہراہ پر سے گزرا نا اس لئے ضروری تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کئی لوگ بعد میں یہ دعویٰ کرتے کہ دارا دراصل قتل نہیں کیا گیا بلکہ وہ اعلیٰ دارا ہیں

۱۵ خط کے الفاظ ہیں۔ داراشکوہ بادشاہ جہاں آباد ثبات قدم و جدوجہد کی خیر خواہی و شکر و انجائیت، زہارا زانجا پیشتر نگذر کہ مابود ہم ادراہیہ فیصل غیر کم ۱۵ عالمگیر کیلئے انسان تھا انسانیت بالآخر خدا کی توقع ہم اس کے نہیں کر سکتے دیکھنا صرف یہ ہے کہ نعل بادشاہوں کے سوانح حیات کے مرقع میں اس کی تصویر اگر ہاں توں زیادہ خوشنما نہیں تو اگر ہاں توں زیادہ بری بھی نہیں (مقتدرہ معائنات عالمگیری) ۱۵ سفر نامہ اکثر بریں ۱۵ عالمگیر نامہ مائر عالمگیری ۱۵ خاص شاہ جہاں کے حکم سے اس کا بھائی شہر بار اور اس کے بھتیجے ہوشنگ و طمورت پسران دانیان قتل کئے گئے۔ ۱۵ شبلی

اب مجھے کوئی مزید سواں نہیں کرنا تھا اس لئے میں خاموش ہو رہا۔

۱۱

رات نصف سے زیادہ گزرتی تھی اور تہ کے گرد اندھیرا ہو گیا تھا۔ و
نورانی جسم آہستہ آہستہ تاریکی میں غائب ہو گیا۔ میں نہ معلوم کتنی دیر تک
ان واقعات پر غور کرتا رہا جبکہ ایک بھادر کی آواز مکن ہے ہانے مجھے چونکا
دیا اور میں نے اٹھ کر قیامگاہ کی راہ لی جہاں تمام ہمتی آرام سے چڑے ہوئے
سہ رہے تھے۔

عالمگیر کی فرد الزامات کی پوری روداد میرے سامنے تھی۔ میں غور سے

ایک ایک واقعہ کو جانچ رہا تھا کہ مخالف مورخوں نے اس کو بتانے کیلئے
کیا کیا غلط بیانیوں کی ہیں۔ کس کس طرح واقعات کو بدلایا ہے۔ کیسے کیسے غلط
سناج اخذ کئے ہیں اور کسی نہ کسی طرح بیجا ثابت کرنا چاہا ہے ۶
کہ عالمگیر سب کوشش تھا عالم تھا سنگم تھا
مجھے افسوس تھا کہ کیوں میں نے ان بیجا الزامات کو بیان کر کے مرحوم
شہنشاہ ہند کی روح کو تکلیف دی اور خوشی بھی تھی کہ کم از کم میں تو اب تھوڑے
مورخوں کی بیدار کردہ غلط فہمیوں میں مبتلا نہ رہا تھا۔

محمد نذیر خاں۔ بھوپال

”کیسے آئے چین“

کیسے آئے چین!

سکھی ری کیسے آئے چین!

تیاں مکھڑا موڑ گئے ہیں،

پیت کا ناتا توڑ گئے ہیں،

برہ کا دکھڑا چھوڑ گئے ہیں،

تڑپت ہوں دن رین!

سکھی ری کیسے آئے چین!

کوئی کہے یہ گر بھاتی ہے،

کوئی کہے یہ بھراتی ہے،

کوئی کہے مانٹش کھاتی ہے،

بسجی کے کھوٹے بین!!!

سکھی ری کیسے آئے چین

جل کر راگھ ہونی جاتی ہوں،

گھٹ گھٹ ہائے مری جاتی ہوں،

پانی روپ بھی جاتی ہوں،

رورو پھوٹے بین!

سکھی ری کیسے آئے چین!

اندھرت، شرما،

کلام محمود

کیا تو جگنوؤں نے گل میں کچھ سوز نہاں پیدا
ہوئی ہیں آتش گلزار سے جھکاریاں پیدا
نگاہ مست ساقی تھی عجب موج سرور افزا
کہ ذرتے ذرتے دل کے بیچ جامِ اغواں پیدا
خدا ہی جلنے کیا گزریگی مر کر غم نصیبوں پر
کہیں زیر زمین بھی ہونہ جائے آسماں پیدا
گل صد چاک سی حیرانی ز گیسے شبنم سے
چمن کے پتے پتے سی، میری اتاں پیدا
نوائے سوز کی جھی بستجو ہے سازِ محفل کو
کرے گیتی پسند آسا کوئی آتش بجاں پیدا
گلوں کو شعلہِ غرباں کیا ہے سوزِ باطن نے
عجب کیا ہے ہوا ہو بطنِ نیسے کج ہاں پیدا
بنائے فطرتِ ہستی ہے اضدادِ عناصر پر
کیا کرتی ہے امواجِ خنکِ قِیاں پیدا
یہاں تخریب سے تعمیر کی بنیاد پڑتی ہے
گل پژمرده کرتے ہیں خمیرِ بوتاس پیدا

میں لوحِ دہر پر محمود وہ تحریر ہوں جس کا

نہ کوئی راز داں نہاں کوئی ترجمان پیدا

محمود۔ سرسبلی،

احساس

از حضرت امین حسزیں، بھاولپور

منتظر تھی۔ اس کی نظریں جریدے کے چہرہ پر گڑھی ہوئی تھیں اس کی انگلیوں میں کچھ مٹی تھی جو اس کی باطنی حالت کی آئینہ دار تھی۔

”پیارے تم نہیں جانتے ہو کہ میری خوشی اور غم دست سے میرے ضعیف نابینا باپ کی خوشی و راحت وابستہ ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟“ زربینہ نے یلوسانہ انداز میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ”مجھے تمام دن اپنے ادنیوں کے گھٹکے ساتھ اسی تختہ ان میں رہنا پڑتا ہے جہاں میرے جریدہ... ہماری محبت کی ابتدا ان پرورش ہوئی تھی۔ جہاں اس جھیل کے کنارے... ہاں، اسی جھیل کے کنارے تم میری تعریف میں لطیف اشعار لاپتہ تھے اور جب کبھی میں تم سے روضہ عاقبتی تو تم جھیل کے پانی سے میرے کپڑوں کو گھٹو کر رنگ کرتے تھے۔ مٹی کہ میں تمہاری ہوجانے کا وعدہ کر دیتی تھی۔“

”ہاں... ہاں... صرف میری... تمام زندگی کیلئے...“ جریدہ نے رنگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تو آپ مجھے ایسی تباہ کن حالت میں چھوڑ دینگے... آہ نہائی کی سختیاں میرے دل سے جو تمہارے خیال سے ٹکڑے ہو رہا ہے... نہیں اٹھ سکیں گی۔“

پیارے دیکھو! آج حسن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ تیری باگ میں ملتی ہے... دیکھو... رحم کرو... ورنہ میرے برباد دل کے نازک تار ٹوٹ جائیں گے... زربینہ نے جریدہ کے چہرہ پر نگاہیں جماتے ہوئے غمگین آوازیں کہا۔

جریدہ بیخیل نظروں سے زربینہ کی طرف دیکھنے لگا جو اپنے مستقبل کے

”جریدہ! آج چاند کی چاندنی معمول سے زیادہ صحرائے ذرہ کو منور کر رہی ہے۔ قدرت اپنے جوبن کی سستی میں اپنے تمام عطیے ہم پر بکھپا کر کرناچاہتی ہے... آہ... آج اتنی دیر سے کیوں...؟“ زربینہ نے عربی کرنیل کے گدھے کی ٹیک لیتے ہوئے کہا۔

جریدہ بارگاہِ من میں سزگلوں ہو گیا۔ وہ کچھ کسنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان اس کے دل کی ترجمانی سے قادر تھی۔ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے زربینہ کے نرم و نازک ہاتھوں کو پکڑا اور دونوں ایک اونچے نیچے پڑ جہاں ان کے بچپن کی شوخیوں کی یاد گاریں دفن تھیں بیٹھ گئے... وہ آج کچھ خلاف معمول رنجیدہ سا تھا۔ کوئی خیال تھا جو ہر لمحہ اس کی پریشانی اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے بچپنی سے زربینہ کی طرف دیکھا اور... دہمچی، آوازیں کہنے لگا۔

”پیاری زربینہ! مراکش پر فرانسیزیوں کا حملہ ہونے والا ہے... جنرل سعید نے مشورہ کئے بلایا تھا اس لئے آج ذرا... میر ہو گئی۔“

”تو کیا آپ کو ان کے مقابلے کے لئے جانا پڑیگا؟“ زربینہ نے جریدہ کے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بے مبری سے پوچھا۔

”یقیناً۔ وطن کی آزادی کے لئے جب تک جسم میں روح اور روح میں احساس ہے۔ میرے خون کا آخری قطرہ آزادی کی دیوی کی بھینٹ پڑے گا۔“ جریدہ نے اپنی تلوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹمکنت سے کہا۔

”تو کیا ہماری یہ رنگیں مائیں، روح پرور طاقتیں۔ جو میرے لئے تمام دن کی کوفت کا علاج ہیں... ختم ہو جائیں گی؟“ زربینہ نے بچپنی سے پوچھا وہ مستقبل کے تصور سے غمگین ہو گئی۔ اس کی محبت کی تمام آسانی لطافتیں جریدہ کے ایک حرف سے وابستہ تھیں۔ آہ وہ بچپنی سے اس حرف کی

جرید کا سنبھالنے لگا۔۔۔ وہ وطن کے ناموس کو بارگاہ محبت پر قربان کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہونے لگی۔ اس نے اپنے دل کو محبت کی مایوسیوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا اس نے حسرت بھری نظروں سے زریں کی طرف دیکھا اور حکیم زریں کے ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

”پیارے زریں! الوداع... الوداع...“ جرید نے جلتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

”پیارے جرید! پیارے جرید! میرے دل کی تمام مغل نشاط کو جہوم اندہ کے سپرد کر کے کہاں جا رہے ہو؟“ زریں نے داس پکڑتے ہوئے کہا۔
”جہاں سے واپس آنے کے متعلق میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔“ جرید نے مخالف سمت دیکھتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

کیا زریں میری بے لوث محبت، وطن کے جذبہ ہواپنی آتشیں لپٹوں سے خاکستر کرنا چاہتی ہے۔ کیا آزادی وطن کی بھول بھلیوں میں جھنڈا پڑھتی ہے۔ دیکھو میرے ارادہ کی مضبوط چٹان تمہارے آنسوؤں کے طوفان کی رور... لہروں سے متزلزل نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ بس مجھے بھول جاؤ... وطن کی خاطر... بھول جاؤ۔“

وہ اپنے خیالات اور جذبات کی طوفانی رو میں بہنے لگا۔ اس کی کوئی غیر معمولی طاقت رہنمائی کرنے لگی۔ وہ بچی نظروں سے صحرا کی ریت کی گہرائیوں میں اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ یکایک اس نے ایک جھلکے سے اپنے دامن کو زریں کی مضبوط گرفت سے آزاد کر دیا اور نیلے کے دامن سے ہوتا ہوا ایک گھوڑے کے دخت کے پاس پہنچا۔ جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا اس نے اسے کھولا اور مہدی سے اس پر سوار ہو کر مراکش کی سمت تیزی سے روانہ ہو گیا۔

۲

آج صحرا پر سورج کی سختی معمول سے زیادہ تھی۔ ہر طرف آگ برستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گرم ہوا کی تاب نہ لا کر بیچارے اونٹ بھی دو ر ایک نعلتان کی گھوڑوں کے سارے میں پناہ گزیں تھے۔ صحرائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آبادی کا نشان تک نہ ملتا تھا۔ صرف اسی نعلتان کے

نظام اور ماضی کے فلک بوس قہوں کو جدائی کے زلزلوں سے تباہ ہوتا دیکھ کر پریشان و مضطرب ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کو زریں کی تمام خواہشوں کا کھلم کھاس تھا۔ لیکن مصروف اپنی ذاتی محبت کی رنگین زندگی کیلئے اپنے وطن کو غلامی کا کروہ جامہ پہنانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی ایک نفرش سے اپنے تمام بھائیوں کی آزادی کو غلامی کے بے عزت بازار میں، اپنے عبادت خانوں کو گھوڑوں کے طریقوں میں، اپنے حقیقی جذبات کو مصنوعی طور پر غیروں کی خدمت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان تھا، جو فرض اور محبت کی کشمکش نے پیدا کر دیا تھا۔ وہ کبھی اپنی آنسوؤں کو خاکستر ہوتے دیکھتا۔ کبھی اپنے پیارے وطن کو غیروں کی زنجیروں میں۔۔۔ اس کو کچھ نہیں سمجھائی دیتا تھا کہ کس کی آواز پر لبیک کہے۔ محبت یا وطن۔۔۔ اس کا چہرہ کئی بار غم آلود ہوا۔ اس کی آنکھوں سے کئی خونی قطرے گرتے اور نیلے کی ریت میں ہمیشہ کے لئے جذب ہو گئے۔۔۔۔۔ زریں جو ابھی تک مجبور لگا ہوں سے اپنے بہادر جیسے چہرے کے تغیرات کا مطالعہ کر رہی تھی اس کے دل کی گہرائیوں میں پوچھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی کوششوں نے اس کو دھوکہ دیا۔

جرید نے اپنے سینہ کا مٹن ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”پیارے زریں۔ مجھے تمہارے دل کی تمام کیفیات کا پوری طرح احساس ہے اور تمہاری مجبوریوں کو سمجھ کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ زریں نے بات کٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارا دل گوارہ کرے گا کہ مجھ غریب کو جس کا جینا تمہارے بغیر موت کے مترادف ہے، جدائی کی آتش میں جلتا ہوا چھوڑ دو۔۔۔۔۔“

”دیکھو زریں! جذبات کی ترنگ میں اگر خطرناک غلطی کی تر محبت ہو۔“ جرید نے سپاہیانہ آواز میں کہا۔ ”میری قسمت کے ساتھ ہزاروں انسانوں کی زندگیاں وابستہ ہیں، میری غلطی کا ساری قوم کو غمناک و بھگتنا پڑ گیا اور کئی والی نسلیں، ہماری رگوں کو غدار۔۔۔ قوم فروش۔۔۔ اور بزدل کہہ کر یاد کر رہی۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پیارے جرید۔!“
”دیکھو زریں تم کس طرف بھی جا رہی ہو؟۔۔۔۔۔“
”اپنی کائنات محبت کے بہشت کی طرف جانا چاہتی ہوں۔ لیکن آہ“

نزدیک تنہا ایک جھونپڑا تھا جس پر بیکسی اور مکمل خاموشی طاری تھی۔ جو بیڑے کے اندر سے آنے والی کمزور آواز بھی کسی اس کی سکوت کو توڑ دیتی تھی۔

”بیٹی زرنیہ! پانی..... آہ..... پانی.....“

زرنیہ کا بوڑھا نانا بابا ابراہیم کئی دن سے علیل تھا۔ اس کی تیمارداری کرنے والی اکلوتی بیٹی آج صبح سے غائب تھی۔ اس کو پیاس اور گرمی کی شدت نے آخری دم تک پہنچا دیا تھا۔ خدا کی دیس سز میں پڑوسل کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا وہ اپنے خیالات کو اس کی تلاش میں پریشان کر چکا تھا۔ بوڑھے اعضا سے جواب دے چکے تھے بیچینی سے اس نے اپنی لڑکی کو پھر غائب کیا..... جو اپنی محبت کی مثال قائم کرنے کیلئے اپنی زمین کو موت کے سپرد کر چکی تھی۔

”دیکھو! زرنیہ اپنے بابا..... ضعیف باب کو پانی بھی..... نہیں دیتیں..... کیا آج اتنی بے رحم ہو گئی ہو؟..... آؤ کہہ دو کہ تمہارا نانا بابا..... تمہیں..... دینا کے ظالموں..... کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے تم سے..... جدا.....“

بوڑھے ابراہیم کو ایک بچکی آئی جس نے اس کے کلام کے سلسلہ کو توڑ کر اس کی روح کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا..... اب اس کی پیاری بیٹی دینا کے برہم حملوں کا مقابلہ کرنے کیلئے تنہا رہ گئی تھی اور وہ بہشت کی سرزمین میں پہنچ کر دنیا کی ذمہ داریوں اور فریب آلود چالوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ اونٹوں کو حسب معمول ان کی پیاری مالک اور خدمت گزار بہیم پہنچانے سے قاصر ہو چکا تھا۔ اس کی آواز فنا کی زنجیروں کی جھنکار میں گم ہو چکی تھی۔ اور مزید اپنی کائنات کی تباہی پر اپنے دردوں کو بلٹنے سے خاموش تھی۔

سورج ڈھلا شروع ہوا اور اپنے ساتھ صحرا کی آتشی گرمی کو بھی فطری اصول کا احتساب کھانے لگا۔ اونٹ جو ابھی تک مجبوری سے مجبوروں کے سایہ تک محدود تھے اب ادھر ادھر کھرنے شروع ہوئے..... کیونکہ ان کی رہنا خود تلاش منزل میں گم ہو چکی تھی..... اب کوئی بھی انہیں راہ راست پر لانے والا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب زمین پر سیاہی مٹا ہونے لگی تو صحرا کی وسیع فضا میں چند اونٹوں کی آوازیں گونجیں اور پھر ہمیشہ کیلئے معدوم ہو گئیں۔

۳

مراکش کے وسیع میدان باب الطارق میں فرانسیسیوں اور

عربوں کی فوجیں برسر پیکار تھیں، گھمسان کی لڑائی میں، شور و فغاں، جیخ و پکا مار و محاربت سے فضا کانپ رہی تھی۔ جریدہ عربی کرنل شمالی سمت فوج کے دلہنے باز و پرانی فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یکایک لڑائی کا رخ تبدیل ہوا اور جریدہ اپنی فوج سے الگ ہو کر جاسٹیس فرانسیسی سپاہیوں کے زعفریں پھنس کر رہ گیا۔ لیکن اس جری سپہ سالار کی ہمت مافقت برابر ٹھہرنے لگی اس نے بے تحاشا توار چلائی شروع کی۔ کسی فرانسیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار دالا۔ اب اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ اس کی طاقت اب اسے جواب دینے لگی۔ اس کی توار اب سست پڑنے لگی۔ اس کو اپنی تباہی کا با یقین ہونے لگا۔ زرنیہ کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ زرنیہ جس بجز اس کی دنیا اندھیر تھی۔ اس نے اپنی یابیوں کا خیال کیا اور اپنے آپ کو موت کی آہنی گرفت میں پکڑا اپنی تمام گزشتہ طاقتوں کو مجتمع کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر دیوانہ وار مقابلہ میں مصروف ہو گیا۔

سانے جنوب کی طرف ایک غبار کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں گھوڑے کے ناپوں کی آواز آنے لگی۔ جوں جوں وہ آواز نزدیک آ رہی تھی جریدہ کے دل میں ایک ہرجان پاتا ہوتا جا رہا تھا۔ جس کی فکر ایک غیبی طاقت تھی۔ آواز آتی بند ہو گئی۔ ایک نقاب پوش جو عربی لباس میں ملبوس تھا۔ گرد و غبار میں اٹا ہوا سانے سے ظاہر ہوا۔ تھوڑی دیر اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اڈ بٹھا ہو کر ارد گرد کسی کی تلاش میں اپنی پچھن نظروں کو گردان رہا تھا۔ جریدہ مجبور ہو گیا۔ اس نے مجبوراً اپنا ہاتھ روک کر نقاب پوش کو آواز دی۔ جو ایک فوجی افسر کی رعب دار آواز تھی۔ وہ بالکل بے خبر سا ہو گیا تھا۔ اسے کچھ احساس نہ تھا کہ وہ دشمنوں کے زعفریں ہے۔ اس کی بے پردائی سے اس کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور ایک فرانسیسی افسر نے عقب میں آکر پھرتی سے فخر کا دار کر دیا۔ جریدہ ایک دہزار مار کر گرا۔ نقاب پوش اپنے جیخ سنتے ہی ادھر نکلا ری کا تیرہویں کھا کر گرتا ہے..... نقاب پوش اپنے جیخ سنتے ہی ادھر کا رخ کیا اور اس جگہ پہنچ کر جریدہ کو خاک و خون میں بیوٹ پڑے ہوئے دیکھ کر غضبناک اصرار سے مبرا ہو گیا۔ اس نے جریدہ کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور اپنے پر قابو پا کر اس سے خطاب بھرا کہنے لگا۔

”میرے عزیز وطن پرست جریدہ! دنیا نے محبت کو آزادی وطن

چند سالہ صرف چار روپے چار آنے للہ علاوہ محصولِ ناک۔

آرزو

از حضرت اعجاز میرٹھی،

ان کے ہم سے بڑھ گئی ہے غروشان آرزو
سانے ہو گا کسی کے استخوان آرزو
آرزو ہی ان سے خود کر دے بیان آرزو
وہ نہیں سنتے زباں سے داستان آرزو
میرے ہی دم سے جہاں ہیں آرزو اک حیر ہے
آرزو کے نام ہی سے رکھتے ہو کانوں پہ ہاتھ
جب وہ دل میں مکیں ہیں صورتِ فصل بہار
نام بھی تو آرزو کا اب کوئی لیتا نہیں
آرزو مندوں کا دل اس راز سے آگاہ ہے
تو بڑا ہمدرد ہے ناصح بڑا دلسوز ہے
جب سے دیکھا ہے مجھے تم نے نگاہِ ناز سے
آپ کے قبضہ میں لے دینا ہے حسن و ناز ہے
اب زمین آرزو ہے، آسمان آرزو
پُر اثر کتنی ہے میری داستان آرزو
شانِ قدرت سے جو پیدا ہو زبان آرزو
کاش ہو بائیں نگاہیں تر جہان آرزو
یہ نہ ہوں تو پھر کہاں نام و نشان آرزو
اب تمہیں ہم کیا سنائیں داستان آرزو
کس قدر چھو لایچھلا ہے گلستان آرزو
مجھ سے ہی آباد تھا گویا جہان آرزو
آرزو ہے جان دل کی دل ہے جان آرزو
میں تباؤں کا تجھے راز بہان آرزو
میرے دل میں چھب گئی نوکِ سان آرزو
ہے تصرف میں ہمارے اک جہان آرزو
آرزو کے دل سے اے اعجاز و جہِ زندگی
دمِ نکل جا بیگا جب نکلیگی جان آرزو

پنولین کے مکتوب محبت!

جناب مولانا خواجہ احمد صاحب فاروقی

بیکسر الفت و پرستاری، ایک مہذب شعلہ عشق بن کر رہ گئی تھی۔
چھبیس برس کا جوان، ناشائستہ، زرد روپہ سالار جو بارہ
کیلے صوف بونا پارٹ تھا پیرس آتا ہے۔ یہاں کے عیش و نشاط کو پہلی بار
دیکھتا ہے۔ جوزوفائین ایک فیش پرست عورت سے ملاقات کرتا ہے
اور بلا کسی پس و پیش کے جوانی کی پوری گرمی اور جوش کے ساتھ اس کا
شناخاں بن جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ حسین جوزوفائین کی عمر تیس

پنولین اعظم اپنی شجاعت والوہزمی کے لحاظ سے کسی تعارف کا محتاج
نہیں۔ وہ دنیا کی ان شخصیتوں میں سے ہے جن کا نام بقائے دوام حاصل کر چکا
ہے اور جو ہمیشہ تاریخ کے چند بہترین اور زندہ جاوید سپہ سالاروں میں شمار
کیا جائیگا۔ ایسی ہمیشہ ہستی کی حیات محبت کا مطالعہ کر کے دلچسپی کا باعث
نہ ہوگا۔ پنولین دراصل جہاں دلیری اور مردانگی کے جذبات سے لبریز تھا وہاں
وہ سراسر محبت سے بھی معمور نظر آتا تھا۔ جوزوفائین کے ساتھ اس کی زندگی

نوٹ ۱۔ جوزوفائین جزیرہ مارٹینیک (Martinique) میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک شریف لیکن ناکارہ خاندان کی دیکھی تھی۔ سولہ برس کی عمر
میں اس کی جمی نے بوڑھی ہونشیا ر عورت تھی ایک شخص الگرا اندر ڈی بوا ز میں نامی باغی امیر سے اس کی شادی کر دی لیکن یہ رشتہ بالکل ناکامیاب
رہا۔ جوزوفائین طفل مزاج اور غیر تعلیم یافتہ تھی۔ وہ ان شخص کیلئے بے مذہانہ شکوہ تھی جو اس وقت روسیو کا مطالعہ کر رہا تھا اور ایسی دنیائے مساوات
کا خواب دیکھ رہا تھا جس کی صفات تمام فرانسیسی فلاسفہ اپنی تحریروں سے کر رہے تھے۔ وہ سجدہ گمان اور فتنہ خیز واقع ہوئی تھی۔ الگرا اندر کیلئے
اس کا صحن بہت ہی جاذب نظر نہ تھا۔ وہ اس کے ہر وقت لے آنسوؤں سے بالکل تنگ آچکا تھا۔ ”عہد مہنت“ (Le Travail) جو نہ صرف
میں جب اس کو اور اس کے شوہر کو قید ہو گئی تو جوزوفائین نے بااثر لوگوں سے تعلقات پیدا کر لئے۔ وہ جاتی تھی کہ خوبصورتی اور رعنائی ایک
تفاک اور ظالم انقلابی کے دل کو بھی ہوم کر سکتی ہے۔
بالآخر الگرا اندر نے اس سے غلط فہمی حاصل کر لی اور جوزوفائین کے لئے ایک رقم مقرر کر دی۔ اس وقت کے دو بچے یوگن اور ہارٹنس تھے
وہ دنیا کو خوب جان گئی تھی اور اپنا وقت مارینی محبتوں میں بسر کرنے لگی۔

ششہ عیس ہارٹنس کے ہمراہ وطن ہوتی ہوئی پیرس چلی گئی۔ یہ انقلاب فرانس کا زمانہ شباب تھا۔ الگرا اندر اور اس کے درمیان ایک قسم
کی مفاہمت ہو گئی تھی لیکن دونوں کی غلط فہمی برقرار قائم رہی۔ پھر بھی جوزوفائین اپنے شوہر کے عروج و ترقی سے خند مسرت و لطف حاصل کرتی رہی۔
الگرا اندر کچھ دنوں بعد مر گیا اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اس وقت جوزوفائین کی حالت سید قابل رحم تھی۔ وہ بیوہ تھی، ایک ذمہ دار ماں،
لیکن بالکل مفلس اور تار دار۔ اب مایوس پیری کی جگہ بارس نے لے لی تھی۔ ہر جگہ اسی کاؤ لنگیج رہا تھا۔ حسین بیوہ کی خوش قسمتی سے بارس کی
معاہدات اس کے اوپر پڑی۔ اس کے بچے اعلیٰ اسکولوں میں داخل کر دیئے گئے۔ اب اس کے پاس ایک مکان بیرس میں تھا اور ایک دیہات
میں۔ اس کی حیثیت افسر جمہوریت کی بیوی کی سی تھی۔ لیکن اسے بارس سے جو کچھ رقم اسے ملتی وہ سب خرچ کر دیتی اور اس سے زیادہ کمزور ہوتی۔

سال کی ہے۔ اس کا آداب شباب ختم ہو چکا ہے۔ اور یہ کہ جوزوفائین کا اتھات محض اس لئے ہے کہ وہ نئے نظام مسیحیہ (Mosaic) کے ایک بڑے حصے سے شخص سے ملاقات رکھنا چاہتی ہے۔ پولین اسے جنت قلب و روح اور فرانس کے پرانے خاندان کی ایک شریفینہورت سمجھتا ہے۔ بقول سی۔ ایچ۔ چارلس ان کی پہلی ملاقات ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ پندرہ دن تک ان دونوں میں کچھ تعلق رہا اس کے چھ ماہ بعد ان کی شادی ہو گئی۔ پولین دو ہی دن بعد اٹلی چلا جاتا ہے۔ وہ اسے ہر سہ ماہ سے خط بھیجتا ہے۔ ان خطوط میں محبت و الفت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ پولین کو مستقبل نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ حال کا وہ خود مالک تھا قیمت کا خود فرمانروا۔ لیکن وہ اپنی تمام روح ان خطوط میں جذب کر دیتا تھا جو اس نے جوزوفائین کو لکھے۔ اور جس سے اسے بے انتہا محبت تھی

ایک خط میں وہ لکھتا ہے۔
”میں جب اس زندگی پر غور کرنے لگتا ہوں تو اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں وہاں تیری ہی تصویر حرکت کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ میں اس کو دیکھتا ہوں۔ محبت میرے لئے سراسر مسرت ہے۔ مجھے ہر چیز دعوت عہم دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بجز اس لمحہ کے جو تجھ سے جدا ہوتا ہے۔“
اس کے لئے اس نے پندرہ مہینوں میں اپریل ۱۸۹۷ء سے ستمبر ۱۸۹۷ء کے چھ مہینے حاصل کیں۔ اکیس غم سرگئے اور پڑناٹھ نے مشروط اطاعت قبول کر لی۔ اب وہ جوانا کو نشانات فح دیکر اس کے لینے کے لئے پیرس بھیجتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔
”جلدی۔ دیکھو میں کتنا ہوں اگر تم نے دیر کی تو تم مجھے بیمار پاؤ گی۔ یہ مکان، محنت اور جہاں بہ کینقت ناقابل برداشت ہیں۔“

بقیہ نوٹ ۱۔ رفتہ رفتہ بارس بھی الگ انداز کی طرح اس سے تنگ آ گیا۔

۱۸۹۵ء میں پولین پیرس آیا۔ وہ غریب تھا۔ بیوا اور سجدہ دست۔ لیکن لوگوں کے محاصرے میں اپنا نام پیدا کر چکا تھا۔ اور بارس نے اسے جنرل بنادیا تھا۔ اس نے جب جوزوفائین کو دیکھا تو ہمہ تن درد، آہ اور کراہ بن کر رہ گیا اس کی حالت بالکل نیمہ داغ و نیمہ خاکستر تھی۔ پولین اپنی بلند نظری اور اعلیٰ حوصلگی کا ہمیشہ غلام رہا ہے لیکن اس کی زندگی کا صرف یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ مطلع نظر انداز محبت کے آگے بھلا دیا جاتا تھا پہلی ہی ملاقات کے بعد وہ اس سے شادی کر لیتا چاہتا ہے۔ لیکن جوزوفائین اتنی جلد اس کے لئے آمادہ نہ تھی۔ وہ اس سے کچھ خوفزدہ سی تھی لیکن بارس جو اس سے عاجز آچکا تھا۔ شادی پر قہر ہوتا ہے اور آخر کار ۸ مارچ ۱۸۹۶ء کو پولین اور جوزوفائین کی شادی ہو جاتی ہے۔ بارس اور پولین دو خاص گواہ بنے ہیں۔

دو ہی دن بعد پولین اٹلی کی ہم پر چلا جاتا ہے۔ پولین بیدار نہ تھا اور مصروف رہتا ہے لیکن جوزوفائین کو خط لکھنے کیلئے اسے ہمیشہ وقت مل جاتا ہے۔ یہ جلدی میں لکھے ہوئے خطوط نامہ سحرش اور اثر سے بھرے لکھے ہیں۔ پولین اسے اٹلی جاتا ہے لیکن وہ پیرس ہی میں رہ کر جنرل بونا پارٹ کی بیوی کی حیثیت سے لوگوں کی تحسین اور تعریف سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔ آخر کار وہ جون کے آخر میں طان پہنچ جاتی ہے لیکن اس طرح روتی ہوئی جاتی ہے جیسے وہ کوئی سزا بھگتے جا رہی ہے۔

جوزوفائین کی بیچیاں اور فضول خچیاں براہ قائم رہتی ہیں۔ پولین غصا بھی ہوتا ہے لیکن پیرس جاتا ہے اور اس کا فرض تک ادا کر دیتا ہے۔ پولین کے دل میں اب یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنا خاندان قائم کرے جو شاہان یورپ میں ایک خاص وقار کا مالک ہو۔ اس کی تمکین کے لئے کسی شاہی خاندان میں شادی کرنا ضروری تھا اور اس کے لئے جوزوفائین کو طلاق دینا ناگزیر۔ وہ کچھ دنوں تک سوچتا رہا۔ اپنے دل کی اس آرزو کو دہاتا رہا لیکن چند سہمی ضرورتوں اور شیردوں کے پیہم امر ارے اسے مجبور کر دیا۔ اور آخر کار ۱۸۹۷ء میں اس نے جوزوفائین کو طلاق دے دی۔

لیکن اس میں ذرا کلام نہیں کہ پولین جوزوفائین سے برابر محبت کرتا رہا۔ جب روس سے باقی ماندہ ”عظیم الشان“ فوج خستہ و در ماندہ واپس

اس حالات میں بھی اسے ایک خیال — صرف ایسی ہی خیال ہے۔ تم آؤ گی؟ — ہاں تم میرے پاس ہو گی، میرے دل میں۔ میرے پلو میں۔ پر گھلاؤ۔ آجاؤ۔ جلد آجاؤ۔

لیکن جو زوفائین کو جلدی نہیں ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایک اطالیہ کے سپہ سالار اعظم کی بیوی ہے۔ ایک اہم شخصیت ہے۔ پنولین آس گھائے ہوئے ہے۔ اسے غصہ آتا ہے۔ امید و بیم کی کیفیات سے وہ پھٹکا جاتا ہے۔ وہ قاصد پر قاصد دوڑاتا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ وہ کیا سوچ رہی ہے؟ کیا اس نے واقعی کسی انیس سالہ جوان سے محبت کر لی ہے؟ وہ برابر ایک ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا ہے۔

جو زوفائین حالات اور ابتدائے درد زہ کا خد کرتی ہے یوناپارٹ کو بڑی مدامت ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

”میں نے تمہارے اتنے قصور کئے ہیں کہ میں ان کی تفصیل سے بھی عاجز ہوں۔ میں یقین قیام پیرس پر الزام دیتا ہوں درآ خالی کہ تم ہاں بیمار تھیں۔ میری پیاری آئی! مجھے صاف کر دو، بخش دو، محبت جو تم نے میرے رگ وریشہ میں بھردی ہے اس نے مجھے فائر العقل کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فتور کبھی دور نہ ہوگا۔ کوئی اس بیماری سے اچھا نہیں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اپنی ماں جیسا ایک خوبصورت بچہ تمہاری گود میں فرحت و انبساط محسوس کر گیا۔ اور میں بد نصیب اپنی فتح و کامرانی پر قناعت کر گیا۔

جو زوفائین نے محسوس کیا کہ یہ بہانے زیادہ دنوں تک۔ چلنے والے نہیں ہیں۔ پنولین تحریر کرتا ہے کہ اگر اس کی بیوی نہیں آئے گی تو وہ مستغنی ہو جائیگا۔ ہر چیز چھوڑ دے گا اور خود اس کے پاس چلا آئے گا۔ آخر کا جو زوفائین ناخوشی سے جوناٹ اور جوزف (پنولین کے بھائی) کے ہمراہ آجاتی ہے۔ اس کا کتا ”فائرچمن“ بھی ساتھ آتا ہے۔ پنولین جب اس کے ملاں کے قریب پہنچنے کی اطلاع پاتا ہے تو اس سے درخواست کرتا ہے:

کہ وہ دونوں آجائے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اس لئے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔“

لیکن وہ ملاں ہی میں انتظار کرتی ہے۔ وہ وہیں چلا جاتا ہے اور وہ وہیں خوب چادر و محبت میں گھومتے ہیں۔ ”زہرہ صبح بھی ہے اور جام پور بھی۔“ کا لطف خاص حال ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے نزدیک دنیا۔ ”میں جائے سن دھائے تو باشد“ کا نام تھی۔ لیکن فدا ہی جنگ کی کچھ خطرناک صورتیں اسے جلد واپس جانے پر مجبور کرتی ہیں وہ روزانہ طویل محبت ناسے لگتا رہتا ہے۔ ایک خط میں لکھتا ہے۔

”آہ مجھے اجازت دو کہ میں کسی طرح تمہارے کچھ نقص معلوم کر لوں تم قلمد کم حسین بن جاؤ۔ کم نازک بن جاؤ اور سب سے زیادہ یہ کہ کم ہر بان ہو جاؤ۔ اور ہاں کبھی متفکر نہ ہو۔ بد گمان نہ ہو۔ کبھی آنسو نہ بہاؤ۔ تمہارے آنسو مجھ سے عقل چھین لیتے ہیں۔ میرے خون میں آگ لگادیتے ہیں۔ آؤ، میرے پاس آجاؤ۔ تاکہ مرنے سے پہلے ہم یہ تو کہیں کر ہم نے اتنے دن سترت کے ساتھ گزار لئے۔“

جوان محبت کی یہ طوفان خیزیاں اگرچہ کم ہو گئیں لیکن وہ بیوی سے بدستور محبت کرتا رہا ”میدام سیٹل“ سے وہ کہتا ہے۔ ”مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ اگرچہ وہ چالیس برس کی ہو گئی ہے اور اس قدر معلوم بھی ہوتی ہے۔“

در آل یوناپارٹ کے لئے اس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ تمام زندگی چاہے وہ اسے کتنے ہی فریب میں مبتلا رکھے۔ وہ اسی کا دم بھرتا رہتا ہے، وہی اس کے تنکین و پوش پر قابض رہتی ہے۔ ذیل میں اس کے خطوط کا انتخاب اس امر کو واضح کر دے گا۔

(ملاں کو)

ازدرونا، سدر نوبر ۱۹۳۷ء۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ

(بھتیس فوٹ) آئی ہے تو سپاہیوں کو جو زوفائین کا برابر خیال تھا ان لوگوں نے کہا: پنولین کدہ بر صیال کی چوڑیاں نہیں چاہے تھی۔ وہ اس کی خوش قسمتی کا باعث تھی۔ پنولین کو اس وقت بھی کچھ یقین تھا کہ یہ لوگ کچھ رہے ہیں۔ ”صیام“ ۱۰۰۰ day سے پہلے ہی جو زوفائین کا انتقال ہو گیا مرنے وقت اس کے لبوں یوناپارٹ ہی کا نام تھا۔ پنولین بھی اسے زینت و زینت ”اس کی محبت کو دل کی سب سے شیریں محبت سمجھتا رہا۔“

خواجہ احمد فاروقی

جو زوفائین سے زیادہ شریف و عزیز بن منصوبوں پر فائز ہوئی ہیں لیکن قبول سڈنی ڈارک اس قدر قابل محبت کم۔

تمہ سے نفرت کرتا ہوں۔ تم کیسی خوفناک، کیسی بُری، کیسی بیوقوف۔ کُل
-سند لیا ہوا، تم مجھے بالکل خط نہیں لکھتیں۔ اپنے شوہر سے ذرا محبت
نہیں کرتیں۔ تمہیں اس سرت کا خوب اندازہ ہے جو مجھے تمہارے خطوط
ہوتی ہے۔ پھر بھی تم اسے اتفاقاً ہی پانچ چھ سطریں گھسیٹ کر نہیں،
بھیج دیتیں۔"

یگم! پھر تم آخر دن بھر کیا کرتی ہو؟ وہ کیا مشغولیت ہے جو تمہارا
تمام وقت لے لیتی ہے اور تمہیں ایسے اچھے محب کو خط لکھنے سے باز رکھتی ہے
... وہ کون نیا اور عجیب محبت ہے جو تمہارے تمام لمحات پر عادی ہے۔ جو
تمہاری فرستوں پر جا رہا نہ قبضہ کرنے ہوئے ہے اور جو تمہیں، تمہارے شوہر کا
آرزو مند ہونے سے منع کرتا ہے۔ جو زوفاؤں، یاد رکھو کہ ایک دن دروازے
کھینچنے اور میں وہاں موجود ہو گیا۔

میری اچھی آئی! دراصل میں تمہاری غیرت نہ معلوم ہونے سے سخت
پریشان ہوں۔ مجھے جلد چار منٹ کا خط لکھو اور اس میں ایسی اچھی اچھی باتیں
تحریر کرو جو میرے دل کو سرت اور محبت سے سرشار کر دیں۔
مجھے امید ہے کہ میں جلد تم سے آکر بنگلہ ہو گیا اور لاکھوں ایسے
لوہل اور گرم بوسوں کی بارش کروں گا کہ یہ معلوم ہو کہ تم خط استوا پر ہو۔
"بونا پارٹ"

(بہ مقام جنیوا)

طمان ۲۷ نومبر ۱۹۳۶ء وقت ۲ بجے سہ پہر

میں طمان آیا اور تمہارے کمرے میں دوڑا ہوا گیا۔ میں نے ہر چیز
تھیں دیکھنے کیلئے، تم سے بنگلہ ہوئے کے لئے چھوڑ دی ... ہاں تم وہاں
نہیں تھیں۔ تم ایسی جگہ چلی جاتی ہو جہاں ہنگامہ طرب ہوتا ہے۔ سرت پیدا
ہوتی ہے۔ تم ایسے وقت چلی جاتی ہو، جب میں تمہارے پاس آتا
ہوں، تم اپنے پیارے پولین کا اب ذرا بھی خیال نہیں کرتیں۔ تمہاری اس
سے محبت شاید وہم ہی وہم تھی۔ تمہاری تلون المزاجی شاید اس بے اتفاقی
کا باعث ہے۔ میں خطرات کا عادی ہوں۔ مجھے زندگی کی کلفتوں کا علاج معلوم
ہے۔ یہ بد نصیبی جو میرے اوپر غالب ہے، سید و صاحب ہے۔ میرا حق تھا کہ میں اس
سے بچا لیا جاتا۔

میں یہاں ۹ کی شام تک رہا ہوں گا ... تم خوب عیش کرو۔ عیش
تمہارے ہی لئے بنا ہے۔ تمام دنیا تمہیں خوش کرنے پر سرور ہے۔ لیکن صرف
تمہارا شوہر بہت — بہت بد نصیب اور غمگین ہے۔
"بونا پارٹ"

خواجہ احمد فاروقی،

رباعیات

کیا کیفیت چو شمس تناسکے؟
بوش آئے تو افسانہ صہبائے
رعنائی سنجانہ سے دل ہے بخودید،
رازہ کو اک خبت دنیا کی ہے؟

مولانا عابد شاہ صاحب پٹواری

دیوانہ کے دیکھے آغازِ نبار۔
اک عشرِ خدباتِ باندازِ ببار۔
کیوں دستِ خونِ مہینِ نبار۔
عابد شوقِ مہینِ رازِ ببار۔

آفتاب

اے ایامِ زندگی! اے نیتِ گردوں مدار
تیری تابش سے منور کوہِ سار و باغ و راع
جلوہ گستر دیکھ کر تجھ کو ستلے چھپ گئے
تیرے ہاتھوں نے اٹھائی ہے نقابِ روئے صبح
بامِ گردوں پر تری ہستی ہے حیرتِ آفریں
ہے پیامِ زندگی ذی روح کو سترِ اظہور
تیرے جلووں سے درخشندہ ہے ایوانِ شہی
ہیں تری رنگیں شعاعیں کس قدر نیرنگ کار
تیرے تن پر زیب دیتی ہے تری زریں قبا
رنگ دیکھے تیری طلعت کا کوئی وقتِ محسّر
دہر کا ہر ذرہ تیرے نور سے معمور ہے
غنجِ غنچہ سخن گلشن کا بستمِ ریز ہے
تیری تنویروں سے تابندہ ہے ساری کائنات
مدتوں سے ہے یونہی تاریک کاشانہ مرا

اے چراغِ زندگی! اے آفتابِ زرنگار
تیری آمد سے ہوا گلِ محفلِ شب کا چراغ
چھپ گئے اپنا سامنہ لے کر پکارے چھپ گئے
ہر روش پر باغ کی پھیلی ہوئی ہے لہجہ صبح
میری نظروں میں ہے تو جامِ شہ آبِ نشیں
تیری تنویروں سے تاباں دشت و صحرا و فخور
اور غریبِ فلسفہ بیکس کی خستہ جمبوڑی
سنگریزوں کو بسنا یا جس نے در شاہوا
مشرق و مغرب میں تیری پادشاہی ہے بجا
پردہ تاریکے ہوتا ہے جب تو جلوہ گر
چشمِ عالم میں تری ہستی سراپا نور ہے
چپہ چپہ ارضِ عالم کا نشاط انگیز ہے
میں سمجھتا ہوں تجھے اشعِ شبتانِ حیات
غمِ فزا دل سوز درد آگیاں ہے افسانہ مرا

آ خدا را میرے دل سے داغِ ہجر ادا کر
اس سیہ خانے کو اپنے نور سے معمور کر

آزاد انصاری۔ لکھنؤ

داروغہ ہتھام الدولہ بہادر

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت

نہوئی تو کچھ اور سوچا ہے۔ یہ کہہ کر ابدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔ بنوئی نے کہا میں نے جو مشورہ دیا تھا اسے توحید حسین نے ٹھکرا دیا اور بُرا مانا لیکن نوکری ان کو کہاں مل سکتی ہے۔

ایک دن اتفاق سے یہ بازار میں گزر رہے تھے ایک جوگی ملا اس نے ان کی پیشانی سے اقبال مندی کے آثار دیکھ کر کہا بچہ تیرے دروازے پر باقی بند سے گامیری بات یاد رکھنا۔

حیدر حسین نے کہا سائیں جی ہم تو خود غیر کے دروازے پر بند سے ہیں اور بے غیرتی کی روٹی کھا رہے ہیں اور پیسہ پاس نہیں ہے۔ ہاتھی کہاں اور ہم کہاں، یہ تو غیر ممکن ہے اگر ہاتھی بند ہے گا تو تم کو ایک دھوٹی بند ہوا دیگے اب تو خود محتج ہیں۔ جوگی نے کہا میں کسی سے بھیک نہیں مانگتا، اس شہر میں میری پھر پھر جی ہوگی صرف میری بات یاد رکھنا۔ یہ کہہ کر وہ اگے چلا گیا بات رفت گذشت ہو گئی۔

لیکن بنوئی کے اس کلام کا تیرا کیا لگا کہ کسی طرح زخم مندمل نہ ہوا نوکری کی تلاش میں دروازے کی خاک چھانی مگر کہیں نہ ملی تو ٹھانی کہہ بن کی روٹیاں کب تک توڑیں بہتر یہی ہے کہ شہر چھوڑ پر پیس کی بھیک اچھی اس سوختی میں ہماری جان بچ جائیگی۔ لکھنؤ چھوڑ کر اپنی قسمت کا کھٹا پورا کریں

۴ یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برباید

یہ منصوبہ دل میں باندھ کر اپنی نانی کے پاس گئے۔ اپنا حال اور بن کے یہاں پڑے رہنے کی ذلت بیان کیا۔ بہت کچھ روئے گلے اور کہنے گئے، تم سے رخصت ہونے آیا تھا کیونکہ تم سے زیادہ چلنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اب چند سے اپنی چھاتی پر پتھر رکھو اور ہم کو رخصت کرو۔ اگر

دولت اور عزت خدا کی دین ہے۔ اس میں کسی کا اختیار نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دولت انھیں لوگوں کو ملتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں تیز داری سے محنت کرتے ہیں اور عزت ان کو ملتی ہے جو عزت کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس کی اہلیت رکھتے ہیں اہل اپنی عزت آپ کرتے ہیں۔ ان کی ابتدا کسی لیت میں ہوا دنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال داروغہ میر حیدر حسین خاں ہیں جو قوم کے مسید لکھنؤ میں رہتے تھے۔ طفلی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خاندان میں کوئی اس قابل نہ تھا جو ان کی پرورش کرتا اور تعلیم دیتا۔ عورتوں میں صرف ایک بہن تھی جس کے بیاں زردوزی کا کافیا تھا اور شوہر زردوز تھا تو بھی اپنے چھوٹے بھائی کی پرورش کرتی تھیں۔ باپ کا نام میرزا حاجی بیگ تھا۔ جب حیدر حسین خاں چار برس کے تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں اپنے شوہر کے غم میں دو برس کے اندر پاگل ہو کر مر گئی تھی۔ ایک نانی تھیں جو زمانہ محمد علی شاہ میں نواب ملکہ آفاق خدرہ غلطی متاثر زمانی بیگم عرف کھیتو بیگم کی خاص محل کی سرکاری مصاحبت میں دن رات حاضر باش رہتی تھیں ان کو محل سے کہاں فرصت تھی کہ نواسے کی خبر لے لیں۔

بن کے شوہر چاہتے تھے کہ تعلیم کا سلسلہ تو غیر ممکن ہے کم سے کم حیدر زردوزی کام سیکھ لیں۔ ایک دن ان سے کہا خالی آوارہ کب تک پھونگے کل سے کارخانہ میں بیجا کرو تو چار پیسے کے مزدور ہو جاؤ گے۔ پس اپنے قوت بازو سے کچھ کما، چاہے غیور حیدر حسین نے اس نصیحت کا ٹٹا اڑ لیا کہنے لگے۔ یہ تک مجھے خود فکر ہے کہ کوئی اپنی معاش کی صورت نکالوں اور اسی خیال میں سرگرداں پھرنا ہوں خدا مسبب الاسباب ہے لیکن کوئی پیشہ کرنا میرے لئے ننگ ہے۔ میں تو عزت کی ملازمت چاہتا ہوں اگر اس کی جگہ سبیل

ایسا ہوا کہ بی مرزائی کے ذریعہ سے حضور کے قدموں تک رسائی ہوئی بہت کچھ اطمینان ہوا۔ آج کا قصہ سنئے۔ میرا نواسہ جسے میں اپنی زندگی کا ذریعہ جانتی تھی اور جسے چار برس کے سن سے کچھ سے گھار کھا تھا اور جسے بڑی بہن کے پاس چھوڑ کر حضور کے دامن دولت سے وابستہ تھی زار و قطار روتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں اب بہن کے پاس نہیں رہنا چاہتا ان کا سلوک اچھا نہیں دیکھتا۔ اب غیر کے ہاتھ کی روٹی نہیں کھانا چاہتا اپنے قوت بازو کی کمائی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیس چھوڑ پر دیس کی بھیک اچھی امید ہے کہ کوئی نورگاہ ضرور مل جائیگا۔ تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ میرے حواس جاتے رہے دل قابو میں نہ رہا۔ کہا بیٹا کیا مانی مرگئی ہے جو مجھے بچے چھوڑ کر پر دیس سدھارتے ہو۔ کھانا کپڑا میں بھیتیں دے سکتی ہوں۔ کینے کا میں بہن کے مکان میں دوبارہ نہیں جاؤں گا۔ میں نے کہا اچھا دو چار دن کا صبر کرو۔ اگر سرکار سے کوئی صورت تمہارے لئے نکل آئی تو بہتر ہے ورنہ تم کو اختیار ہے۔ اب حضور کے ہاتھ میری موت اور زندگی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر نواسہ کہیں نکل گیا تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔

جناب عالی نے فرمایا اچھا میں آج بادشاہ سے کہو گی آئندہ لڑکے کا مقدر۔ جب محمد علی شاہ محل میں تشریف لائے تو بیگم صاحبہ نے بادشاہ سے عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا اس کا سن کیا ہے کہا پندرہ سولہ برس کا۔ کہا اچھا کہ دو ہمارے خواص کے خوان دیکھ لیا کرے دوسرے دن سے داروغہ باورچی خانہ مقرر ہو گئے۔ حسب دستور بادشاہ کے خوان کے ساتھ ایک خوان داروغہ کو بھی ملتا تھا۔ یہ اپنا خوان اپنی بہن کو بھیجتے تھے اسے گھر کھاتا تھا۔ جبکہ محمد علی بادشاہ نے ماہ ربیع الثانی کی پانچویں تاریخ یوم شنبہ ۱۲۵۶ھ کو اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ تاریخ وفات وہ اور یہ بحال حکومتِ ہندوستان اور حضرت محمد امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو داروغہ علی اہتمام دربار عام کی اعتبار الدولہ عطا حسین خان برادر امین الدولہ کو عنایت کی داروغہ مادر حجازہ حیدر حسین خاں کو اہتمام الدولہ کا خطاب دیکر پیش دست اعتبار اندولہ کا مقرر کیا کیونکہ زمانہ ولسمدی کے روزانہ حاضر پیش رہتے تھے اور فیصل خراج اب کیا تھا اہتمام دربار عام کے پیش دست۔ کل علم ان کے اختیار میں تھا ان کی آمدنی کافی تھی۔ مگر تعلیم سے بے بہرہ۔ بالکل جاہل مگر خدا نے اس جہالت پر بھی فضل کیا کہ اس جہالت پر بھی تمام علم ان سے خوش تھا اور بڑے بڑے

زندگی باقی رہی اور کوئی روزگار مل گیا تو ایک دن ساتھ غیریت کے تمہاری قدموں سے حاصل کرینگے نہیں مگر کہے بیٹھ رہنا اور جاننا کہ بیٹی کی طرح نواسہ بھی مر گیا۔ بے عزتی کی زندگی کے ساتھ دنیا سے اٹھ جانا آدمی کے لئے بہتر ہے نانی صاحبہ جلد نام سن کر رونے لگیں اور کہا جائیں تمہارے دشمن تم کو روٹی کپڑے کی ضرورت ہے تو کیا مانی مرگئی۔ جو کچھ تمہارے کھانے کپڑے کا خرچ ہو مجھ سے لیا کرو لیکن رہو اپنی بہن کے پاس کیونکہ محل میں تو تم کو رکھ نہیں سکتی۔ یہاں تو پانچ برس کا بچہ بھی نہیں آسکتا۔ انہوں نے کہا تو مجھے بھی رخصت کرو کیونکہ میں اب بہنوئی اور بہن کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا نہ کسی غیر کا احسان اٹھانا چاہتا ہوں۔ مانی نے کہا تجھے میری جان کی قسم بھی کو پیٹے صرف آٹھ روز ذرا صبر سے کام لے۔ میں آج ہی بیگم صاحبہ سے کہہ کر خدا کو منظور ہے تو تجھے کوئی جگہ دلا دیتی ہوں۔ اتنے دنوں تم میرے پاس آکر کھانا کھا جایا کرو۔ اسی طرح آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے نو لے کر رخصت کر کے بیگم صاحبہ کے پاس گئیں تو انہوں نے کہا بیگم خیر تو ہے تم تو رونے کا نام بھی نہیں جانتیں۔ خود رو توں کو ہنسا دیتی ہو۔ یہ آج کیا ہے چہرہ ادا اس آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ بد حواس آ رہی ہو۔ کہنے لگیں حضور کے واسطے اس حال کو نہ چھوڑو آج ایسا داغ دینے والا آیا تھا کہ اس کی دو باتوں میں کلیجہ قابو سے نکل گیا اور یہی جی چاہا کہ چھری مار کر جان دیدوں۔ مجھ نے نصیب کی زندگی کا سہارا صرف ایک لڑکی تھی جس پر میری جان فدا تھی اور جی جان سے اسے چاہتی تھی اور اپنی زندگی کا سہارا اسے سمجھتی تھی۔ قسمت کی بات ہے کہ شوہر کے مرنے کے دو برس کے بعد وہ بی بی دو بچے چھوڑ کر مجھے داغ مفارقت دیکھیں دل قابو سے باہر ہو گیا سرن دیوانی بن گئی۔ میں زندگی میں اتنا ہنسی تھی کہ اس کا کافی بلا مجھ سے خدا نے لیا سارے محل میں ہنسا چل رہی تھی۔ کچھ زمانے میں شوہر کا مرنے کا گھر کا تباہ ہونا۔ جاننا زچہ کے دھچکچہ چھوڑ کر دنیا سے سدھارنا مجھے سرن بنانے کو کیا کم تھا۔ غرض اسی حالت جنون میں اپنی نواسی کو جس کا سن چودہ برس کا تھا ایک زرد وز کے یہاں شادی کر کے چاہتی تھی کسی جنگل بیابان میں نکل جاؤں۔ جی بہت گھبراتا تھا کہ نواسی کے سبب سے بہت رنج ہو جائیگی اس کے شوہر کی مغلسی قرضداری میں پریشانی روز روز کی فاقہ شکنی کیونکہ ہو سکے۔ اپنا مکان بیچ کر داماد کا بھرنہ بھرا دیا اس کو زرد وزی کا کارخانہ کھلوادیا۔ اب یہ صورت ہوئی کہ آپ فاقہ کرنے لگی۔ خدا کا کرنا

علی کے گھمے پڑے دربار کے عالم فاضل ان سے مشورہ لیتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی دیانت اور امانت مشہور تھی اور بادشاہ کو ان پر اعتماد تھا۔ مرزا امجد علی شاہ نے چار برس دس مہینے ۲۴ یوم ۱۹۲۳ء پنجشنبہ کے روز سلطنت کر کے انتقال فرمایا اور سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ رونق افروز تخت سلطنت ہوئے تو دیوان خانہ کے متمم اور کارخانجات شاہی کے سکریٹری قرار پائے اس لئے کہ بادشاہ ان کو داد و جان کے وقت کا قابل اعتماد کار گزار سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایسا انتظام کیا کہ بادشاہ ان سے بہت خوش ہوئے اور علی والے ان سے مشکل امور میں مشورہ لیتے رہتے یہاں تک کہ بادشاہ کے چوتھے وزیر کے نام سے پکاسے جاتے تھے۔ مبارک میں نور الدولہ۔ امین الدولہ دلیہ الدولہ۔ شرف الدولہ کے پہلو پہلو جائے نشست ملتی تھی۔ بادشاہ کے ہر مشورہ کا جواب نہایت عقلمندی سے دیتے تھے۔

اس عرصہ میں سلطنت کا زوال ہو گیا۔ بادشاہ معزول ہو کر لکھنؤ سے کانپور تک پہنچے تھے کہ ایک دن چیف کمشنر نے مصلح الدولہ سیح الدولہ۔ دیانت الدولہ۔ احسن الدولہ۔ شہار الدولہ۔ اکرام الدولہ۔ اہتمام الدولہ کو ضمانت کے لئے طلب فرمایا۔ سب شاہی علی کے لوگ حاضر ہوئے اور اہتمام الدولہ معروض حساب میں آئے اور دس ہزار روپیہ کا الزام ان پر عاید کیا گیا۔ یہ بت پریشان ہوئے۔ صاحب لوگ ان فرست اور امانت و دیانت سے خوب واقف تھے۔ آخر بڑا صاحب نے ان کی ضمانت کرنی۔ اہتمام الدولہ نے حساب لکھانا شروع کی۔ ان کے علی نے کاغذات دکھائے اور دس ہزار کے بدلے خود ان کا چودہ ہزار واجب الادا نکلا۔ چیف کمشنر ان کی یادداشت اور دیانت کے مقرر ہوئے کہ جاہل اہلکار نے محض اپنی یادداشت کے اعتبار پر الزام سے بریت حاصل کی اور اپنا چودہ ہزار کا مطالبہ پیش کیا۔

قدر سے پہلے جب جان عالم کلکتہ تشریف لے گئے تو تمام شاہی علی کے سرکار کمپنی نے برطرف کر دیا اور ان کا مطالبہ بھی کچھ ادا کیا ہزاروں آدمی اپنی آبرو لے کر لکھنؤ چھوڑ کر خانہ ویران ہو گئے۔ جو ریاست کو تھے فقر و فاقہ کی حالت میں شہروں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم، لوگ خود گرفتار ہاتھ نوکر کس کو رکھ سکتے تھے تو بھی اہل لکھنؤ کی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان کی حالت پر افسوس کرتے تھے۔

اہتمام الدولہ کی پہلی شادی جب یہ داروہ تھے ۲۳ سال کی عمر میں

ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس بی بی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا عقد میر علی صاحب ایک عزت دار نامور تاجر تھے ان کی صاحبزادی کلثوم بیگم صاحب کے ساتھ ہوا۔ یہ نیک بی بی نہایت ذی شعور اپنے شوہر کے اطاعت گزار تھی ان کے زمانہ میں اہتمام الدولہ خطاب ملا۔ جاگیر و منصب ملا۔ جائداد میں ترقی ہوئی لیکن اولاد سے محروم رہے کوئی اولاد اس بی بی سے نہیں ہوئی۔ اہتمام الدولہ کے مرنے کے بعد جو اس بی بی پر بیعتیں نازل ہوئیں ان کو مردانگی سے سر کیا اور انھیں کے مکان میں ہر طرح کی اذیت اٹھانے کی زندگی ختم کر دی۔

اہتمام الدولہ نے اپنے عروج کے زمانے میں بہت عیش کئے۔ اکثر انھیں ان کی نوکر تھیں۔ انھیں میں ایک بندی جان طوائف تھی نہایت حسین و خوبصورت اور ان سے بہت محبت کرتی تھی اور بہت خیر خواہ تھی۔ اتفاق سے ایک دفعہ بندی جان کی کوئی بات اہتمام الدولہ کو سخت ناگوار ہوئی انھوں نے غصہ میں اس کو ایک طایفہ رسید کیا۔ اس نے اس ناگوار حرکت کا بہت اثر لیا اور دل میں سوچنے لگی کہ جس شخص کا میں اس قدر پاس و لحاظ کرتی تھی اور ہر وقت اس کی خوشی چاہتی تھی اس نے ایک خداسی بات میں غیر شرعیانہ حرکت کر کے میری جان تباہی اور وفاداری کو خاک میں ملا دیا۔ تو اس سے خفا ہو کر غیر سے سلوک کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ سب میرے تقدیر کی خرابی ہے اب جینا بیکار ہے اس سے مر جانا کہیں بہتر ہے اسی بیخ و غصہ میں ایک ہیرے کی انگوٹھی چھابی اور صبح کو سوئی کی سوئی رہ گئی۔ داروغہ صاحب کو اس کے مرنے کا بہت صدمہ پہنچا۔ مقام سپہ پر اپنے باغ رنگڑی پور میں دفن کیا اور چہرہ تک اس کے ماتم دار رہے۔

متوعد عورتوں میں ایک حرم مجبور تھیں بہت محبوب ترین حرم میں ان کا شمار تھا ان سے ایک فرزند مرزا احمد حسین پیدا ہوئے۔ ان کی شادی نہایت دھوم سے میر نظیر علی خاں صاحب کی صاحبزادی ہیری بیگم سے ہوئی اور تنہا دھوم سے ہوئی۔

اہتمام الدولہ بھی اسی آفت میں مبتلا تھے ان کے پاس سوا جاہداد غیر منقولہ اور نقد کے اور کوئی وسیلہ نہ تھا۔ بہت عاقبت اندیش تھے کھے کہ میرا کوئی وثیقہ نہیں ہے اب بقیہ زندگی بسر کرنا مشکل ہوگی اور جاہل ہوں کہیں نوکری ملنا محال ہے۔ اپنے خرچ کو پہلے کم کیا۔ باقی گھوڑے بیچ لے نوکر کم کئے۔ صرف چھ کمار نوکر رہنے دیئے دوزخانی ڈیوڑھی پر اور چار

ان کی پنیں اٹھانے کے لئے گرمی میں شرتی۔ اصلی جامدانی۔ اور عمدہ کپڑے کے انگرکے۔ برکاپا بچا۔ مندیل دار لوطی۔ جائے میں شالی چنہ۔ سفید، شال کا دو شالہ، اصلی جامہ وارا ڈھتے تھے۔ بہر ایک باورچی کو کرتا لیکن اور کاکھانا نہیں پکاتا تھا۔ زنانے مکان میں کھانا پکایا جاتا اور اس میں خواص کا انتظام تھا۔ علی الصباح حواج ضروری سے فالغ ہو کر بجے ناشتہ کرتے ان بجے دن کو دسترخوان بچتیا۔ بین پچیس آدمی دسترخوان پر کھانا کھاتے۔

صبح شام ملی اردی کا سالن خاصہ میں ضرور ہوتا تھا۔ شام کو نو بجے دسترخوان بچتا تھا اس وقت گرم گرم پوریوں امیر خ کے کباب روزانہ بازار سے منگوا کر خاصہ پر رکھے جاتے تھے۔

ہندی گنج میں دو نکلہ تھا اور قریب قریب آدھا ہندی گنج ان کے عالی شان محل میں شامل تھا۔ قیل خانہ۔ مطبل۔ توشہ خانہ۔ مودی خانہ۔

دوان خانہ۔ باورچی خانہ۔ امام باڑہ وغیرہ۔ زنانی ڈیوڑھی۔ محل خانہ۔ خدنگار۔ چوکیدار۔ گہار۔ منشی وغیرہ میں ملازم باہر تھے۔ ماماں پیش خدمتیں۔ باری داریاں۔ خواص۔ مغلایاں کل میں عورتیں محل میں ملازم تھیں۔ ماہ محرم میں بہت خاص اہتمام سے مجلسیں ہوتی تھیں۔ ۸۰ محرم کو حضرت عباس علیہ السلام کا عظیم الشان علم اٹھایا جسے باقر خوانی و مال میں ہندی ہوئی سب شرکائے مجلس میں بطور تبرک تقسیم ہوتی تھی۔ لوحہ خواں۔ مرثیہ خواں۔ نثر خواں۔ سوز خواں۔ حدیث خواں مجالس میں ذکر کی کے لئے نوکر تھے غرضکہ بڑی سرکار تھی جس سے شتراسی نوکر وں کی پرورش ہوتی تھی۔ چوک

میں حیدر میں خاں کا چھانک اور کئی کمرے کئی مکان تھے جن کی آمدنی کافی تھی احمد حسین خاں صاحب نے اپنی زندگی نہایت نیک چلنی سے بسر کی فیض آباد میں اہتمام الدولہ کا ایک گاؤں تھا وہیں قیام اختیار کیا اور وہیں انتقال بھی ہوا۔ ان کی ایک ماجزادی اور تین ماجزائے تھے۔ محمد حسین عرف چٹن صاحب مرحوم۔ منے صاحب مرحوم۔ تیسرے صادق حسین صاحب جو بقید میات ہیں۔ احمد حسین کے زمانہ تک ان کے گھر کی حیثیت بنی رہی لیکن ان کے انتقال کے بعد اداں الذکر دولہ کے خراب چال چلن کے نکلے انھوں نے عیاشیوں اور بد معاشریوں میں سب جامدات تباہ کر دی اور تباہ ہو کر مر گئے عادی حسین صاحب جو مرزا احمد حسین کی کسی حرم سے تھے بد چلن ہونے سے گھر سے نکال دیے گئے تھے۔ بعد ازاں احمد حسین خاں بھائیوں نے ان کو ترک نہیں دیا

بلکہ کچھ روپیہ دیکر بغیر کرایا اب صادق حسین غریب اور محتاج ہیں۔ اس تاریخی واقعہ کے بیان سے ہماری غرض یہ ہے کہ جو شخص دور فلک سے منظرِ نادا کے گھر پیدا ہوتا ہے اور بہت کام لیتے تو وہ اگر جاہل ہو اس کا دل بھرتی کے کاموں کی طرف مائل نہیں تھا۔ شرفیوں کی طرح محنت کے فاکوٹی سے زندگی بسر کرتا ہے اس محنت کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی دیگر کے کامیاب ہو کر دراج علی کو پہنچ جاتا ہے اہتمام الدولہ و پچا رائے غریبان کے آدمی تھے ان کا کامیاب مغربی میں سفر تھا گیا یتیم بیکر تعلیم سے محروم ہے بن کو در پر پے سے لیکن تھے غیرت اور بن کی مفت کی لٹی ناگوار ہوئی اس سے چاہا زردوزی کا کلمہ کریں یہ محنت ان کے ہمارا کے کے خلاف تھی پردیس جانے پر مستعد ہوئے نانی کے بھانے سے امید و دل بکر بہت دن تک بادشاہ نے ضرور آدمی کچھ کر محض پرورش کو کھانک کپنے دسترخوان کا نگران لیا اور پھر محمد علی شاہ بادشاہ انتقال کیا تو امجد علی شاہ نے ترقی دیکر دوبار عام کا پیش منست کر دیا ایسی ایسی محنتوں کے آخر دراج علی پر ہو گئے اور اکابرین سلطنت کے زمرہ میں شامل ہو گئے یہ سب اتنے باریک اور انت ان کو حاصل ہوئے ورنہ دراج علی جاہل تھا کسی بے عمدہ کے لائق نہ تھے دانشمندی اور ہمت تمام دراج علی کو اور سب مرادیں پوری ہوئیں اور اس کا کمال بھی ہوا۔ اخیر عمر میں متیق النفس کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ سالن چٹنے لگی بہت سے طبیبوں کا علاج کیا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ فیض آباد میں اپنے دوست نواب شہزادہ الدولہ بہادر جو طبیب مادی مشہور تھے علاج کے واسطے تشریف لے گئے حکیم صاحب نے کوئی دقیقہ علاج کلاٹھا نہ کھا مگر قسمت میں نہ تھی آخر ۲۲ رجب ۱۲۸۳ کو فیض آباد میں انتقال ہوا۔ نعش لکھنؤ لائی گئی اور اندرون رقبہ کر بلا امداد میں خاں میں دفن ہوئے۔

تیار خدوات میر سجاد حسین فلک نے کی ہے

اے دل عجیب واقعہ ہے طرہ و اردات احباب ہوتے جاتے ہیں سب فلو کو روں بیٹھے ہوئے تھے حسد زہر پر جو کل وہ آج پھیل کے پاؤں سوتے ہیں رتد کے درمیاں قائم پھر اقامت گبری ہوئی اک اور صبح بہار عیش جہاں جس سے ہے خزاں رخت جہاں سے کر گیا افسوس وہ پیرس رویگا جس کے غم میں لہو برسوں کا خوش و خوش مزاج خوش اقبال خوش تقریر و صف خوبی سے خاصہ ہے سرگوں تقریر ہلکے و صحت بھلا کساں

رضواں نے دی فلک دم تار سچ ہے ندا

اب چین سے ہیں غلام حیدر حسین خاں

(۱۸۸۶ء)

کان میں پھر بھی اناحق کی صدا آتی ہے!

جناب مولانا حکیم جگر صاحب صدیقی بنوانی،

دل جب آتا ہے کسی پر تو قضا آتی ہے
ہم ہیں مظلوم ہیں صرف دعا آتی ہے
باغ سے نغمہ بلبل کی صدا آتی ہے
ہم وفا کرتے رہے ہم کو وفا آتی ہے
موسم گل میں دھن بن کے گھٹا آتی ہے
ساتھ ساتھ اس کے دبے پاؤں قضا آتی ہے
ان کو صرف آگ کیلجہ میں لگا آتی ہے
درد دل کی یہ تجھے خوب دوا آتی ہے
بتکدہ وہ ہے جہاں خلق خدا آتی ہے
ظلم آتا ہے نہ تم کو نہ جفا آتی ہے
تم بنادو تمہیں تقدیر بنا آتی ہے
کان میں کوچہ جاناں سکدا آتی ہے
بڑھکے منزل اُدھراے آبلہ پا آتی ہے
آپ سے کہتے ہوئے ہم کو حیا آتی ہے
کان میں پھر بھی اناحق کی صدا آتی ہے
ہو گئے خشک مگر بوئے وفا آتی ہے
بتکدے جاتے ہیں تو یادِ خدا آتی ہے

حُسن کو خوب محبت کی دوا آتی ہے
ظلم آتا ہے ستمگر کو جفا آتی ہے
موسم گل میں اگر گھر کے گھٹا آتی ہے
تم جفا کرتے رہے تم کو جفا آتی ہے
رُخ پہ بھرائے ہوئے زلفِ دُعا آتی ہے
قال آتا ہے جو بسمل کی عیادت کے لئے
کیا غرض ہے جو لگی دل کی بھجائیں آکر
آفریں کیوں نہواؤ زہر پلانے والے
کعبے میں شیخِ حرم ہے فقط اللہ کا نام
شکوہ جو رستم لوگ غلط کرتے ہیں
میری بگڑی ہوئی قسمت کا سنو رہا ہے حال
جو ہوا عشق میں گمراہ اسے راہ ملی،
پاؤں تو راہِ محبت میں جدھر رکھتا ہے
کوئی ایسی بھی تمنا ہے ہمارے دل میں
اب نہ منصور نہ وہ دارورسن باقی ہے
پھول تربت کے ذرا آپ اٹھا کر سونگھیں
شان حق حُسن بُتساں میں نظر آتی ہے جگر

ضمیمہ کی آواز

از جناب چوہدری عبدالوہاب صاحب بی بی سی

بہت دنوں سے وہ بیمار تھا۔ شام کے وقت اس کا دوست بیڈن اس کی عیادت کے لئے آیا۔ دونوں آگ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کی بیماری زیادہ تشویشناک تھی اس لئے وہ مختلف مضمون پر گفتگو کر رہے تھے۔ بیڈن نے پرستہ انداز سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”بیڈن! میں بالکل تنہا اور افسردہ خاطر ہوں۔ ایسی تنہائی کا انداز تم خواب و خیال میں بھی نہیں کر سکتے جس جوں عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہوں میری تنہائی اور شہرِ مردگی میں اماندہ ہو رہا ہے۔ آج اتفاقیہ گذشتہ واقعہ کی یاد میرے دل میں تازہ ہو گئی ہے۔ بیس سال پہلے میں نے ایک خاتون سے وعدہ کیا تھا مگر ایفانہ کر سکا۔ الفاظ میرے دماغ میں گھوم رہے ہیں اور میرے دل کو نوچتے ہیں۔ میں دنیاوی کاروبار میں اپنے لفظوں کی پاسداری کرتا ہوں لوگ مجھے وعدے کا پورا اور سچا خیال کرتے ہیں۔ تم کو معلوم ہو گا کہ رات کے وقت جب تم سو رہے ہو تو کسی کواڑ یا کھڑکی کے کھلا رہ جانے کا خیال کس قدر بیہوشی کا موجب ہوتا ہے۔ یاد ان کے وقت خط کے جواب نہ دینے کی یاد کس قدر بقیار کرتی ہے۔ اسی طرح بسا اوقات اس وعدہ کی یاد مجھے یوں پورا ذکر رکھا مجھے تنگ کرتی ہے۔ مگر آج اس کا خیال مجھے رنج و غم سے گھلے جا رہا ہے۔“

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی اور وہ بدستور باتوں میں محو تھے۔ بیڈن کی نظریں آگ پر جمی ہوئی تھیں مگر تصویر میں مغربی یورپ کے ایک گاؤں کا نقشہ پھر رہا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام کو پھر جاری کرتے ہوئے کہا۔

”میں اس حد تک سنی کے واقعہ کو کبھی فراموش نہ کر سکا۔ جب میں دنیا کے کاروبار میں تندہی سے مصروف تھا تو اس تنگ و دو کی حالت میں بھی آپ کی دھندلی سی یاد میرے دل میں باقی تھی۔ آج ایک واقعہ کی قانونی لپٹ

بیڈن لندن کے ایک خاموش کوپے میں بارہ نمبر کی عمارت میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے کئی سال سے ایک خوبصورت کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اس کی شکل و صورت سے اہل کوچہ مانوس اور آشنا ہو گئے تھے۔ اس کی عمر تقریباً پچاس برس سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ منازلِ بیات کی آخری منزل طے کر رہا تھا۔ عادات و خصائل میں باقاعدہ ہونے کے علاوہ تقسیم اوقات کا بھی پابند تھا۔

کوچے کے سرے پر پہنچ کر اکثر وہ دائیں جانب مڑ کر بانٹ سٹریٹ کی راہ لیتا اور شام کے قریب کلب میں جا پہنچتا۔ مقررہ وقت پر کلب سے اسی راستے واپس لوٹتا۔ اکثر اوقات پیدل آتا مگر جب کبھی کسی دعوت یا مجلس میں شریک ہونا ہوتا تو راستہ میں کوئی ٹانگہ پکڑ لیتا۔ لوگ اسے فارغ البال اور خوشحال تصور کرتے تھے۔ مگر اس کی ظاہر اس وجہ اس کے برعکس تھی کہوارا ہونے کے باعث وہ کرایہ داری کی پُر آسائش طرز زندگی میں خوش و خرم تھا اس لئے اس نے بہت سا ساز و سامان خرید کر فراہم کر لیا تھا۔ اس کی واقعیت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کے روشناسوں میں سے کسی نے بھی اس کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی۔ اس کی زندگی اور طرز عمل کسی طرح کی رازداری کا محتاج نہ تھا اور نہ دنیا میں انتشار ہونے کا مستحق تھا۔ وہ سادہ فطرت اور سادہ مزاج تھا۔ اس کی پیدائش دیہاتی خطہ میں ہوئی تھی اور وہ ایکس (X) اس کا جنم بوم تھا لندن میں وہ بینک کی ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا۔ وقت کے ساتھ وہ ذمہ دار عہدہ پر پہنچ گیا تھا۔ باپ کی موت پر جس نے کافی روپیہ جمع کر رکھا تھا وہ ایک متحول آمدنی کا مالک ہو گیا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے دنیاوی کاروبار سے قبل از وقت کنارہ کشی کر لی۔

نے جو اسی نوعیت کا تھا پھر اس کی بد میرے دل میں موجزن کر دی ہے مختصر لفظوں میں یہ واقعہ تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں جب اس سے آگاہ ہو جائے تو تم میرے ذی میں ہونے کا ٹھکانہ اڑاؤ گے۔

میں اپنی عمر کے اکیسویں سال میں تھا تو ماؤں بڑو کو جہاں میں نے جنم لیا تھا خیر باد کہا۔ اس گاؤں میں ایک لڑکی سے جو میری ہم عمر تھی میں نے شادی کے عہد و پیمان کئے تھے۔ اُن میں نے اس وعدہ کو پورا نہ کیا، اب میں ناکند ہوا اور یہ ایک پرانی داستان ہو گئی ہے۔

”ماں بڑو کو الوداع کہتے وقت میرے دل میں خیال آیا کہ میں کس اچھے پن سے ایک بڑی الجھن سے نکل گیا ہوں۔ مگر بعد ازاں اس وعدہ شکنی کا خیال بہت دفعہ میرے دل کو ایک ٹھیس سی لگا تا رہا۔ میری ضمیر مجھے لعنت ملا مت کرتی تھی کہ کیوں میں دیانت دار نہ رہا میرا دل ٹوٹ چکا تھا اور میں اپنے آپ کو دشت کے جیسے بکے سوا اور کچھ نہ خیال کرتا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے منہ لفظوں میں وعدہ کیا اور بعد ازاں اس سے آنکھیں اس سرد دھری سے پھیر کر جیسے یہ بھی اعلیٰ خلعت کا جزو ہوتا ہے۔ آہ! یہ کینگی تھی جو میں گر گذرا۔ لڑکی نے ایک بچہ جنا اور اس کی پرورش کی زحمت میں مبتلا ہو گئی۔ میں اس کی مالی مدد کچھ عرصہ تک کرتا رہا۔ مگر اس نے وہ جگہ جلد چھوڑ دی یہ سوزنمانی ہمیشہ میرے دل میں شعلہ زن رہتا ہے۔ کئی سال گزر گئے ہیں اور یہ واقعہ بہت پُرانا ہو گیا؟ اب وہ بوڑھی عورت ہو گئی۔ مگر پھر بھی یہ واقعہ دل کو کھائے جا رہا ہے۔“

بیدن نے کہا: میں سب کچھ سمجھتا ہوں اور ان تمام باتوں کا انحصار انسان کی فطرت اور خلعت پر ہے۔ ہزاروں شخصوں کو ایسے واقعات پیش آئے اور وہ بھول گئے۔ اگر تم بھی شادی کر لیتے اور بچوں کے باپ بھوتے تو یہ واقعہ تمہیں خواب کی طرح یاد رہتا۔ کیا اس نے شادی کی تھی؟

”میرے خیال میں اس نے کسی سے شادی نہیں کی تھی اس نے ماؤں بڑو کو چھوڑ کر اکسن بری میں اپنا نام بدل کر جا رہی۔ وہاں اسے کوئی شخص نہ جانتا تھا کہ وہ تین سال ہوئے کہیں اکسن بری میں جا رہا تھا مجھے پتہ چلا کہ اس نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے اور فن موسیقی کی محکمہ ہے۔ بس میں اس کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں۔ اس کشیدگی کے بعد میں نے کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور نہ ایسی کوشش کی۔“

”ڈاکٹر! کیا وہ بچہ زندہ ہے؟“

”کچھ عرصہ ہوا وہ زندہ تھی، اس وقت وہ ایک محسوس لڑکی تھی۔ اس کے متعلق اب مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اب بیاہی گئی ہوگی؟“

”ڈاکٹر! کیا اس کی والدہ، خوبصورت شریف خاتون تھی؟“

”آہ، وہ خاموش اطبع اور ذی ہوش عورت تھی۔ حسن و جمال میں وہ اوسط درجہ کی تھی جب وہ مجھ سے شناسا ہوئی اس وقت وہ میری حیثیت کی لڑکی نہ تھی۔ کسی گانے بجانے کی دکان میں وہ ملازم تھی۔ میرا باپ اس وقت باعزت وکیل تھا۔ اس سے شادی کرنا میری بے غرقی اور تنگدستی تھی۔“

”ڈاکٹر! میری رائے میں بیس سال کے بعد اس معاملے کے سلجھانے کی کوشش کرنا بعد از وقت ہے۔ وقت کے ساتھ یہ خود بخود بہتر ہو چکا ہے۔ اگر وہ حیات میں تو ان کے لئے کچھ روپیہ وقف کر دو۔“

”میرے پاس آماروپیہ نہیں ہے کہ ان کے لئے کچھ وقف کر سکوں مگر میرے کئی رشتہ دار تنگ دست اور غفلت کمال ہیں اور مالی مدد کے وہ زیادہ مستحق ہیں۔ اگر مجھ میں کثیر رقم وقف کرنے کا مقدور بھی ہوتا تو پھر بھی یہ معاملہ اس طرح طے نہ ہو سکتا۔ میں نے اس سے دولت سے الامال کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس کو کہا تھا کہ شاید ہم بالکل تلاش اور غفلت ہونے کے طرفہ بائیمہ میری رفیق حیات بیگی۔“

ڈاکٹر نے زحمت ہوتے ہوئے کہا: ”بھورن! اسے ڈونڈہ کر شادی کر لو۔“

”آہ! بیدن تم میرا کھلا ہوا ٹھکانہ اڑا رہے ہو۔ مجھے شادی کی بالکل خواہش نہیں ہے۔ میں اسی طرح زندگی گزار دینے پر راضی ہوں۔ ابھی تک میں اپنے اہل و عیال اور خفاں میں کنوا رہا ہوں۔ باوجودیکہ میرے دل میں اس کی عزت باقی ہے۔ مگر میرا دل اس کی محبت سے سحر ہے۔ میری فطرت میں میری دلعزیزی کے وہ شریف خاتون کی حیثیت رکھتی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کے دکھ درد میں اس کا مونس و غمگسار بنوں کیونکہ یہ تمام میری ناقابت اندیشی کا انجام ہے۔ میں بہت عرصے خیال کر رہا ہوں کہ اس نفرت انگیز لغزش کی تلافی کروں اور اپنی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کر لوں۔“

ڈاکٹر: اس کا عظیم میں خوش قسمتی تمہاری پاسبان ہو غریب تم مصیبت کوکھ میری اس اندرونی تحریک کو آزمائش کی کھائی کے سپرد دیکھ دو گے۔ بیس سال کا طویل عرصہ خاموشی میں گزر گیا ہے۔ اب تم اسے زیادہ اہمیت دو میں تمہیں اس کے بھلا دینے کی تلقین کر دوں گا۔“

اپنے پیشے کا پروڈیگنڈا بڑے سادے طریقے سے کرتی تھیں۔ جس کمرہ میں لڑکیوں کو لگنے بجانے کے متعلق سبق دیے جاتے تھے اور عملی طور پر لگانے کی مشق سرائی جاتی تھی اس کی کھڑکی قصد اکھلی رکھی جاتی تھی تاکہ گزرنے والے باسانی ان کے نیتوں سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ مسز فرنیٹک لینڈ پیاں بھی کرایہ پر دیا کرتی تھی اور وہ اس کمپنی کی ہیڈنٹ تھی۔ اس کی آمدنی کا زیادہ انحصار انہیں دو باتوں پر تھا۔

ان حالات کا انکشاف بلورن کے لئے بہت مسرت انگیز تھا۔ ان کی حالت اس کی امید اور توقع سے بدرجہا بہتر تھی۔ ان کو دیکھنے کا اسے بہت زیادہ اشتیاق تھا۔ انتظار کی صبر آزما گھڑیاں اسے زیادہ بیکانی پڑیں۔ یکایک مسز فرنیٹک لینڈ چھتری لئے نمودار ہوئی اور دروازے پر آکر رک گئی۔ اس کا جسم تپتا تھا۔ گردہ کمزور اور ضعیف نہ تھی۔ اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ جس نے مسز فرنیٹک میں مجھے سحر کر رکھا تھا آج باطل تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ اور فکر کے سنسار ہویدائے۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئی تھی جو شاید بیوگی کی علامت تھی۔ بعد ازاں اس کی لڑکی بھی ادھر پہنچی جو بالکل اپنی والدہ سے ملتی جلتی تھی۔

اس کے دل میں ملاقات کرنے کا مصمم ارادہ جاگزیں ہو گیا۔ لگے دن اس نے اپنا ملاقاتی کارڈ بھیجا۔ چونکہ وہ دن بھر مصروف رہتی تھی اس لئے اس نے ملاقات کے لئے شام کا وقت مقرر کیا۔ شام کے وقت وہ ان کے مکان پر جا پہنچی۔ مسز فرنیٹک لینڈ نے اس کو گانے بجانے کے بڑے کمرے میں بٹھایا اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد ان کی ملاقات تلخات مروجہ سے رنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ آہ وہ مظلوم عورت عمدہ لباس پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے رعب اور دبدبہ اور سخت مزاجی نکلتی تھی۔ یہ ملاقات خوشی کی جھلک سے بالکل خالی معلوم ہوتی تھی۔ میں ال کی خاموشی کے بعد بے اعتنائی اور بے اتفاقی کے سائے اسے اور کیا امید ہو سکتی تھی۔

”مسٹر بلورن کیا حال ہے۔ ادھر کیسے کل آئے؟“ یہ اس کی رسمی گفتگو کا پہلا فقرہ تھا۔ انہوں نے میں تھیں۔ ملاقات کے کمرے میں نہیں لیجا سکتی کیونکہ وہاں میری فرانسس اور اس کا دوست پیارو محبت کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”آہ تمہاری لڑکی۔۔۔ اور میری۔“

”اے ہاں کہتے ہوئے اس نے تیزی سے کہا کہ۔“ اس کے متعلق تم جتنی

بلورن اپنے ضمیر کی گونجتی ہوئی آواز کو جو کئی مہینوں سے اس کے دل میں، موجزن تھی روحانی خیال کرتا تھا۔ وہ اس آواز کو کسی اصول پر محمول کرتا تھا۔ ہر وقت وہ ڈاکٹر کی نصیحت اور اندرونی دھڑکن کے سودا ذریعہ کے متعلق گہری فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ یہ جذبات اس پر جلدی اثر پذیر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اسے صحت ہو گئی۔ اپنے ضمیر کی آواز کو کسی اور مہستی کے راز میں سے دینے کی جگہ اسے مضمل کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز لگس پڑتا تھا۔ دماغ لکٹی کے پاگنڈ خیالات نے جو اسے تنہائی میں عموماً پریشان کرتے رہتے تھے بالآخر اسے مغلوب کر لیا۔ بیماری کے چار مہینے بعد وہ موسم سدا کی خوشگوار صبح کو، کمین بری کی طرف روانہ ہو گیا۔ روانگی سے ایک دو روز پیشتر اس نے ڈاکٹر کی سرنامہ جات کی کتاب سے علوم کیا کہ وہ عورت جس کو روپوش ہونے میں سال کا عرصہ گزرنے لگا ہے اپنا نام تبدیل کر کے ایکس بری میں آگامت پذیر ہے۔ اس نے وہاں بیوہ کی حیثیت میں رہائش اختیار کی ہے۔ اس کی ظاہری حالت میں ابھی تک خاص فرق نہیں آتا ہے۔ اس کی لڑکی بھی زندہ تھی اور اسی کے ساتھ رہتی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے سرنامہ جات میں اس کا پتہ درج تھا۔ مسز لیونور فرنیٹک لینڈ اینڈ مس فرنیٹک لینڈ نے ملتان فن موسیقی، ایکس بری۔“

بلورن دوپہر کے وقت ایکس بری پہنچا۔ شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے اس نے ان کا مکان دریافت کیا۔ مکان کے دروازے پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔ مگر تحقیق کے بغیر مکان میں داخل ہونے سے گھبراتا تھا۔ سامنے کی کھلونوں کی دوکان پر وہ بیٹھ گیا جس کے عین مقابل ان کا رقص سکھانے کا کمرہ تھا اس اثنا میں اس نے ادھر ادھر کی باتیں سننا کہ ان کے چال چلن کے متعلق دریافت کیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ مسز فرنیٹک لینڈ اور اس کی لڑکی کے متعلق لوگوں کے خیالات خوشگوار ہیں اور شہرت و نیک نامی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ باوجودیکہ مسز فرنیٹک لینڈ کا زلیخہ معاش رقص و سرود سے وابستہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ سنجیدہ عورت تھی خیراتی کاموں میں وہ مدد کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ مذہبی مجلسوں میں گانے بجانے کا پارٹ وہ بخوشی ادا کرتی۔ غرض شہر کی مذہبی، قومی اور دیگر قسم کی مجالس میں وہ ضرور شرکت کرتی۔ اس کی لڑکی شہر کی گانے بجانے والی عورتوں کے گروہ کی سرگزشت تھی۔ کرسمس اور ایٹر کے موقع پر وہ کلیساؤں کی اپنے سر پہ گیتوں سے رونق پڑھاتی اور آلات موسیقی کے استعمال میں ماہر ہونے کا ثبوت دیتی۔ دونوں شہر میں نیک نام مشہور تھیں۔

”تو کم کرو گے اتنا ہی بہتر ہے۔ اب تم مجھے بوجہ تصور کرو۔“

ملبورن:۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

مسٹر فرینک لینڈ کے اندازِ تخم میں اس قدر دھکے بن اور بے اتفاقی کی ملک پائی جاتی تھی کہ وہ جھجک کر رہ گیا۔ وطن و شہنشاہ اور کچھ کاہرست منظر جو رت تخیل نے کئی بار اس کے سامنے پیش کیا تھا دینے حقیقت میں غائب تھا اس لئے وہ جھٹ اپنے مدعا کی طرف پھرا اور کہا:۔ ”یونورا! کیا تم بالکل آزاد ہو؟ میرا مطلب شادی اور وعدہ...“

مسٹر فرینک لینڈ:۔ ہاں، بالکل آزاد ہوں۔ مگر حیرانی اس کے چہرے سے پک رہی تھی۔ پھر وہ حرفِ مطلب زبان پر لایا:۔ ”تیس سال ہوئے میں نے تم سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اب ایسے وعدے کے حاضر ہوا ہوں، آہ!... لا پرواہی...“

یہ گفتگو اس کی مزید حیرت کا باعث ہوئی۔ بہت افسوسناک لمحہ میں اس نے اپنی ناراضگی ظاہر کی اور کہا اب میں زندگی کے آخری مراحل طے کر رہی ہوں اس عمر میں میرا ایسے سوال پر غور کرنا نہایت نامناسب ہے اس سے میرے حالات بگڑ جائیں گے کا خطرہ ہے۔ موجودہ آمدنی میں میری ضروریات بآسانی پٹت باقی ہیں اور مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے شادی میرے لئے بالکل عبث اور بے حقیقت ہے۔ کیا چیز تھیں اس طرف راغب کر رہی ہے؟

”آہ! ہمیر کی آواز مجھے کوستی ہے۔ نفسانی خواہشات کو اس سے کوئی سروکار نہیں اور مجھے شادی کی خواہش نہیں ہے۔ یہ ہمیر کی صدا اور ایسے وعدہ کا معاملہ ہے۔ یہ اندوہی دھڑکن مجھے خون کی حد تک لے گئی ہے۔ تمہ۔ وعدہ کیا اور اس سے منحرف ہوا۔ افسوس! یہ شہر مناک فعل مجھ سے سرزد ہوا تھا اس کی تلافی کرنا میرا فرض ہے۔“

”مسٹر لمبورن تمہارا خیال قابلِ تعریف ہے۔ مگر میری موجودہ حالت بھی ذرا نظر فائر کی محتاج ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ مجھ میں شادی کا شوق یا ن مٹ چکا ہے اس لئے میں اپنی زندگی کی پرسکون طرز معاشرت کو نئے سانچے میں کیونکر ڈالوں اس تغیر میں تمہارے ضمیر کے لئے راحت ہے مگر اس میں میرے لئے بہت بڑا انقلاب ہے۔ میں اس شہر کے باعزت لوگوں میں شمار ہوتی ہوں اور اس عزت کو میں نے بڑی جانفشانی اور تندہی سے حاصل کیا ہے اس لئے یہ تبدیلی میرے لئے بہت ناخوشگوار ہوگی میری پیاری فرانسس ایسے نوجوان سے رجم درام

پیدا کر رہی ہے جو عنقریب بہت اچھا خاوند ہوگا۔ مجھے اس کی فکر بھی نہیں ہے۔“

ملبورن:۔ کیا وہ میرے تعلق کچھ جانتی ہے؟

”خدا بچائے، نہیں، بالکل نہیں، اس کے خیال میں اس کا باپ مدت مدید سے سپردِ خاک ہو چکا ہے۔“

یادیں کے عالم میں وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا اور کہا:۔ ”میری آرزو جانتے ہو اس کے پورا کرنے سے کوئی غیر معمولی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ کیا تم اس پر دوبارہ غور نہیں کرو گی؟ آؤ! اس لڑکی کی یاد میں ہم اپنے پرانے تعلقات کو از سر نو تازہ کر لیں۔“

ملبورن نے اکثر اوقات اس سے ملاقات کی اور ہر دو فراس پر اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ مسٹر فرینک لینڈ نے اپنے پرانے دوست کا پیغام اپنی لڑکی کے بھی گوشِ نوا کیا۔ اس نے بڑی نفرت سے اس کی مخالفت کی۔ مس فرینک لینڈ اپنی پہلی ملاقات میں اسے بڑی بے مروتی سے پیش آئی۔ اس کو کامیابی و شہرِ نظر آئے لگی اس پر یادیں اور سرانگی چھا رہی تھی مسٹر فرینک لینڈ اپنی ہٹ کی کچی اور پوری معلوم ہوتی تھیں اپنے خیال پر وہ بدستور قائم تھی۔ اس نے کہا کہ اتنے عرصہ کے بعد شادی کی درخواست اور صرف ضمیر کی خاطر بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہے ایسی جیلہ سازی سے کام نہیں چلیگا۔

ایک روز وہ کھڑکی میں کھڑے آبی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک نوجوان جو وضع قطع سے محروم معلوم ہوتا تھا وارد ہوا۔ یہ فرانسس کا دوست تھا۔ مسٹر فرینک لینڈ نے کہا وہ گھر پر نہیں ہے اس سے اس کا پتہ پوچھ کر وہ اس کی تلاش میں چلے گیا۔ مسٹر فرینک لینڈ نے بتایا کہ یہ ناسٹ:۔ درسی ہے اور یہاں سے پچاس میل کے فاصلہ پر رہتا ہے۔ فرانسس اور اس کے تعلقات مثل سابق پر جوش نہیں رہے۔ اس کے چند دوستوں نے ہمارے پیشہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے گو یہ ان کی پرداہ نہیں کرتا مگر اب اس پر کچھ اثر ہو رہا ہے۔ لمبورن نے کہا:۔ ”ہماری شادی اس وقت کو رنج کر دیگی۔ کیونکہ شادی کے بعد تم اس پیشہ کو ترک کر دو گی۔“

اس دلیل نے اس پر اثر کیا۔ یہ تجویز مس فرینک لینڈ کے کالوں تک بھی پہنچی اور اس نے بھی اس کے ساتھ اتفاق کیا۔ کچھ مدت کے بعد قریب کے گرجا میں دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور وہ لندن میں رہنے لگے۔

لمبورن نے دوبارہ لندن میں رہائش اختیار کر لی۔ اس دفعہ اس کا مکان کسی اور کپے میں تھا۔ فرانسس کا منیجر مسٹر پریول کوپ بھی اس تبدیلی میں بہت خوش تھا۔ کاروبار کے لئے وہ لندن میں بہت دفعہ آتا اور ان سے ملنے فرم آتا۔ لندن کی نئی بود و باش کی خوشی دیر تک نہ رہی کیونکہ اکیس بری ایسی چھوٹی جگہ بہت مشہور تھی مگر لندن میں وہ بالکل نووارد تھیں اور اتنے بڑے پردہ فنی شہر میں مقبول عام ہونا بہت مشکل تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے ایام زندگی بہت بے لطف ہو رہے تھے لندن میں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ بھا بھاگتا تھا جبکہ تمام خاندان ہفتہ عشرہ کے لئے جزیرہ وائٹ میں سیر و تفریح کے لئے چلا گیا۔ پریول کوپ بھی وہاں پہنچا۔ اس کا خاندان کئے فرد سے یعنی لمبورن سے تعارف کرایا گیا۔ ان کے پاس وہ دوتین دن کے لئے ٹھہرا۔ آخری دن جب اسے ان لوگوں سے رخصت ہونا تھا وہ کرایہ کے بھرا پر سیر کے لئے نکلی۔ ابھی دور نہیں گئے تھے کہ مسٹر کوپ کے سولے سب کو ٹھنڈی ہوا ناموافق معلوم ہونے لگی۔ اس کی خاطر چھوٹا رکھتے ہوئے وہ تمام خاموش بیٹھے رہے۔ ان کو بیکل سادیکھ کر اس نے خود بخود واپس ہونے کے لئے راستہ تبدیل کیا۔ واپسی کے وقت وہ بالکل چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے اور بھرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فرانسس، لمبورن کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اور مسٹر کوپ اس کے بالمقابل بیٹھا ہوا تھا۔ اس حالت میں اس کو ان کے درمیان مشابہت کی گہری جھلک نظر آئی جس سے وہ حیرت کے عالم میں غرق ہو گیا۔ سکراہٹ اور شاشت اس کے چہرے سے غائب ہو گئی ساحل پر پہنچکر وہ چند لمحوں تک بے خود و وارفتہ ہو کر بیٹھا رہا جب وہ گھر کو روانہ ہوئے تو ان کے خط و خال اپنی اصلی حالت پر آگئے اور مشابہت بالکل دور ہو گئی۔ بحری خوف و ڈر کا اثر چہرہ پر بہت زیادہ ہوتا ہے اور عام طور پر نقش و نگار کی خاندانی مشابہت جو آنکھ کو ظاہر دکھائی نہیں دیتی ایسے وقتوں پر نمایاں طور سے نظر آنے لگتی ہے۔ اور اس لمحہ کے گزرنے کے بعد انسان اپنی اصلی حالت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کی ظاہری حالت تبدیل کرنے میں عمر و صنف کا بہت زیادہ دخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سیر کے دوران میں درمیانی پردہ راز پنہاں کو آشکارا کرنے کے لئے اٹھ گیا اور عارضی طور پر ان کی حقیقی مشابہت کو ظاہر کر دکھایا۔ شام کے وقت مسٹر کوپ نے کہا۔

فرانسس کیا تھا راستہ بابت تھاری امی کا میرہ یا پھر ابھائی ہے؟ فرانسس د۔ وہ میری اماں سے سولے پرانا دوست ہونے کے اور کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ تمہارے دماغ میں ایسے دھماکے کیوں جاگزیں ہو رہے ہیں؟ وہ بالکل خاموش رہا اگلے دن وہ ان سے رخصت ہو گیا۔ مسٹر کوپ راستہ باز فوجان تھا۔ گھر پہنچکر وہ مسز فرنیٹک لینڈ کی گذشتہ زندگی کی سوچ میں پڑ گیا۔ کبھی فوت اور خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا بحری سیر کے متعلق تخیل رہتا اور ان کے نقش و نگار کی مشابہت پر دماغ سوزی کرتا۔ وہ سوچتا تھا کہ مسز فرنیٹک لینڈ کے گذشتہ حالات پر اسرار ہیں اور میں مس فرانسس کی ظاہری شکل و صورت پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔ مزید حالات دریافت کئے بغیر شادی کرنا سراسر نادانی ہے۔ ایک طرف فرانسس کا خیال دامنگیر تھا اور دوسری طرف اپنی عزت اور نیکنامی کا سوال تھا۔ آخر کئی دن کی سوچ بچا کے بعد اس نے سر آہ بھرتے ہوئے فرانسس کے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا۔ مس فرانسس نے اس سوال کا ذکر اپنی والدہ کیا۔ مسز فرنیٹک نے پر اس بات کا گہرا اثر ہوا جو اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ فرانسس نے کہا میرے خیال میں اس میں کوئی خاص بات قابل فکر نہیں ہے۔ کیا اس نے خط و کتابت کا سلسلہ ہی لئے منقطع کر لیا ہے۔ اس کی والدہ کچھ مشوش سی ہو کر ہم گئی جس سے فرانسس تنگ و شبہ کے عالم میں پڑ گئی۔ اسی رات اس نے اپنے والدین کو کھانا پٹی اور تنہا بستی کی گفتگو کرتے سنا افسوس ان کی باہمی الفت اور اس و اماں کے دن ختم ہو گئے تھے اور شکر رنجی اور جھگڑے پھوٹ پڑے تھے۔ مسز لمبورن خشکین نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور کہتی تھی۔ آہ تم نے دوبارہ میری زندگی کو تلخ کر دیا۔ تم نے منیر کی آواز سے مجھے بیان تک حیران کر دیا کہ مجھے تمہاری درخواست باصرار کو منظور کرتے بنی۔ اکیس بری میں ہم دونوں آرام و راحت کے ایام بسر کر رہے تھے۔ میری صرف یہی آرزو تھی کہ مس فرانسس اس خواہش پر فوجان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائے افسوس تمہاری بے جا مداخلت سے تمام معاملے دگرگوں صورت اختیار کر گئے۔ آہ ہم کیوں میری امن و سکون کی دنیا میں رخنہ انداز ہوئے اور میری سخت محنت سے حاصل کی ہوئی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور رقت انگیز لہجہ میں رونے لگی۔ لمبورن پشیمانی کی حالت میں

تصویر کی طرح خاموش کھڑا تھا۔
علی الصبح مسز بلورن اپنی لڑکی کی حسب خواہش مسٹر کوپکے پاس گئی،
فرانسس بہت متفکر تھی اور والدہ کا انتظار بڑی بیقراری سے کر رہی تھی گاڑی
سے اترتے ہی اس نے خاموشی کی وجہ دریافت کی۔ مسز بلورن صبح جب
تباہ سے گھبراتی تھی مگر طنزاً سمجھا دیا کہ مسٹر کوپکے کی کشیدگی کی وجہ اس کی
بلورن سے شادی کرنا ہے۔ فرانسس نے تمام حالات کو سوچا اور سمجھا پھر والدہ
کہا کہ کیا اس کا شک درست ہے؟ اس نے خجالت اور شرمندگی سے منہ پھینکی
کر لی اور کہا: ہاں درست ہے!

اس کے جسم پر بالوسی کی لہر دوڑ گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی۔ یہ کیسے ہو
تھا کہ صبح انصاف پادری مجھے شادی کرتا جبکہ میری پیدائش ہی مشتبہ ہے
اس نے حیرت اور افسردگی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر اپنے غمگین جذبات
پر قابو نہ پاسکی وہ تھا اس کی پٹیم رعنا سے سیلاب انگ باری ہو گیا۔ مسز بلورن
کے سامنے وہ خاموش رہی مگر جب وہ کرسی پر اڑ گئی لگا تو مسز بلورن نے
غیظ و غضب کے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ مسز فرانسس کہتی تھی کہ یہ بھوت پریت

کی طرح ہماری شادی کی تقریب میں وارد ہوا ہے اور ہمارے تمام ارادوں کو
ماس و مسرت میں بدل دیلے۔ آہ! میری لہجی، یہ سب کچھ میں نے اس کی
ضمیر کی خاطر کیا۔ اس میں ہماری تباہی اور بربادی مصمم تھی۔ ایکسٹری بڑی کو جلا
ہم باعزت زندگی بسر کر رہی تھیں خیر باد کہی۔ آف! ان دنوں کی یاد اجلے
کے بعد تاریکی ضروری ہے۔ ہماری زندگیاں شمع کی طرح بھبک کر گئی ہوئی
بلورن غفلت کی نیند نہیں سو رہا تھا۔ اس سمرزنش اور نکتہ چینی کو
بخوبی سن رہا تھا مگر اس نے آف ٹنگ نہ کی اس نے کلب میں جانا شروع
کر دیا۔ گھر کے ریج آمیز خیالات بھوت کے سائے کی طرح اسے ہر جگہ گھیرے
ہوئے تھے اور اسے کہیں چین نہ لینے دیتے تھے اب اس کی یہ حالت ہوئی تھی
کہ کلب میں بھی یکسوئی قلب سے اخبار نہ پڑھ سکتا تھا۔

مسٹر کوپکے بدستوران سے کنارہ کش تھا۔ گو بلورن نے اپنی لڑکی
اور عدوت کی طنز آمیز گفتگو بڑی خاموشی سے برداشت کی مگر وہ غور و فکر میں نسبتاً
زیادہ مستغرق رہنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نیا خیال اس کے دماغ میں
نشو و نما پا رہا ہے۔ ان کی چیخ و پکار سے تنگ آکر اس نے لندن کو چھوڑ دینے

بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوا دوگرے کا بال امرت!



یہ دوا بچوں کے بال امرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے خوشی سے پیتے ہیں بچوں کی کھانسی، بخار، بخمی، سچیش وغیرہ امراض جو
اکثر نا طاقتی کے سبب سے پیدا ہو جاتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور بچوں کا بدن تھوڑے عرصہ میں گوشت سر
بھر کر فربہ اور وزن دار بنتا ہے۔

لاہور ایجنٹ

بھگت رام پوری سوتر منڈی، لاہور

ہو جائے۔ اخیر میں خطان سطور کے ساتھ بند کیا گیا تھا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرض کی کوتاہی سے کئی ایسی لغزشیں ہو جاتی ہیں بعد ازاں جن کی تکمیل اس وجہ سے کو نہیں مٹا سکتی۔ ہمارے گزرے ہوئے برسے اعمال تغیر و تبدل کے انتظار میں بالکل ساکن اور الگ تھلک نہیں رہتے بلکہ وہ متحرک پودے کی طرح پھیلنے ہیں اور اپنی جڑیں زمین میں اس طرح گاڑ دیتے ہیں کہ ان پر اہلی پودے کے کاٹ ڈالنے کا کوئی بُرا اثر نہیں ہوتا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو دھونڈنے میں میری غلطی تھی۔ ایسے معاملات کو سمجھانے میں شادی کوئی چارہ نہیں ہے۔ ابدی مغافرت ہم دونوں کیلئے بہترین سید ہے۔ تم مجھے دھونڈنے کی ناکام کوشش مت کرنا۔ میرے خیال میں ہمارا معاملہ زیادہ نکتہ انگیز ہوگا۔

اس کے بعد مہجورن روپوش ہو گیا۔ نام تبدیل کر کے اس نے برلن میں رہائش اختیار کر لی اور اب سر مہجورن کے سوا اور کوئی پہچان نہیں سکتا تھا، موسم گرما کی دوپہر کو وہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ سر کوپ اور مس فرانس کی شادی کا اعلان اس کی نظر سے گذرا اب وہ سر کوپ ہو چکی تھی۔ یہ پڑھ کر اسے بہت خوش ہوئی اور خدا کا شکر بجالایا۔ یہ عارضی تسکین قلب اہلی خوشی سے بہت دور تھی اس سے پیشتر اس کے ضمیر کی آواز اسے بچپن کرتی تھی مگر اب وہ ہمیشہ کے لئے اپنے روشناسوں سے کنارہ کش ہو گیا ہے۔ یہ خیال اس پر منوں بوجھ ڈال رہا تھا۔ اپنی چھوٹی خدمت پر کڑھتا تھا۔ غم و اندوہ سے آزاد ہونے کیلئے وہ شراب کا مادی ہو گیا۔ شراب کے نشہ میں ہر وقت مجھیر رہتا مگر اس حالت میں بھی وہ اپنی بیوی اور لڑکی کے لئے بے ضرر رہتا۔ کیونکہ اس کی زبان پچھلے واقعات پر بالکل بند تھی۔

(ترجمہ۔ تھامس ہاڈی از عبد الوہاب ظاں صاحب بی۔ ایس۔ سی)

کا ارادہ کر لیا۔ ایک روز اس نے اپنا خیال ان پر ظاہر کیا اور وہ رضامند ہو گئے اس نے ایک پُرانا گھر جو سر کوپ کی جائے رہائش سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا کرایہ پر لے لیا۔ پرانے وقتوں میں یہ مکان کسی لارڈ کی ملکیت تھی اس لئے یہ مکان بہت خوشگوار اور فراخ تھا۔ سر مہجورن نے کہا۔ کسی دن سر کوپ تم سے میرے گزشتہ واقعات کے متعلق استفسار کرے گا۔ اگر تم نے اس کو صاف صاف کہہ سنایا تو یہ فرانسس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیگا۔ اس لئے میں تم کو اس امر سے آگاہ کرتی ہوں۔

مس فرانسس دن بدن ریخ و غم سے کمزور اور لاغر ہوتی جاتی تھی۔ اور مہجورن سے بہت ملتی جلتی کھائی دے ہی تھی۔ آہ، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونگی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

مہجورن نے اس پر زیادہ بحث نہ کی اور کہا اب سے میں کوئی اکٹھا نہیں دیکھے گا۔ نقل مکان از بس ضروری ہے اس نے بیوی اور لڑکی کو اکٹھا ہونے میں بھیج دیا اور اپنے گھر کو فروخت کر دیا۔ گھر کے سامان کو نئے مکان میں منتقل کر دیا جب حاضر خواہ انتظام ہو گیا تو وہ ان کو سٹیشن تک رخصت کرنے گیا اور خود کسی کام کا بھانڈا کر کے واپس لوٹ آیا۔

نیا مکان درختوں کے خمبند میں واقع تھا جس کو انھوں نے بہت پسند کیا۔ سر کوپ سب سے پہلا شخص تھا جو انھیں وہاں ملنے آیا مگر اس کی ملاقات پہلے جیسی نہ تھی۔ وہ کسی اور حیثیت سے ملتا تھا۔ یہاں آئے ہوئے انہیں دو تین دن گزرے ہونگے جب انھیں ایک خط موصول ہوا یہ خط سر مہجورن کا تھا جس میں لکھا تھا کہ اس نے ایک کثیر رقمہ ان کے نام جمع کرادی ہے اب وہ اس رقم کی مالک ہے۔ اور زندگی بھر کے لئے مس فرانسس اس کے بے دکی جائزوار شاہ ہے۔ اس کی وفات پر اہل رقم اس کے بال بچوں میں تقسیم

شاعری سیکھے! اگر آپ کو اردو زبان ذاتی اور شاعری کا شوق ہے تو شاعری کا سیٹ، مصنف مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنؤی طلب فرمائیے۔ اس میں علم عروض، علم تائید، منافع و بدائع، اصلاح دینے کے اصول غرضیکہ شاعری سیکھنے کیلئے ایسے آسان اور دلچسپ اسباق دیئے گئے ہیں جن کو پڑھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے ایک مہینہ ہی میں شاعر کا بن سکتا ہے۔ نیکرڈوں شاعر اور غیر شاعر اس وقت تک اس سے مستفیض ہو چکے ہیں۔ قیمت محل سیٹ دو روپیہ علاوہ موصولہ اک نیز تمام کتب مولفہ خواجہ عشرت و دیگر مشہور مصنفین ہم سے طلب فرمائیے۔ ملنے کا پتہ:۔

مینجر عشرت بکڈلو۔ احاطہ خالصاں۔ کیننگ سٹریٹ۔ لکھنؤ۔ اودھ

عالمگیر کتب خانہ کی چند قابل دید کتابیں

ناظرین عالمگیر کو یہ قابل دید کتاب صرف پیر علاوہ معمولہ اک میں ملے گی۔
کتاب کا حجم پونے آٹھ سو صفحات ہے۔

شادی آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا موزی صاحب کی شادی خاندان آبادی کے متنبی خانہ خود ملا صاحب کے فائونڈیشن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ گمانا مشکل ہی نہیں نامکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔ حجم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے چھ

صبح لطافت ملا موزی کے چہیدہ اور بہترین مزاحیہ معنائیں کا نایاب و قابل دید مجموعہ کتاب کے صفحات معجزانہ کشمیر کی گیارہویں کم نہیں پڑھتے جائے اور نہتے جائے محبت صفحات قیمت صرف دو روپے چار

(نوٹ) ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے چار آنے علاوہ معمولہ اک میں ملے گی۔

علی احمد جی ندیلان مصری کے دوسری تاریخ ناول
موتیوں کا تخت | **محبوبہ بیرواں**
حجم ۳۰۰ صفحات حجم ۲۷۵ صفحات

دفتر عالمگیر کی طرف سے برف زد کشمیر ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں پہلی مرتبہ شائع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ کتاب کی دلچسپی کے لئے درج ذیل نام کافی ہے آج سب سے پہلی فرصت میں طلب فرمائیے!

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مزاحیہ طرز بیان کے ساتھ لکھوان اعظم کے جگہ گئے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں سے ہولناک و تھمہ خیز سین دکھائے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی شدت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی و دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑا چڑھا ہے۔ کھرپا بہادر کو پڑھ کر آپ شکر کے دربار حرام کو پور کو بھول جائیے بہترین لکھائی چھاپی خوش طالع رنگین سرورق قیمت ۷۰ روپے
خطوط کی ستم ظریفی مصنف مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی جنہا نے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کی مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپی ہے۔ بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ فوراً طلب فرمائیے قیمت ۱۲ روپے

کتاب التقدير علامہ ابن الیم عربی کے ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ آپ نے تقدیر کے مسئلے پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور مفیم کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر دلوئی کرم بخش صاحب مرحوم نے بڑے اہتمام سے صرف ہر کثیر کر ایسا کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن الیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب قبیلے الہی راہی ملک بھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا۔ اب ہمارے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں۔ اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپے ہے۔

ملنے کا پتہ
عالمگیر کتب خانہ
بازار سید مٹھا
لاہور

Alamgir Book Depote
Bazar Said Mitha
Lahore

جذباتِ فضا

جناب سید دل محمد صاحبِ فضا جالندھری

ہوش حاصل ہے نہ منزل کی طلب
غرق ہو کر بھی ہے ساحل کی طلب
جان دے کر کشتگانِ ناز کو
بیخودی دل کا عالم دیکھئے
ان کے جلوے سے یہ رشکِ طرب ہے
پھر بھڑک اٹھی ہے پروانوں کی خاک
گوشہٴ دل کی طرف بھی اک نظر
اس فضا میں لے دل بیتاب ہوں
وہ نراہِ شوخ اشکِ آلود ہے
خاک ہو کر بھی وفائے عشق میں
آہ کیوں بیگانہ تاشیر ہے
اور گم کرتا ہے جوشِ آرزو
غرق ہو یہ کاشِ بحرِ عشق میں
حسن کی فطرت سراپا ناز ہے
ہے مالِ غم ہی تہیہ سکون

عشق میں اک ناز ہے دل کی طلب
دیکھئے گم کردہ منزل کی طلب
پھر بھی ہے شمشیرِ قاتل کی طلب
ہے لب ساحل بھی ساحل کی طلب
دیکھئے پُر آرزو دل کی طلب
پھر انہیں ہے شمعِ محفل کی طلب
تا کجا اے قیس محل کی طلب
مٹ چکی ہے دل سے منزل کی طلب
دیکھتا تو کوئی منزل کی طلب
ہے وہی حسرت وہی دل کی طلب
ٹھو کریں کھاتی ہے کیوں دل کی طلب
جس قدر بڑھتی ہے منزل کی طلب
کشتیِ دل کو ہے ساحل کی طلب
کیا کرے پھر کوئی حاصل کی طلب
لے فضا کیا عشق میں دل کی طلب

ہارون الرشید اور شارلیمان

کیا ان میں باہمی تعلق تھا؟

مترجمہ مولانا جلیل الدین صاحب ناظم دہسنگوی (مولوی فاضل)

(ذیل کامنوں ایک مصری فاضل کا ہے جس کا پورا ترجمہ بلا تصرف صرف اس غرض سے شائع کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان کے فاضل مومنین اس بحث پر قلم اٹھائیں اور اگر ان دونوں بادشاہوں کے درمیان واقعی کوئی تعلق ہے تو مدلل طور پر ثابت کریں ورنہ بصورت دیگر اس شاندار گھڑی کا واقعہ بھی جو ہمارے زبانوں پر جاری ہے صرف افسانہ ہوا جاتا ہے علامہ شبلی نے اپنے مقالات میں ان دونوں بادشاہوں کے تعلق اور اس مشہور گھڑی کے واقعہ کو مشکوک قرار دیا ہے۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ سے ذوق رکھنے والے اصحاب اس جدید بحث پر عالمگیر کے صفحات میں ضرور روشنی ڈالیں گے۔ مسترحم)

سے نقل کیا ہے۔ پھر میں نے لاطینی تاریخوں کا مطالعہ شروع کیا بالخصوص علامہ کلیمنگوز (*Clément Clément*) کی تاریخی بحثیں میں نے بخور پڑھیں جن میں علامہ موصوف نے دو معتبر لاطینی تاریخوں یعنی (*Annales de* اور *Annales de*) پر اعتماد کرتے ہوئے مرتب کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید اور شارلیمان میں کسی قسم کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ تعلقات جو عالم اسلام کے اتنے بڑے خلیفہ کے ساتھ شارلیمان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں بالکل خرافات ہیں۔ جن میں سن عیسوی کی متوسط صدیوں کے ماہیوں اور مورخین نے صرف شارلیمان کی عظمت شان دکھانے کیلئے خود گڑھ لیا ہے۔ علامہ موصوف نے اپنے اس دعویٰ کو متحد قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

ان میں ایک دلیل تو یہی ہے کہ دو متذکرہ صدر لاطینی تاریخیں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتیں اور حقیقت بعض علمی طبقہ میں بھی دونوں بادشاہ کے تعلقات کا تذکرہ ان دونوں لاطینی کتابوں کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے پھیل گیا ہے لاطینی کتاب (*Annales de Charlemagne*)

تاریخ کے پڑھنے والوں کے نزدیک بلکہ جن تاریخی کتابوں میں عام طور پر مشہور ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور شہنشاہ فرانس شارلیمان میں سیاسی روابط و تعلقات تھے۔ بلکہ ان میں باہم اتحاد تھا کہ ایک دوسرے کو بیانات محبت اور ہدایاے الفت بھی بھیجتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے شاہ شارلیمان کو کینتہ اقیانوس کی کنجیاں بھی سپرد کر دی تھیں اور اس کو بیت المقدس کی حفاظت کی اہازت بھی دے دی تھی۔ چنانچہ اسی رشیدی استحقاق کی وجہ سے شارلیمان نے اپنا لقب "حامی الاراضی المقدسہ" رکھ لیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ اور بھی مختلف مرغومات ہیں جن میں ان دونوں بادشاہوں میں تعلقات ثابت کرنے والے پیش کرتے ہیں۔

میں نے اس شہرت بے اہل کیلئے عربی زبان کی مرکزی تاریخیں پڑھی ہیں ابوالخیر، ابوالفضل، ابن خلدون، ابن خلکان، مسعودی اور سیوطی کی بغور و خوض ورق گردانی کی، لیکن مجھے ہارون اور شارلیمان میں کوئی تعلق کا کوئی تذکرہ نہیں ملا۔ اسی تتبع و تلاش میں اس کا ذکر صرف بعض متاخرین کی کتابوں میں میری نظر سے گزرا جسے ان لوگوں نے غالباً یورپین تاریخوں

اس قصہ سے پادری رسنوکا مقصد صرف اپنے گرجا کو مشہور کرنا تھا، جس میں بقول ان کے وہ مقدس ٹکڑے اس وقت تک (تا دم تحریر کتاب) موجود تھے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ عجیب و غریب خیر بات تو پادری جوئے ۱۹۶۸ء میں تحریر کی۔ انھوں نے یوں افسانہ نگاری شروع کی کہ "شارلیمن

تے ہیں جن پر علامہ موصوف نے اول اول کافی زور دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے وہ مراجعت کرنی ہے لیکن ہم بھی ان امور کی حقیقت پر کچھ نظر ڈالیں گے، دیکھتے ہیں۔

(۱) اس زمانہ میں مسلمانوں کو نہ ہی تعلیم کافی ہو چکی تھی نہ ہی بنا پر یورپ و شہر کے بطریق نے شاریہ ایمان سے دستبردار تعلق جوڑ لیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاریہ میں اور ہارون الرشید میں عمدہ تعلق تھا اسی وجہ سے بطریق نے توسط شاریہ میں ہارون سے اپنی تعلیم فصیح کرنی چاہی۔ میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو کوئی دینی تعلیم ہی تھی۔ چنانچہ آج تمام کے تمام علماء تاریخ بعد ہارون الرشید مسلمانوں کی دینی تعلیم کا صاف انکار کرتے ہیں۔ یہاں پر وہ مشہور تاریخی خط لکھی ہیں نظر رہے جس کو تھامس برنارڈ کے بطریق نے شہر میں بھیجا تھا۔ اس خط میں بطریق موصوف نے مسلمان عرب کے عدل و انصاف اور دیگر مساوات کی یہی تعریف کی تھی۔

(۲) علامہ بریہاؤر بھرتھتے ہیں۔

”اندلس میں تمام بوزنطی اور اموی شاریہ و ہارون الرشید کے دشمن تھے۔ اس دشمنی کی وجہ سے ہارون اور شاریہ میں باہم قربت پیدا ہو چکی تھی۔“

لیکن کیا ایک مورخ کے لئے جائز ہے کہ جن امور کا صحیح اور علمی طور پر دلائل نہ ہم ہو چکے۔ پھر بھی وہ اپنی طرف سے ان کا غلط نکال لے، ہاں ان تنگ نہیں کہ مورخین ایسے علمی نتائج کو جو صحیح علمی تحقیق پر مبنی ہوتے

ہیں نہایت دست و پاز کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ کسی ایسی تحقیق کو جو ایمان و عزائمات دلائل پر مبنی ہوں ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ کیا تاریخ میں بھی ”ایجاد بندہ اگرچہ گندہ“ کو دخل ہے؟

لہذا آخری طور میں ہم صاف عرض کئے دیتے ہیں کہ عربی زبان کی تمام اموی اور مستند تاریخیں خلیفہ ہارون اور شاریہ ایمان کے درمیان کسی تعلق کو بھی قطعاً ذکر نہیں کریں۔ پھر حیات شاریہ ایمان سے متعلق دو لاطینی تاریخیں *Armenia* اور *ha nie de char* *de char* *de char* شاریہ ایمان اور بوزنطی بطریق کے درمیان کو عدد دہرید پام کا ذکر تو کرتی ہیں لیکن ہارون و شاریہ ایمان کے درمیان کسی تعلق کا کوئی ذکر نہیں کرتیں۔ اب ہم صحیح اور علمی تاریخ یوں دیتے ہیں کہ ہارون نے نہیں بلکہ قس کے بطریق ہی نے شاریہ ایمان کو قس کے دربار میں بٹھائی تھی۔ شاریہ ایمان نے اسی مدرسہ کا قیام کیا تھا۔ اور کچھوں نے بٹھائی تھی۔ اور اس قسم کے بن ہدایا کا ذکر شہر و دہ جس خرافات میں جن کو تو دونوں وسطی کے مصنفین نے اپنی ذاتی اغراض یا شاریہ ایمان یا شاریہ ایمان کی فائدہ ساز علمیت کو دکھانے کے لئے کر دیا تھا۔ اور یہ وہ مصنفین ہیں کہ صحیح علمی طور پر مورخین کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

یہ میری مہینوں کی تحقیقی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے جو ناظرین کے پیش نظر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(محمد ازالہ اللہ عہد)

عبد السلام نانم دہلوی

سارے تین آنہ گز فنیسی شہر کے پڑا برائے قیض جیمپ عرش اگر وہ ۱۰۰ گز کا تھا تو ہوتا ہے نمونے کا تھا ۱۰ گز والا اس شہر پر شخص منگا سکتا ہے کہ نشان ملنے پر کم از کم پانچ دکانداروں کو دکھلا دیں کہ یہ کپڑا ۱۰ گز منگا گیا ہے تاکہ وہ دیکھ کر ۱۰ گز کے نشان کا آرڈر دے دیں پھر پھر محصول ڈاک آئے آنہ علیحدہ بھیج ہوں گے۔ ۱۰۰ گز کے نشان پر محصول ڈاک معاف ہوگا۔ المنتحہ حضرت جیمپ فنیسی سٹور علاقہ لودیانہ پنجاب

غزل

از مولانا عبدالحکیم صاحب ناظم درہنگوی

سرمیں جب سودا نہیں اوڑل میں دہلیا
زندگی کی پھر حقیقی لذتیں حاصل نہیں

بکھریا سرکاٹ کر خود اس کے پائے ناز پر
میں بکھلا شد رہیں مشتِ قاتل نہیں

بڑگئے ہیں ماہ میں دراصل کچھ نقشے سیاہ
ورنہ ان کے عارضِ تاباں پہ کز تل نہیں

خوفِ ناکامی ارادے کے ترزل ہی تیا
ہمتیں بسب بندہ گئیں پھر دوری منزل نہیں

اُنکس زمانہ وہ بھی تھا ابھی تھیوں جب دلہا
اسب یہ دل وزی سہ کیوں کیا وہاں نہیں

عشق کی دنیا میں ناظم چین کیس آرام کیا
اس جہاں میں کچھ سنوں دل قرار دال نہیں

امرت دھارا کے پینتیسویں سالانہ جلسہ کی خوشی میں

رعایت رعایت

یکم دہشت سے ۳۱ مارچ تک اصحاب اپنا و نیلا کسی بھی ڈاک خانہ میں ڈالینگے یا خود آکر خرید کریں گے۔
ان کو کوئی ولود و ٹیڈ بکشن چنڈت ٹھا کر بت شرماؤ ٹیڈ کی تیار کر دہ

امرت دھارا اور اس کے پانچ مہکرات ۳۴ قیمت پر یعنی ڈو پیس میں ہر کسی پر اور دیگر ادویات و کتب

نصف قیمت پر دیجاویں گی!

جو اصحاب اس حصہ میں روپہ جمع کرادینگے انکو جب تک وہ روپہ ختم نہو اس رعایت کا حق بھیجے بجائے جلد چلتی بارود اور ڈاکرٹنگوئیں
اس وقت تک جن کے پاس فہرست نہ پہنچی ہو وہ ایک کارڈ لکھ کر منگواسکتے ہیں
خطہ کتاب و تار کا۔ امرت دھارا ۱۹۷۱ لاہور

المشہرہ فیہ امرت دھارا اور شہرہ الیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا ڈاک خانہ لاہور

پیمیانِ تحکم

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاشدی

خواب بولند بشارت کریم صاحب غریزی - بہار

رشتکاری حامل کر لی یکن — خدا کی پناہ! میں نے وہ نالہ و شہین، وہ فریاد
دجا، وہ آہ و دادیلا، وہ گریہ و زاری، وہ صدمے، احتجاج، بلندی — کہ توبہ ہی
بھلی۔ ہر ایک بے درد، سفاک، ظالم اور سیرجہ جس کا قلب و جگر فلاد کا ساتھ دے
بھی فریاد ہی بھل کے اس نلے کی تاب نہ لاسکا۔
بیل ناشاد نے کچھ اس طرح فریاد کی روتے روتے آج پہلی بندہ گئی صیاد کی
بیل نے صرف اسی پر بس نہ کی بلکہ وہ خون کے آنسو روتے لگی —
روتے لگی اور روتی رہی — اسی طرح اپنی جان شیریں کھوتی رہی اور
زبان حال سے یہ کہتی رہی ۶

یا جاں رسد بھاناں! یا جاں زتن بر آید،
خویش قطراتِ اشک سے اس نے محبوب گلاب کے پودوں کی آبیاری
کی۔ آبیاری کی اور کرتی رہی۔ بیان تک کہ وہ بارہ فونہا لان گلاب، سرسبز
و شاداب ہو گئے۔ اور ہر چہ میں تازہ روح اور نئی زندگی عود کر آئی۔ بدلہ پھر نئی
سرستیاں دکھلانے لگی — ہاں اسی طرح نہ معلوم کتنی خزاں اور کتنی بہاریں
چمن میں آئیں اور گئیں۔ مگر تم — مجھ سے قسم لے لو۔ حلف اٹھو کہ میرے
لوح دل سے جو ہر طرح کی شائبہ آمیزی سے بالکل مٹھی اور بجلی ہے اور جس
میں تمہاری محبت کے تبرک حروف منتوش ہیں۔ مرہ و پلام اور امتداد زمانہ
نے ایک نقطہ بھی محو کیا ہو۔ بلکہ میرے تمام اعصاب، تمہاری محبت کی گری
تمہاری یاد کی سوزش سے اب تک تپاں ہیں۔

ہاں! میں تمہاری محبت میں اب تک سرشار ہوں۔

مناجات گھنٹے میں — گھنٹے ایام ہیں — ایام ہفتے میں —
ہفتے مہینوں میں — مہینے سال میں تبدیل ہوئے — تبدیل ہوئے اور
ہو رہے ہیں۔ زمانے نے نہ معلوم کتنی دفعہ کنگی سے تنگ آ کر لباس پارہ چاک
کر ڈالا اور پھر پوشاک جدید میں سرور و خنداں، جلوہ گاہ عام پر ظاہر ہوا۔
آفتاب ہمارے سروں پر لاکھوں بار کل نکل کر چپکا اور چپک چپک کر ڈوبا۔ گلستان
اور چمنستان میں ان گنت مرتبہ بہار و خزاں آتی جاتی رہی۔ زمانے نے ہزاروں
انٹا پٹا کھایا۔ خدا معلوم کتنے مرتبہ طوطیاں نیک ادا، طائران خوشنوا۔ بیلان
نغمہ سنجی، قمریہ، زینبہ، وریب جابا کر محبت کا، آگ الاپا۔
رنگ باری رہیں — اور اپنی سرسیوں کا مظاہرہ کرتی رہیں — بیان تک
کہ گلوں کی شکستگی، اور ان کا رنگ و روپ، برقرار نہ رہ سکا۔ خاص کر — خادوں
کی آتش عشق نے ان کے دل — دماغ — روح — حتیٰ کہ سارے جسم کو جلا کر
خاکستر کر دیا۔ اور پھر ان کے مفاسل (پتیاں) روش پر منتشر ہو گئے — بھر
گئے — پرالندہ ہو گئے — پامال ہو گئے — بیلوں نے اپنے عشق کی
دہ چٹکاریاں — محبت کے وہ شعلے — جذبات کے وہ شرارے بھر کرائے
کہ پھول تو پھول، بعض کلیاں بھی آتش سرتی و دالہی میں، سوزاں و بریاں
بھو کر قبل از وقت ہی بیل اور گلہیں ہمارے کو داغ مفارقت دے گئیں۔ بالآخر
ان گشتگان عشق و محبت کے متعلق غلطیوں کو یہ ناطق فیصد کرنا ہی پڑا کہ
پھول تو وہ دن بہت سارے جافرا دکھلا گئے،
سرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مر جاتے
گلہیں تو خیر کل من خلیفانان پڑھتے ہوئے اس صدر جاکھا ہے

ہاں! ہاں! مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جبکہ میں نے تمہیں اول — اور نہ صرف اول مرتبہ ایک لہلہاتے باغ کی سبزہ زار روش پر نرم نرم پودوں کے درمیان، لہجہ دار گلاب کے ایک خوشنما پھول کی باریک اور نازک پتھریوں کو نازک — مگر بھری بھری انگلیوں سے مس کرتے ہوئے معرفت گلشت پایا تھا، ہاں میں نے تمہیں دیکھا — دیکھا، اور دیکھا رہا، تمہیں میری بوجھگی کا کافی دیر تک احساس بھی نہ ہوا۔ اور میں تمہاری اس لاعلمی سے سید متع ہوا۔ ناگاہ! اس پھول سے جس کو نسیم بہار کے سر و جنوں نے محبت کی لوریں لگا کر تمہاری نازک تھیلی کے پر سکون گوارہ میں تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، ایک بھونرا لپٹ گیا اور وہ اس کی شھاس کو چوسنے لگا۔ تمہاری طبیعت جلی — گرمی — بگڑی — برہم ہوئی۔ مگر — تمہارا وقار، تمہاری شان، تمہاری تسانت، تمہاری تکنت، اس بات کی متقاضی نہ ہوئی کہ تم — ہاں تم دو دلوں کے درمیان جدائی کا باعث بنو۔ بھونرا بیٹھا رہا۔ لپٹا رہا۔ چوستا رہا اور تم ان دو دلوں کے عشق کی کتاب — کتاب کے ہر ہر ورق و ورق کے ہر ہر صفحہ — صفحہ کی ہر ہر سطر — سطر کے ہر ہر جملے کے ہر ہر لفظ — لفظ کے ہر ہر حرف — حرف کے ہر ہر نقطہ کا بھونرا دینا دیا، یا فیما سے بے خبر، چپ و راست سے غافل — حتیٰ کہ خود اپنے سے گم ہو کر مطالعہ کرتے رہے اور — میں اپنی قسمت کی اس کتاب کو، جس کے تمام حروف، تمہاری روشن پشیمانی پر کندہ تھے جلد جلد پڑھتا رہا۔ بھونرا چوستا رہا — مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بھونرا چوستا رہا اور تمہارے چہرے کا رنگ درود و تکلیف، کرب و بے چینی سے ادا تھا بدلتا رہا۔ مجھے اس رنگ کی تبدیلی بھی یاد ہے پہلے سُرخ — پھر زرد — پھر بالکل زرد — پھر سفید، پھر سُرخ — پھر — پھر — ناگاہ بھونرا اڑ گیا، آنکھوں سے اوچھل پھوٹا۔ تب کہیں تمہارا سحر دور ہوا۔ طلسم بھنڈی ٹوٹا — آپے میں آئے۔ اس کے بعد — اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری نظریں اوپر کو اٹھیں۔ ٹریں — جھکیں — اور — جھگیں — تم مجھے دیکھ کر شہراگئے — جھپٹ گئے — اب اب ہو گئے — اس لئے کہ تمہارا بھونرا بھی۔ تمہارے گلاب جیسے رخسار کا۔ تم سے کچھ ہی پرے موجودیت ہو کر — انگشت بدنداں رہ کر — عالم نیم مدھمی دوار فکری میں نظارہ کناں تھا۔ کیونکہ میں بھی تمہارے عارض تاہاں کے عشق و محبت کی نیم گرم شھاس سے مستفیض ہونا چاہتا تھا — لیکن دئے

شومی قسمت کہ میرا طلسم خواب بھی اسی وقت کا فوراً تار بھر بھی اسی وقت تار تار ہوا جبکہ تمہارے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی تم ادنیٰ تھک کر بھاگے۔ پھر اپنے ساتھیوں اور سینوں کے جھگڑ میں جا کر مل گئے۔ مگر میں نے محسوس کر لیا کہ میری مہمناہ گجھاہوں کا اثر تمہارے معصوم دل پر بھی ہوا اور ضرور ہوا، اور ہونا بھی یہی تھا اور اس لئے کہ — عشق اول در دل مشوق پیدا ہوتا — تانسو شمع کے پودا نشیدامی شود ہاں! آج تک میں تمہاری اسی گرمی نظریں کی سوزش سے نیم سوختہ ہو کر تڑپ رہا ہوں — تمہاری اس تیغ نگاہ کا ذبیحہ — تمہاری اس تیر نظر کا کشتہ، تمہاری اس نوک مژگاں کا پتھر ہوں۔ اے کاش تم دوبارہ رونما ہوتے تاکہ میں آنکھوں کو سیکھتا۔ روح کو گرتا، جسم میں لگی ہوئی آتش خاموش کو کبھی خاموش نہ ہونے دیتا۔ ہاں، اب تک میں تمہارا متوالا ہوں اور — تمہاری محبت — پاک و بے لوث محبت میں — سرشار۔

وہ زمانہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا جب ایک دفعہ ہم اور تم، ایک سہائی رات میں، اس رات میں کہ چاندنی چھٹی ہوئی تھی چودھویں کا چاند تھا اور بدھ کامل نہایت ہی فیاضی سے تمام چیزوں پر نور کی بارش کر رہا تھا۔ آسمان ابر سے اور فضا غبار سے بالکل پاک و صاف تھی۔ اول تو یونہی ہر چیز نور کے بحر غبار میں تیرتی نظر آ رہی تھی، مزید براں برسات کی چاندنی اپنی نصیب کے اس دلغریب نظریں اور بھی گوناگوں اضافہ کر رہی تھی۔ ہاں اسی رات میں، ہم اور تم ایک پیٹری کے دامن میں، ایک خوشنما آبشار کے کنارے ایک سفید — دودھ سے زیادہ سفید و شفاف — مثل رخ بستہ چٹان پر بیٹھے عشق و محبت کی وادی میں گم رہے۔ کھمے ہوئے سترق اس شعر کی ہم آہنگی میں مصروف تھے —

ویدار سے گو کچھ نہ ہو مقصود ہے اتنا
تو میری نظریں رہے میں تیری نظریں

صرف یہی نہیں — بلکہ تمہارے جسم پر میرے تگ آغوش میں محسوس تھا اور میں تمہارے جسم کی حرارت کا کافی طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت ہم دلوں کے تنفس تیز اور نینس سریل تھی — بہت ہی سریل، اور میں

اے کاش! کہ تم دوبارہ رونمائی کر کے اپنی شرابِ محبت کے دو ایک جام کو روپلاتے مجھ کو دوبارہ عطا کر دے جو دوا آتشہ ہوتی میرے جنون کو دو بلا کر تیری کیونکہ میں متمنی ہوں اُسی "محبتِ دوام" کے پیمانِ سخلم "کامیں آرزو مند ہوں تھکے دہن مبارک سے اسی مہرِ کو دوبارہ سن لینے کا یعنی ع من تو شدم تو من شدمی من تن شدم تو جاں شدمی۔
لہذا تم ہاری اس استدعا کو ستر دن کرو۔ ٹھکرانہ دو۔ کیوں؟ اس لئے کہ
دن بہت ہو گئے نہیں دیکھا ہائے تیرا وہ چاند سا کھڑا ہے۔
بادلوں کی طرح برستی ہیں آنکھیں ویدار کو ترستی ہیں رنجیں
ہاں! — ہاں!! میں تیری محبت میں اب تک سرشار ہوں۔

[illegible]

الوار سخن

داغ دل بے شمار ہو جائیں
 پرکشش غم ہے اس لئے شاید
 تو نوازے تورہ نشیں سائل،
 ترا نقش قدم اگر پائیں !
 دیدہ و دل خدا کرے دونوں !
 اس کو مد نظر ہے ضبطِ غم،
 دید کی آرزو نہ رہ جائے
 زندگی میں تھے داغِ دل نہیاں
 دل اگر پاک ہو کدورت سے
 سارا عالم ہو غم گسار آفر
 ہم سراپا ہمار ہو جائیں
 اور ہم بے قرار ہو جائیں
 صاحب اقتدار ہو جائیں
 مرے سجدے نثار ہو جائیں
 خوگر انتظار ہو جائیں !
 غیر اب راز دار ہو جائیں،
 وہ ہیاں ایک بار ہو جائیں
 اب وہ شمع منار ہو جائیں
 راز سب آشکار ہو جائیں
 وہ اگر غم گسار ہو جائیں

لطیف انور گوردہ پوری

عالمگیر ہندوستان بکس علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

نمبر ۱

فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۳۶ء

جلد ۲۲

نمبر	مضامین	اثر خامہ	نمبر	مضامین	اثر خامہ	نمبر
۱	فہرست	مینجر	۱	۱۱	محرمی سوار	۲۸
۲	ملاحظات	ایڈیٹر	۲	۱۲	بہلول سے	۳۴
۳	اسلام اور سپین	ماغذ از اخبار اتحاد	۳	۱۳	نارو	۳۵
۴	رباعیات	جناب مولانا عابد شاہ جہانپوری	۴	۱۴	نغمہ دل	۳۷
۵	جذبات عالیہ	حضرت دکن شاہ جہانپوری	۵	۱۵	غزل	۳۸
۶	سرخ پھول	مترجمہ سعادت حسن صاحبہ	۶	۱۶	اُردو شاعری اور شراب	۳۹
۷	ان کا انتظار	حضرت علامہ کیفی چتریا کوٹی	۷	۱۷	لمعات	۴۲
۸	شاہی عید کا جلسہ	مولانا عشرت کھنوی	۸	۱۸	شہید محبت	۴۳
۹	غزل	جناب رشید صاحب کبر آبادی	۹	۱۹	گلزار خلیل	۵۰
۱۰	محسوسات ماہر	مولانا ماہر القادری	۱۰	۲۰	خاک کا ڈھیر	۵۱
				۲۱	اشتمارات	۵۷

مکتبہ جامعہ!

اگر آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم عزیز ہو تو مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا باتصویر رسالہ یا تعلیم طلبہ فرمائیے
قیمت سالانہ دہائی پروجہ سالانہ نمبر ۳۵ روپے ۸ روپے کا تہہ - مکتبہ جامعہ ملیہ قریب بازار - دہلی

مکتبہ جامعہ

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر انکس پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر سال عالمگیر بازار سید محمد لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

عالمگیر کا سالانہ نمبر ۳۶ء بھی گزشتہ خاص نمبر ۳۶ء کی طرح بڑا

جہاز می سائز پر شائع ہوگا،

اور میں اپنی پریشانیوں کے باوجود اس پریکڑوں روپیہ زائد صرف کر کے سالانہ نمبر ۳۶ء ایسا جاذب نظر بنانا چاہتا ہوں کہ باید و شاید۔ خدا نے چاہا تو آپ کھینکے کہ یہ سالانہ نمبر حیثیت سے کتنا شاندار ہے۔ تصاویر مقبلیں افسانے اور منظومات کے اعتبار سے یہ اشاعت خاص فی الواقع خاص چیز ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے عالمگیر سے ایسی دالمانہ محبت ہے جس کا نظارہ بذریعہ الفاظ ناممکن ہے۔

قارئین کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ مہینے میرا سخت جگر اس جان فانی سے رخصت ہو گیا۔

ساعتِ عشرت یا ایک لمحہ غم ہوگئی عید آتے ہی میرے گھر میں محترم ہوگئی یہ قدرت کی ان بوجہی مصلحتوں کا کرشمہ ہے کہ جو احباب چند ہفتے پہلے بڑا دستر کے خطوط لکھ رہے تھے آج ان کے گرامی نامے غزل طلال کا آئینہ بنے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس صدمے کا اثر میرے دل و دماغ سے چلا جائے لیکن احباب کی آکے دن کی ہمدردی اس غم کے درد کا احساس از سر نو تازہ کرتی رہتی ہے مضطرب کر دیا احباب کی ہمدردی درنہیں اور یہ احساس باجر جہانے کا بہر حال جن احباب کرام نے اس صدمہ جاکہ میں میرے ساتھ اٹھا ہمدردی کیا میں ان کا بصیرت قلب ممنون ہوں۔ خطوط کے ذریعہ شرکتِ غم کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ میں فردا فردا جواب لکھنے سے محذور ہوں یقین ہے کہ میری یہ جائز محنت لائق پذیرائی اور قابل قبول ہوگی۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ

سالانہ گزشتہ کی طرح اس سال بھی عالمگیر کا سالانہ نمبر ۳۶ء کے پہلے ہفتے میں نہایت بڑی اشتہار کے ساتھ شائع ہوگا۔ عالمگیر نے خاص نمبروں کے سلسلے میں قابل رشک شہرت حاصل کر لی ہے وہ متراج بیان نہیں لیکن سالانہ نمبر ۳۶ء انشاء اللہ ہر لحاظ سے امتیازی خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا۔ اس کیلئے جو تصویریں میاگی گئی ہیں ان میں ہر ایک مکمل مصوری کا نام در ترین نمونہ کھلانے کی مستحق ہے آپ ان تصویروں کو دیکھ کر بلاشبہ کہہ سکیں گے کہ رنگوں اور خطوط کے لطیف امتزاج نے حسن و کیفیت کی ایک خاموش دنیا بسا دی ہے۔

اس نمبر کے لئے جو مضمون و منظومات میا کئے گئے ہیں ان کے محاسن کا اظہار زبان قلم سے ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ ہر مضمون خیالات و جذبات کی تربیت و تہذیب کا بہترین ذریعہ ہے۔ تفصیلات کیلئے مئی کے پرچہ کا انتظار کیجئے جن حضرات نے سالانہ نمبر کیلئے اب تک مضمون نہیں بھیجا ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس اعلان کے دیکھتے ہی اپنے قدیم شیوہ عالمگیر نوازی کے پیش نظر اپنے اپنے ساج آکار بھیج کر ممنون فرمائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مصروفیات اور پریشانیوں کی مشترکہ یورش کے باعث فردا فردا مضامین کیلئے خطوط لکھنے سے قاصر رہا۔ اس لئے میں اپنے محترم کرمفراؤں سے یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ میری درخواست کے بغیر مضامین اور منظومات بھیج کر مجھے شکریہ کا موقع نہایت فرمائیں گے۔

موجودہ اقتصادی بد حالی کے زمانہ میں یہ اعلان کرتے ہوئے دل کو ایک تشویش ہی پیدا ہوتی ہے لیکن عالمگیر کو ترقی کے اس نام رافع تک لانے میں جن تشویش انگیز پریشانیوں کا میں کج تک بفضل ایزدی مقابلہ کرتا آیا ہوں مانگ یہ تشویش کچھ زیادہ نہیں اس لئے میں انشاء کا نام لے کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ

قطعاتِ تاریخ و وفا فرزندِ دلِ جنابِ حافظِ محمد صالح مدثر لکھنؤ

از جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر

(۱)

مرگِ پسر کہ بر سرِ حافظِ فتد چو کوہ،
 ممکن نہ شد ز کس کہ بگرداندش ز راہ
 بودہ است ہچناں ز ازل بند و بستِ آہ
 تیرے کہ از کمانِ مقدرِ محبتِ آہ
 کس می توان کشید و چپاں متواں کشید
 تیر غمے کہ در جگر او نشست آہ
 رفتہ بہار و سیر نہ دیدیم روئے گل،
 گوی حیاتِ پردہ بخشاد و بست آہ

تاریخِ حلتش ز دلِ حامدِ حنین

بر جست۔ ناگہاں دلِ حافظِ شکست آہ

۶ ۱۹ ۳۶

(۲)

دلِ حافظِ بخت از مرگِ فرزند
 بچشمِ دلِ نظر کردم برویش
 چہ تاریخِ غمش کلکم نگار د
 بگفتم، دیدہ از غمِ خوںِ ببار د

۶ ۱۹ ۳۶

اسلام اور اسپین

جلد تہذیب اسلام نے کیسا اثر ڈالا؟

یہ دپ میں ترکہ اسلام کے نام سے ایک طویل القدر کتاب شائع ہوئی ہے جس میں متحدہ شاہیر طمانے کی تعریف کیا ہے اور جس میں دکھایا ہے کہ موجودہ تہذیب پر اسلام کے کیا کیا احسانات ہیں۔ الفریڈ ولیم نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

”ملک عرب میں اسلام ظاہر ہوا اور اس کے ظہور نے ایک نئی تہذیب پیدا کر دی جسے اسلامی یا عربی تہذیب کہتے ہیں۔ عربی اس لئے کہ خلفاء کے زمانہ میں بنی اسلام اور عربی زبان ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ یہ اسلام کی خوش نصیبی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے زمانہ میں ظاہر ہوئے جب عربی زبان عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس واقعہ سے انکار نہیں کہ کوئی سامی زبان بھی عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عربی اس قدر وسیع زبان ہے کہ ہر قسم کے معانی کیلئے اس میں الفاظ موجود ہیں۔“

اس کتاب کی بے سلاباب جی۔ بی۔ ٹرنیڈ نے ”اسلام اور اسپین“ کے عنوان سے لکھا ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

تصہب کا مرکز بنادیا۔ اس کی ذہنی آزادی سلب کر لی اور اسے اپنا غلام بنا لیا۔
اسلامی اسپین
 قدیم اسپینی مورخوں نے اسلام پر بے شمار جھوٹی تہمتیں لگائی ہیں لیکن جس کے بناء کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ جس زمانہ میں تمام یورپ پر جہل کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اسپینی مسلمانوں نے ایک طویل القدر تہذیب اور منظم اقتصادی زندگی قائم کی جس سے تہذیبوں مدی کے یورپ نے بہت فائدہ اٹھایا اور علوم و فنون میں اس سے پیش بہادری۔ اس حقیقت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ڈینیٹی وغیرہ شعرا پر عربی روح متا طور سے نظر آتی ہے۔

لیکن اسپینی مسلمان کون تھے؟ کیا وہ خالص عرب تھے؟ طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں اسپین فتح کیا۔ خود طارق عرب نہیں بلکہ بربری قوم کا ایک فرد تھا اس کے ساتھ صرف تین ہزار سپاہی تھے جن میں سے عرب صرف تین سو تھے۔ باقی دو ہزار سات سو مجاہد بربر تھے اس کے بعد ۷۱۱ء میں موسیٰ بن نصیر فتح کو مکمل کرنے کے لئے ایک فوج لیکر آیا۔ یہ فوج بھی عربوں، شامیوں، مصریوں اور

اسپین کے باشندوں کو اسلام سے مدد پر بعض رہا ہے ان کے مذہبی پیشواؤں اور مورخوں نے اسلام کا چہرہ ہی طرح بگاڑا اور باشندوں کو نفین دلا دیا کہ ان کے تزل کا اہلی سبب اسلام کا ان کے ملک پر قبضہ تھا۔ لیکن ۱۸۹۹ء میں امریکہ سے شکست کھانے کے بعد اسپینیوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے حق کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ تاریخ اسلام سے ان کا تعصب کم ہونے لگا اور ان کے بعض علماء نے تسلیم کیا کہ اسپین کو اسلام سے بہت نفع پہنچا ہے اور یہ کہ ۱۴۹۲ء میں اسپین سے اسلام کی جلا وطنی نہ صرف اس ملک کی بد نصیبی تھی بلکہ ساری دنیا کیلئے ایک مصیبت تھی۔

اسلام نے رواداری پیدا کی
 یورپ مذہبی تعصب کا اندھا ہوتا تھا لیکن اسلام کے اثر سے اسپین کے مذہب طبقہ میں رواداری پیدا ہو گئی۔ چنانچہ وہاں کے باقیماندہ عیسائی بادشاہوں نے مسلم علماء، صنائع، ادراہرین موسیقی کو اپنے درباروں میں جمع کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا مگر جو نئی اسلام کو شکست ہوئی، کیونکہ پادریوں نے اسپین کو

بربر سے غلو طعنی۔

پھر اسلامی فتح کے بعد کثرت عیسائیوں نے اپنا مذہب بدل ڈالا اور مسلمان بن گئے۔ عربی نام رکھ لئے اکثر فاتحوں حتیٰ کہ خود موسیٰ بن نصیر نے اپنی کے آخری شاہی خاندان کی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور ایک ہی نسل کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ اپنی مسلمانوں کی مائیں اپنی عورتیں ہو گئیں جن میں مسلمان بھی تھیں اور عیسائی بھی۔ اپنی مسلمان عالی خاندان عیسائیوں میں شادی کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ عیسائی عورتوں کو مسلم عورتوں پر ترجیح دیتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں عربی خون تبدیل کج ہو گیا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ سپن کے تمام مسلمان عرب تھے۔

اپن کی زبان فتح اسلام کی قیسری یا چوتھی صدی میں سپن کے باشندے دونوں بولتے تھے (۱) عربی زبان جو وہاں کی سرکاری زبان تھی (۲) بول پال کی رومی زبان جسے عرب بھی بولنے لگے تھے اور جس سے موجودہ لٹینی زبان پیدا ہوئی ہے۔

اپن کے عیسائی اگرچہ اسلامی فتح سے دو سو برس بعد مسلمان سپن پر انگریزوں نے عربی زبان کا پورا قبضہ نہ کیا جبکہ مقدس کے بپا سے ثابت ہے تاہم اسلامی تہذیب ترقی کرتی گئی۔ اپن کے عیسائی عام طور پر ان پڑھے تھے اور عربی زبان پر قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن تعلیم یافتہ لوگ عربی زبان کو اپنی زبان پر ترجیح دیتے تھے چنانچہ قرطبہ کے بشپ نے انھیں سخت ملات بھی کی تھی کہ وہ اپنی قومی زبان کے مقابلے میں عربی نظم و ثمر کے کیوں دلدادہ بن گئے ہیں مگر عیسائی باشندے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ عربی ان کی زبان سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ پھر جب مسلمانوں نے سپن میں کاغذ سازی کو رائج کیا تو عربی زبان کی کتابیں باسانی مل جایا کرتی تھیں۔

دسویں صدی عیسوی میں قرطبہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے تمدن شہر تھا۔ ساری دنیا کی نگاہیں اس پر تھیں اس میں شہر کتب خانے اور نو سو پبلک حاما تھے۔ عیسائی بادشاہ قرطبہ ہی سے طبیب، انجینیر، اور مینی بلاتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک عیسائی ملکہ کا لڑکا بہت موٹا تھا جب یورپ بھر میں کہیں اس کا علاج نہ ہو سکا تو ملکہ نے اسے قرطبہ بھیجا جہاں سے وہ بالکل اچھا ہو کر واپس گیا۔

قرطبہ کے تیززل کے ایک سو برس کے بعد شہر اشبیلیہ نے شہرت حاصل کی

اور قرطبہ کا وارث بن گیا۔ یہ زمانہ طوائف الملوک کا تھا۔ مگر اسی زمانہ میں سپن ممالک کے سب سے زیادہ سیاح اسلامی سپن میں آئے اور واپس جا کر اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی تہذیب پھیلانے لگے۔ شمالی سپن (کسچی) میں اور ہاس یوہین ممالک میں اسلامی تہذیب اس طرح اور بھی جلد پھیلی کہ طوائف الملوک کے زمانہ میں سپن کے غیر مسلموں نے یہاں سے بہت زیادہ تعداد میں ہجرت کرنا شروع کر دی تھی کیونکہ مراٹھیں اور صحران کے عہد حکومت میں خصوصاً مشرق سے ۱۲۶۷ء تک انھیں بہت ستایا گیا۔ اندلس کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ مسلمان نے مذہبی تعصب ظاہر کیا جسے مسلم بربر بادشاہ اور شمال سے عیسائی پادری اپنے ساتھ لائے تھے لیکن اس دینی جنون کے زمانہ میں بھی ایسے علماء پیدا ہوئے جو اپنے عہد میں اپنی نظر آپ تھے اور اپنی قابلیتوں کی وجہ سے دنیا کے سب سے بڑے عالم تسلیم کئے گئے۔ ابن رشد، ابن طفیل، ابن العری، ابن میمون، ابن جبر، اسی زمانہ میں ظاہر ہوئے تھے۔ اسلامی سپن سے بھاگنے والے یوہین ممالک میں اپنے ساتھ اسلامی طرز لباس کا فیشن، بعض اسلامی عادتیں اور دیگر لے گئے۔ لیکن یورپ میں اسلامی تہذیب ان وقت سے بہت تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی جب وسطی تیرہویں صدی عیسوی میں سیجیت نے اندلس پر یغیر شروع کی اور بہت مسلمان دستکار اور علماء مسیحی حکومت کے ماتحت ہو گئے ۱۰۸۵ء میں عیسائیوں نے طلیطلہ فتح کیا۔ ۱۲۳۸ء میں قرطبہ پر ان کا قبضہ ہو گیا اور ۱۴۹۲ء میں اشبیلیہ کو بھی انھوں نے چھین لیا۔

بعض اسلامی صنعتیں سپن کے مسلمان پچھلی مٹی سے برتن بناتے تھے اس صنعت میں انھوں نے ایسا کمال

حاصل کر لیا تھا کہ ساری دنیا میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی تھی گیارہویں صدی عیسوی میں طلیطلہ اس صنعت کا مرکز تھا۔ مٹی کے یہ برتن نہایت خوش نما ہوتے تھے ان پر ایسا رنگ ہوتا تھا کہ یا قوتی سے شروع ہو کر سب کے رنگ پر ختم ہوتا تھا پرتگال، اٹلی، فرانس کے بادشاہ اور امرا ان برتنوں کو بڑی قیمت پر خریدتے تھے حتیٰ کہ بشپ زینیس نے ایک مرتبہ کہا، ان کا فرد دستکاروں (یعنی مسلمانوں) میں ایمان کی اتنی ہی کمی ہے جتنی ہم میں دستکاری کی ہے۔

دباغت اور ساری قرطبہ میں کمال کی دباغت ایسی ہوتی تھی کہ تمام یورپ میں مشہور تھی اسی طرح اندلس کے کنارے یورپ میں ضرب المثل بنے ہوئے تھے۔

موسیقی اسپین کی لٹنی موسیقی اور مراکش کی موسیقی میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح دونوں ملکوں کا نام بھی بہت مشابہ ہے ضرور اسپین کے میسائی بادشاہوں کے دربار میں مسلمان ماہرین موسیقی موجود تھے۔ تاریخ سے بھی ان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں ہی نے اسپین میں خود اہل کیا نیز بائسری افسد باب کو رواج دیا۔ باب کا نام موجودہ اسپینی زبان میں "ریل" ہے اور پرتگالی اسے "را بیگا" کہتے ہیں۔

اسپینی زبان میں اکثر موسیقی آلات کے نام عربی ہیں جو کثرت استعمال سے ذرا بگڑے ہوئے لفظ میں بدلے جاتے ہیں مثلاً "تندیر" "جو عربی میں "مندر" ہے یا "سونا جان" جو اصل میں "صنوج" (جمع صنج) ہے۔ اسی طرح ایک عربی لوق کا نام "فیصل" ہے جو اصل میں "فیض" ہے یا "گیط" جو اصل میں "غیط" ہے یا "لوگ" جو عربی لفظ "لوق" ہے۔ موسیقی کے سلسل میں سب سے زیادہ شہور اسپینی لفظ "نزد" ہے حالانکہ یہ بھی عربی ہے اور عرب بگڑ کر بنا ہے۔

اسپین کے لوگ جب گانا سن کر وجد میں آتے ہیں تو اولیہ "اولیہ" پکارتے ہیں لیکن یہ خالص اسلامی لفظ "اللہ" ہے عرب بھی جب وجد میں آتے ہیں تو "اللہ" کہتے ہیں۔ پھر اسپینی گانے بھی عربی گانوں کی طرح "یا لیل یا لیل" سے شروع ہوتے ہیں۔

اسپینی زبان پر احسان جب مسلمانوں نے اسپین پر قبضہ حاصل میں داخل ہو گئے اور اسے وسیع بنا دیا۔ اسپینیوں نے عربی لفظ اس طرح سے لئے ہیں کہ عربی کا حرف تعریف الف لام برقرار رکھا ہے اور اسی کے ساتھ اسپینی حرف تعریف کا بھی بڑا دیا ہے۔ ذیل کی مثالیں طالعہ ہوں۔

عربی لفظ	اسپینی لفظ
الحاجہ	la Alhaja
الرسا	la arraz
الساقا	la acaqia
النقال	la anacala
القبلا	la alcoba
المحدتا	la almahda

اسپین کے کسانوں میں قبضے اور ان اور ہیلے راج ہیں اب تک ان

سب سے نام عربی ہیں۔ پھر بہت سے ذراعتی لفظ بھی عربی ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج تک اسپین کے باشندے انشاء اللہ کہتے ہیں۔ اگرچہ اس کا لفظ اوشا اللہ کہتے ہیں۔

ترجمات کے نام اسپین اور پرتگال میں آج تک اکثر ترجمات کے نام وہی ہیں جو عربوں نے رکھے تھے اگرچہ تلفظ کبھی بدل گیا ہے مثلاً "جبر الفارد" اصل میں جبل الفارد ہے یا "جبر لطر" اصل میں "جبل الطابق" ہے یا "طر فہار" اصل میں "الطرف الاغر" ہے۔ "الجیراس" اصل میں "الجیزرہ" ہے۔ اسپین میں زیادہ تر ترجمات کے نام "وادی" سے شروع ہوتے ہیں۔ اسپینی زبان میں یہ لفظ "Guad" لکھا جاتا ہے مگر بولادادی ہی جاتا ہے۔

خاندانوں کے نام اسپین میں آج تک بہت سے خاندانوں کے نام عربی اسلامی ہیں مثلاً۔

بنو خالد	Benadalid
بنو الوکیل	Benaudalla
بنو شرف	Benasharfe
بنو عبد اللہ	Benacasin
بنو غانم	Benaganim
بنو محمد	Benaiamemel

ظاہر ہے کہ اور ایسے ہی خاندان عرب اور مسلمان تھے مگر زبردستی عیسائی بنائے گئے۔

دسویں صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب پورے اسپین میں پھیل چکی تھی حتیٰ کہ مسیحی علاقوں میں بھی اور جب طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو اسلامی تہذیب یورپ کے تمام حصوں میں پہنچ گئی۔

قرطبہ کی بربادی کے بعد طلیطلہ نے علوم و فنون میں اس کی جگہ لے لی حتیٰ کہ ۱۰۰۰ء میں قبضہ کے بعد بھی یہ شہر علم و حکمت کا سر زبنا رہا۔ خود شاہ الفاسوششم کا دربار اسلامی تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا اور شاہ نے اپنا لقب قرار دیا تھا۔ "دونوں دینوں کا شہنشاہ"۔ اس زمانہ میں طلیطلہ کی درگاہیں یورپین طالب علموں سے لبریز دکھائی دیتی تھیں۔ یورپ کا کوئی ملک نہ تھا جہاں سے طالب علم نہ آتے ہوں حتیٰ کہ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ

دیکھو کہ جو چاہیں لکھیں بشرطیکہ اپنی تعلیمات کی عوام میں اشاعت نہ کریں
یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے فلسفی قرطبہ کے عروج کے زمانے
میں ظاہر نہیں ہوئے بلکہ عہد طوائف الملوکی میں ظاہر ہوئے۔ انھیں لوگوں نے
ارسطو کا فلسفہ عربی زبان میں منتقل کیا۔ اور تمام یورپ مجبور ہوا کہ اعلیٰ تعلیم
کی تحصیل کے لئے اپنے طالب علموں کو طلیطلہ بھیجے۔ جہاں وہ عربی زبان
میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

(اتحاد - پٹنہ)

کے طالب علم بھی موجود تھے۔ چنانچہ انگریز عالم رابرٹس نے طلیطلہ ہی میں تعلیم
حاصل کی اور یورپ میں سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ کیا۔ پھر سکاٹ لینڈ کا عالم ریکارڈ
دانیال نورسے اڈلرڈ آف باتھ وغیرہم نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی تھی اور انہوں
نے عربی سے لاطینی میں ارسطو اور اقلیدس کی کتابیں ترجمہ کیں۔
اپنے کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب کیلئے جو سب سے زیادہ قیمتی میراث
چھوڑی وہ مسلم فلسفیوں کی تصانیف ہیں۔ مرابطی اور موحدی فلسفین اگرچہ
مستقبل تئیں مگر انہوں نے فلسفیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اور موقعہ

رباعیات

حضرت عابد شاہ جہانپوری

ہر ذرۂ دل و روح سے بگیاں ہے
پا پاں پر ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے
چشم شکر عابد
تو تھی کبھی وہ چشم شکر
افسانہ خاموشی و آواز ہے

گود غم جانسو سے دیوانہ سی
باپوں تناسی ویرانہ سی
عابد گلہ جوڑنے آئے لب تک
وہاں ہے وفات کوئی بگیاں سی

۳

ہر گام پہ پکت بیکر خاموش ہوں میں!
یہ عالم حیرت ہے کہ بیہوش ہوں میں
کچھ راز تو بتیابی دل کا کھلتا
شاید تیرے جلوؤں سے ہم آغوش ہوں میں

جسبہ عالیہ

حضرت دل شاہ جہاں پوری

دل اب وہاں ہے حوال خود ہی تا عا ہوں میں
 اس اضطراب پیربان اک جہان سکوں
 چمک اٹھی مرے ذروں سے عشق کی قسمت
 حریم ناز سے آتی ہے یہ صد اپنی ہم!
 مری خموشی مجبور اک قیامت ہے
 اک آہ سرد نے صد ہلکے ہیں شہ پیا
 یہ کوئے عشق کی دشواریاں معاذ اللہ
 مجھے کہیں دل پامال کا نشان نہ ملا،
 نہ پوچھ عشق کی روداد انک خوں کو دیکھ
 مشاہدہ کا تقاضا ہے اب حجاب نہیں،
 سنبھال اپنے دل مطمئن کو اے ناصح،
 اسی سے کیجئے افتاد کا کچھ اندازہ،
 ہجوم شوق و تمنا میں گم ہوا ہوں میں!
 کوئی سنبھال: اسے تپ رہا ہوں میں!
 دیار حسن میں تو خاک ہو چکا ہوں میں!
 کہ اس حجاب پر بھی عالم آشنا ہوں میں!
 یہیں سے عشق کی فطرت بدل رہا ہوں میں!
 ابھی تو دردِ محبت کی استدا ہوں میں!
 قدم قدم پہ ہیں نشتر برہنہ پا ہوں میں!
 ہر ایک ذرے کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں!
 دل شکستہ کی فریاد بے صدا ہوں میں!
 حدودِ طور سے شاید گزر چکا ہوں میں!
 کہ سرگزشتِ محبت سنا رہا ہوں میں!
 نظامِ دہر بدلتا ہوا اٹھا ہوں میں!

جباب بحر کی سمجھو مجھے نمودائے دل
 اگر یہ وہمِ ناز ہے تو اور کیا ہوں میں؟

سُرخ پھول

شہرہ آفاق روسی افسانہ نگار گار شین کا ایک مشہور افسانہ
ایوان تورگنیف کی یاد میں
مترجمہ سعادت حسن منٹو

تیزاد بھاری قدم اٹھانا۔ موسم جلے کی منڈھی ہوئی کرسیوں پرانے درازوں اور
کتنبوں کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنا اور اپنے ساتھیوں کی موجودگی سے بالکل
غافل ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔

اس کو ساتھ والے کمرے میں لیجاؤ دہانے ہاتھ
میں جاتا ہوں، میں جاتا ہوں۔ پچھلے سال مجھے تمہارے ساتھ رہنے
کا اتفاق ہو چکا ہے۔ ہم دونوں نے ہسپتال کا معائنہ کیا تھا مجھے سب کچھ معلوم ہے
اور مجھے دھوکا دینا بہت مشکل کام ہے۔ دیوانے نے کہا۔

یہ لکھ روہ دروازے کی طرف مڑا۔ وارڈ نے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ
کھول دیا۔ اس پر وہ نا انداز سے تیز اور سنبھلے ہوئے قدم اٹھاتا اور اپنے
دیوانے سر کو اٹکڑے ہوئے دفتر سے باہر نکلتا۔ باہر نکلتے ہی وہ دفتر دہانے ہاتھ
اس وارڈ کی طرف بھاگ پڑا؟ ہنسی یاریوں کے مریضوں کے لئے مخصوص تھا
اس نے ساتھی جو اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکے۔
گھنٹی بجناؤ۔ میں خود نہیں جاسکتا اس لئے کہ تم نے میرے ہاتھ مائدہ رکھے ہیں
اس پر ایک قلی نے دروازے کو کھول دیا اور وہ تینوں ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

ہسپتال کی سنگین عمارت بہت وسیع تھی اور ساخت کے لحاظ سے کسی
سرکاری دفتر کے مشابہ تھی۔ دو بڑے کمرے تھے ایک کھانے کا کمرہ اور دوسرا وہ جو
کم تکلیف وہ مریضوں کیلئے مخصوص تھا۔ یہ کمرہ کافی فراخ تھا جس کے شیشے لگے ہوئے
دروازے ایک باغ کی طرف کھلتے تھے۔ ان دو کمروں کے علاوہ بالائی منزل پر
میں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں مریضوں کی رہائش کا انتظام تھا اور دو

محمود ملک منظم شاہنشاہ پطرس اول کے نام پر میں مطلع کرتا ہوں کہ پگمل
خانہ کا معائنہ کیا جائیگا۔

یہ الفاظ سمع خراش اور غصہ ہوئی بلند آوازیں ادا کئے گئے۔ ہسپتال کا
سیکرٹری بورڈ شانی کے دھبوں سے بھری ہوئی میز کے قریب بیٹھا بیماروں کے
متعلق ایک بوسیدہ ریسر میں اندراج کر رہا تھا مسکرائے بغیر نہ سکا۔ مگر وہ دو
نوجوان جو باہر کے ساتھ تھے نہ ہنسے۔ دو دن اور دو راتوں کے سفر نے جو ان
کی آنکھوں میں گنا تھا انہیں اس قدر ماندہ کر دیا تھا کہ وہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے
وہ اس پگمل کی گجباتی کرتے رہے تھے جسے وہ ٹرین سے ابھی ابھی ساتھ لائے
تھے۔ سفر کی آخری منزل پر ان کے ساتھی کی دیوانگی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔
انہوں نے بڑی شکل سے ایک کرتا تلاش کر کے ریلوے کے نوکروں اور سپاہیوں
کی مدد سے اسے پہنا یا تھا۔ اس طرح یہ دونوں جوان طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر
بعد مشکل اپنے دیوانے ساتھی کو شہر تک لائے تھے اور اب ہسپتال تک پہنچے۔
ان کے ساتھی کی شکل سخت بھیانک تھی۔ بھورے رنگ کے سوٹ پر
جو دیوانگی کے دوروں کے باعث جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا ایک جیکٹ ناکر یا تھا
جو بڑے عرض کی زین سے بنا ہوا تھا۔ یہ کرتا اس کے بدن پر لپٹا ہوا تھا اس کی
لمبی بازو اس کے بازوؤں کو چھپا رہی تھیں جو اس کی پیٹھ کے پیچھے رسی سے بند
ہوئے تھے۔ اس کی سُرخ آنکھیں (دس دن سے وہ متواتر جاگ رہا تھا) شعلوں
کی طرح دھک رہی تھیں۔ پچھلا لبرازاں تھا۔ پیشانی پر بال گھوڑے کی
ایال کی طرح بکھر رہے تھے۔ وہ دفتر میں ایک کونے سے دوسرے کونے میں

اس کے لئے یہ دونوں مانتیں یکساں ہیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب؟
 ”نہیں تمہارا خیال شاید درست ہی ہے: ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اور اس
 کی حرکات کا شاہدہ کہنے کے لئے کہنے میں پری ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 مریض کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک تیز قدم اٹھاتا ہوا چکر
 لگاتا رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ اپنے لمبوترے سیپروں کو فرش کے ساتھ گھسیٹ رہا
 تھا۔ اور اپنی دھاری دار روتی ڈرائنگ گون کو ادھر ادھر لہراتا جاتا تھا۔
 ڈاکٹر کا معاون اور انسپکٹر جو اس کے ساتھ آئے تھے دونوں دروازے کی
 دلیز پر خاموش کھڑے تھے۔

”میرے دماغ میں ایک ایسا ہی زبردست خیال محفوظ ہے: مریض چلتے
 چلتے ٹھہر کر کہنے لگا۔ جب یہ میرے دماغ میں پیدا ہوا تو میں نے ایسا محسوس کیا
 کہ گویا میں دوبارہ جنم لے رہا ہوں۔ میرے حواس تیز ہو گئے اور میرا ذہن پہلے
 کی نسبت زیادہ کام کرنے لگ گیا اس سے قبل جن مسائل کو سلجھانے کیلئے میں
 گھنٹوں غور و فکر کیا کرتا تھا اب میں انھیں فوراً حل کر لیتا ہوں۔ دوسرے
 نفلوں میں میں نے غلطی کی انتہا یوں تک رسائی حاصل کر لی ہے میں اب اس
 فکر عظیم کا تجربہ کر رہا ہوں کہ زمان و مکان محض ایک قصہ ہے۔ میں ہر زمانے میں
 رہتا ہوں۔ میری جائے اقامت مکان کی سرحدوں سے بہت دور ہے،
 ہر ایک جگہ ہے یا کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ میری مرضی پر منحصر ہے چنانچہ میرے لئے
 یہ دونوں صورتیں یکساں ہیں کہ تم لوگ مجھے یہاں رکھو یا یہاں سے رخصت کر دو
 مشکلیں کس لویا کھلا چھوڑ دو۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ اس جگہ پر میرے ایسے
 بہت لوگ موجود ہیں مگر ان کے لئے یہ جگہ بہت بولناک ہے۔ آخر تم انھیں
 چھوڑ کیوں نہیں دیتے ہو؟ کون چاہتا ہے۔۔۔۔“

”تم نے ابھی ابھی کہا ہے: ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ کہ تم مکان
 کی سرحدوں سے بہت دور رہتے ہو مگر یہ چیز تم کو ہر حالت میں تسلیم کرنی پڑے گی
 کہ میں اور تم اس کمرے میں موجود ہیں اور اس وقت (ڈاکٹر نے جیب سے گھڑی
 نکال کر وقت دیکھا) ساڑھے دس بجے ہیں اور یہی سنہ اتحادہ سو کچھ کی چھ تاریخ
 ہے۔ اب بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟“

اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے لئے دونوں صورتیں یکساں ہیں کہ میں
 کس زمانے میں زندگی بسر کرتا ہوں یا کس مقام پر رہتا ہوں۔ جب میرے لئے
 ان میں کوئی فرق نہیں تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ہر جگہ پر ہوتا ہوں اور

ہمیشہ ہوتا ہوں۔“

ڈاکٹر نہیں بڑھا۔

”یہ بیہودہ منطقی ہے اس نے کرسی پر سے اٹھ کر چلتے ہوئے کہا: شاید تمہارا
 خیال درست ہو، اچھا خدا حافظ۔ ہاں مگر پیو گے؟“

”شکریہ“ کہہ کر مریض نے خاموشی سے نگار لیا اور اس کے ایک سرے کو
 دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ غور و فکر میں مدد دیتا ہے۔۔۔۔۔ یہ دنیا حقیقت
 ناگہم کو ذمہ ہے۔ ایک طرف کلیات ہیں اور دوسری طرف تیزاب۔ دنیائیں
 سعادت یی ہے کہ خیال و مقام عدم عناصر ایک دوسرے کے اثر کو زائل کرتے
 ہیں۔ غیر خدا حافظ ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ ان میں سے اکثر اپنے اپنے
 بستروں کے پاس کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی افسر اپنے ماتحتوں سے
 اتنا خراج توقیر و عزت وصول نہیں کرتا جتنا ایک اہل نفسیات ڈاکٹر اپنے دیوانے
 مریضوں سے وصول کر لے۔

مریض جواب کمرے میں اکیلا تھا کمزوری کے باعث لرزتا ہوا ادھر ادھر
 ٹپل رہا تھا۔ جب اس کے لئے چار لائی گئی تو اس نے کھڑے کھڑے دھڑکنے
 میں چار کا برتن خالی کر دیا۔ اور کوس کا وہ ٹکڑا جو چائے کے ساتھ آیا تھا منہ
 میں ڈالتے ہی نگل گیا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل کر بے پروا انداز میں چند
 گھنٹوں تک ہسپتال کی عمارت کے اندر چکر کاٹتا رہا۔

بارش کی وجہ سے فضا تم آلود تھی اس لئے مریضوں کو باغ میں جانے
 کی اجازت نہ تھی جب ڈاکٹر کا اسٹنٹ نے مریض کو تلاش کرتا ہوا آیا تو لڑائی
 نے غلام گردش کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پر وہ اس دروازے
 کے ایک شیشے کے ساتھ اپنا منہ جاملے ہوئے تھا جو باغ کی طرف کھلتا تھا اس
 کی تمام توجہ کام کرنا ایک سرخ پھول تھا۔ گل لالہ کی قسم کا ایک بچہ۔

”چلے صاحب! آپ کا وزن کر لے!“ ڈاکٹر کے اسٹنٹ نے اس
 کے کانٹے کو چھوتے ہوئے کہا۔

جب مریض اس کی طرف مڑا تو وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ اس
 کی آنکھیں خوفناک طور پر تنفر اور حسد و بغض کے جذبات سے دھک رہی تھیں
 ڈاکٹر کے اسٹنٹ کو دیکھ کر اس نے فوراً ہی اپنے چہرے کا رنگ بدل لیا اور کچھ کچھ بغیر
 اس کے ساتھ نہایت آرام سے چل پڑا گویا وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ وہ دونوں ڈاکٹر

کا حقیقی انسانی سر کر تصور کرتا تھا۔

ہسپتال میں ہر شخص کے ذمے کوئی نہ کوئی کام تھا اور وہ اس چیز کو ایک کا عظیم تصور کرتا تھا جس کا مقصد دنیا کے تمام معایب کو نیست و نابود کرنا ہے۔ گو اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ بدیوں کو کیونکر دور کیا جاسکتا ہے لیکن وہ خود اس کام کے لئے کافی و دافی قوت محسوس کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے خیالات میں نفوذ کر سکتا تھا۔ وہ ہر چیز کے باطن میں جھانک کر اس کی اندرونی کیفیات کا مطالعہ کر سکتا تھا مثال کے طور پر صحن کے دروازہ درخت اس کو اپنے تجربات کی تمام کہانیاں سناتے تھے۔ ہسپتال کی عمارت کو جو یقیناً پرانی و منح کی تھی۔ وہ پطرس اعظم کی تید کردہ سمجھتا تھا۔ اس کو یقین کامل تھا کہ جنگ پوتلوا کے دوران میں نزار پطرس، اس عمارت میں قیام پذیر تھا۔ علم اسے اس عمارت کی دیواروں، تنگ پتھر کاری اور اینٹوں اور ٹائلوں کے ان ٹکڑوں سے معلوم ہوا تھا جو باغ میں بکھرے پڑے تھے وہ ان پاس جگہ کی تمام تاریخ لکھی ہوئی پاتا تھا۔

قبرستان کے عجوبے احاطے میں اس کے خیال کے متعلق ایسے ہزار ہا لوگ اکابر تھے جو عرصہ ہوئے مرکب چکے تھے۔ وہ اس کو ٹھہری کی ٹھہریوں کے گرد و غمار سے اٹے ہوئے شیشوں کی طرف گھنٹوں کی گھنٹی گھمائے دیکھتا رہتا جو قبرستان کے ساتھ باغ کے ایک کونے میں بنی ہوئی تھی۔ ان شیشوں کے نامہوار اور توس قنبر کی طرح رنگین عکسوں میں اسے ایسے چہرے جھلکتے معلوم ہوتے جو یا تو زندہ انسانوں کے ہوتے تھے یا وہ تصویروں سے خلق ہوتے تھے۔

موسم اب بہت خوشگوار اور پیارا ہو رہا تھا۔ وہ دن بھر کھلی ہوا میں ٹہکتا رہتا۔ باغ کا وہ حصہ جو زمینوں کی سیر و تفریح کے لئے مخصوص تھا اس میں درخت کثرت سے لگے ہوئے تھے اور جہاں کہیں ٹھکن تھا پھولوں والے بوئے بھی لگائے گئے تھے۔ ہسپتال کا منتظم ہر مریض کو مجبور کرتا تھا کہ وہ باغبانی میں تھوڑا بہت جھد مزدور لے۔ چنانچہ سارا دن مریض روشوں پر بھاڑ دیتے۔ بوٹوں کو پانی پھینے اور اسی طرح کے دیگر کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

باغ کے ایک کونے میں بیروں کے درخت تھے۔ دوسرے کونے میں ٹالوٹوں کا ایک جھنڈ تھا۔ درمیان میں ایک مصنوعی ٹیلے پر بڑے پیارے پھولوں کی کبیاری بنائی گئی تھیں۔ سب سے اوپر والی کبیاری میں شوخ رنگ کے پھل کھل رہے تھے درمیانی جگہ پر گل کوکب کا ایک نادر پودہ تھا اس کا پھول بیچ میں سے زرد اور بیرونی پتھر یاں عنابی رنگ کی تھیں۔ یہ مقام باغ کا مرکز اور اس جمن کی دلکش

کے پرائیویٹ کمرے میں لے گئے۔ مریض خود بخود تراد کے چوتھے پر چڑھ گیا ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اس کا وزن کر کے اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا یہ ایک سو نو پونڈ تھا۔

جب دوسرے روز اس کا وزن کیا گیا تو ایک سو سات پونڈ تھا اس سے دوسرے دن یہ ایک سو چھ رہ گیا۔

اگر وزن اسی طرح گرتا رہا تو اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا اور اسے ہدایت دی کہ مریض کو مقوی بادویات اور غذائی جلے۔ مگر زیادہ خوراک اور ادویات کے باوجود وہ روز بروز بدلا ہوتا گیا۔ اور ڈاکٹر کے اسسٹنٹ کی نوٹ بک میں اس کے وزن میں ہر روز ایک پونڈ کمی ہوتی رہی وہ رات کو ایک لکے کیلے بھی نہ سوتا تھا۔ اور دن بھر حرکت کرتا رہتا تھا۔

اس کو معلوم تھا کہ وہ پاگل خانے میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ بعض اوقات وہ پہلی شب کی طرح آدمی رات کے سائے میں جاگ پڑتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ اس کی تمام ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور اس کا سر بہت دھڑکی ہو گیا ہے۔ مگر وہ اس وقت بہت باہوش ہوتا تھا۔ اس کی وجہ شاید رات کے سکون میں خیالات و افکار کی غیر موجودگی تھی یا شاید اس لئے کہ نیم خوابی کی حالت میں اس کا دماغ بہت کمزور ہو گیا ہوتا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ان لمحات میں وہ اپنی حالت سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ گویا وہ ہم ایسا خوشنما انسان ہے مگر پوچھتے ہی ہسپتال میں مریضوں اور ملازموں کی بیداری کا شور اور دن کی تیز روشنی اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا کر دیتی اور پھر اس کے جنون سوار ہو جاتا تھا۔

اس کا دماغ مقبولیت اور بیہودگی کا ایک عجیب و غریب اجتماع تھا۔ وہ اتنا سمجھتا تھا کہ اس کے آس پاس سب مریض ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ خیال کرتا تھا کہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کو وہ ابھی ارج مانتا ہے یا ان کے متعلق اس نے کسی سے سنا ہے یا کسی کتاب میں پڑھا ہے اور یہ صرف اسی لئے وہ اس سے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہسپتال میں تاریخ کی سب قوتوں اور سب ناموں کے لوگ آباد ہیں۔ کچھ وہ جو مر چکے ہیں۔ کچھ وہ جو زندہ ہیں، دینکے اکابر، بادشاہ اور وہ سپاہی جو گذشتہ جنگ میں کھیت لے تھے اب دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ وہ کسی دائرہ سحر کے درمیان گھرا ہوا معلوم ہوتا تھا اور خود بینی کے دھند میں اگر بعض اوقات وہ اپنے آپ کو اس دائرے

ترین جگہ تھی اور دیکھا گیا تھا کہ اکثر مریض اس کو بہت پر اسرار مہیت دیتے تھے۔
سٹریٹس کی نظروں میں بھی یہ جگہ غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ گویا یہ سب
جگہ کا تاج ہے۔

رنگوں کے ساتھ ساتھ پھول کھل رہے تھے۔ یہ بونے مریضوں نے اگلے تھے
اس جگہ پر قریب قریب وہ تمام پھول موجود تھے جو ایک روکی باغ میں مل سکتے تھے۔
گلاب، شبنم، قبا کو کی جھاڑیاں جن پر اودے رنگ کے پھول کھتے ہیں، انٹر
چیمیلی، گل لالہ، غرض کہ ہر قسم کے پھول موجود تھے۔ پھانک کے پاس گل لالہ کی
ہر قسم کے تین پلوے لگے تھے۔ ان کے پھول عام قسم کے پودوں کے پھولوں
بہت چھوٹے تھے۔ ان کا اتنی زری نشان ان کے غائبی رنگ کی غیر معمولی شوخی تھی
انہیں پودوں کے ایک پھول نے نئے مریض کی توجہ کو خاص طور پر اپنی طرف
منحرف کر لیا تھا جب ہسپتال میں داخل ہونے کے پہلے روز اس نے دھماکا
کے شیشے میں سے باغ کی طرف جھانکا تھا۔

جب وہ پہلی مرتبہ باغ میں آیا تو وہ بیڑیوں پر ٹھک کر ان شوخ رنگ کے
پھولوں کی طرف نظریں گاڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ یہ پھول صرف دوتھے جو محض اتفاقیہ
طور پر دوسرے پھولوں سے بہت پرے ایک کونے میں ناہوا لگا اس اور سرگرد
کے درمیان لگے ہوئے تھے۔

پھانک کے باہر مریض قطار بانہ کر کھڑے ہو گئے۔ وارڈوں نے جوان کے
پاس ہی کھڑا تھا ان سب کو ایک ایک سوئی ٹوپی تقسیم کر دی جس کے ماتھے پر سرخ
صلیبی نشان بنا ہوا تھا۔ یہ ٹوپیاں دوران جنگ میں فوجی ہسپتال میں استعمال
کی گئی تھیں اور نیلام پر خریدی گئی تھیں۔ نئے مریض نے جو اپنے خیالات میں
غرق تھا اس ٹوپی کے سرخ صلیبی نشان کو بہت پر اسرار خیال کیا اس نے
اپنی ٹوپی اتاری اور اس کے سرخ نشان کو بغور دیکھنے کے بعد گل لالہ کی طرف
دیکھا۔ پھول ٹوپی کے نشان سے زیادہ شوخ رنگ تھا۔

”میدان اسی کے ہاتھ ہمارے مگر پھر کیا ہوا؟“ دیکھا جا گیا۔ اس نے اپنے
آپ سے کہا۔

”یہ کتنا ہوا وہ بیڑیوں پر سے اتر کر تپتے باغ میں آیا اور دارڈر کی موجودگی
کی پروا نہ کرتے ہوئے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے ایک کیاری پھانڈ کر اس
اس سرخ پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ اس کو توڑنے کا ارادہ نہ کر سکا اس
اپنے بڑے ہونے والوں میں ایک غلط اور ملن سی محسوس کی جو رفتہ رفتہ اُس کے

تمام جسم پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پھول کے غائبی پتھریوں سے کسی
نامعلوم طاقت کی روح خارج ہو کر اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر رہی ہے وہ
ذرا اور آگے بڑھا اور پھول توڑنے کے لئے اپنا ہاتھ اور آگے بڑھایا مگر اس کو ایسا
معلوم ہوا کہ وہ پھول اپنے آپ کو پھانڈنے کے لئے ایک خطرناک قسم کی زہریلی اور
بدبودار گیس چھوڑ رہا ہے۔ اس پر اس کا سر ہلانے لگا۔ اس نے اسی حالت میں
آخری مرتبہ پھول کو توڑنے کی زبردست کوشش کی لیکن ابھی اس کا ہاتھ ڈبڑی
تک ہی پہنچا تھا کہ دفعتاً ایک وزنی ہاتھ نے اس کے کاندھے کو پکڑ لیا۔ یہ
دارڈر کا ہاتھ تھا۔

”پھول کو توڑنا اور کیاریوں کو زخمی نہ کرنا منع ہے ہمارے ہیں تم ایسے
بیموں پاگل ہیں اگر ان میں سے ہر ایک پھول توڑنے لگے تو یہاں بالکل اجاڑ
ہو جائے۔“ پورے دارڈر نے اس کے کاندھے پر سے ہاتھ نہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

اس پر مریض نے دارڈر کے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اس
کی گرفت سے آزاد ہو کر بڑے اضطراب سے قدم اٹھا تا ہوا روش پھیل گیا۔
”آہ قیمت لوگو“ اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ ”تھیں کچھ بھائی نہیں دیتا
تمہاری بصارت اس قدر کمزور ہے کہ تم خواہ مخواہ اس پھول کی حفاظت کر رہے
ہو۔ کچھ بھی ہو مگر میں اس کو ضرور تباہ کر دوں گا۔ آج نہیں کل ہم اپنی قوت کا انداز
لگائیں گے اور اگر اس کوشش میں میں فدا ہو گیا تو یہ کون سی بڑی بات ہے؟“

دن بھر وہ باغ میں گشت گزرتا رہا۔ وقت کاٹنے کے لئے کچھ وہ ایک مریض
کے ساتھ تیس شروع کر دیتا اور کبھی دوسرے مریض کے ساتھ ٹھننے لگتا تھا جب شام
کی تاریکی چھلنے لگی تو اس کا یقین حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اس نے دل ہی دل
میں یہ کہا۔ اب سب کام تیار ہے؟ اس کو یقین تھا کہ اب ہسپتال کے آہنی سلاخوں
والے دروازے گر پڑیں گے اور سب مصیبت زدہ لوگ بھاگ نکلیں گے۔ تمام دنیا
لرز کر اپنا پناہاں اتار دیگی اور نئے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔

ان خیالات میں کھویا ہوا وہ پھول کو قریب قریب پھول گیا۔ لیکن جو پہلی
دہ باغ چھوڑ کر بیڑیاں چڑھنے لگا تو ایک بار پھر اس کی نگاہیں ان دو سرخ
پھولوں کی طرف پڑیں جو گہنی اور شبنم آلودہ گھاس کے درمیان لگے ہوئے
تھے۔ وہ ٹھہر گیا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی قطار سے علیحدہ ہو کر دارڈر
کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور کسی اچھے موقع کا انتظار کرنے لگا۔ کیاری پھانڈ کر اس
سے ایک سرخ پھول توڑ کر اس نے اپنے کرتے کے دامن میں چھپا لیا۔ یہ

انحصار تماشیر میری خوداک ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آج کل میں قطعاً سو نہیں رہا ہوں۔
”کھاؤ بجے آدی کھاؤ اور جلدی جلدی ٹکڑے ہو جاؤ۔“ تاہاں اس کی
”مجھ اور وہ ٹی دیدیتا۔“

وہ برتنوں کے سامنے بیٹھ گیا اور لے کی ایک پیٹ ڈٹ کر کھانا شروع
کر دی۔ جب سب مریض کھا کر فارغ ہو چکے اور منتظم نے دیکھا کہ وہ ابھی تک کھانے
چلاھا رہا ہے تو اس نے اس سے کہا۔ ”بس کر دیاں اب بس کرو۔ پڑھنی کی کتا
مول لے لگے۔ خیال رہے۔“

”آہ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ انہوں نے مجھے کتنی طاقت کی ضرورت ہے؟
کتنی قوت درکار ہے۔ اچھا خدا حافظ کو لائی کو لیج۔“ یہ کہہ کر مریض اٹھا اور بڑے
تپاک سے منتظم کا ہاتھ دیا۔ ”خدا حافظ۔“
”مگر اب جا کہاں رہے ہو؟“ منتظم نے سکر اکراں سے دریا کیا۔

”میں اب؟ کہیں نہیں، یہیں ٹھہر چکا۔ لیکن شاید کل ہم ایک دوسر
سے مل سکیں گے، آپ کی عنایات کا شکریہ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پھر ایک بار منتظم
کا ہاتھ دیا۔ اس کی آواز تھرا گئی، دوسری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔

”حوصلہ کر دیاں حوصلہ کرو“ منتظم نے اسے دلاسا دیا۔ ”آخر ایسے تاریک
خیالات سے فائدہ؟ جاؤ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔“ تمیں بہت بہت نا
چاہئے۔ یہ تمہارے لئے بہت فائدہ بخش ہوگا۔“

مریض ردی آواز میں کچھ بڑبڑایا۔ منتظم اس کو چھوڑ کر نوکروں سے میزوں
کے برٹن صاف کرانے میں مشغول ہو گیا۔

نصف گھنٹے کے بعد ہسپتال میں سوائے اس مریض کے اور سب محو خواب
تھے، اپنے کمرے کے ایک کونے میں بستر پر کپڑے اٹکے بغیر لیٹا تھا۔ اس کے
جسم پر کڑھ طاری تھا گویا اس کو بخار چڑھ رہا ہے۔ وہ بار بار سینے پر اپنی مٹھیاں
بہینچتا تھا اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چھاتی میں کوئی بہت ہی ہریٹلی
ادگر نام نہان سرایت کر گئی ہے۔

راہب بھراں نے ایک لمحے کے لئے آنکھ نہ چپکی۔ اس نے بھول کو صرف
اس لئے توڑا تھا کہ اس کے خیال میں یہ فعل ایک بہت بڑا معرکہ تھا جس کو انجام
دینے کے لئے وہ مجبور تھا۔ جب اس نے اس بھول کو پہلی مرتبہ دروازے کے
شیشوں میں سے نگاہ کر دیکھا تھا تو سرخ پتھر یوں نے اس کی توجہ کو اپنی طرف

شخص نے نہ دیکھا۔ جب اس کے پیٹ کے ساتھ اس بھول کی شہم آلود پکھیریاں
سہ نہیں تو اس کا رنگ لاش کی طرح زرد ہو گیا اور فرط خوف سے اس کی
آنکھوں کی پتلیاں بھول گئیں۔ سرد پسینے کے قطرے اس کی پیشانی سے ٹپٹپ
کرنے لگے۔

ہسپتال میں لمپ روڈن تھے اکثر مریض اپنے اپنے بستروں پر لیٹے کھاتے
کا انتظار کر رہے تھے مگر چند بے صبری سے کمروں اور فلام گردش کے چکر کاٹ
رہے تھے۔ بیمار مریض بھی ان میں شامل تھا۔ وہ مٹھیاں پھینچتے پھرتے اپنے بازو کی
چھاتی کے ساتھ اس زور سے گھٹکے پھرتے اور اوپر چل رہا تھا۔ گویا وہ اس بھول
کو دبا کر اس کی جان نکال دینا چاہتا ہے جو اس نے اپنے کمرے کے پتھے چھپایا
ہوا تھا۔ جب کوئی شخص اس کے پاس سے گذرتا تو بڑی احتیاط سے پرے ہٹ
جاتا وہ اپنی احتیاط کرتا کہ اس کے کمرے کے دامن کے ساتھ بھی نہ چھینے پائے۔

”میرے نزدیک نہ آنا، میرے نزدیک نہ آنا“ وہ چلا پڑتا مگر ہسپتال میں
لوگ اس کی اس جھج پکار کوئی کان نہ دھرتے۔ وہ اسی طرح کل دو گھنٹے بے
لبے قدم اٹھتا اور ہر جگہ پکارتا رہا۔

”میں تم کو فنا کر دوں گا۔ تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔“ وہ بھول سے مخاطب
ہو کر وقتاً فوقتاً بڑے خوفناک اور منتقم لہجے میں کہتا رہا۔ کبھی کبھی وہ غصے میں
اپنے دانتوں کو پیسنے بھی لگ جاتا۔

کھانا ڈریسنگ روم میں چنگیا۔ لمبی اور تنگی میزوں پر بہت سی چوبی اور
روغن شدہ تھالیوں پر تھیں جن میں پیلا دلیا دیا گیا تھا۔ مریض ان میزوں
کے قریب بچوں پر بیٹھ گئے اس پر ہر ایک کو سیاہ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا بانٹا گیا
ہر آٹھ مریضوں کے لئے شوربے کی ایک ایک تھالی مخصوص تھی جس کو وہ چوبی بچوں
سے روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔

وہ چند مریض جن کو نسبتاً اچھا کھانا دیئے جانے کی اجازت تھی ان سے
علقہ ہمارے مریض لے وہ کھانا جلدی جلدی گل لیا جو دار در اس کے کمرے میں
لایا تھا اور اس سے مطمئن نہ ہو کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

”مجھے یہاں کھانے کی اجازت دی جائے۔“ اس نے منتظم سے کہا۔
”کیا تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے؟“ منتظم نے اس کے لئے تھالی
میں کھانا چھتے ہوئے کہا۔

”مجھے سخت پیچ لگ رہی ہے اور مجھے اپنی صحت برقرار رکھنا ہے اور اس کی

ہند بک گیا تھا اس وقت اس نے محسوس کیا تھا کہ بھری دنیا میں سے صرف وہی کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ دنیا کے تمام مصائب ہر سرخ پھول میں جمع ہو گئے ہیں۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ان پھولوں سے انیون تیار ہوتی ہے اور شاید یہی چیز تھی جس نے اس کے دل میں جگہ پکڑ کر ایسے خطرناک دہم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اس پھول نے دنیا کی تمام بدیوں کو اپنی پتھریوں میں پتہ دے رکھی تھی اور وہ خیال کرتا تھا کہ اس کی پتھریاں صرف اسی لئے سرخ ہیں کہ وہ معصوم لوگوں کے خون اور مصیبت زدہ انسانوں کے آنسوؤں سے آلودہ ہیں۔

اس کی نظروں میں یہ پھول جو بظاہر نہایت ہی معصوم اور بے غرر تھا فحشاء کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو توڑ کر فنا کر دیا جائے مگر یہ تو کام ایک حصہ تھا۔ اس کو یہ بھی دیکھنا تھا کہ کہیں یہ پھول اپنی زہریلی گیس پھونکنے پر کامیاب نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کو اپنے کونے کے پیچھے سینے کے مقام پر دبا رکھا تھا۔ اس کو امید تھی کہ صبح ہونے پر اس پھول کا تمام زہر پلا اور فاسد مادہ مردہ ہو جائیگا یعنی وہ اس کے جسم میں داخل ہو جائیگا۔ اور وہاں نیکی اور بدی میں کشمکش ہوگی جو اس میدان میں جیتنے کا وہ غالب رہیگا۔ پھر وہ خود فنا ہو جائیگا مگر اس کی یہ موت بے اثر نہ رہے گی۔ وہ ایک ظفر مند سپاہی کی طرح جان دیگا۔ سپاہی جو انسانیت کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ اس لئے کہ اس سے قبل کسی شخص نے تنہا دنیا کی تمام برائیوں کو کچلنے کی ایسی غیر معمولی جرات نہ کی تھی۔ وہ برائیوں کے اس مخزن کو نہ دیکھ سکے مگر اس نے اس کو دیکھ لیا۔ اب میں اس کو فنا کئے بغیر کوئی نہ کر سکتا ہوں۔ موت آتی ہے تو کئے۔ وہ ایک عرصے تک اس دہم میں غلطیاں دیکھاں بستر پر کوٹیں لیتا رہا۔

صبح ہونے پر ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اس کو شکل سے سانس لیتے ہوئے پایا مگر فوراً ہی اس پر دیوالی کا دورہ ہوا اور وہ اضطراب کی حالت پر بستر پر سے کود کر باہر صحن میں چلا گیا اور دوسرے مریضوں سے پہلے سے بہت بلند آواز اور بڑا غیر مربوط انداز انداز میں گفتگو شروع کر دی اس کو باغ میں جلنے کی اجازت تھی اس لئے وہ صحن ہی میں ٹھہرا رہا۔

جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کا وزن دن بدن کم ہو رہا ہے اور وہ رات کو ایک لمحہ کیلئے بھی آنکھ نہیں جھپکتا بلکہ چوبیس گھنٹے حرکت کرتا رہتا ہے تو اس نے حکم دیا کہ اس کو انیون کے جوہر کا ایک تیز ٹیکہ لگایا جائے۔

مریض نے ٹیکہ لگوانے وقت کسی قسم کا شور برپا نہ کیا۔ خوش قسمتی سے اس کے دیوانے خیالات اس وقت اس عمل سے موافقت رکھتے تھے۔ وہ بہت جلد مر گیا اس کی وحشیانہ حرکات بند ہو گئیں اور وہ شور جو اس کے کانوں میں برپا تھا اس کی مضطرب چال کے لئے سرنال کا کام دیتا تھا خاموش ہو گیا۔ وہ بیہوش ہو کر ہر ایک چیز کو بھول گیا حتیٰ کہ اس پھول کو بھی جس کو اسے توڑنا تھا۔

مگر تیسرے روز جب اسے ہوش آیا تو اس کو اپنا ارادہ فوراً یاد آ گیا اور وہ اس بوڑھے دارڈر کی پروا نہ کرتے ہوئے جو اس کے پلنگ کے قریب کھڑا تھا اٹھ بھاگا۔ دارڈر نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ فوراً ہی دوڑتا پھاندا باغ میں پھوپھا اور ایک ظفر مندا نعرہ لگاتے ہوئے پھول کو توڑ کر اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔

”تم پھولوں کو کیوں توڑتے ہو؟“ دارڈر نے دہاتے ہوئے اس سے فست کیا مگر مریض آتے ہی بستر پر لیٹ گیا تھا اور سینے پر اپنے دونوں بازوؤں کو جوڑے اس قدر دہائی تباہی بک رہا تھا کہ دارڈر صرف اس کے سر سے سُرخ نشانی والی لونی اتار کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب اس کے دہم کی کشمکش پھر شروع ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ پھول میں سے بدی کی لابی لابی دھاریں نکل رہی ہیں جو سانپوں کی طرح رنگ کر اس کے جسم سے پلٹ رہی ہیں اور اس کو اپنے سینے میں کس کر اور اس کے بازوؤں کو دبا کر اس کے بدن میں اپنا خوفناک زہر پلا دے گا داخل کر رہی ہیں اس نے دنا شروع کر دیا اور گالیوں کے ساتھ ساتھ جو وہ اپنے اس دشمن کو دے رہا تھا وہ دعا بھی مانگتا رہا کہ خدا اسے اس شر سے محفوظ رکھے۔

شام کے قریب جب پھول کی پتیاں مرجھا گئیں تو اس نے سیاہ شدہ پھول کو اپنے کونے کے پیچھے سے نکالا اور بوٹ سے اچھی طرح اس کو کچل دیا پھر وہ اس کچلے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھا کر غسلی نے میں چلا گیا۔ یہاں اس نے پھول کے باقی ماندہ اجزاء کو انٹیکسی کے دھکنے ہوئے سرخ انگاروں پر پھینک دیا اور اپنے دشمن کو آگ پر جلتے۔ سکوڑتے چڑھاتے اور آخر کا ایک سفید راکھ میں تبدیل ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے اس راکھ کو بھونک سے اڑا دیا۔ اب پھول قطعی طور پر مگ ہو گیا۔

دوسرے روز اس کی حالت بہت سے ابتر ہو گئی اس کے چہرے کا رنگ خوفناک حد تک زرد پڑ گیا۔ کان اندر کو چپک گئے اور آنکھیں دھنس گئیں۔ مگر وہ اس کے

باد صفت دیوانہ وار دھڑ دھڑ گھومتا رہا۔ گو اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے اور اس کا بدن پیٹنے میں نہایا ہوا تھا مگر اس نے اپنی غیر ختم کھٹکوبند کی اور بوتا رہا۔
میں نہیں چاہتا کہ اس پر کسی قسم کی زبردستی کی جائے۔ بڑے ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

مگر ڈاکٹر صاحب ہمیں اس کی نہ ختم ہونے والی حرکات بھی تو بند کرنی ہیں اس کا وزن صرف ۹۳ پونڈ رہ گیا ہے۔ اگر اس کا وزن اسی بقدر سے کم ہو جائے تو مجھے بدیشہ ہے کہ وہ صرف دو تین دن ہی اور زندہ رہیگا۔

ڈاکٹر نے مجھ پر سوچا اور نیم سو الیہ میں کہا۔ تو پھر فریادیں کھولیں۔
کل مارڈیا کے ٹیکے کچھ اثر نہیں کیا۔

”تو اس کی خشکیں کس کر جا رہی ہیں پر لٹا دو۔۔۔۔۔ شکل ہی معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اچھا ہو سکے گا۔“

چند دن اس کی خشکیں کس لی گئیں۔ اب وہ پٹنگ کے آہنی ڈنڈوں کے ساتھ جکڑا ہوا ایک لباس کرتے پہنے لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی جنونی حرکات کم نہ ہوئیں۔ بہت عرصہ تک بہت عرصہ تک اپنے آپ کو اس بند من سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر کار اس نے ایک زبردست جھٹکے سے اپنی ٹانگیں چھڑا لیں پھر اس نے دوسرے بندھنوں سے آزاد ہو کر کمرے میں ٹھنڈا دھواں اور شور برپا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ بھی ٹک بندھے ہوئے تھے اور وہ ان کو آزاد نہ کرا سکتا۔

”آہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟“ دارڈر اس کو اس طرح آزاد اور شور برپا کرتے دیکھ کر چلا یا۔ ضرور شیطان نے تمہاری مدد کی ہے۔۔۔ اے گریٹیکا۔۔۔ ایوانا ہر آیدو۔۔۔ اس دیوانے نے سب زبیاں توڑ لی ہیں۔“

دونوں کو کر بھگتے ہوئے آئے۔ اب ایک طویل جنگ شروع ہو گئی جو پتہ ان کے ملازمین کے لئے باعث تکان اور مرہن کے لئے سخت اذیت رساں تھی جو اپنی قوت کا آخری ذرہ تک اس میں صرف کر رہا تھا۔ انجام کار ملازموں نے بڑی مشکل کے بعد اس پر قابو حاصل کر لیا اور اس کو بستر پر لٹا کر پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اس کو کس دیا۔

”آہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟“ اس نے ہانتے ہوئے ان لوگوں سے کہا۔ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ میں نے تیرا پھول دیکھا ہے پوری طرح کھلا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ کھل چکا ہوگا۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔ مجھے

مجھے اس پھول کو تباہ کر دینا چاہیے۔ مار دینا چاہیے۔ ہلک کر دینا چاہیے۔ پھر بے بدی کا غنا تم ہو جائیگا۔ ہر ایک شخص کی جان بچ جائیگی۔ میں تم لوگوں کو ہی۔ پھول تو ڈنڈے کے لئے بھیج دیا مگر معیت یہ ہے کہ یہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ تم تو اس کو ہاتھ لگاتے ہی مر جاؤ گے۔“

”خاتون رہے منہاں خاتون رہے۔ بڑے دارڈر نے جو اس کی گدھا پر مامو تھا اس سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

اس پر مرہن دختہ خاموش ہو گیا۔ اس نے دارڈر کو دھوکا دینے کا ارادہ کر لیا اس روز وہ سارا دن اور ساری رات اسی حالت میں پٹنگ کے ساتھ جکڑا رہے۔ یا گیا۔ شام کا کھانا کھلانے کے بعد دارڈر نے فرش پر ایک چٹائی پھیلا دی اور اس پر لیٹ گیا اور لیٹے ہی سو گیا۔ یہ دیکھ کر مرہن نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے اپنے بن کو حرکت دینا شروع کی حتیٰ کہ وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنی

کلائیوں سے پٹنگ کے آہنی ڈنڈے کو محسوس کر سکے وہ اس کپڑے کو جس سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس ڈنڈے کے ساتھ بڑے زور سے رگڑنے لگا۔ خود سے عرصہ کے بعد وہ کپڑے کی گانٹھ ڈھیلی ہو گئی اور وہ اپنی ایک اٹلی باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب باقی کام بالکل آسان تھا اس نے کمال چاکر دیا اور چالاکی سے جو کسی بو شمن انسان کا حصہ ہو سکتی ہے اس گانٹھ کو کھول لیا جس سے اس کی کلائیوں میں پٹنگ کے پچھے بندھی ہوئی تھیں۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ ایک عرصہ تک بڑے دارڈر کے خراٹوں کو سنتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اپنی جیکٹ اتار دی۔
— اب وہ بالکل آزاد تھا۔

بستر سے اٹھ کر وہ دروازے کی طرف گیا مگر وہ اندر سے قفل تھا اور چابی یقینی طور پر بڑے دارڈر کے جیب میں تھی اس خوف سے شاید بڑے دارڈر جاگ پڑے اس کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس کی جیب ٹٹوے۔ چنانچہ اس نے کمر کی میں سے بائیں کھٹکے کا تھپہ کر لیا۔

رات تاریک، گرم اور پرسکون تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ سیاہ آسان پرتلے چمک رہے تھے اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ان مانوس اجرام فلکی کو پہچانتے ہوئے وہ اس خیال سے بہت سرد رہا کہ وہ اسے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آنکھیں جھپکتے ہوئے روشنی کی ان غیر ختم کروں کو دیکھا جو تارے اس کی طرف بھیج رہے تھے اس اس کا

اُن کا انتظار

سحبان الہند علامہ کیفی چوہدری کوٹی ،

(۱)

رات وہی ہے، دن وہی، جوشِ انتظار میں
ذوق کے اعتبار سے جور کا اب تپہ نہیں،
لیجئے! فرق آگیا، گردشِ روزگار میں
اور وفا کے شوق میں جبر ہے اختیار میں
کوئی ہے انتظار میں، کوئی ہے اعتبار میں
یاد کسی کی دل میں ہے رنگِ نشاط کا
مستِ مشام ہو گیا، پھول کھلے بہار میں

باغ یہی ہے وہ نہیں نام بھی جس میں حنا کا
جحر میں جو نمود ہے، رنگ یہاں ہے پیار کا

(۲)

کان ادھر لگے ہوئے آنکھ اُدھرا ٹھی ہوئی
پاؤں کی چاپ ہر گھڑی ایک ٹھک ہے سانس کی
اور جبین آرزو جانبِ درجہ کی ہوئی
شکلِ قدم کے نقش کی قلب میں ہے بنی ہوئی
پیک خیالِ شوق کا راہ میں لہری کو ہے
”لیجئے اب وہ آگے“ ایک ہی رٹ لگی ہوئی
آنکھ زمیں بنی ہوئی اور نظرِ پچی ہوئی

پاؤں کو چومتا ہوا شوق جو اُن کو لائے گا
جان اگر طلب کرے آج تو اُس کو پائے گا

(۳)

ایک وہی پیرِ رخ ہیں اور جہاں ہے انجن
رنگ وہی ہے پھول میں پھول بھی حاصلِ چمن

ماہ میں ٹھنڈ ہی روشنی ان کے ہی تم ہم سے
صبح کی دلفریبیاں، شام کی خوش نمایاں
ہر کے آئینہ میں بھی عکس انہیں کا ضو فلکن
زنگ شفق میں ہیں ہی جسٹن انہیں کا ہر کرن
روح کا وہ قرار ہیں عیش کی وہ بہار ہیں
ہر کا وہ شکار ہیں قہر ہے ان کا بانچن

پائے خرام ناز ہے ان کا جہان آرزو
جسم ہے آرزوئے دل، اس میں وہ جان آرزو

(۴)

ایک انہیں کی ذات میں حال کائنات ہے،
خوف نہ ہو گناہ کا تو میں انہیں غذا کہوں
پاؤں میں ان کے خاک ہے یا وہ مری جاتے
اور میں ان کو کیا کہوں لاکھ میں ایک بات ہے
آنکھ سے میری دیکھئے میری ہی ل سے پوچھئے
ایک انہیں کا دیکھنا حاصل شش جاتے
عشق کی شرع میں سنا قول ہے مستند یہی
ایک انہیں کی رہبری میرے لئی نجات ہے

باب پر ان کے شوق کے خم یہ سر نیاز ہے
اور ادا جو ہو سکے دل کے لئے نماز ہے

(۵)

جوش میں اضطراب ہے شوق میں سچ و تاب ہے،
راز کی بات ہے مگر میں کہوں تو کیا کروں
اور کہوں تو کیا کہوں؟ حال مرا خراب ہے
شوق جو جاگداز ہے زیت بھر خدا ہے
رات جو ہے تو کوہ غم، دن ہے تو محشر الم
ہجر کے بس میں پڑ گئی جان کا کیا حساب ہے
ہجر میں کل بدل گیا ہائے نظام زندگی
جان میں اضطراب ہے، طلب میں التماس ہے

یاد ہے مجھ کو قول یہ کیفی عزم نواز کا،
حسن و جمال دلنشیں شمع میں ہے گداز کا،

شاہی عید کا جلسہ

ایک تاریخی مضمون،

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

آخری شاہ اودھ جان عالم حضرت محمد واجد علی شاہ آخر کا سالانہ عید جو لکھنؤ میں بڑا بادشاہت تھا اس کا ذکر تو بار بار ہوتا رہا لیکن بعد فدا سلطنت جب سلطان عالم کلکتہ میں شریف لائے اور صاحب قید و بند سے نجات پائی تو دل پہنے کا سالانہ کافی نہ تھا۔ ہر وقت طبیعت گہرائی تھی۔ سلطنت اودھ کی یاد چھین کر تھی۔ سوچی کھولا عرف میا بھن میں کوٹھی عالی شان خرید کی اور بہت سے محل بنوائے۔ سلطان خانہ تعمیر ہوا۔ نور محل بنوایا۔ تفریح بخش، فرحت منزل۔ تاج منزل۔ غلوت منزل۔ دولت منزل۔ جشن منزل۔ نشاط منزل۔ بیت السرور۔ جواہر منزل۔ بادشاہ منزل۔ قصر المنزل۔ فلک سیر گوشہ شہنشاہ منزل۔ حسن منزل۔ اسد منزل۔ زرد کوٹھی۔ رادھا منزل۔ باروا منزل۔ پری منزل۔ نور منزل۔ شمشٹ منزل۔ بارغ دلکش۔ بارغ فلک۔ سلطان بارغ۔ ہائیوں بارغ۔ گلستان ادم۔ خاص منزل تیار ہوئے۔ اس کے بعد حضور نے اپنے دل پہنے کے واسطے رہس کا آغاز کیا اور رہس وایاں مقرر ہوئیں ان کی تنخواہیں ملے کر کے ان سے متعہ کیا تاکہ نامحرم پر نظر نہ پڑے۔ عید کے روز شہب بھر رادھا کھینچا رہس کھیلایا جائے جس کا آغاز اس طرح ہوا رہس ڈالیاں سمب ساردا منزل میں۔۔۔۔۔ رہتی تھیں اور ان کے کمرے الگ الگ ہوتے تھے۔ یہ رہس صرف بادشاہ، شہزادی، شہزادیاں اور اعزا و اقارب اور محلات کی خوشی کے واسطے ہوتا تھا اور صبح تک ہوتا تھا۔

طریقہ یہ تھا کہ پہلے ملکہ محمدہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحب مع خدم و حشم شریف لاتی تھیں۔ پھر حضور ملکہ عالیہ ملکہ اودھ رونق آرا بیگم نواب آخر محل صاحبہ رونق افروز ہوئیں۔ ملکہ تاج النساء۔ معشوق محل صاحبہ۔ ملکہ شاہ زمانہ

نواب دل آرا بیگم۔ ملکہ مرتن افسر النساء بیگم عرف نشلا محل صاحبہ۔ ملکہ مینن، نواب اچھی بیگم صاحبہ۔ ملکہ زمانہ مہدی بیگم صاحبہ۔ نواب واجد محل بیگم صاحبہ شہزادہ محل نواب گیہان بیگم صاحبہ۔ نواب یادگار محل۔ فخر محل۔ طاقت محل۔ محبوب محل۔ نواب فخر محل صاحبہ۔ نواب نعل محل صاحبہ۔ الفت محل۔ نواب صاحبزادی بیگم صاحبہ، نواب شباب محل صاحبہ وغیرہ وغیرہ رونق افروز ہوئیں۔ پھر بیویں شریف لائیں۔ ملکہ ذیہ النساء بیگم صاحبہ۔ نواب بادشاہ بہو صاحبہ۔ نواب سرت آرا بیگم صاحبہ۔ نواب حضور بہو صاحبہ۔ نواب ملکہ عظم تاج عالم ملکیں جہاں مریم دوساں نیاہات النساء بیگم صاحبہ۔ نواب شہر یار بہو صاحبہ۔ پھر داماد بادشاہ نواب تاجدار دولہا۔ نواب شہر یار دولہا صاحبہ وغیرہ پھر مرد زادے شریف لائے۔ پھر رہس وایاں اپنے اپنے مقام پر آگئیں پردہ بڑ گیا۔ یہ سب کھینچا رہس کی ایکڑ ہیں۔ نواب حبیبستان بیگم صاحبہ کھینچا کاپارٹ کرتی تھیں۔ گستاخ پشوا زہنا۔ گلو بند کار چوبی باندھا۔ مکش کار چوبی گنگا۔

نواب دہرا فروز بیگم صاحبہ نے رادھا کاپارٹ کیا۔ تھ پہنی۔ بینہ گائی۔ تمام ہندوانی زیور پہنے پھر گھنچا پشوا زہنی۔ چاندی کی بانسری ہاتھ میں لکڑی تیار ہو گئیں۔

زعفران پری، یعنی نواب ہادی بیگم صاحبہ جو فن و قاصی و موسیقی میں بہت مہارت رکھتی تھیں۔ کار چوبی دو چر گھلے جامہ حسن پر زربہنا۔ ہر قسم کے زیور پہنے۔ پانچاہ زریں زیب جسم کو کے پری بن گئیں۔

ارغوانی پری نواب پیاری بیگم صاحبہ نے ارغوانی پر گھلے پشوا زہنی

زیور پنے گھٹنا کار چوبی پٹنا۔ ارغوانی پری کا پارٹ ادا کیا۔
 لٹا سکھی، چین سکھی، ساکھا سکھی، لڑوا سکھی، جیفہ یکنی، سلطان بندہ
 تمام زیور پوشاد۔ دوپہ۔ پانچامہ ہینکر سکھیوں کا پارٹ کریں۔ خواب آغائی
 بیگم لٹا سکھی۔ نواب سلطان بیگم چین سکھی۔ نواب زہر بیگم مرزا سکھی نواب
 احمدی بیگم مرزا سکھی نہیں۔
 نواب خوش آرا بیگم نے جوگن کا پارٹ کیا۔ تہہ شغریٰ کنفی لمبی۔ پال صنوی
 جملکے معنوی نقی سانپ گلے اور کپڑے میں لٹکائے۔ جونی داہنے شانے
 پر تونی پیراگی ہاتھیں بھوت بچے نوتیوں کا لگائیں۔
 نواب خوش قدر بیگم نے عفریت دیو کا پارٹ کیا۔ جاگت تپوں سیاہ
 داسا ز سیاہ۔ ہوزہ سیاہ۔ چہرہ مٹی کا کالا۔ گرز چوبی سیاہ۔
 مردت پسند غربت کا پارٹ کریں۔ انگڑ کھا۔ پانچامہ۔ چپکن سفید۔ کمر بند
 دستار باندھ کر تیار ہو جائیں۔
 نواب الاچی بیگم صاحبہ رام چیرا بنیں۔ دھوتی۔ مرزئی۔ جینو۔ انگوچھا
 ہاتھیں چاندی کا کڑاہیں کرتا رہیں۔
 اب پردہ اٹھایا جائے۔ ایک نورانی بارہ دری میں سب سکھیاں گاتی
 نظر آئیں۔ ایک جانب ارغوانی پری اور زعفران پری کرسیوں پر جلوہ افروز
 ہوں۔ دیو پریوں کے سامنے گزراں لے ہوئے کھڑے ہوں۔ ایک کرسی
 پر جوگن بیٹھی ہوئی نظر آئے۔ اس کے قریب غربت دست بستہ کھڑا ہو۔
 بچے کے دریں رادہا کھینچا عجیب شان و شوکت سے اپنی اپنی کرسیوں پر فلق
 افروز ہوں۔ رام چیرا دونوں کی خدمت میں دست بستہ کھڑا ہو۔ چار سکھیاں
 بیٹی میں کھڑے ہو کر بادشاہ کی ٹھریاں گاتی ہوں اور بعد ختم ٹھری کہیں چرخی
 رہو جان عالم۔
 غربت جوگن کے سامنے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہے۔ جگ جگ جیو اند رہو
 جوگن صاحبہ کا ہے جی ملین ہے؟
 جوگن:- چوبیس برس سے میں نے اس غم میں جوگن کیا ہے کہ رادھا
 اور کھنیا کا نایع نہیں دیکھا۔
 غربت:- تو میں اس کی تدبیر کرتا ہوں۔ آپ غم نہ کریں۔
 غربت جاتا ہے اور غربت دیو سے ملتا ہے۔
 عفریت:- بھائی غربت آج تم کہاں آئے؟

غربت:- ہماری جوگن صاحبہ کہتی ہیں مجھے رادہا کھنیا کا نایع دکھا دو۔
 عفریت پریوں کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک جوگن کہتی ہے
 کہ میں رادھا کھنیا کا نایع دکھا دو۔
 زعفران پری:- اچھا تو اس بیچاری جوگن کو یہاں لے آؤ۔
 جوگن کو تخت پر بٹھا کر عفریت لانا ہے اور زعفران پری کے سامنے
 پیش کرتا ہے۔
 زعفران پری:- کیوں جوگن جی تم رادہا کھنیا کا نایع دکھا چاہتی ہو؟
 جوگن:- میں برس سے اس غم میں جوگن بنی ہوں کہ رادہا کھنیا
 اور ان کی سکھیوں کا نایع دیکھوں۔
 زعفران پری:- عفریت جوگن کو رادھا کھنیا کا نایع دکھا دو۔
 عفریت رادھا کھنیا سے کہتا ہے زعفران پری نے کہلے اپنا نایع
 سکھیوں کے جوگن کو دکھا دو۔
 اس وقت سکھیاں کھڑی ہو کر ایک چادر تانیں اور رادہا کھنیا ہنڈول
 بہت سری آواز میں گائیں جوگن بہوش ہو جائے۔
 استہائی راگ ہنڈول۔ ہینڈولہ جھولے سیام۔ سیام کھنسی گنگا پلت
 پون سنہ نہ سنہ نہ سنہ نہ سنہ نہ۔
 پلانا ترہ۔ سب سکھیاں مل کے پیگ بڑھاؤ۔ پکے تان نہ تنہ۔
 تنہ نہ تنہ۔
 وسرا انترہ۔ مورکٹ کٹ راگہ روکنڈر پائل بلجے جینہ چنہ۔
 جہنہ نہ۔ جے رام چندرجی کی۔
 پردہ اٹھ جائے اور کھنیا جی ایک طرف کھڑے ہوں۔ ان کے دو
 سکھیاں ہوں۔ دوسری طرف رادہا کھڑی ہوں۔ ان کے ساتھ
 دو سکھیاں ہوں۔
 اب دونوں میں سوال و جواب شروع ہوا اور ایک دوسرے کو پہچانے
 اترتے بھاؤ ہوتا جائے اور چکر لگائیں۔ مطلع رادہا کا۔
 جمع غمیں ایسا ستم ایجاد کیا قاتلا بھول کے ہم کو نہ کبھی یاد کیا
 دوہرا۔ میں برہمنی سنجوگ سنگہ نہ کوو ساتھ + ناری حقوت مید کے
 پھیلکے ہاتھ۔ جواب کھنیا جی کا۔
 نام ہر کھنیا میں تجھے جانتا ہوں۔ رادہا جی جان میں کھلو سواناتا ہوں

اور تپشیدہ کرد۔ کنھیا جی آسن مار کر ناک پکڑ کر سانس روکیں۔ خود ارادہ جی اٹھ کر گلے چٹالیں۔

پھر سکھیاں لڈو پوجا کریں۔ یعنی کنھیا جی گال پھلا کر آنکھیں حیرت زدہ بنائیں کہ تپلیوں کو حرکت نہ ہو اور بائیں پاؤں سے کھڑی ہوں۔ اور دہنے پاؤں کو بائیں گھٹنے پر رکھیں۔

اد چاروں سکھیاں دہنے گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر بائیں پاؤں کو اونچا کر کے دونوں ہاتھوں کو گول لڈو کے مانند بنا کر اور ہاتھوں کو گردش دیتی ہوئی کنھیا کے گالوں کو ٹھوکا دیں اور کہتی جائیں لے لے لڑوالے۔ پھر سب سکھیاں گاکر بیٹھ جائیں۔ کنھیا جی کھڑے ہو کر دہرا گائیں۔

مرلی سمری کھو گئی متھرا سبند را بن کے حریت نامو ہے سو جلت اور چھوڑنا مو ہے سو جعت عیت

رادہا۔ ہراج میری خوشی چاہتی ہو تو مرلی ڈھونڈ کر لاؤ۔

کنھیا۔ اچھا مرلی ڈھونڈت ہوں اور سب سے کہیں ہماری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔

رام چیرا۔ ہماری مرلی کسی نے دیکھی ہے؟
کنھیا جی اسے ایک گھونسا ماریں اور کہیں مرلی ڈھونڈنے ہی کہہ گئی پھر نہیں۔ ہماری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔

رام چیرا کہے۔ ہماری بھینس کسی نے دیکھی ہے۔ پھر کنھیا اسے دھکا دے کر نکال دیں۔

اس وقت کنھیا جی مسافر سے پوچھیں۔

کنھیا۔ میاں مسافر کہاں سے آتے ہو؟

مسافر۔ متھرا بند را بن سے آتا ہوں۔

کنھیا جی۔ ہماری مرلی بھی کسی کے پاس دیکھی ہے۔

مسافر۔ ہاں دیکھی ہے۔ پنکھٹ پر چار پنہاریاں پانی بھرتی ہیں ان میں ایک گوری ٹھکی نانی سی ہے اس سے ٹانگ لاؤ۔

کنھیا جی پنکھٹ پر جائیں اور منت سے کہیں۔ تم کو لڈو دکھلائیے گا ہی مرلی دے دو۔

پنہاریاں۔ جاؤ جاؤ یہاں مرلی نہیں ہے۔

آخر ایک پنہاری کہے۔ راجن کے راج ادھراج شیو پروہان،

رادہا جی کے انگ پندیا اور چھپتیت انو پھول کینکی بھنور پاس لیت جواب رادہا۔ میں ترے غم میں دیوانی ہوئی اسے گانا میں نے جی جان سے تم کو تو یہاں پہچانا۔

دوہرا۔ او پیارے موہن پلک ڈھانپ تو ہے لیوں نامیں دیکھوں اورن کو اورنا تو ہے دیکھنے دیوں۔

جواب کنھیا۔ عشق تیرے رادہا جی جگل جگل چھانا دیو پری نے ہی جھکو کیسی نہیں پہچانا۔

جواب رادہا۔ ندی کنارے دھواں اٹھے میں جانوں کچھ ہوئے:

جن کے کارن میں جلی کہیں ہی نہ جڑا ہوئے!

سوال رادہا کا۔ راجن کے راج ادھراج جگل جگل جیو اندر ہو وہ مرلی جس میں چھ رنگ چھتیس رنگیناں باجبت ہیں کہاں چھوڑ آئے؟ دی بجو۔

کنھیا کا جواب۔ راجن کے راج ادھ رانی۔ ہمارا نالکھیس دیت ہے جگل جگل جیو اندر ہو۔ رام دہائی دی مرلی کھو گئی۔

جواب رادہا۔ نکا کھوپ چھینت ہوں۔ تم کہہ کو دے آئی ہو۔ یہ کہہ کر رادہا جی خفا ہو گئیں اور رانگ بیٹھیں۔

کنھیا جی ان کی منت کرنے لگے۔ پاؤں پر گرے اور ہاتھ باندھ کر منانے لگے پھر بھور ہو کر کنھیا جی رام چیرا کو پکاریں۔

رام چیرا۔ باجر ہراج باجر

کنھیا جی۔ رادہا جی خفا ہیں کہ تم مرلی کہہ کر کوئے آئے ہو امانت ناپیں۔

رام چیرا۔ پھر مناؤ کسی سکھی کو بیچ میں ڈالو۔

کنھیا جی۔ اسے لقا

لقا۔ آئی ہراج، تاں میں کروک ساتھ ناپتی ہوئی جائے۔

کنھیا۔ ہمرے رادہا رسیا گئے کا کروں۔

لقا۔ منتی کرو۔ چروری کرو۔ موڑ گھسو۔ نک رگرو۔

کنھیا۔ (رادہا جی کی چروری کرتے ہوئے) رادہا جی مو سے لبل کپوں تائے

انتر۔ کامو سے کچھ چوک بھی۔ سوری رانی نہیں نہیں گھونکھٹ کھول

کیوں نہ لے۔ جب یہ بہت منی کریں اور سب سکھیاں جمع ہو جائیں۔ تب

کنھیا جی کھڑی ہو جائیں اس وقت رام چیرا کہے ہراج رادہا کو داتا سے مانگو۔

مگر وہ سے بادشاہ متوجہ نہ ہوئے تھے۔ باقی متوجہ نہ ہوئے تھے۔ سب گیا۔ تھیں۔ یہ جو اہر منزل والیاں مشہور ہیں۔ تنخواہ کل کی تین سو پچاس روپیہ ماہوار تھی۔ ۱۲۹۲ء میں یہ جلسہ رہس سکھانے کے لئے حساب الدولہ ہوا۔ درخشاں کے حوالے کیا گیا۔

دسواں یہ خاص جلسہ والیاں مشہور ہیں کل سات بیگیں ہیں تین متوجہ ہیں۔ باقی امیدوار متوجہ ہیں۔ نئی کس ستر روپیہ ماہوار تنخواہ ہے اور بادشاہ خود ان کو تعلیم دیتے تھے۔ تین برس کی تعلیم سے سروں میں بخوبی واقفیت ہو گئی۔ پنچا۔ گونا۔ ارتھ بھاؤ بتانا۔ مکرے پاؤں سے ادا کرنا سب بادشاہ نے سکھایا کسی سازندے یعنی۔ رفاہی۔ دزد کے کو اس میں ذرا دخل نہیں بلکہ بادشاہ کے سوا تعلیم کے وقت آنے کی اجازت نہیں۔ اگر کبھی بادشاہ کا جی چاہتا تو سازندوں کو ساتھ بھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ تین مہینہ میں جنگوہر۔ دھرپو۔ جرنک۔ زرد ترانہ۔ دھال۔ روپک۔ تیورا۔ چوتالہ۔ دیما۔ تالہ۔ گہر کی چھب۔ برم لہمی۔ سولہ فادہ۔ چھب تالہ۔ چار پونرل ادھا۔ خیال۔ ٹھری گالیتی ہیں۔ ٹھنور سے پر کام کرتی ہیں۔ بغیر ٹھنور کے کے سروں پر لگا سکتی ہیں۔ جو دھر لہمی کے چھ مکرے پاؤں سے نکالتی ہیں۔ دو تین سو چیزیں سب طرح کی آج تک سکھائی گئی ہیں۔

تعلیم بھی مضحک کرتی ہیں۔ صورت اس کی یہ بھولی کہ بادشاہ نے نو جیسے مرتب کئے اور رادہ منزل والیوں۔ سلطان خانہ والیوں پر بہت محبت کی۔ اکثر بادشاہ نے صبح کا خاصہ شام کو اور شام کا خاصہ صبح کو نوٹس فرمایا مگر آخر کار ان بھولنے کے سبب محبت دوم ڈھائی کا مزاج اختیار کر لیا اور اکیلے بادشاہ کی محبت کا اثر کچھ نہ ہوا۔ علم کی طرف توجہ بالکل نہ کی یہ حالت دیکھ کر بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا۔ کبیدہ خاطر ہوئے۔ سوچ رہے تھے کہ الٹی کیا کروں۔ بغیر سازندوں کے ایک کلمہ زبان سے ادا نہیں کر سکتیں۔

ایک دن شاہ زمانی نے بادشاہ کو بہت طول دیکھ کر کہا۔ حضور آپ کیوں پریشان خاطر رہتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بادشاہ نے یہ تمام قصہ شاہ زمانی سے کہا کہ تعلیم ناقص اور خراب ہوئی اس کا مجھے بہت قلق ہے۔ شاہ زمانی نے جواب دیا قربان جاؤں حضور کا علم کیا کم ہے جو آپ ان دو ڈھائیوں سے تعلیم دلواتے ہیں ادا ان پانچوں کو تعلیم میں شریک کرتے ہیں۔

جب جنگ ہو اندر ہو۔ ہم کو تازہ کھن۔ لادو کو تھاری مری دیں۔ کھن تھتی جائیں ادر کیں اب دی میں ما کھن پچن جات ہوں کھنیا جی جب کھن مانکس تودہ گانا شروع کر دیں۔ آخر کھنیا جی کچھ کھن چاکلاں پنہار یوں کو دیں ادا ان سے اپنی مری لیں اور بکلاں میں نو لادہ جی دوزکر ان کے گلے سے چھٹ جائیں۔

رادہ ہرا ج کا بول بالا رہے اب صدامن خوش ہوا۔ تم گدی پر برا جو میں تمہارے آگے گاؤں ادر ناچوں۔ اس گلے کے بعد دونوں کو مبارک باد دی جائے اور جلسہ ختم ہو بادشاہ سلامت اور سب اعزہ واقربا اپنے اپنے مہلات میں تشریف لے گئیں اسی طرح بادشاہ کی دلچسپی کے بہت سے سلمان مہیا تھے تاکہ زوال سلطنت کا رخ ان کو نہ ہو۔

رادہ منزل والیاں سب پہلے تیار کی گئی تھیں۔ یہ کل اٹھ تھیں ان سب کو ایک کمرہ آٹھ سو چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی۔ دوسری ساردا منزل والیاں پندرہ تھیں۔ آٹھ سو اسی سو روپیہ ان کو دیا جاتا تھا۔

تیسری سلطان خانہ والی چوبیس بیگیں تھیں جو سب بادشاہ کی متوجہ تھیں ماہوار دو ہزار چوبیس روپیہ ان کو دیا جاتا تھا۔ چوتھا رہس حضور والیوں کا ہے۔ یہ خاص منزل والیاں کلانی ہیں سب گیارہ بیگیں ہیں۔ تنخواہ چار سو پچیس روپیہ ماہوار ملتی ہے۔

پانچواں رہس سرو منزل والیوں کا ہے ان کو مہاجات خلوت بھی کہتے ہیں۔ ان میں اکثر سن رسیدہ ہیں۔ سب متوجہ ہیں کل سو بیگیں ہیں۔ تین سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔

چھٹا شمشادہ منزل والیاں ان کو رہس کی تعلیم نہیں دی کل تنخواہ تین سو چالیس روپیہ ماہوار ہے اس میں آٹھ بیگیں ہیں۔

ساتویں جلسہ والیاں ہیں۔ یہ چھوٹے جلسہ والیاں ہیں سات بیگیں ہیں یہ متوجہ ہیں دو سو روپیہ ماہوار ان کو دیا جاتا ہے۔

آٹھویں جلسہ والیاں یہ سب پانچ بیگیں ہیں۔ نو منزل والیاں کلانی ہیں۔ بادشاہ اس جلسہ سے نہایت خوش تھے کل تنخواہ دو سو پچیس تھی۔

نواں جلسہ یہ جلسہ حال میں متوجہ کیا گیا تھا۔ نو اب زینت بیکم اور نو اب

بادشاہ نے کہا۔ ان جلسہ والیوں کی حالتیں خراب ہو گئی ہیں اور میری تعلیم سے خوش نہیں رہتیں۔ چاہتی ہیں کہ دوم ڈھار میں بھی ان کے شریک تعلیم رہیں۔ شاہ زمانی نے عرض کیا حضور ایک در بند ہزار رکھ لے لعنت بھیجو ان جلسہ والیوں کو میں سرکار کے لئے کنواری لڑکیاں لو کر رکھتی ہوں۔ کچی کڑی کی طرح جد ہر مؤرد گئے بے تکلف آسنا و صد مقابل کر نیگی۔ بیروا طاعت سے منہ نہ موڑ نیگی۔

نواب یادگار محل صاحب اور اہل کار وغیرہ داروغہ شافعی سلطان اور نواب شہزادہ بیگم صاحبہ نے اس کلام کی پر زور تائید کی اور اسی طرح ان کے سچانے سے بادشاہ بھی راضی ہو گئے اور یہ طریقہ بہت مفید ہوا۔ بادشاہ نے عہد واثق کیا کہ اب سے تمام عمر کسی دوم ڈھاری۔ میراثی۔ کلاوت۔ گھئے دھردلے کو دور بنال کئے۔ رقا ص۔ پھا جی کے حملے ایک رہیں دالی کو نہیں کیا آخر اس دسویں جلسہ والیوں کی تعلیم بالکل پانی نظر آئی۔

ان میں نواب خانہ آبادی بیگم۔ نواب سیر بیگم۔ نواب گلبدین بیگم۔ نواب ہر افروز بیگم۔ نواب نازکدین بیگم۔ نواب تمباڑ بیگم۔ نواب لہ افروز بیگم۔ گیارہواں جلسہ یہ گونگھٹ والیاں مشہور ہیں۔ ان کو بھی خاص بادشاہ تعلیم دیتے ہیں سات بیگیں ان میں بھی ہیں دو سو روپیہ ماہوار کی خواہ دار ہیں اچھا گاتی ہیں۔

بارہواں جلسہ یہ تھو والیوں کے نام سے مشہور ہے محض بادشاہ کی تعلیم میں ہے۔ سات اسم ہیں ان کی خواہ ماہوار ایک سو چھپا نوے ہے۔

تیرہواں جلسہ اس میں بھی سات اسم ہیں۔ یہ گانے والیاں مشہور ہیں اور بادشاہ خود ان کو تعلیم دیتے تھے بہت جلد کمال حاصل کر لیا۔

چودہواں جلسہ بیگیں والیاں مشہور ہیں یہ کل سات پر یاں ہیں خواہ اکیسواں چھپا نوے روپیہ ماہوار اور بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔

پندرہواں جلسہ یہ جمور والیوں کے نام سے مشہور ہیں اور بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔ سات اسم ہیں۔

سولہواں جلسہ جھلنے والیاں مشہور ہیں۔ یہ بھی سات اسم ہیں نواب یہ افروز بیگم۔ گلبن بیگم۔ بگ خرام بیگم۔ نواب لالہ عذار بیگم وغیرہ بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔

سترہواں جلسہ میر والیاں مشہور ہیں۔ یہ بھی سات اسم ہیں نواب

عشق ندیم۔ گل ادا نام بیگم۔ نواب زہرہ بیگم۔ وغیرہ۔
اٹھارہواں جلسہ بندیا والی سات اسم ہیں نواب جہانار بیگم
نواب پری خصال بیگم وغیرہ بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔

انیسواں جلسہ یہ مرثیہ والیاں مشہور ہیں۔ سوز بڑھتی ہیں۔ بادشاہ نے تعلیم دی ہے۔ نواب ٹکسار بیگم۔ نواب ماتمی بیگم۔ نواب مرثیہ خواں بیگم۔ نواب نوحہ خواں بیگم۔ نواب ذاکرہ بیگم۔

بیسواں جلسہ یہ نقل والیاں مشہور ہیں اور محکم نقلیں کرتی ہیں۔ ست اسم ہیں۔ نواب تین تیرہ بیگم۔ نواب پو بارہ بیگم۔ نواب چار کوڑی بیگم وغیرہ

اکیسواں جلسہ تماشے والیاں مشہور ہیں سات اسم ہیں۔ نواب زر اند بیگم۔ نواب زردار بیگم۔ نواب زرافشاں بیگم۔ وغیرہ۔

بائیسواں جلسہ یہ معاین مشہور ہیں۔ نواب کجکاکہ بیگم۔ خوشبید کاکہ وغیرہ۔

بادشاہ کی تعلیم میں تینتالیس اسم ہیں اور سب جلسہ والیاں ملا کر دوسو تیرہ گانے والیاں ناچنے والیاں ہیں۔ یہ سب ہر وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتی ہیں گرتینتالیس جو خاص ہیں ان سے زیادہ تر گفتگو اور محبت بنتی ہے اور وہی تعلیم یافتہ شاہ کہلاتی ہیں۔

بادشاہ کی سرکاریں دو دو میناں بھی ہیں جن کو سرور محل کہتے ہیں یہ طرافت میں مشہور ہیں۔

لوگ جلتے ہیں کہ زوال سلطنت کے بعد بادشاہ عیش پرستی میں پڑ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ اکثر ایسے کثیر اور لازوال نقصان پہنچنے کے بعد کچھ ایسا صدر پہنچتا ہے کہ لوگ اپنی جان دیدیتے ہیں۔ اولاد کا مرجانا۔

عزیز و اقارب کا اٹھ جانا خود مرض خرمین میں مبتلا ہو جانا اکثر ملک ہوتا ہے لیکن ایسے واقعات سے تو کبھی کبھی صبر بھی آجاتا ہے۔ لڑکا مر گیا۔ دو چار برس کے بعد غم چلا رہا اور اب اولاد کو بھول گیا۔ یا خدانے دوسرا بیادید یا پلے بیٹے کا خیال بھی پیش آتا۔

لیکن زوال سلطنت و زوال دولت ہر وقت کیلجے کی پھانس بن جاتا ہے اور اس کی غلط نہیں جاسکتی اور جس کی حکومت و سلطنت چلی جائے اس کے مددوں کی انتہا کو کوئی نہیں جان سکتا اور جان سکتا ہے تو وہی جس کا یہ حال ہوا ہو۔ کوئی اس دکھ کو بہادر شاہ ظفر سے پوچھے۔

لیکن زوال سلطنت و زوال دولت ہر وقت کیلجے کی پھانس بن جاتا ہے اور اس کی غلط نہیں جاسکتی اور جس کی حکومت و سلطنت چلی جائے اس کے مددوں کی انتہا کو کوئی نہیں جان سکتا اور جان سکتا ہے تو وہی جس کا یہ حال ہوا ہو۔ کوئی اس دکھ کو بہادر شاہ ظفر سے پوچھے۔

لیکن زوال سلطنت و زوال دولت ہر وقت کیلجے کی پھانس بن جاتا ہے اور اس کی غلط نہیں جاسکتی اور جس کی حکومت و سلطنت چلی جائے اس کے مددوں کی انتہا کو کوئی نہیں جان سکتا اور جان سکتا ہے تو وہی جس کا یہ حال ہوا ہو۔ کوئی اس دکھ کو بہادر شاہ ظفر سے پوچھے۔

تو وہی جس کا یہ حال ہوا ہو۔ کوئی اس دکھ کو بہادر شاہ ظفر سے پوچھے۔

اپنے داغ سلطنت کا بہت اچھا علاج کیا۔ گویا پرستان کے راجہ اندھے
ہر وقت پریوں کا جھرمٹ ان کے سامنے نہا کر تا تھا ان کی زندگی عیش سے
کٹی تھی بہت تعلندی سے اپنے غم کو غلط کیا حقیقت میں جان کا بدلہ مل چکا
نے اپنا زہر و جہر و پیہ پیہ کو اپنی جان پر نثار کر دیا غلٹی میں بادشاہی کی ٹیاریج
کو سلطنت ادا بنا دیا دیکھنے والے کہتے ہیں کہ بادشاہ کے وقت میں مینا بوج
دوسرا لکھنؤ معلوم ہوتا تھا۔

سلطان عبدالعزیز سے پوچھے۔ عبدالمجید خان سے پوچھے۔ قیصر جرمن سے
پوچھے۔ امان اللہ سے پوچھے کہ کیسا داغ سلطنت ہوتا ہے۔ و اجد علی
شاہ بادشاہ اگر یہ سامان نعیش نہ کرتے تو سلطنت جانے کے بعد تین
برس کیونکر زندہ رہتے۔ اس شراب دوا آتش نے ان کو محفوظ رکھا ادا سی کی
بدولت ان کا غم غلط ہوتا تھا اور دن عید تہوارات شب برات تھی۔ کوئی دن
ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وہ پریوں کے جھرمٹ سے دم بھرا لگ ہوں۔ انہوں نے

غزل

ہجر میں تیرا مبتلا روئے نہیں تو کیا کرے
عشق تعب نواز ہے حسن طرب طراز ہے
بیل و نالہ و تعب گل ہمنہ خندہ و طرب
تجگو بجائے ناز حسن جلوہ حسن دیکھ کر
تیرے خرام ناز میں فرق پڑے تو کیوں پڑے
حسن حیا و ناز ہے عشق تحیر و ادب
ہنسا رکھے تجھے خدا خوش رہے تو خدا کرے
تجگو خوشی کہاں نصیب بخت تری بلا کرے
شمع و ناز بزم شب کوئی جلے جلا کرے
کوئی جے جیا کرے کوئی مرے مرا کرے
کوئی پسے پساکرے کوئی مٹے مٹا کرے
کوئی کہے تو کیا کہے کوئی کہے تو کیا کرے

ناز و نیاز میں رشید شان ہے حسن و عشق کی
کیونش کوئی جفا کرے؛ کیونش کوئی وفا کرے

(رشید اکبر آبادی)

محسوساتِ ماہر

از مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدر آباد دکن

اُتر بھی آفر از لامکاں سے اٹھا دے یہ بھی پردہ درمیاں سے
 اُسے پروا نہیں دیرِ حوسم کی جسے نسبت ہے تیرے آستان سے
 وہی آغاز ہے راہِ طلب کا قدم آگے نہ پھرا ٹھٹس جہاں سے
 پے تسکینِ دل جنتِ خالق وہاں کا ایک نظارہ یہاں سے
 دکھاؤں تالیشِ انوارِ صہبَا صُراحی کو لڑاؤں کہکشاں سے
 تصوّر اور تری کا فرطِ سر کا تعلق اور برقِ بے اماں سے
 طلب کرتا ہوں دادِ سخت جانی بلائیں مانگتا ہوں آسماں سے

جسے شعر و سخن کہتے ہیں ماہر

عبارت ہے میرے حُسنِ بیاں سے

بحری سوار

"S.M. SYNGE" کا مشہور ڈرامہ

جناب محمد فاروقی صاحب مالیکانوی

جب وہ خود مائیکل کو تلاش کرنے باہر جائیگی۔ ہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ کپڑے مائیکل کے ہیں یا نہیں۔

کیتھلین :- یہ کپڑے مائیکل کے کس طرح ہو سکتے ہیں نورا؟ وہ جنوب میں اتنی دور کیسے جاسکتا ہے؟

نورا :- جو جوان پادری کتا ہے کہ اس نے اسے دیکھا ہے وہ کتا ہے۔ اگر وہ مائیکل کے ہیں تو تم بوڑھی عورت سے خود کہہ سکتی ہو کہ خدا کی رحمت سے مائیکل کو ایک پاکیزہ تجیز و تکھین نصیب ہوئی اور اگر وہ اس کے نہیں تو کوئی اس کے متعلق کچھ نہ کہے کیونکہ بڑھیا اس کی موت پر غم سے دیوانی ہو جائیگی۔ (سامنے کا دروازہ جو کہ نور نے ادھورا کھلا چھوڑ دیا تھا ہوا کے جھونکوں سے پورا اٹھ جاتا ہے)

کیتھلین :- (تشویش کنگناہوں سے باہر دیکھتے ہوئے) کیا تم نے پادری سے پوچھا آیا وہ بارٹے کو گھوڑوں کے ساتھ گالوسے کے جاترا کو جانے سے روکیگا؟

نورا :- میں اسے روکوں گا نہیں۔ وہ کتا ہے مگر تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے اس کی ماں خود آدمی آدمی رات تک دعا اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ اور خداوند رب العزت اسے اس کے لڑکے سے محروم نہیں کر سکتا۔

کیتھلین :- کیا سفید چٹان کے پاس سمندر زیادہ خطرناک ہے نورا؟

نورا :- ہاں خطرناک ضرور ہے۔ خدا ہماری حفاظت کرے۔ مغرب کی طرف گھٹائیں اٹھ رہی ہیں اور اگر ہوا چل گئی تو سمندری طغیانی اور بھی

بڑھ جائیگی۔ (وہ سبڈل سمیت میز کے قریب جاتی ہے)

کیا اب میں اسے کھول سکتی ہوں؟

تعارف :- موریا

بارٹے

کیتھلین

نورا

مرد، عورت وغیرہ وغیرہ

جگہ :- آر لینڈ کی مغرب جانب دو ایک جزیرہ

منظر :- جھونپڑے کا باورچی خانہ۔ مچھلی کے جال، روغنی کھالیں

کاتنے کا چرچہ دیوار سے لگے ہوئے چند تختے وغیرہ وغیرہ

کیتھلین ایک عریب لڑکی عمر تقریباً بیس سال آٹا گوندہ کر توب پر بکھتی ہے پھر اسے آگ پر رکھ کر اپنے ہاتھ صاف کر کے چرچہ کاتنے لگتی ہے۔ نورا ایک

نوجوان لڑکی دروازے سے اندر جھانکتی ہے۔

نورا :- (دھیمی آواز سے) وہ کہاں ہے؟

کیتھلین :- وہ اندر لیٹی ہے خدا اس کی مدد کرے۔ لیکن وہ سو رہی ہو۔ اگر وہ

اس قابل ہے۔

(نورا آہستہ سے اندر داخل ہوتی ہے اور اپنی شال کے پٹے سے ایک

سبڈل نکالتی ہے۔)

کیتھلین :- (چرخہ تیزی سے گماتے ہوئے) یہ کیا ہے نورا؟

نورا :- اسے نوجوان پادری نے دیا ہے یہ ایک تیش اور ایک سادہ جراب ہے

انہیں ڈونگل میں ایک ڈبے ہوئے آدمی کے بدن سے نکالا گیا ہے۔

(کیتھلین یکایک چرخہ روک لیتی ہے اور سننے کی طرف لگے جھک جاتی ہے)

کیتھلین :- وہ مفید تھے کے پاس کھوٹی سے ٹنگ رہی ہے اسے لاکر دیدو
نہا میں نے آج ہی صبح اسے وہاں لٹکایا ہے۔ سیاہ پانوں والا سورا
دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

نورا :- (ایک رسی دیتے ہوئے) کیا یہی ہے وہ رسی؟
موریا :- بہتر ہوگا بارٹلے اگر تم رسی کو دیں تھے کے پاس لٹکتا ہوا چھوڑ دو
(بارٹلے رسی لیتا ہے) اس جگہ اس کی ضرورت ہوگی۔ میں تم سے کہتی ہوں ٹیکل
کی لاش کل صبح یا پرسوں صبح یا اس ہفتے کسی دن بھی ہوتی ملے گی اور ہم
خدا کے فضل و کرم سے اس کے لئے ایک بہت گہری قبر بنائیں گے۔

بارٹلے :- (رسی کی گٹام بناتے ہوئے) میرے پاس اور کوئی گٹام نہیں جس
کی مدد سے میں سواری کر سکوں اور مجھے آج ہی جلد روانہ ہونا چاہئے۔ آج
کے جہاز کے سوا آئندہ دو ہفتے تک اور کوئی جہاز نہیں جائیگا اور اس سال اترا
گھوڑوں کی تجارت کیلئے بہت مفید ہوگا میں نے لوگوں سے کہتے سنا ہے۔

موریا :- اگر ٹیکل کی لاش سمندر میں ہوتی پانی گئی اور گھر میں کوئی
تاہوت نہ مانے والا نہ رہا تو وہاں کیا کہیں گے؟ خصوصاً اس وقت جبکہ میں
کانیبرا کے بہترین سفید تھنوں کیلئے ایک بڑی قیمت ادا کی ہے۔

بارٹلے :- لاش کس طرح مل سکتی ہے اماں جان! ہم مسلسل نودوں سے
اس کا انتظار کر رہے ہیں حتیٰ کہ مغرب اور جنوب سے ہوا کے تھکھونکے واپس
لوٹ رہے ہیں۔

موریا :- اگر لاش نہیں مل سکتی تو ہوا سمندر میں طغیانی پیدا کر رہی ہے اگر
ہاں سینکڑوں ہزاروں گھوڑے بھی ہوں تو میرے بیٹے کے مقابلے میں ان
کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے اور اس وقت جبکہ وہ اکلوتا بیٹا ہو۔

بارٹلے :- (بدستور گٹام بناتے ہوئے کیتھلین سے) تم روزانہ کھیت میں جانا
کیتھلین اد جوار کو پھیلنے سے محفوظ رکھنا اور اگر کوئی خریدار مل جائے تو تم
سیاہ پاؤں والے سور کو فروخت کر سکتی ہو۔ بشرطیکہ قیمت اچھی ہو۔

نورا :- کیتھلین جیسی لڑکی ایک سور کی اچھی قیمت کس طرح وصول کر سکتی ہے
بارٹلے :- (کیتھلین سے) اگر باڈیسم کے جھونکے چاند کے اختتام تک چلتے
رہے تو تم اور نورا جانو۔ کیلئے کافی گھاس کاٹ لینا اب سوائے ایک شخص

کے آج سے ہمارے ساتھ کوئی بھی کام کرنے والا نہ ہوگا۔ ہمارے لئے یہ بہت
بڑی بد نصیبی ہے۔

کیتھلین :- شہر! ممکن ہے وہ جاگ اٹھے اور ہمارے ختم کرنے سے پہلے
یہاں آجائے۔ (وہ مینکے قریب آ جاتی ہے)

نورا :- (اندرونی دروازے تک جا کر سنتی ہے) وہ بہتر پر حرکت کر رہی ہے
وہ ایک لمحہ میں یہاں آجائیں گی۔

کیتھلین :- نورائیں میری لاؤ۔ میں انھیں چان پر رکھ دیتی ہوں جہاں وہ انھیں
مطلق دیکھ نہیں سکتی۔ اور جب سمندر میں طوفان کا زور کم ہوگا تو وہ خود اس
کی لاش کو مشرق کی طرف بہتے ہوئے سطح آب پر دیکھنے کیلئے باہر جائیں گی۔
(دونوں بیٹری کو روشن دان کے دیوار کے مقابل رکھ دیتی ہیں کیتھلین
چند سیڑھیاں ملے کر کے بندل کو چان پر رکھ دیتی ہے۔ موریا اندرونی کمرے
سے داخل ہوتی ہے)

موریا :- (اوپر کیتھلین کی طرف دیکھتے ہوئے تنک مزاج سے) کیا یہاں جو
گھاس موجود ہے وہ کھانا پکانے کے لئے کافی نہیں ہے؟

کیتھلین :- آگ پر عرصہ سے روٹی پک رہی ہے (گھاس بچے پھینکتے ہوئے)
اور سمندر میں طغیانی کم ہونے کے بعد اگر بارٹلے کا ذرا جائیگا تو اسے روٹی کی ضرورت
ہوگی۔ (نورہ گھاس اٹھا کر آگ پر رکھتی ہے)

موریا :- (آگ کے قریب سٹول پر بیٹھتے ہوئے) آج جبکہ جنوب اور مغرب سے
گھاسیں اٹھ رہی ہیں اور طوفان بڑھ رہا ہے بارٹلے ہرگز باہر نہیں جائیگا۔ وہ
آج نہیں جاسکتا نورا جان پادری اسے یقیناً روکیگا۔

نورا :- وہ اسے نہیں روکیگا اور میں نے این۔ سائمن۔ سیٹھن۔ فیٹی۔ زکالم
شان کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ آج ضرور جائیگا۔

موریا :- وہ ہے کہاں نورا؟

نورا :- وہ اس تلاش میں باہر گیا ہے کہ اس ہفتے کوئی جہاز جانے والا ہے
یا نہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ اب بہت جلد واپس لوٹے گا کیونکہ سبز نیلے کے
پاس سمندر کا زور کم ہوا ہے اور ماہیگیروں کی کشتیاں بھی مشرق سے واپس
ہو رہی ہیں۔

کیتھلین :- میں بڑے پتھر کے پاس کسی کے پاؤں کی آہٹ سن رہی ہوں۔
نورا :- (باہر دیکھتے ہوئے) وہ آ رہا ہے اور تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے۔

بارٹلے :- (انداز آہستہ اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے) پھر نرم اور ٹھیک لہجے
میں کہتا ہے (کیتھلین وہ رسی کہاں ہے جسے کانبرا میں خریدا گیا تھا؟

موریا :- اور یقیناً اس سے بھی بڑی بے بسی، سستی ہوگی جب تم ہی دوسرے لوگوں کی طرح فرق آپ ہو جاؤ گے۔ اس وقت میں کس طرح زندگی گزار سکو گی بارٹلے؟ اور میرے ساتھ یہ لڑکیاں؟ میں ایک ضعیف و ناتوان عورت جو ہر لمحہ موت کا انتظار کر رہی ہے۔

(بارٹلے گام رکھ کر اپنا پُرانا کوٹ اتارتا ہے اور اسی غلاہن کا ایک نیا کوٹ پہنتا ہے)

بارٹلے :- (نور سے) کیا جہاز ساحل کی طرف آرہا ہے؟

نور :- وہ سبز ٹیلے سے گزر رہا ہے اور اپنے بادبان ہوائیں اڑا رہا ہے، بارٹلے :- (اپنی تعیل اور تبا کو لیتے ہوئے) مجھے جہاز تک پہنچنے کے لئے نصف گھنٹہ لگے گا اس کے بعد میں دو یا تین دن میں واپس لوٹوں گا اور اگر خدا نخواستہ ہونا موافق رہی تو میں چار یا پانچ روز میں واپس آسکوں گا۔

موریا :- (آگ کی طرف مرکرا پنی شال سر پر ڈالتے ہوئے) کیا یہ سنگدل اور بے رحم انسان نہیں جو اپنی بوزمی ماں کا کھانا نہیں مانتا جبکہ وہ اسے سمندر میں جانے سے روک رہی ہے۔

کیٹھیلین :- سمندر کا سفر ایک نوجوان آدمی کی زندگی کا سوال ہے پھر ایک بوڑھی عورت کو کون خاطر میں لاسکتا ہے؟

بارٹلے :- (گھام اٹھاتے ہوئے) مجھے جلد روانہ ہو جانا چاہئے۔ میں لال گھوٹے پر سوار ہونگا اور سفید ڈھاس کے پیچھے دوڑوں گا۔ خدا کی رحمت تمہارے ساتھ ہو۔ (چلا جاتا ہے)

موریا :- (جب وہ دروازے سے گزرتا ہے وہ چلاتی ہے) وہ چلا گیا۔ خدا ہماری حفاظت کرے۔ اب ہم اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ چلا گیا! اور جب یہ رات دنیا کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی اس دنیا میں میرا کوئی بیٹا باقی نہ ہوگا۔ کیٹھیلین :- اماں جان جب وہ غریب جا رہا ہے تو اسے دعا کیوں نہیں دیتیں؟ کیا یہ نوح و الہ ہمارے لئے کافی نہیں جو تم اسے بددعا کے ساتھ بھیج رہی ہو۔

(موریا بغیر مڑے ہوئے چپٹے سے آگ کو بے پروائی سے کر دیتی ہے)

نور :- (اس کی طرف مڑتے ہوئے) تم گھاس کو آگ سے ہٹا رہی ہو اماں جان کیٹھیلین :- (چلاتی ہے) غضب خدا کا! ہم یہ روٹی دنیا بھول گئے نور! (آگ کے پاس جاتی ہے)

نور :- اودھا! وہ شام تک چلتا رہیگا اور اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے

کیٹھیلین :- (تو بے پروا سے روٹی اٹھاتے ہوئے) یقیناً وہ تباہ ہو جائیگا جس گھر میں ایک بڑھیا ہمیشہ بڑبڑایا کرتی ہے اس گھر کے لوگوں کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی (موریا سٹول پر کانپتی ہے)

کیٹھیلین :- (روٹی کا کچھ حصہ کاٹ کر کپڑے میں لپیٹتی ہے پھر موریا سے) تم چپے والے کنویں پر جاؤ اور جب وہ وہاں سے گزرے تو بہر روٹی اسے دیدینا اس صورت میں تم دوبارہ اس سے مل سکتی ہو پھر تمہاری بددعا لوٹ جائیگی اور تم اس سے کہنا۔ خدا تمہاری حفاظت کرے! اس طرح وہ مطمئن اور خوش ہو جائیگا۔

موریا :- (روٹی لیتے ہوئے) کیا میں اس کی تیز رفتاری کا مقابلہ کر سکتی ہوں کیٹھیلین :- ہاں اگر تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔

موریا :- (کانپتے ہوئے کھڑی ہو جاتی ہے) میرے لئے جانا سخت دوجہ ہے۔

کیٹھیلین :- (بقیابانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اسے لکڑی دو کورا درنہ وہ پتھر پر پھسل کر گر پڑیگی۔

نور :- کون سی لکڑی؟

کیٹھیلین :- دہی جے مائیکل کا نیرا سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔

موریا :- (لکڑی لیتے ہوئے) دنیا میں بڑے لوگ اپنے بچوں کے لئے چیر چھوڑ جاتے ہیں مگر اس گھر میں خود نوجوان لڑکے اپنے نیچے بوڑھوں کے لئے چیزیں چھوڑ جاتے ہیں۔

(وہ آہستہ آہستہ باہر جاتی ہے، نور میٹرھی کے پال کی ہے)

کیٹھیلین :- ٹھہر دو کورا! ممکن ہے وہ فوراً واپس لوٹ آئے۔ وہ شدت غم سے دیوانی ہو گئی ہے، نہیں معلوم وہ کیا کر گزریگی، خدا اس کی حفاظت کرے نور :- کیا وہ جھاڑی سے گزر گئی؟

کیٹھیلین :- (باہر دیکھ کر) اب وہ دور چلی گئی۔ ہنڈل کو جلدی نیچے پھینکو خبر نہیں وہ کب لوٹ آئے؟

نور :- (چان سے ہنڈل اتارتے ہوئے) نوجوان پادری کل یہاں گزر گیا۔ ہم اس سے پوچھنیے آیا یہ کپڑے مائیکل کے ہیں؟

کیٹھیلین :- (ہنڈل لیتے ہوئے) کیا اس نے کچھ کہا یہ کپڑے کہاں سے؟

نور :- (بیچے اترتے ہوئے) اس نے کہا وہ آدمی شتی میں آرش شراب لیکر صبح دن بھنے سے مشہر شمال کی جانب سیاہ چوٹی سے گزرے تھے کیا کیش اس کے چپو کرائی

سوائے سمندر پر اڑنے والی سیاہ روحوں کے اور کوئی بھی تاہم کرنے والا نہ ہو۔
نورا :- (جھومتے ہوئے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلاتے ہوئے) کتنے رحم کی باتیں
کہ ایک شخص جو اتنا بڑا ملاح اور ماہی گیر ہوا اپنے بعد سوائے ایک بچے ہوئے قیصر
ایک سادہ جراب کے کوئی بھی نشانی نہ چھوڑ سکے۔

کیٹھیلین :- کیا وہ آ رہی ہے نورا؟ میں راستے پر کچھ آہٹ سن رہی ہوں۔
نورا :- (باہر دیکھ کر) وہ آ رہی ہے وہ بھانک کے قریب ہے۔

کیٹھیلین :- اس کے آنے سے پیشتر انہیں وہیں رکھ دو شاید بارٹلے کو ڈا
دینے کے بعد وہ کچھ آسودہ خاطر ہو۔ اور ہم یہ ظاہر نہیں ہونے دینگے کہ بارٹلے
کے جانے کے بعد ہم نے کچھ دیکھا یا سنا ہے۔

نورا :- (بندل کے بازو میں کیٹھیلین کو دے دیتے ہوئے) ہم سے کہیں کونے میں
رکھ دینگے (وہ بندل کو کونے میں رکھ دیتی ہیں کیٹھیلین چرسے کے پاس واپس جاتی ہے)
نورا :- کیا وہ دیکھ سکتی ہے کہ میں رو رہی تھی۔

کیٹھیلین :- پیوہ دروازے کی طرف کر لو اور اس طرح بیٹھ جاؤ کہ تمہارے
چہرے پر روشنی نہ پڑے پائے۔

(نورا دروازے کی طرف پیوہ کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ موریا لڑکیوں کی طرف نیکے
بغیر اندر داخل ہوتی ہے اور آگ کے دوسری طرف ٹول کر بیٹھ جاتی ہے
روٹی کا بندل اب تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ لڑکیاں ایک دوسری کی طرف
دیکھتی ہیں۔ نورا روٹی کی طرف اشارہ کرتی ہے)

کیٹھیلین :- کچھ دیر کتنے کے بعد) کیا تم نے روٹی نہیں دی اماں جان؟
(موریا بغیر مڑے ہوئے دھیمی آواز سے رونا شروع کرتی ہے)

کیٹھیلین :- کیا تم نے اسے جانے ہوئے دیکھا؟ (موریا بدستور روٹی کیٹھیلین
بیسیری سے) خدا تمہاری مدد کرے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اپنی آوار کو زور
دواد مجھ سے کہو کہ تم نے کیا دیکھا؟ بجائے اس کے کہ تم ایک گڈری ہوئی بات
پر قائم کرو؟ کیا تم نے بارٹلے کو دیکھا۔ میں پوچھتی ہوں؟

موریا :- (خفیف آواز سے) میرا دل چور چور ہو رہا ہے۔
کیٹھیلین :- (بدستور) کیا تم نے بارٹلے کو دیکھا۔

موریا :- میں نے خوفناک ترین چیز دیکھی ہے۔
کیٹھیلین :- (چرخہ چھوڑ کر باہر کی طرف دیکھتی ہے) خدا تمہیں معاف کرے۔ وہ

گھونے پر سوار سبز بیلے سے گذر رہا، اور اس کے پیچھے سفید ٹھو۔

کیٹھیلین (بندل کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے) مجھے چاقو دو نورا! بھیکیں پانی
نے گناہ کو سخت بنا دیا ہے اور یہ گناہ اس قدر مضبوط ہے کہ ایک ہفتے کے
حصے میں بھی نہیں کھل سکتی۔

نورا :- (چاقو ہتھے ہوئے) میں نے سلسلہ کی ڈائیگنل سے لایا گیا ہے جو ایک
دور دراز فاصلے پر واقع ہے۔

کیٹھیلین :- (ڈوری کاٹتے ہوئے) یقیناً کچھ عرصہ پیشتر یہاں ایک شخص آیا
تھا وہی جس سے یہ چاقو خریدا گیا ہے اس نے کہا کہ اگر تم پاس کی چٹان سے
چینا شروع کرو گے تو سات دن میں ڈائیگنل ہو چکے گے۔

نورا :- تو پھر خیال کرو کہ ایک لاش کو وہاں تک پہنچانے کے لئے کتنا عرصہ لگے گا
(کیٹھیلین بندل کھول کر ایک پھٹا قیصر اور ایک جراب نکالتی ہے دونوں دیکھتی ہیں)
کیٹھیلین :- (دھیمی آواز سے) خدا ہماری مدد کرے۔ نورا کیا یہ کتنا تعجب خیز نہ
ہوگا کہ یہ کپڑے یقیناً مائیکل ہی کے ہیں؟

نورا :- میں اس کا دوسرا ٹیس لاتی ہوں پھر ہم معلوم کر سینگے کہ آیا وہ اسی
ہیں (کونے میں لٹے ہوئے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے) وہ ان کپڑوں
نہیں آخر وہ کہاں ہے؟

کیٹھیلین :- میرا خیال ہے کہ بارٹلے نے آج صبح اسے چنا تھا کیونکہ اس کا
قیصر نمک کی زیادتی سے بھاری ہو رہا تھا (کونے میں بتاتے ہوئے) وہاں ہی
کپڑے کی ایک پٹی پھٹی آستین پڑی ہے اسے لے آؤ۔

(نورا آستین لے آتی ہے۔ دونوں کپڑے کا مقابلہ کرتے ہیں)
یہ دونوں ایک ہی کپڑا ہے نورا۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے شخص نے
بھی وہاں سے وہی کپڑا خریدا ہو جیسا کہ مائیکل نے لیا تھا۔

نورا :- (جواب لیکر اس کے بجائے گنتی ہے اور عطا کرتی ہے) یہ مائیکل ہی کے ہیں
کیٹھیلین، یقیناً مائیکل کے خدا اس کی روح کو بخشے۔ جب وہ خود اس حقیقت
سے واقف ہوگی تو کیا کہے گی؟ اور پھر بارٹلے بھی بحری سفر پر روانہ ہو گیا ہے۔

کیٹھیلین :- (جواب لیتے ہوئے) یہ تو بالکل سادہ جواب ہے۔
نورا :- یہ تیسرے جوڑی دوسری جراب ہے جسے میں نے خود بنا تھا۔ میں نے
گن کر ساٹھ بجے لگائے تھے جس میں چار میں نے خود چھوڑ دیئے تھے۔

کیٹھیلین :- (بجائے گن کر) بجائے بالکل برابر ہیں (روتے ہوئے) آہ نورا کتنا
بھیاںک منظر! اس کی لاش اتنی دور شمال سے بہتی ہوئی آئے ادا اس پر

(موریہ چونک جاتی ہے جس سے شال پیچھے گر پڑتی ہے اور اس کا سفید بال سے ڈھنکنا ہوا سر نظر آنے لگتا ہے وہ سہمی ہوئی آواز سے کہتی ہے)

موریہ اور اس کے پیچھے سفید ٹٹو —

کیٹھلیں۔ (اگ کے قریب اگر) آخر تمہیں کون سی چیز تکلیف دے رہی ہے؟ موریہ۔ میں نے اتنی خوفناک چیز دیکھی ہے کہ کسی کو اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ کیٹھلیں اور نور۔ اوہ! (وہ دونوں اگ کے قریب بڑھیکے قریب بیٹھ جاتی ہیں۔)

نور۔ ہم سے کہا ماں جان تم نے کیا دیکھا؟

موریہ۔ میں تپنے والے کنویں کے پاس پہنچ کر دھانگے میں مشغول ہو گئی۔ یکایک ہارٹے لال گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں آیا اور اس کے پیچھے سفید ٹٹو! (وہ اپنی آنکھوں سے کوئی چیز چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتی ہے) خدا ہاری حفاظت کرے نور۔

کیٹھلیں۔ تم نے کیا دیکھا؟

موریہ۔ میں نے خود مائیکل کو دیکھا۔

کیٹھلیں۔ (نری سے) نہیں ماں جان! جسے تم نے دیکھا وہ مائیکل نہیں تھا کیونکہ اس کی لاش دور شمال میں پائی گئی ہے اور خدا کی رحمت سے اسے ایک پاکیزہ تجیز و تکفن نصیب ہوئی ہے۔

موریہ۔ (مخالفت کما نڈاز میں) میں نے آج اسے خود سوار ہوتے اور بھاگتے

دیکھ لیے۔ پہلے ہارٹے لال گھوڑے پر آیا۔ اور میں نے کھنے کی کوشش کی۔

خدا تمہاری حفاظت کرے۔ مگر کسی چیز نے میرے گلے کو الفاظ سمیت گھونٹ لیا۔

اور وہ تیزی سے میرے قریب سے گزر گیا اس نے کہا: تم پر خدا کی رحمت ہو

اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر میں نے اوپر دیکھا اور چلائی وہاں سفید ٹٹو پر مائیکل سوار

تھا وہ نفس خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے پاؤں میں نئے جوتے تھے۔

کیٹھلیں۔ (رونے لگتی ہے) ہم تباہ ہو گئے، ہم لٹ گئے۔

نور۔ کیا نوجوان پادری نے کہا تھا کہ خداوند ب العزت اسے اس کے

مذہب کے محروم نہیں کر سکتا۔

موریہ۔ (دیمی مگر صاف آواز میں) سمندر کا دیوتا اچھی طرح جانتا ہے۔ ہارٹے

اب مجھ سے کہو جائیگا، جاؤ تم ایمن کو بلا لاؤ تاکہ وہ سفید تختوں سے ایک عمدہ باتو

تیار کرے کیونکہ اپنے لڑکوں کے بعد میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس گھر میں میرا شوہر

تھا اور شوہر کا باپ اور چھ بیٹے، چھ بہترین انسان! حالانکہ ان کی پیدائش کے وقت مجھے سخت تکلیف اٹھانی پڑی ان میں سے چند تو مل سکے اور کچھ ہمیشہ کے لئے کھو گئے مگر اب وہ سب کے سب چلے گئے۔ سٹیفن اور شان ایک بہت بڑے لوفان میں کھو گئے تھے۔ بعد میں ان کی لاشیں گولڈن مٹھ کے سمند میں پائی گئیں۔ جہاں سے دونوں ایک ہی تختے پر اس دروازے سے اندر لائے گئے (وہ تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر جاتی ہے) دونوں لڑکیاں نیم دروازے سے کچھ آہٹ سن کر چونک جاتی ہیں۔)

نور۔ (کان میں) تم نے کچھ سنا کیٹھلیں؟

کیٹھلیں۔ (آہستہ سے) وہاں ساحل کے قریب کوئی رو رہا ہے۔

موریہ۔ (غیر کچھ سننے ہوئے بدستور) یہاں نہیں تھا اور اس کا باپ۔ یہ سب

اندھیری رات میں گم ہو گئے تھے مگر طلوع آفتاب کے بعد بھی ان کا کوئی نشان

نہ ملا۔ اس کے بعد پانچ کشتی کے الٹ جلنے سے غرق ہو گیا۔ میں یہاں ہارٹے

کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت ہارٹے بالکل بچہ تھا وہ میرے انو پر سو

رہا تھا۔ یکایک میں نے دو دو تین تین عورتوں کو ہاتھ باندھے ہوئے اندر چل

ہوتے دیکھا۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔ قبر کی سی خاموشی۔ پھر میں نے باہر دیکھا

ان کے پیچھے چند آدمی چھٹے ہوئے سرخ بادبان میں لپی ہوئی کوئی چیز اٹھا

لا رہے تھے جس سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر خشک زمین پر پنا نشان

چھوڑ رہے تھے۔ (وہ پھر رک جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں کو دروازے کی طرف

پھیلا دیتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور بوڑھی عورتیں سینے پہلے ہاتھ باندھے اندر

داخل ہوتی ہیں اور دہلیز کے قریب چوتھے کے مقابلے دونوں ہاتھ جاتی ہیں ان

کے سروں پر سرخ کپڑے پڑے ہوئے ہیں۔)

موریہ۔ (نیم خوانی کی حالت میں کیٹھلیں سے) یہ کون ہے؟ پانچ یا مائیکل؟

کیٹھلیں۔ مائیکل کی لاش دور سمند میں پائی گئی ہے پھر جب وہ وہاں

ملی تو مائیکل یہاں کس طرح آ سکتا ہے؟

موریہ۔ لاش سمند میں تیرتی ہوئی پائی گئی پھر لوگ کس طرح کہہ سکتے ہیں

کہ وہ مائیکل یا اس کے کسی ہم شکل کی لاش ہے؟ کیونکہ ایک لاش جب متواتر

لودن تک پانی میں تیرتی پھرے تو اس کی شناخت اس کی ماں بھی نہیں کر سکتی۔

کیٹھلیں۔ وہ مائیکل ہی کی ہے کیونکہ لوگوں نے اس کے کپڑے دور شمال سے

نبھے ہیں۔ خدا اس کی روح کو بخش دے (وہ مائیکل کے کپڑے لاکر مہیا کو دیتی ہے)

موریا آہستہ سے کھڑی ہو جاتی ہے اور کپڑے لے لیتی ہے اور باہر نکلتی ہے
نورا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ کوئی چیز اٹھائے لارہے ہیں میں سے پانی کے
قطرے ٹپک ٹپک کر زمین پر نشان بنا رہے ہیں۔

کیتھلین۔ (ایک عورت کے کان میں) کیا یہ بارٹلے ہے؟
عورت۔ یقیناً! خدا اس کی روح کو بخندے۔

(دونوں جوان عورتیں آگے بڑھ کر نہ بوسہ کرتی ہیں پھر چپا دی تختے پر
بارٹلے کی لاش کو یاد بان میں لپیٹتی ہیں اور سیز پر کھدینے ہیں)

کیتھلین۔ (عورتوں سے) وہ کہاں غرق ہوا؟

ایک عورت۔ وہاں سفید چٹان کے قریب جہاں مویں سمندر کو اور
بھی خوفناک بنا رہی ہیں۔ سفید ٹوٹے لات چلائی جس سے وہ سمند میں گر پڑا
اور جلد ہی غرق ہو گیا۔

(موریا مین کے قریب دونا نو میو جاتی ہے۔ عورتیں دھیمی آواز سے نام کرتی
ہیں اور جہم کو آہستہ آہستہ حرکت دیکر جھومتی ہیں کیتھلین اور لورا مین کے دوسرے
سرے پر اود مرد دروازے کے قریب دونا نو جاتے ہیں)۔

موریا۔ (سراٹھا کر اس طرح گویا ہوتی ہے جیسے اس نے اپنے گرد لوگوں کو
دیکھا ہی نہیں) وہ سب رخصت ہو چکے اب سمندر میرے لئے کوئی مزید کیف
کا باعث نہیں بن سکتا۔ جب سمندر میں طغیانی بڑھ گئی اور میں مشرق و
مغرب سے اٹھ اٹھ کوا یک دوسرے سے ٹکرا کر مہیب آواز پیدا
کریں گی تب دعا مانگنے۔ عبادت کرنے یا چیخنے چلانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی
اب مجھے سیاہ راتوں میں "مقدس پانی" کی تلاش میں باہر جانے کی ضرورت
نہ ہوگی اور جب دوسری عورتیں سمندر کے مد و جز سے سمج کر گریہ زاری کی گئی
میں اپنے گھر میں خاموش اور مطمئن آرام کی غیند سوتی ہوئی (تو اسے) مجھے
"مقدس پانی" دو نورا۔ وہ کھانے کی میز پر ہے اس کا آخری چلو۔ نورا پانی
دیتی ہے۔

موریا۔ (بارٹلے کے پاؤں کے قریب کپڑے گراتی ہے۔ "مقدس پانی"۔
اس کی لاش پر چھڑکتی ہے) کیا میں نے تمہارے لئے رات رات بھر دعا نہیں
مانگی بارٹلے؟ کیا میں نے سیاہ راتوں کو تمہارے معلوم ہوئے بغیر عبادت
میں نہیں گزارا۔ مگر اب مجھے مکمل آرام نصیب ہوگا۔ اب میں بے پروائی سے
طویل راتوں کو میٹھی غیندیں گزار سکتی ہوں۔ اگر مجھے روتی کا کھڑا اور بدبو

مچلی ہی شکم پڑی کئے میسر ہو جائے۔

(وہ دوبارہ دونا نو ہو جاتی ہے اور اپنے ہاتھوں کو سینہ پر باندھ کر زیر
لب دعا پڑھتی ہے)

کیتھلین۔ (ایک بوڑھے آدمی سے) ہو کے تو آپ اور امین سوچ طلوع ہونے
سے پیشتر تابوت تیار کر لیں۔ بوڑھے ماں نے خود ایک نفیس تختہ خرید لیا ہے اس
کا خیال تھا کہ مائیکل کی لاش جلد ہی مل جائیگی۔ میرے پاس تازہ روتی موجود
آپ کام کے دوران میں اسے کھا سکتے ہیں۔

بوڑھا۔ (تختے کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا اس میں کیل بھی ہیں؟

کیتھلین۔ نہیں کالم کیل تو ہم بھول ہی گئے۔

دوسرا آدمی۔ تعجب ہے کہ وہ کیل کیونکر بھول گئی جبکہ پورے تابوت کا
سامان موجود ہے۔

کیتھلین۔ وہ اب بوڑھی ہو گئی ہے اور اس کی طاقت جواب دے رہی ہے۔
(موریا دوبارہ کھڑی ہو جاتی ہے اور مائیکل کے کپڑوں کو پھیلا کر ان پر
"مقدس پانی" کے آخری قطرے چھڑکتی ہے)

نورا۔ (کیتھلین سے) آج وہ خاموش اور مطمئن ہے لیکن جس روز مائیکل
غرق ہوا تھا اس کی چیخ و پکار اچھے والے کنوین تک باسانی ہی جا سکتی تھی۔ وہ مائیکل کو
دل سے چاہتی تھی۔ کسی کو اس کا گمان بھی ہو سکتا ہے۔

کیتھلین۔ (دھیمی اور نرم آواز سے) ایک بوڑھی عورت کسی کام سے بہت جلد اکتا جاتی
کیا یہ سسل نودن سے گھر میں آہ و زاری اور ماتم نہیں کر رہی ہے؟

موریا۔ (پانی کے پائے کو منہ کے بل میز پر رکھتی ہے اور بارٹلے کے پیڑوں پر پسند و نونوں پر تھک چکی
ہے) اب وہ سب کٹا ہو گئے خدا بارٹلے کی روح کو اٹھائیں اور پانچ اورٹین لورٹان کی روح
کو بخندے (سر جھکاتے ہوئے) اور میری روح پر اور نودا کی روح پر اور اس دنیا میں تمام پند گان
کی روحوں پر خدا کی رحمت ہو (وہ ٹھہرتی ہے اور عورتوں کے رونے کی آواز ذرا تیز
ہو جاتی ہے پھر کایک خاموش ہو جاتی ہے)

موریا۔ (بیتور) خدا کی برکت مائیکل کو شمالی سمندر میں ایک پاکیزہ تہیز بخین میں پھونکی
بارٹلے ایک نفیس سفید تختوں والے تابوت کا وار ہوگا اور یقیناً ایک گہری قبر کا وارث
ہیں اس زیادہ اور کیا چاہئے دنیا میں کی بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ نہیں رہ سکتا اور میں
اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ (وہ دوبارہ دونا نو ہو جاتی ہے)

~~~~~ (پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے) ~~~~~

# برسوں سے

جناب مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ آگرہ

نظر میں ہے خمارِ نرگسِ متسانہ برسوں سے  
تلاشِ قیس میں ہے آج تک یمنِ برسوں سے  
کیس کھولی ہوئی ہے ہمتِ نندِ برسوں سے  
وہی ہیں حسن کے جلوے ہی شوقِ غمخواری  
نگاہیں پھیریں تم نے تصدقِ ننگا ہوں کہ  
جہاں لب بھی ڈھنڈے سے میکش کو نہیں ملتی  
ہماری کم نگاہی پر مگر جلوؤں کو رحم آئے  
خزاں کے بھرے تونچ ہو اٹتے دروں پر

اٹھا رکھے ہیں ہم نے بادہ و پیمانہ برسوں سے  
کہاں آوار ہے تو اے دل دیوانہ برسوں سے  
کہ خالی جام ہیں غلاموشِ ہر میخانہ برسوں سے  
جنون شوق کھو بیٹھا مگر دیوانہ برسوں سے  
بنار کھلے بھکوا اپنے بیگانہ برسوں سے  
وہیں آ باد تھکے تنفسِ میخانہ برسوں سے  
نگاہیں تک رہی ہیں آ زو سندانہ برسوں سے  
مری ناکامیوں کا ثبت ہوا فسانہ برسوں سے

دمِ آخر نگاہِ منتظر نے کیا کیا طاہر  
ہوا تھا رازِ دل کا آج تک افسانہ برسوں سے

# نازو

از جناب اختر انصاری صاحب بی۔ اے (اڑس)

اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن آہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری نہیں، یہ تمام رعنائی ایک دھوکہ ہے۔ ایک فریب ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح آٹھ ہے ایک جھوٹے کے مانند گزر جائیگی۔

اے وہ لکھی نموس اور نہرا دھبہ تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا کہ آپا میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے اس بے چارے کو بخار کو سو، ہنسنے کا نتیجہ سمجھا تھا اور اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک دو دن کی دوا کے بعد اتر جاتا ہے بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر و بیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ آبا جان نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دہلی کے افضل سے افضل سے طبیب بلوائے اور جب ان کی کوششیں ناشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا لیکن بخار کسی طرح نہ اترتا اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلادیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے قبل وہ بھائی بیٹی اور قہنی دعائیں مانگی گئیں، انگلیں گر طیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری ناز کی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ صرف ردنا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سمجھا لایا کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر اس کو کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے اگر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا تو کم ہو گیا لیکن زبان کی دیسی گونگی رہی چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ کہا۔ دن، دن، دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی سب کچھ سمجھتی تھی اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف

میرے شوہر کو مناظر قدرت اور ان کی دلپذیر شادابیوں سے بہت محبت ہے چنانچہ ہم شہر سے کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، گیاریاں ہیں اور رویشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر دوس فطرت دست انسانی کی گستاخیوں سے نا آشنا ہے چاند، سورج، مینہ اور شبنم مشاطہ کے فرائض ان رات انجام دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ مسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گہنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر لیل کی پٹری ہے جس پر سے دن رات ریلیں گزرتی ہیں۔

یہ گزرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پا کر اپنی بہن کو داغ دے گئی۔ جو جوان ہوئی اور جوان ہو کر مر گئی۔ جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت، بڑی جانفشانی سے پالایا میں دن دن بھر اس کو گود میں لئے رہتی اور ساری ساری رات پگورے میں لٹا کر لوہیاں سناتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اماں جان بھی اگر زندہ رہتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی۔ جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ جہان بھر کی تابانیاں اور روئیں اس میں سمٹ کر آگئیں، اس کے سیاہ بال بید گھنے اور لائے ہو گئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہو گیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ چچ ایک عورت معلوم ہوتی، میں اس اٹھان



ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہوئے ہے۔ لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال کرتی ہوئی اس کے ارمانوں کو کھیتی ہوئی سفاکانہ بے اتفاقی کے ساتھ کھل جاتی ہے تو اس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ (جامعہ)

ہوش کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے ریل اپنی شاندار بیت الگیز کر گزرا ہٹ کے ساتھ آتی اور میرے مکان کے سلتے سے گذرتی ہے اس وقت میں مایا محسوس کرتی ہوں کہ ناز و افق کے کسی بعید زین گوشے سے مسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو دیکھ رہی ہے اور اپنے دلوں

# نغمہ دل!

جناب نیت داند رجیت صاحب شراما

گوارہ غفلت میں ذرے پٹے سوتے ہیں  
آغوش محبت میں قطرے جو ہیں روتے ہیں  
دنیا کو ڈوبتے ہیں ظلمت کو بھگوتے ہیں  
غفلت کو مٹائے جا  
سرست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا،

خاشوش تری ہستی کا ہوگا رباب اکدن  
موجوں کے تھپیڑوں میں ٹوٹے گا حجاب اکدن  
رکھا ہی نہ رہ جائے یہ تیرا حجاب اکدن  
پر دہل کو مٹائے جا  
سرست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا،

اے میرے دل شیدا تو داگ سنائے جا  
اب نیند نہیں آتی بیٹھا ہوں میں گلے جا  
تاریک فضاؤں میں نغموں کو بہائے جا  
ذروں میں سمائے جا  
سرست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا

ظلمت کے مناظر پر چادر ہے ستاروں کی  
آفاق پہ چھائی ہے اک موج شراروں کی  
دنیا میری نظروں میں ہے نور کے پاروں کی  
تصویر بنائے جا  
سرست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا

# غزل

ستم ہے دل ہے شوخ کی محفل سے بیگانہ رہا خود راہبر گویا رہ منزل سے بیگانہ  
 لرزتے تھے زمین و آسمان بتیاب تھا عالم قیامت تھی ہوا دل حبیبی محفل سے بیگانہ  
 محیطِ عشق میں نا آشنائے کامیابی ہوں کہ میری کشتی امید ہے ساحل سے بیگانہ  
 سناؤں کیا تجھے رواد میں سوزِ محبت کی بزمِ شمع کشتہ ہوں تری محفل سے بیگانہ  
 مری روادِ بربادی نہ پوچھو ہم نشین مجھ سے نشاط و عیش کا کیا ذکر میں ہوں دل سے بیگانہ  
 عجب افسانہ بھرتے، اس بکس کی بربادی رافت میں جہنم ناکام ہو منزل سے بیگانہ  
 اگر مانگو تو مل جاتا ہے رنجِ اُس کی محفل سے کہاں ہے وہ تمنائے دلِ سائل سے بیگانہ  
 عجب انداز کا محنوں ہوں میں شجیت میں مری لیلیٰ ہے قیدِ پردہ و محفل سے بیگانہ

رشید اب حضرتِ ناصح جو برہم ہیں تو ہونے دو  
 وہ کیفِ محرم سے کیا واقف؟ جو ہو محفل سے بیگانہ

# اردو شاعری اور شراب

جناب شربا سطر صاحب بسوانی

شیخ، نامح، ناہ وغیرہ

اکبر الہ آبادی

دل بھی کا پنا ہونٹ بھی تھرائے شرابا بھی خوب

شیخ کو لیکن تری محفل میں پسنا ہی پڑا

حضرت اکبر نے مصرہ کیا لگا یہ تصویر کھینچی ہے۔ ۶۔ دل بھی کا پنا ہونٹ

بھی تھرائے شرابا بھی خوب۔ پینے دل کا پنا اس کے بعد ہونٹ بھی تھرائے

دل نہ کا پنا تو پھونٹ کیوں تھرائے؟ شرابا بھی خوب۔ ”خوب“ کیا خوب ہے

مسی میں کس قدر ترقی ہو گئی۔ باوجود ان تمام باتوں کے غریب شیخ کو چھٹکا

نہ ملا۔ اور چھٹکارہ کیونکر مٹا کوئی ایسے ویسے کی محفل تو تھی نہیں۔ پینا ہی پڑا

کی کیا تعریف ہو سکتی ہے؟

(۱) ساغر ہے سامنے شیخ سے کہہ رہے ہیں وہ

دیکھتا کیا ہے ہر طرف مرد خدا چڑبا بھی جا

یہ بھی ایک موقع ہے ساغر سے سامنے ہے مگر شیخ غریب اپنے تقدس کے

لحاظ سے جھجک رہا ہے۔ جب زیادہ اصرار رہا تو آدائی ظاہر کی مگر ساتھ ہی

اس کا بھی خیال ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے مگر پلانے والا چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو

یہ لطیف شے شیخ کے حلق کے پیچھے اتر جائے لہذا تاکید فرمایا جاتا ہے م

دیکھتا کیا ہے ہر طرف مرد خدا چڑبا بھی جا

”مرد خدا“ کے کڑے کے بر محل ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ چڑبا بھی جا

کتنا خوب ہے۔

شیخ کی دعوت میں ہے کاکام کیا احتیاطا کچھ منگالی حساب لگائی

شیخ کی دعوت میں دراصل شراب کا کیا کام؟ گو نہیں اس زمانہ کے

شیخ ہیں مکن ہے کچھ پی لیتے ہوں لہذا احتیاطا تھوڑی سی منگالینے میں کیا

ہر جہ سے رہا کہ کیوں پیتے ہیں؟ اس کی تاویل شیخ جیسا خوش تقریر اور دھڑکا

تقدس سو طرح کر سکتا ہے۔

باسطہ

کس ہو تقریر سے کیونکر جناب شیخ کو روز پی لیتے ہیں تھوڑی غلط فہمی کے بعد

ریاضہ

نہم سے پر برس پڑا تراا پر سید بن کج رہیگی دہلے واعط تری تقریر سنا

تقریر سنا نہ کا کیا لطف بیان کیا جائے میں کے دوران میں جناب

واعط غم پر برس پڑے اور پھر رسنا بھی کس انداز کا۔ ”ابر سید بن کج“ مطلب یہ

ہے کہ تقریر واعط سے بجائے خفا ہونے کے حضرت ریاض لطف اندوز ہوئے

اور دواعط کے برس پڑنے کی طرف دھیان نہ دیا۔

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی میکہ سے اب پرانی جائیگی

کیوں نہ تو شیخ جیسے بزرگ کے لئے چاہئے بھی کہ نہ۔ آخر کوئی شائبہ

تو ہونا چاہئے

وہ آ رہا ہے عصا میلتا ہوا واعط یہاں اتنی کہ سائی کہیں نہ تھائے

بحان اللہ غرق سے ناب اولیٰ کی تدبیر اس سے اچھی کیا ہو سکتی ہے

کسی صورت سے شیخ کو داخل ثواب کرنا ہے۔

پپی کے اس لئے مجھے کئی تمام رات اللہ سے شغل زادہ غیب زندہ دار کا

خدا جانے یہ کس قسم کی شراب تھی کہ جس کو پی کر سوائے سجدہ کے

اور کچھ سوچا۔ اس شغل۔ ان اشغال کی کیا تعریف ہو۔ ہر بندہ خدا کو

یہ تو فہم کہاں ہوتی ہے۔

کجنت نے شرابی کو اس قدر کیا واعط کے منہ سے کہنے لگی ہونٹا کی

اور ذکر کریں۔ آخر زندوں کے سامنے اور ہر وقت ذمت شراب



کرنے کا کچھ تو پہل مل چاہئے۔

آئیر ۵

آئیر اک باہمی اعطائیں کتنا خدا لگتی خدا جانے بلکہ تپے کیا جھوٹا خدائی کا  
اور مصرعوں میں تین جگہ لفظ خدا کی تکرار ہے مگر کیا جمال جو کیس نہ گور  
ہو۔ خدا لگتی اور خدائی کا جھوٹا۔ محاورے کس روانی اور بیباکی سے نظم  
ہمے ہیں۔

آتش ۵

زاہد ان خشک کو کیفیت دینا نہیں ساغر گل سے نئے کس ن چن میں غارت  
زاہد ان خشک کو غارت خشک سے تشبیہ دینا۔ ساتھ ہی کیفیت سے محرومی  
اشد اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔

داغ ۵

قسم تو کھل کر زاہد کیا کرے گراں گھر کیسے چھلکنا ساغر کو کا چلنا بادہ خواروں کا  
قسم دیکر پوچھ رہے ہیں۔ آخر دریافت میں اس قدم مار کیوں۔ صرف  
اس لئے کہ زاہد سے سوا اس جواب کے اور کوئی امید ہی نہیں کہ وہ بھی زاہد و تھوٹی  
کو خدا ساغر کر دے۔

لطف نے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کجبت لٹنے بی ہی نہیں  
کیا کہنا ہے۔

باسطہ ۵

پی کے دیکھ تو حال کھل جائے شیخ پوچھو نہ کچھ مزہ کیا ہے  
داغ ۵

اندیشہ فردانہ رہ حضرت زاہد بیخانے میں پی لیجئے تھوڑی سی گر گرج  
ہاں عادت ہو گئی تو بادہ کو زبھی پینے میں شکل نہو گی۔

اگر آپ مول لیجئے تو تیر نشہ ہوتی بے صفت کی جو زاہد وہ نہیں شراب پرگز  
تیر نشہ نہ سہی مگر صفت کی شراب حلال تو ہو گئی۔

اے داغ یکے سے گویں غیب شیخ ٹوٹے آج قبد حاجات کا لحاظ  
لحاظ تو نہائی تو شکل ہوتا ہے اس کے بعد ہر شکل آسان ہے۔

تقصیر غرض کی لئے عتبہ نہیں یہ چیز اڑ کے جاتی ہے میواری کی طرف  
اس میں کیا شک ہے اس سے اچھی کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ یہ چیز کیا لطیف  
اشارہ ہے۔

کچھ شان مغفرت سے دھندلاہو ڈوبیں گناہ بادہ شعل شراب میں  
شان مغفرت سے دھندلاہو نہیں کہ ندان بلا نوش بھی اپنی تمامت  
لفیل غشہ دینے جائیگے۔

غائب ۵

کمان بیخانہ کا دروازہ کھلا اور کمان اعط پراتنا جانتے ہیں کل جاتا تھا کہ ہم نکلے  
واعط کو در بیخانہ سے کئی مناسبت نہیں اسی سے تو حضرت غائب کی تیر  
اور اس کے اظہار کا پیرا بھی خوب۔ ڈرتے ڈرتے کہہ ہے۔ ۶  
پراتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

باسطہ ۵

مزہ ہو سیکر سے شیخ سو ڈھیر سو با وہ چھیں تو کہاں آیا میں ہوں تم کہاں  
تیر ۵

بارے ستوں نے ہوشیاری کی دیکے کچھ عتبہ کا منہ جھلا  
کیا خوب۔ عتبہ کو کس ترکیبے غامض کیا ہے۔

باسطہ ۵

شیخ جی کی میکشی کا کچھ عجب انداز ہے کچھ تو پہلے پیتے ہیں کچھ غلط فرماتے کے بعد  
بیخانہ سے پلٹے پلٹے شیخ جی ملے پہچان لگے تھے تو لولہ کہیں نہیں  
بیٹھے ہیں شیخ صاحب دہن میں جی کے کیا غیب سے ہوئے ہیں مان دگی کے  
جوش جی کا چلے بس تو میکشی کیسی خیل دفتر مذ بھی حیران ہو جائے  
مرے ساتھی یہ بناوٹ نہیں دیکھی جاتی بے شیخ نے منہ اپنا سب رکھا ہے  
بیجودی میں بھی تھا پاس ہندو شیخ کو لب سے باغ ہٹا یا غلط فرماتے لگے  
سرور آج اچھی دگی ہے کہیں بیٹھا ہوں اور زاہد نے پی ہے  
غرض مستانہ

ریاض ۵

ہاری غرض پائیں طواف کعبہ ہے پے ہوئے در پر مٹاں سکتے ہیں  
قربان اس پر مٹاں کے حواس نگہ سے پلائے۔

چکبست ۵

رخ ہے ساتھی کی طرف ہاتھ پٹائی ہے رہنا آج سری غرض مستانہ ہے  
کوئی تعریف ہو سکتی ہے۔ غرض بھی کس ٹھکانے کی ہے۔

جلال لکھنوی ۵

شاروں کا کیا پاؤں پھینکتے نہیں کیا دوست تری لغزش پاوری کچھ  
"اوری کچھ" سے لغزش پاوری کچھ ہو گئی ہے۔

باسط ۵

ہست جن ہاتھ میں آجاتے ہمارے لیتی ہے قدم لغزش مستان ہمارا  
زین لے لے لاکھ قدم بیکے ہمارے چھوٹا نہ مگر ہاتھ سے پیسا ہمارا  
مازل کے روگر پیر خاں کا تھام یہ میری ہر لغزش میں گنگ لغزش تلو تلو  
تو بہ شکنی

داغ ۵

ی داغ تو یہ کی ہے کبھی پھر شراب پی نہ عذاب ہی لیگا نہ جس ثواب ہرگز  
کیا فیصلہ فرمایا ہے۔

لغات لکھنوی ۵

بدھ کی ہوس میں دم تو بہ شکنی جب اٹھ دست مار گئے چٹو ہو کر  
"چٹو ہو کر" کی کیا تعریف ہو۔

ریاض ۵

چنگن یہ کون ہوا خم سے ہکنار کیا کیا ملی ہے ٹوٹے تو بگناہ سے  
مہ ہے تو چنگن تو بھری جام چنگن سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے  
تو چنگنی تک تو غنیمت تھا مگر جام شکنی تو ملاحظہ کیجئے۔ دوسرے مصرع  
ہے تو منظر ہی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

جگر سوانی ۵

مہ اسے تو یہ اسی میں غرق کر دیتے ہیں پھر تجھ کو  
جہاں لبریز ہو کر سامنے پیسا آتا ہے  
تو چنگنی کا ذکر کس لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔

باسط ۵

اسط تو چنگن تھا گوشتہ میخانہ تھا لب پہ تھا کچھ کہہ تبسم ہاتھ میں بیاض تھا  
ورا آنکھوں ابھی ساغر و میخانہ کروں موسم گل کا قاضی ہے کہ تو بہ نہ کروں  
ہو اور راج ناہد اس طرح یکیشی ہو تو یہ بھی ہیکہ سے بیت تیرا دیکھتی ہو  
کیف و بخودی

جگر آبادی ۵

سی کی مست خرامی کاواہ کیا کہنا کہ جیسے حافظ شیراز چور چور آئے

ندرت تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ریاض ۵

بڑی کیا تھی نا تو مستی بے لطف گذرتی لئے کچھ جوئے کی تلخی غم روزگار ہوتا  
کیا پیاری تمنا ہے۔

دست شفقت طرح اک بند پیرارینا بیٹھکر یاد خدا میں جھومنا جاتا رہا،  
چکبست ۵

کیفیت گلشن ہے مرے نشہ کا عالم کوئل کی صدا نعرہ مستان ہے میرا  
جلال لکھنوی ۵

دل ہو وہ چشم مست ہو بزم شراب کوئی خراب ہو تو بلا سے خراب ہو  
داغ ۵

عالم وجد میں بخود نہیں ہوتے صوفی نشہ میں چور ہیں نمان خرابات ہی کیا  
صوفی بدست کیوں نہیں ہوتے مگر ان کو کوئی نہیں کہتا۔ قصور تو صرف  
زندوں نے کیا ہے۔

سچ کیا جلیے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں، بے بادہ مست ہوں میں شب اشتباہ  
شب ہاتھ کے بھلے ہوئے جلیے خدا کرے کسی کو نہ یاد آئیں بخبری تو بخبری جا  
پر بن جاتی ہے۔

حیرہ کچھ ہوش نہ تھا بزم محراب کا ہم کو صدکر کہ مسجد میں ہو مستی میں وارد  
اچھا ہوا وہ نہ ممکن تھا کہ مبر و محراب خیال کر کے گناہگار ہو جاتے۔

باسط کوئی اس وقت دیکھے دوسرے کی آغیت ہم اپنے کانپتے ہاتھوں میں دم مہام لیتے ہیں  
(باسط لبسواخی)



# لمعات

مجھ پہ طاری موت کا ہنگام ہے،  
دل کا آنا موت کا پیغام ہے  
انتظارِ یار بھی اک کام ہے  
میری بربادی کا چہرچا عام ہے  
اس طرح ہوتی ہے طے راہِ امید  
یا ہوئی ہے وصل کی شبِ مختصر  
آب و دانہ نے دکھایا تھا قفس،  
بزمِ عشرت میں نگاہِ التفات  
یہ بھی اک اسلوب ہے فریاد کا  
کچھ لڑکپن، کچھ جوانی، کچھ حسرت  
پھر گئی جب یہ تو دنیا پھر گئی  
ساری دُنیا دیکھتی ہے آپ کو  
اس کے ساجد کا تبِ اعمال ہیں

چارہ گر سمجھتا ہے اب آرام ہے  
عشق کا آغاز ہی انجام ہے  
صحن ہے، کوچہ ہے، درجہ، بام ہے  
جانتے ہو؟ آپ پر لازم ہے  
منزلِ مقصود ہر ہر گام ہے  
یا مودنِ مرغِ بے ہنگام ہے  
شفقتِ صیاد ہی اب دام ہے  
حُسن کی سرکار سے انعام ہے  
تم سے مطلب ہے فلک کا نام ہے  
کچھ سحر، کچھ دوپہر، کچھ شام ہے  
آنکھ تیری گردشِ آیام ہے  
عاشقِ شیدا مگر بد نام ہے  
آہِ آدمِ سختِ نافرِ جام ہے

آپ نیتِ کونہ ہرگز بھولے  
اک وہی تو بندہ بے دام ہے

نیتِ سر، اتر سہری

# شہید محبت!

## ایک بالکل سچا اور حیدر پرورد افسانہ

جناب محبتی حسین صاحب یقینی۔ بیتا پور

ہر حق مدارِ ملت  
ح

اس کی زندگی کی تباہی کوئی وقت نہ دکھتی تھی اور نہ وہ اس پر کبھی غور کرنے کے لئے آمادہ تھے۔

بچہ بچہ نہ تھی۔ جوان تھی۔ پندہاں سال تھا۔ جانتی تھی اور جو کچھ گھر میں ہوتا تھا اس کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ مجھے اور میری محکمہ دوشیزگی کو بڑی بے دردی سے علاقہ کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے لیکن بے گناہ بچہ نے اس ہندوستانی ماں کی گود میں پرورش پائی تھی جس میں ہائی شادی کے متعلق کسی قسم کا اظہار عام اس سے کہ وہ نہ تباہی حق بجانب و نہ بجا جڑیں کوٹیں ہو سوسائٹی کے نزدیک سب سے بڑا جرم تھا۔

زمانہ ہزاروں کروڑوں لینے کے بعد بھی بچہ جیسی فرشتہ خلعت اور مریم صفت لڑکی پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا اس نے دینائے محبت میں ایک ایسی حسرتناک مثال قائم کی جس پر طبقہ نسواں جس قدر بھی فخر کرے کم ہے باپ کی اطاعت گزاری اس کی فرمانبرداری اپنے چاہنے والے کے ساتھ مستحکم عہد و فاداری غم و ادا دہ کی وہ مجرا عقول نظیر چھوڑی ہے جو اگر آج کیا ب نہیں تو کم سے کم دنیا کے ہر شخص کے علم میں بھی نہیں ہے۔

۲

نصیر آباد، ۲۶ جنوری،

وفا شعار اسلم، خدا کرے تم اچھے ہو، لو میں بات کے کھٹکے سے بچو دنوں کی جان بولیں پر تھی اس کی تکمیل کا وقت آگیا۔ رنجیدہ نہ ہونا اور نہ اس کا لہجہ کرنا کہ تم مجھے حاصل نہ کر سکے۔ اگر تم ایسا خیال کرو تو تمہاری بھول ہے۔ اسلم تم جس چیز کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس کو تم نے حاصل کر لیا۔ باور کرو وہ اب کسی کا نہیں ہو سکتا۔ تم میرے دل ہی کے تو خریدار تھے۔ تو کیا وہ تمہارے

نواب فدا حسین صاحب میں جہاں تمام انسانی خوبیاں تھیں وہاں ان میں دولت پرستی کا ایک ایسا عیب تھا جس پر اپنی اولاد کی قربانی بھی ان کے نزدیک جرم نہ تھی۔ وہ ایک ایسے علاقہ کے مالک تھے جو بادی النظر میں کافی زرخیز تھا لیکن اپنی عمر کے آخری دور میں انہوں نے اپنی چھوٹی لڑکی بچہ کے خون سے اس کو مرہن و شاداب رکھنے کی کوشش کی۔ قدرت نے اگر ایک طرف ان کو تمام اسباب آرام و آسائش بڑی فیاضی کے ساتھ عطا کر رکھے تھے تو دوسری طرف ان کے ساتھ یہ ظلم بھی کرنے میں نکل نہیں کیا تھا کہ ان کو کوئی اولاد نہ عطا نہیں کی جس کی نواب صاحب کو بڑی آرزو تھی اور یہی سبب بچہ کی بربادیوں کا باعث بن گیا۔

بچہ جیسی نیک، معصوم حسین عصمت مآب دوشیزہ اپنے باپ کی دولت پرستی کا جس بری طرح شکار ہوئی آج دینائے انسانیت میں اس کی نظیر ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

وہ بچہ جو بچوں میں پیدا ہوئی۔ کیوں میں کہلی۔ آج آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہی ہے۔ کہوں؟ اس لئے کہ اس کے ظالم، بیرحم سنگدل اور محبت ناک آشنا باپ نے اس جھلملاتی ہوئی شمع امید کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جو اس کی زندگی اور روح کا ایک جزو بن چکی تھی۔

نواب فدا حسین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بچہ اپنے پچھلی زاد بھائی اسلم سے مانوس ہے دونوں بچپن میں ساتھ کھیلے تھے۔ ساتھ کھڑے تھے۔ ساتھ جوان ہوئے تھے لہذا اگر دونوں کے اس نے محبت اور محبت نے عشق کی صورت اختیار کر لی تھی تو کوئی عیب نہ تھا لیکن نواب صاحب جن کے دل میں مجھ سے زیادہ علاقہ کی محبت تھی ان کے نزدیک اس کی ناکامیاں اس کی بربادیاں،

پاس نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے۔ جس میرے پاس نہیں ہے تو پھر بجز تمہارے  
ادس کے پاس ہو سکتا ہے؟

دیکھو! اسم انکار نہ کرو، چھپاؤ نہیں۔ میں واپس نہیں مانگتی۔ مگر ہاں مخالفت  
سے رکھنا۔ بد عمدی نہ کرنا۔ سنا نہیں۔ ایک ناکام تنہا کا حسرت بھر دل تمہارے  
پاس لانت ہے اگر خلوص و محبت سے رکھو گے تو احسان ہے ورنہ کوئی شکایت نہیں  
تم پریشان کیوں ہو؟ کیا اس نے کہیں تمہاری نہیں ہوں۔ لیکن اسم!  
میں نے یہ کب تم سے کہا کہ میں تمہاری نہیں ہوں۔ بظاہر دنیا مجھ کو تم سے الگ  
کر سکتی ہے۔ جہانی حیثیت سے ہم تم دونوں جدا ہو سکتے ہیں یا کر دیے جا سکتے  
ہیں لیکن اسم! مجھ کو دولت و علاقہ کی بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے اس کے  
دل اور اس کی روح کو کوئی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔

میرے مجھ کو اباجان نے پرورش کیا۔ اپنے دل کو میں نے پالا وہ اپنے چیز  
کو علاقہ کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں میں اپنے دل کو تم پر بچھاؤ کر رہی ہوں۔ پھر اسم  
تم کیوں آبدیدہ ہو جس چیز کا اختیار ہی نہیں وہ بھلا میں تمہیں کیسے دیدوں میں  
نے تم کو وہ انمول چیز دی ہے جس کی قیمت کوین کی دولت بھی نہیں ہو سکتی  
اسم چپ کیوں ہو۔ ہاں معلوم ہوا احساس ہے۔ جانتی ہوں تم مجھ سے محبت  
کرتے ہو لیکن بھولے اور خود فراموش اسم محبت کا مقصد انصال جہانی تو  
نہیں ہے۔ اگر محبت کا مقصد محبوب کا حاصل کر لینا ہے تو اس کو حاصل کر لینے کے  
بعد محبت کا فنا ہو جانا بھی یقینی ہے اسم خدا کے لئے اس ناپاک جذبہ کے تحت  
محبت کو مجروح نہ کرو۔ اپنے خلوص کو داغدار نہ بناؤ۔ ورنہ یاد رکھو محبت کا دیوتا کج  
جو خوشی و مسرت کے بھول تم پر برسا رہا ہے وہ کل نفرت اور معارت کے کانٹے  
تمہارے لئے بچھائے گا۔

تباؤ اور صبح تباؤ کس راستہ پر سب سے پہلا قدم رکھنا چاہتے ہو۔ اسم خدا  
شاہد ہے میرا ہر گز یہ منشا نہیں ہے کہ تم مجھ کو کھو دینے کے بعد مجھ کو کی زندگی بسر  
کرد۔ شادی کرو اور اپنی زندگی کی خوشیوں کو میرے اوپر برباد نہ کرو۔ ورنہ یہ  
میرے لئے دوسری تکلیف ہوگی۔

میری زندگی کی ناکامیوں پر نہ رنگ چکی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی اُس  
کی تقلید کرو اچھا خیر اس کو جانے دو اس کے لئے تم کو مجبور کرنے کے واسطے  
کافی زمانہ ہے ذرا سرگزشت تو سنو۔ تم کو صرف اس لئے ناپسند کیا جاتا ہے  
تمہارا جرم صرف یہ ہے کہ تم اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو اور اس طرح میرا

داسن تم سے وابستہ کر دینے میں اباجان کی جائداد و حصوں میں تقسیم ہو جائیگی  
میرے خیال میں اگر مذہب اور سوسائٹی کا موجودہ قانون اجازت دیتا تو  
اباجان کی حریفیں اور دولت پرست طبیعت ہم دونوں بہنوں کو ایک  
ہی شخص کے حوالے کر دینے میں کبھی پس و پیش نہ کرتی۔

اسم دنیا کی نیرنگیاں تو دیکھو۔ اباجان کے دماغی توازن کا تو مطالعہ  
کرو۔ جب ہم دونوں بہنوں کو نصف نصف جائداد دینے پر آمادہ ہیں تو  
پھر تقسیم یا عدم تقسیم کا سوال ہی کیوں درمیان میں لایا جا رہا ہے۔ مگر نہیں  
اسم میں بھول گئی علاقہ کو تعلق بنانے کا لالچ اباجان سے میری قربانی کر رہا ہے۔  
اچھا اس کو بھی جانے دو۔ میں جائداد سے باز آئی۔ میری ساری جائداد  
تو تم ہو۔ بس میری جائداد مجھ کو دیدی جائے مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ لیکن  
یہ اُن سے کہے کون؟ میں کہوں بے حیا کہلاؤں۔ اماں جان کہیں ناقص عقل  
کہلائیں۔ گناؤں کی عورتیں کہیں جاہل کہہ کر دھچکاردی جائیں۔ تم کو تو ناجائز  
تعلقات کا الزام لگایا جائے۔ پھر محبت کی یہ کشتی علاقہ کے سمندر سے پار ہو  
پار ہو تو کیوں نہ ہو۔ اچھا اسم اس کو اسی میں ڈوب جانے دو۔ ہم تم دونوں  
اس چکر سے نہیں نکل سکتے۔

اُو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے یلوس ہو جائیں۔ اس کا کیا علاج  
جس باپ نے ہمیں میں میرے جھوٹنے کے لئے پالنا بنوایا تھا وہی کج میرے  
لئے قبر کھود رہا ہے۔

اُو ہم تم دونوں اپنی تنہاؤں کو اس میں دفن کر دیں۔ میرا خط پڑھتے  
پڑھتے تم گھبراؤ تو نہیں گئے۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اس میں بھلا کون سی ایسی  
بات ہے جس سے تم کو خوشی ہوئی ہوگی۔ لیکن ابھی اور لکھوں گی۔ کچھ اسنو  
لپٹے بٹے کا سامان اسی خط میں کچھ اور تلاش کرو۔ اچھا اگر تم کو نہیں  
ملاقاتو۔ ہم دونوں بہنوں کی شادی میری خالہ کے دونوں لڑکوں مصغر  
اور امل کے ساتھ بالکل آخری طور پر طے ہوگئی۔ سنا اسم! ایک مہینہ کے بعد  
رات لائے گی۔ ہمیں دو مہینے بنایا جائیگا۔ لیکن جانتے ہو فرق کیا ہوگا ایک  
ہمیں کا شہر اشاداب اور دوسری کا اس کی آہوں سے مرجھایا ہوا ہوگا،  
اسم! اس میں کا ایک بھول تم کو بھی دفن ہوگی۔ احتیاط سے رکھنا۔ میری موت  
کے بعد جب قبر پر آنا تو اسی کو چڑھا دینا۔ اچھا اسم صاف کرنا تمہاری بڑی  
سمجھ خاشی کی۔ اجازت دو کہ خط ختم کروں۔ دعا کرو میری پہلا داؤہ ختم ہو  
تمہاری ہم عصمت بھگت۔

ہے اس کے ساتھ مجھ کی شادی کر دینے سے وہ جائیداد بھی تمہاری جائیداد میں شامل ہو جائیگی۔ پھر تم جن دو بھائیوں سے اپنی لڑکیوں کی شادی کر رہے ہو۔ یہ بھی تو دیکھو ان میں جائیداد کی حفاظت کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں؟ ان کے پاس ایک بسوہ بھی نہیں ہے ان کو زمینداری کا حال کیا معلوم۔ لڑکے کچھ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں۔

نواب صاحب! درشت! آئینہ پرچہ میں یہ لکھ کر بڑا بے ہوش ہوئے باہر چلے گئے کہ میں نے جو رائے قائم کی ہے اس کو تبدیل نہیں کروں گا۔

نواب صاحب کی بیوی پر نواب صاحب کے اس آخری جملے سے سنا سنا چھا گیا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ غور کریں بھولی مجھ کی ضرورت سے ان کے سامنے آگئی۔ ناز و نعم سے پالی ہوئی بچی کو دیکھ کر اور اس کی بربادیوں کا تصور کر کے مجبوراً دل بھرا یا جب ماں بیٹی کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں آبدیدہ تھیں۔ ماں نے فرط محبت سے مجھ کو گلے لگایا اور اپنے میری بچی کہہ کر ان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ہونا رنجہ تاڑ گئی کہ شفیق ماں کا کلیجہ کیوں پھٹا جا رہا ہے لیکن مجبوری کی ایک ہی زنجیر میں دونوں لڑکی ہوئی تھیں نہ پہلے ماڈن نہ جلے رفتن۔

دل کا بخا بخرا آنسوؤں سے نکلنے کے اور کبھی کیا سکتی تھیں ابھی دونوں کو سکون نہ ہوا تھا کہ اسلم آپہونچا۔ پھر بھی جان آداب کہہ کر بیٹھ گیا۔ پھر بھی کی مزاج پُرسی کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہیں۔ مجھ چپ سی ہو گئی وہ بھلا اس سوال کا جواب ہی کیا دے سکتی تھی، لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں نے اسلم کے سوال کا جواب دے ہی دیا۔ تجھ نے حسرت بھری نگاہوں سے اسلم کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کہ اسلم تجھ کا آخری نظارہ جی بھر کر کر لو۔ شاید اب وہ پھر کبھی تمہیں دیکھنے کو ملے۔ چغتائے زندگی کا یہ پھول آج ہمیشہ کیلئے مرجھا رہا ہے۔

دل گرفتہ اسلم بھلا اس منظر کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس کو بھی گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی محبت کا راز اس کے آنسو فاش کر دیا وہ اپنے آنسوؤں میں مجھ کی عزت و ناموس کو غرق کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بے اختیار کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ پھر بھی کو سلام کیا اور تجر پر پالوٹا نگاہیں ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔

مجھ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس کی ماں یہ سوچنے کے لئے

نواب صاحب کی بیوی۔ آخر میں کتنی ہوں کہ اسلم میں کیا عیب ہے۔ دیکھنا سنا گھر کا لڑکا ہے اگر مجھ کی شادی اس کے ساتھ اور ناظرہ کی شادی اصغر کے ساتھ کر دی جائے تو کیا ہرج ہے؟

نواب صاحب۔ تم سمجھتی تو ہو نہیں بلا وجہ منہ کرتی ہو۔

نواب صاحب کی بیوی۔ جب ایک کھلی ہوئی بات ہے تو پھر اس میں کھجنا کیا۔

نواب صاحب۔ (ترش و ہو کر) تم اپنی کجواس ختم نہ کرو گی۔

نواب صاحب کی بیوی۔ اور تم اس عمدہ بانی سے باز نہ آؤ گے؟

نواب صاحب۔ اس کا کیا مطلب؟

بیوی۔ یہ کہ تم اپنے دل کا حال کھل کر کیوں نہیں بتلاتے آخر میری بھی تو اولاد ہے کیلئے اس کے صرف پالنے کا حق تھا اس کو شادی بیاہ میں روک دینے کا کوئی حق نہیں؟

نواب صاحب۔ (نڈاری سے) ہمیں تم سمجھتی تو ہو نہیں اور۔

بیوی۔ (بات کا ٹکڑا جب تم سمجھتے ہی نہیں تو کیا ناک سمجھوں؟

نواب صاحب۔ (متانت سے) دیکھو بات یہ ہے کہ جب دونوں لڑکیوں

کی الگ الگ شادی کی جائیگی تو جائیداد تقسیم ہو کر نہ صرف زمینداری کی صورت

میں تبدیل ہو جائیگی بلکہ اس کے تلف ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے لیکن جب

دونوں لڑکیاں دونوں بھائیوں کے ساتھ ہونگی تو اس کا خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا

بیوی۔ اچھا اب میں سمجھی۔ تم کو جس قدر اپنے علاقہ کا خیال ہے اتنا،

بہتری پھیلوں کا خیال نہیں۔

نواب صاحب۔ براؤ فتنہ ہو کر۔ تم نے پھر وہی الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کیں

بیوی۔ بڑے تعجب کی بات ہے جن بچوں کے لئے تم جائیداد کی حفاظت

کر رہے ہو اسی جائیداد کی مالک بچیوں کی شادی تم ان کی مرضی کے خلاف

کر رہے ہو۔ کیا دونوں بھائیوں یا ان دونوں بہنوں میں جائیداد کے لئے جھگڑا

نہیں ہو سکتا۔ تم نے بھی تو اپنے بھائی سے لڑ کر اپنا حصہ الگ کر لیا تھا اس

وقت بھائی کا خیال کیوں نہ کیا۔ میری بھی تو سگی بہن تھیں۔ صرف آموں کی

تقسیم پر انھوں نے اپنا باغ کیوں الگ کر لیا۔ پھر ان لڑکیوں کے متعلق یہ

رائے کیوں قائم کر رہے ہو۔ بھائی ایسا دوست نہ بھائی ایسا دشمن کی مثل

مشہور ہے۔ پھر اگر جائیداد ہی کا خیال ہے تو اسلم کے پاس بھی کافی جائیداد

تندرستی کہ مجھ کی کشتی حیات کو اس مجھدار سے کیونکر نکالا جائے۔ لیکن وہ کسی کامیاب تجربہ پر نہ پہنچ سکی۔

مجھ کی مصوئیت اس کی بیزبانی اور ایک مقید پرند کی طرح اس کی مجبوری بیکس ماں کا دل پاش پاش کئے دیتی تھی اسی اشار میں نواب صاحب آگئے اور ان کی بیوی نے بھرائی ہوئی آوازیں ایک مرتبہ پھر نواب صاحب رحم کی التجا کی لیکن اس مرتبہ پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ انھوں نے اپنی بیوی کو مزید افکار خیال سے منع کر دیا۔

۴

اسلم میں عالم میں وہاں سے چلا تھا اور جس حالت میں گھر تک پہنچا، اس کا صبح احساس کوئی وہ شخص نہیں کر سکتا جس کا دل جذبات محبت سے خالی ہو۔ جس قدر دسکا رویا۔ اپنی قسمت پر جس قدر ماتم کر سکا کیا۔ مجھ کے خط سے اس کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ مجھ کے لئے اس کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچا رہا۔ اس کے بعد عالم خیال میں خود بخود مجھ سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔

آہ مجھ! تمھارا حال کرنا جس قدر آسان تھا افسوس کج اسی قدر مشکل ہے۔ اگر تم خدا میں جاتیں تو میں تمھیں حاصل کرنے میں کبھی ناکامیاب نہ ہوتا۔ میری کوششیں تمھیں میرا بنادیتیں مگر تم انسان ہونے کے بعد بھی میرے لئے ایک عقدہ لائیل بن گئیں افسوس!

ریاض دہر میں نا آشنائے بزم عشرت ہوں  
خوشی روتی ہے جس کو میں محروم سترت ہوں  
کسی کا گلہ نہیں، کسی کی شکایت نہیں۔ جب اپنی ہی قیمت اپنے ساتھ  
دغا کر رہی ہے۔ جب زمانہ ہی دھوکا دے رہا ہے تو پھر شکوہ کس سے اور کیوں  
جو پھول میرے چین میں کھلا تھا وہ کل ہوا ایک دوسرے کے باغ زندگی کی رفت  
بڑھ گیا۔ آہ! مجبور مجھ تیرا بد نصیب اسلم موت و حیات کی کشمکش میں  
مبتلا ہے۔ آہ! اور دیکھ جو اسلم ماں باپ کی موت اور خاندان کی تباہیوں  
پر کبھی نہیں ریا۔ اس کے دل کے آج پرچے اڑے جا رہے ہیں۔ مجھ میں کج  
پھر تجھ سے تمہید دفا کرتا ہوں کہ دنیا کی طاقتیں اگر تجھ کو مجھ سے چین لینے  
پر قادر ہو سکتی ہیں تو ہوا کریں لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور دنیا کی کوئی طاقت

# بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوا دوگرے کا بال امرت



یہ دوا نگرے کا بال امرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے خوشی سے پیٹے ہیں۔ بچوں کی کھانسی بخار۔ بد ہضمی۔ بھیشپس، وغیرہ  
وغیرہ امراض جو اکثر نا طاقتی کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور بچوں کا بدن تھوڑے  
عرصہ میں گوشت سے بھر کر نرس اور وزندار بنتا ہے۔

لاہور پرنٹ

بھگت رام پوری۔ سوترمنڈی۔ لاہور



سفاک ہوں، سبھی کچھ ہوں۔ لیکن تمہاری تھی، تمہاری ہوں اور تمہاری رہو گی۔  
اسلم شک نہ کرو، شبہ کو دل میں جگہ نہ دو۔ تم کو معلوم نہیں میرا کیا حال  
ہے اگر لکھنے کے قابل ہو تو لکھوں لیکن میں اپنی حالت لکھ کر اپنے خون کے آنسو  
سے بھرا ہوا پیالہ تمہارے سامنے پیش نہیں کر سکتی۔

تمہاری نجمہ میں حال میں زندگی بسر کر رہی ہے خدا کے لئے اس کو دیکھنے  
کی کبھی جہت نہ کرنا۔ ورنہ تم برداشت نہ کر سکو گے۔ یہ تم نے بالکل صحیح لکھا کہ  
تم میرے ہو۔ مگر اسلم تم میرے کب نہیں تھے۔ ہمیشہ سے تھے ہمیشہ رہو گے  
کیوں؟ کیا ایسا نہیں ہے؟ کلمہ شام کو اس دروازے پر جہاں ہم تم کھیلا  
کرتے تھے بات بات آگئی۔ کس کی؟ تمہاری نہیں، میری۔ اچھے اسلم تم نہ آنا۔  
اور اگر کیا کرو گے۔ جس دروازے پر تم کو میری بھیک نہیں دی گئی اس پر  
قدم نہ رکھنا۔ سمندر ناز پر ایک تازیانہ کے مصداق تم کو مدعو کیا جا رہا تھا  
اس لئے نہیں کہ تم مجھ کو بلکہ اس لئے کہ اپنے ہاتھوں سے میرا ہاتھ دو  
کے ہاتھ میں دیدو۔ آنے والوں کی خاطر مارات کرو اور جب میں اس گھر کو  
چھوڑنے لگوں تو ایک آنسو بھی اپنی آنکھ سے گرانے کا تم کو اختیار نہ ہو۔

اسلم! یہ وہی تو دروازہ ہے جہاں شام کے چمپٹے میں ہم تم دونوں  
آکھ چوٹی کھیلا کرتے تھے۔ ہاں اسی دروازے پر اسی جگہ بات بات آگئی  
بھلج ہو گا۔ میں ہمیشہ کیلئے دوسرے کی کینری میں دیدی جاؤ گی۔

اسلم! کیا تمہیں اس دن کی خبر تھی۔ آہ اگر تھی تو اس وقت تم نے  
کیوں نہیں بتایا۔ اس وقت تو موت بڑی آسان تھی نہ بگ ہنسائی کا خوف  
نہ رسوائی کا ڈر نہ ذلت کا اندیشہ نہ بدنامی کا خطرہ کچھ بھی تو نہ تھا۔

خیر جو وقت گذر گیا اس کو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ جب نہ سہی تو اب  
سہی گھر بھر میں، گاؤں میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ ہر شخص مسرور ہے  
جلستے ہو اسلم کیوں؟ اس لئے کہ برسوں میری زندہ نعش اس گھر سے نکلے  
گی۔ باغ کے جوں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ سرد کا درخت میری ناکامیوں  
پر مساکت کھڑا ہے۔ نرگس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری تباہیوں کو دیکھ رہی  
ہے لیکن اسلم! دنیا کے انسانیت کی جو ہستی مجھ پر رحم کرنے کے لئے تیار  
نہیں وہ خود میرا باپ ہے۔

اچھا! ہاں اسلم تو پھر میں کل دوپہن بنائی جاؤ گی مجھے سنو اور آج  
لیکن اسے یاد رکھو جس رات میرا یہ سماں قائم ہو گا اسی رات آجڑے گا

مجھے مجبور نہیں کر سکتی کہ جس دل میں تیری یاد ہے۔ جس دل میں تو ہے اس  
میں میری زندگی کے کسی لمحے میں کوئی دوسری ہستی جگہ پا سکے۔ کم از کم میں  
انسان ہوں اور تجھ سے بد عمدی کر کے اپنی انسانیت کو بھروسہ نہ کروں گا۔

نجمہ! اسلم تیرا اور محض تیرا ہے۔ تیرا ہو کر رہ گیا اور اگر زندہ رہ گیا تو  
تیرے نام پر اچھا نجمہ خدا حافظ خوش رہو۔ شادی مبارک ہو۔ خدا کو  
کامیاب و خوشگوار زندگی کی مالک بنو۔ اپنے اسلم کو بھلا نہ دینا۔ ہر وقت  
میں ہمیشہ نہیں۔ روزانہ نہیں۔ کبھی کبھی گھسے ماہے یاد کر لیا کرنا۔ یہ کہتے  
کہتے اسلم کی آواز بھرا گئی بے تابی سے اپنے کمرے میں ٹھننے لگا۔ جب کسی قد  
سکون ہوا تو سامنے کی میز سے قلم و ادات کا غذا اٹھایا اور کچھ لکھنا شروع  
کیا۔ لکھنے کے بعد ایک مضبوط نقاد میں اس کو بند کیا اور اس پر لاکھ کی ہر  
لگا کر حفاظت کے ساتھ اپنی کوٹ کے اندرونی جیب میں رکھ لیا اور پھر  
دیوانہ وار ٹھننے لگا۔



نصیر آباد، ۱۰ اپریل

پریشان اسلم، خط ملا، کہہ دیا تھا پریشان نہ ہو، گھبراؤ نہیں، ہر اسان  
موت پر قسمت پرشاکر رہو۔ مقدر جو تماشہ دکھائے دیکھو اور چپ رہو۔ زمانہ  
کے معاملہ برداشت کرو اور چپ رہو۔ میرے باپ کی سنگدلی اور بے رحمیوں  
کا شکار بنو اور تھلاؤ نہیں۔ بیکچہ اور دل پر غاندان کی سردھریوں کا زخم کھاؤ  
مگر رو پو نہیں۔ لیکن تمہاری سبے صبری دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیا محبت آدمی  
دن کے لئے کی تھی کہ اپنی جان دو۔ اسلم، جان دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی  
چیز ہے۔ اپنے لئے نہیں، میرے لئے زندہ ہو۔ تم کو معلوم ہے کہ میری زندگی  
کا سارا تم اور صرف تم ہو۔ کیا مجھ کو تم اس دنیا میں بے سہارہ چھوڑنا چاہتے  
ہو۔ کیا تمہاری اخت میں حق و فاکے یہی معنی ہیں؟ کیا میری امید کے اس  
آخری تار کو بھی تم توڑ دینا چاہتے ہو۔ نہیں اسلم خدا کے لئے ایسا نہ کرو میری  
مسر توں کو خاک میں نہ ملاؤ۔ آج دنیا کی تمام مسرتوں میں ہی تو ایک خوشی مجھے  
حاصل ہے کیا تم اس کو بھی فاکر دینا چاہتے ہو؟

اسلم! شد باز آؤ۔ میری اور اپنی بربادیوں کا ماتم کرو مگر زندہ رہو،  
مرنے کی اجازت مانگتے ہو اور پھر مجھ سے۔ نہیں اسلم مرنے کی نہیں اگر ماننے  
کی اجازت مانگو تو دے سکتی ہوں۔ ہاں میں سسٹل ہوں۔ میری جہم ہوں

اسلم بھول نہیں۔ تم سے کہا تھا، نہیں وعدہ کیا تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ میں تمہاری پوچھ کر کسی دھن کی کسی دھن۔ کس کا سہاگ۔ جو سہاگ اسلم سے وابستہ نہیں ہو سکتا وہ کسی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ شہانی چوڑیوں کی وہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک اگر اسلم کے دل کو منور نہیں کر سکتی تو سامنے گھر کو ہمیشہ کے لئے تاریک بنا سکتی ہے۔ بچانے والے بچھا دیں۔ سہرا باندھنے والے باندھ دیں۔ نکاح کرنے والے نکاح کر دیں۔ خوشیاں منانے والے میری برادریوں پر جس قدر چاہیں بغلیں بغلیں لیکن اسلم وہ دن بھی اب زیادہ دیر نہیں ہے کہ ان سب کو اگر اپنی حالتوں پر رونا نہیں تو کم سے کم افسوس کرنا اور پچھتاوا ضرور پڑے گا۔ میں تم سے مدد کرتی ہوں اور تم کو یقین دلاتی ہوں کہ اپنی دوشیزیت کو کبھی مجروح نہ کرونگی۔ جس طرح ابا جان نے اپنی جائداد کی حفاظت کی ہے میں اپنی عصمت کی حفاظت کر دوں گی۔ اپنی عفت کی رکھوالی کر دوں گی۔ اپنی شرم و حیا کی لاج رکھوں گی اور کوئی ہاتھ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جہاں خود تم کو پہنچنے سے روکا گیا۔ چلو اچھا ہوا روز کے جھگڑوں سے نجات ملی۔ مگر سے آزادی ہوئی۔ جائداد لینے والے لیں۔ خدا ان کو مبارک کرے۔ مگر میں نصیبوں جلی آگ کے جن دھکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں وہ ہمیشہ میرا بستر رہینگے۔

اچھا اسلم، کم سے کم آج سے اس دنیا میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت اگر یہ صبح ہے کہ قیامت میں ملاقات ہوگی تو پھر وہیں ملیں گے۔ اگر میں تمہیں تلاش نہ کر سکتوں تو تم مجھے ڈھونڈ لیتا اس وجہ سے کہ میرا دان و فابقاہ داغدار ہو چکا ہے لیکن تمہارا دان اب بھی اس قابل ہے کہ اس پر فرشتے نماز پڑھیں۔ میں اب کچھ نہ کہو گی۔ اس خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں اب مجھے کبھی دیکھنے کی کوشش کرنا۔ میں یہ بھی تم کو مانگت کرتی ہوں کہ تم کبھی میرے مکان پر نہ آنا۔ زخموں پر اپنے ہی ہاتھوں نمک چھڑکنا کوئی عقلمندی نہیں۔ پھر اگر کیا کرو گے۔ اچھا خدا حافظ۔

تمہاری حسرت نصیب مجھ

۴

شام کو بڑی دھوم دھام اور تزکِ اہتمام سے بارات آئی اور رات کے گیارہ بجے کے قریب مجھ کا نکاح اطر سے ہو گیا۔ مجھ پر کیا گذری کوئی نہیں بتا سکتا۔ نواب صاحب نے صبح کو بھی بارات روک لیا اور بڑے اعلیٰ پایہ پر

ہمان نوازی کی۔ گاؤں کے جس قدر غریب فریاد تھے سب کو کھانا تقسیم کیا گیا اور بڑی الواعزی، فراخ دلی اور فیاضی سے روپیہ صرف کیا گیا۔ لیکن لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ جس لڑکی کی شادی کئے گئے اس قدر بے پایاں خوشیوں کا اظہار کیا جا رہا ہے خود اس کا دل اندر سے رو رہا ہے لیکن جب اس کی فکر باپ ہی کو نہ تھی تو پھر دوسروں کو کیوں ہونے لگی۔

باراتی اپنی مختلف دیکھیوں میں مصروف تھے کہ اسلم کا مخصوص محلہ گھبراہوا ہوا آیا اور اس نے آتے ہی نواب صاحب کے کھانے چلے دیکھے بھیا کو کیا ہو گیا ہے۔ نواب صاحب بغیر ایک لمحوہ تامل کئے ہوئے نوکے ساتھ ہوئے وہاں جا کر دیکھا تو اسلم کا بدن سرد تھا اور وہ ابدی گہری نیند سو رہا تھا تو نواب صاحب نے اسی وقت قریب ترین ڈاکٹر کو لینے کیلئے کار بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ شدت غم سے قلب کی حرکت بند ہو جانے سے موت واقع ہوئی۔

چند لمحوں میں بزمِ عشرت بزمِ ماتم بن گئی۔ جو لوگ مجھ کو لینے آئے تھے وہ اسلم کو قبرستان لے جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گاؤں کا ذرہ ذرہ اسلم کی بیکسی اور اس کی جواناں مرگی پر ماتم کر رہا تھا۔ مدد و اوارت حسرت بریں رہی تھی اور اس گاؤں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والا اسلم ان سب سے بے نیاز آنکلیں منہ کئے ہوئے اطمینان کی نیند سو رہا تھا۔ ہاں اس کے لبوں پر معصومانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی جس زندگی کی ناکامی پر عمر بھر آنسو بہاتا رہا آج اسی کے اختتام پر مسکرا رہا ہے۔

مجھ پر کیا گذری لکھنے کی ضرورت نہیں دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مجھ کے منہ اُف بھی نہ تھی۔ نہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو تھا نہ لب پر آہ تھی۔ ہاں دھڑکتے ہوئے کلیجہ کی آواز منور سنائی دیتی تھی۔ سارے گھر میں سارے محلہ اور گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا ہر شخص پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا مگر اس کی یہ حالت تھی کہ نہ خنداں تھی نہ گریاں۔

اسلم کا حسرت بھرا اور پرانان پھولوں سے لدا ہوا جنازہ جس وقت قبرستان چلنے کے نواب صاحب کے مکان کے اس حصہ کے پنجے سے ہو کر گذرا جس کے بالائی حصے پر مجھ کا کمرہ تھا تو مجھ کھڑکی پر آکر کھڑی ہو گئی اور اسلم کی آنے والی لاش کا انتظار کرنے لگی۔ جب عین کھڑکی کے مقابل اسلم

کی لاش پہنچی ہے تو اس نے ایک تھکانے لہجہ میں نفس کو روکا دینے کا حکم دیا اپنے سر سے سے چند پھول توڑے اور یہ کہہ کر نفس پر ڈال دیتے کہ اسلام، لو، جن پھولوں کے دیئے کا وہہ کیا تھا افسوس ان کو تمہاری زندگی میں نہ دے سکی۔ مرنے کے بعد دے رہی ہوں اچھوتے پھول ہیں قبول کرو، اتنی بھی جاننے کی جلدی اچھی نہیں۔ منع کیا تھا کہ تم سے پہلے جانے کی جلدی نہ کرنا لیکن تمہاری جبلت پسند طبیعت نہ مانی اور جلد سے کیا اکیلے ہی جاؤ گے تنہائی میں گھر لو گے تو نہیں مجھے بھی اگر ساتھ لئے چلتے تو بھلا کیا ہرج تھا۔ یہ میں نے کب کہا تھا تمہارے ساتھ نہ جانا لگی کیا یہی شرط وفا تھی۔ خوب نہ ناما بڑے وفادار تھے۔ اپنی میں خبر کے ساتھ عمر بھر نباہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کو بے سہارا دے یا رومہ دگر چھوڑ کر جانے میں کچھ پس و پیش بھی نہ کیا اچھا چلوں بھی آئی ہوں گھر او نہیں زیادہ دن نہیں لگاؤنگی۔ پھر اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی اس کا زبان سے ایک دلدوزانہ و زلفک انگانہ آہ نکل گئی اور اسی جگہ گڑا ہیوسس ہو گئی۔ اس کو کب ہوش آیا کیسے آیا کسی کو نہیں معلوم لیکن اس واقعہ کے بعد سے اس لمحہ تک جس میں کہ یہ افسانہ قلمبند کیا جا رہا ہے خبر کو شاید کبھی کسی نے ہنستے ہوئے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ وہ جیسی المناک زندگی بسر کر رہی ہے اس کا صحیح نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جاسکتا

یہ محض ایک افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاندان کی بربادیوں کی زندہ داستان جس کے کل افراد بجز نواب صاحب و اسلم کے آج بھی قید حیات میں پھر بھی موجود ہے لیکن وہ اپنی زندگی سے اس صبر و آغا طرہ ہے کہ آج بجز موت کے کوئی دوسرا آرزو اس کے دل میں گھرنہ کر سکی۔ تیار بجنگاہ سے اس وقت تک شاید اس کے شوہر سے اگر دریافت کیا جائے تو وہ اس کی موت اور صحیح خدا و خال بھی نہ بتا سکتا اور مجھ نے تو شاید عمر بھر اپنے شوہر کی جھلک بھی نہ دیکھی ہو۔ وہ اس وقت ایک پاکیزہ زندگی بسر کر رہی ہے اور دنیا کی وہ تمام لغویات جن کا تعلق ازدواجی زندگی سے ہے ان سے بالکل بے نیاز ہے نہ اس کو پتہ دل کا شوق ہے اور نہ کھانے کا۔ ہاں غریبا کو کھانا کھانا تھا جوں کو امداد و اعانت کرنا اس کی زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ ہے۔ بہر حال شادی کا جو مقصد ہوا کرتا ہے وہ تو پورا نہ ہوا لیکن جس غرض کیلئے یہ شادی کی گئی تھی وہ ضرور پوری ہوئی اسلم کے انتقال کے ایک ہفتہ کو معدہ پٹی کشر منزع کی ایک چٹھی یہ میں مضمون معمول ہوئی کہ محمد اسلم زمیندار و تعلیم یافتہ اپنے اہل کمال امداد و بقول غیر منقولہ آپ کی چھوٹی لڑکی بچہ کے نام اپنے اس وصیت نامے کے بموجب سے منتقل کیا ہے جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں میرے پاس سرسبز داخل کیا تھا۔ اور جو میرے پاس محفوظ ہے۔ میں آپ کو اور آپ کی لڑکی کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ایوبی

# روزنامے خریدنے کیوں؟

اس لئے کہ یہ دور حاضرہ کی بہترین تصنیف ہے۔

بہترین کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، ضخامت ۵۰ صفحات کے زیادہ

چند روزناموں کے عنوان حسب ذیل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محمولہ اک (عہ)

بادشاہ کا روزنامہ، فقیر کا روزنامہ، عاشق کا روزنامہ، معشوق کا روزنامہ، مہر آسلی کا روزنامہ، نوٹو گرافر کا روزنامہ، ایکسپریس کا روزنامہ، حکیم کا روزنامہ، حلوانی کا روزنامہ، مجام کا روزنامہ، رحمتی کا روزنامہ، سرمایہ دار کا روزنامہ، مزدور کا روزنامہ، شاعر کا روزنامہ، دیگر غیر ملکی روزنامے کا پتہ ملے گا۔ عالمگیر بلڈ پو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

# گلزارِ حیات

حضرت خلیل بیگوسراخی

ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے، جام ہے  
 دیکھئے کس کس کے سر جاتی ہے آج  
 ہے جہاں تک کوچہ قاتل کی حد  
 شیخ، جنت میں یہ شہنشاہ کساں  
 آنکھ سے لڑنا، ابھنا، زلف سے  
 مرنے والے کا نشان تک بھی نہیں  
 مے نہیں تو مے کی تلچھٹ ہی سہی  
 جس کو دیکھو ہے کفن بردوش وہ  
 دل کی چوری پر وہ یہ کہتے لگے،  
 تھا وہ جلوہ، ہے مگر یہ جلوہ گاہ  
 سکھ بیٹھا ہے وہ تیرے حسن کا  
 کیوں نہ مٹی میں تن خاکی ملے،  
 لطف کا دن ہے، مرنے کی شام ہے  
 وہ ہیں، متقل ہے، ہجوم عام ہے  
 کر بلا اتنی زمیں کا نام ہے  
 موت ہے اس کی جوئے آشام ہے  
 کام یہ ہے بھی تو دل کا کام ہے  
 وہ سمجھتے ہیں کہ زیرِ بام ہے  
 کچھ چڑھ لینے سے مجھ کو کام ہے  
 آج کیا اس در پہ قتلِ عام ہے  
 جھوٹ ہے، بہتان ہے، الزام ہے  
 طور سے بڑھ کر بتوں کا بام ہے  
 جو بھی ہے وہ بندہ بے دام ہے  
 خاک ہے آغازِ خاک انجام ہے

توبہ کرنے کو تو کر لیتے حسیل  
 کیا کریں برسات کا ہنگام ہے

# ”خاک کا ڈھیر“ اور ”زندگی کا اصل مقصد“

جناب مولانا مفتوح حسین صاحب بی۔ اے احمد پوری

یا اسی طرح کا کوئی اور پیشوا پیدا نہیں ہوتا۔ زمانے کا تقاضا بھی عجیب ہو کر رہا ہے۔ تاریخ کے دیکھتے ہی دیکھتے دین و دنیایت کے رائج ہوتے ہی ہوتے سچائی کے مشن نے بھی کتنے پہلو بدلے۔ خصوصاً ہمارے اس برگشتہ قیمت قد میں اول وہ وقت تھا جب مسلمانوں نے کہا تھا کہ خدا ایک ہے سب اسی ہیں اور اسی میں سب کو لے ہو جانا ہے تو اس وقت کبیر نے کروانا لگنے، ولجہ سوامی نے غرض ایسے ہی نہیں معلوم کتنوں نے کہا تھا کہ جو کچھ ہے سب برہم ہی برہم ہے اور اس برہمت سے ہل میل دالے ہاں کتنے کو تیار ہو گئے تھے۔ یہ ایک زمانہ تھا جو منجملہ دیگر زمانوں کے محض ایک زمانہ گذشتہ ہو کر رہ گیا۔ ایک یا دو گار یا رینیہ جواب میں تعجب کرتی ہے کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی سوسائٹی بھی ہوا کرتی تھی۔

دوم وہ وقت آیا کہ لوگ کہنے لگے ”وہ دنیایت ہمارا مشن ہے۔ کوئی اس میں اور دخل نہ دے“ پھر کیا تھا۔ آریہ سماج پیدا ہوئے۔ گو تبلیغ خدا اب ایک ملکیت ہو گئی اور لوگ اس کے ذریعہ فتنہ قائم کرنے کیلئے ائے عامہ کی عدالت میں مقدمات دائر کرنے لگے۔ ”آریہ سماج“ ”قادیان سماج“ اور علیٰ ہذا القیاس نہیں معلوم کتنے سماج پیدا ہو گئے۔ ہندوستان نے سوسائٹی کا یہ دور بھی دیکھ لیا۔

تسوم۔ وہ دنیایت کا مشن دماغوں سے فراغوش ہوتے ہوئے آخر منٹ گیا۔ اب کیا رہا۔ ہم مسلمان، ہم سکھ، ہم سائق دھرم، ہم شیعہ، ہم ہنسی، ہم بڑی، آفریدی، عسوی، سفلی، پنجوی، بطیموسی، مقدوسی، چھائی، الہی توبہ، انہما کی بھی کوئی انتہا ہے۔ کجا وحدت، کجا کثرت۔

نتیجہ ظاہر ہے اب وہ خلوص و صداقت سے متعلق سوسائٹی کا دائرہ محدود ہو کر زبان کی نوک پر آ رہا۔ گویا ہماری سوسائٹی

میں طرح غسل سے جسم پاک ہوتا ہے جس سے ہر قسم کی فحاشیت کا ازالہ ہوتا ہے دعا سے امراض کا دفع ہوتا ہے اور جس طرح ریاضت و عبادت سے گناہگار آدمی پرہیز گار اور پاک ہوتا ہے۔ نیک عادتوں سے انسان فرشتہ خلعت اور سچے خیالات سے پاک باطن اور دلی کمال ہو جاتا ہے اسی طرح غالباً صداقت اپنا مشن زندگی کے ہر شعبہ تک پہنچاتی ہے اور ہماری روح کو مندی کا راستہ دکھاتی ہے۔ صداقت و خلوص سے بڑھ کر نہ کوئی پیغمبر ہے نہ کوئی ریفاہ اور سوسائٹی جس کو اہل یورپ کی اصطلاح میں فیشن ایبل لوگوں کی تفریح کستا چاہئے جو ابھی ہندوستان میں چند مخصوص طبقوں ہی تک محدود ہے (یعنی وہ جو صرف دولت مند ہی نہیں بلکہ تھوڑے بہت تماشین بھی ہیں) وہ سوسائٹی ہمارے لئے ابھی دور ہے اور خدا اسے دور ہی رکھے تو اچھا ہے۔ بقول شاعر ۶

غیبت ہے کہ ہم صورت ہیاں دوچار بیٹھے ہیں

ہمارے لئے تو دو چار ہم صورتوں کا باہم بیہنا ہی دھماکے سوسائٹی ہے جو آج کل کے صاف دل لوگوں کو خشک سے نصیب ہے اور اس دو چار ہم صورتوں کے باہم مل بیٹھنے میں جو صداقت کا مشن ہے وہی دھماکے ہماری سوسائٹی کی جان ہے۔ خدا معلوم اس کا پرچار اور اس قسم کی پاک معاشرت کی تبلیغ اب دن پر دن کیوں کم ہوتی جاتی ہے۔ کیا ہندوستان کی قسمت ظلمت کے دھواں دہار میں جا کر معدوم ہو گئی کہ اب کوئی گروانا تک، کوئی کبیر کوئی پیر عطا یا ملہا شاہ

سے علوم ادب میں غلام افلاکی کی وہ منت بھی شامل ہے جن کو مذہب اور معاشیات کے مابین تصرف سے الگ مگر اسی کی روشنی میں منجملہ علوم الہی کے ہمارے حقیقت نما کے دلچسپ اور فیضان دالہ ان کے ساتھ یاد کیا کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی Humanitarianism سے متعلق بھی بائبل کی

مقبول

اب سوچو کہ یا خودی کے جوش میں مست ہو کر انانیت کے غار میں تو تو میں  
میں کی بھاری اور ایک دوسرے کے ساتھ آپس کی جوتی پزار میں خوار ہو کر  
یہ کس رہی ہے کہ ۴ بونگ فارمی رقص، بونگ فارمی رقص۔  
یہ تو جوتی معاشرت کی ایک معمولی سی مثال جس کو زمانے کی ادا کر شر سوازی  
روش دینا یا انقلاب جو کچھ کہئے بجا اور درست ہے اس کا شکوہ کیا گویا مرے کے  
سر پہ آہ و بکا کر کے کہنا ہے کہ ۴

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

لیکن اب کیا ہوتا ہے ۴

تمی داس بھو بھوان، اب کا کر ہو کا گد کا گد کا گد کا گد

بڑے بڑے مذاہب، پختہ معاشرے اور آدمیوں کی دلولہ انگیز ذہنیتیں  
اسی طرح انقلاب پذیر ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔ پھر بھی اہل مقصد ہر زمانہ  
کایہی رہا ہے کہ — دیکھو — ہم سے پہلے دنیا کی حالت اچھی تھی۔ موجود  
وقت ناگفتہ بہ ہے اس کو سنو اور آئندہ کی فکر کرو۔“

آخر اس قسم کی زحمت کیوں گوارہ کی جائے؟ یہ سوال تو نہایت بے شکا  
سا ہے کیونکہ ہر عام داری کی کتاب ہوا نظر آتا ہے کہ اپنی ضروریات پوری کرنے  
کے لئے اور اس کے بعد راحت و عیش کا سامان ہم چاہتے ہیں۔ موجودہ  
وقت کو سنو اور آئندہ کی فکر کرو۔

ہاں تو کیا واقعی اہل مقصد یہی ہے۔ حال کی ہیودی اور آئندہ کی فکر۔  
اور وہ بھی صرف ضروریات ہم پہنچانے اور عیش و راحت کے لئے۔ بادی النظر  
میں سب یہی کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر باں ہیں  
ہاں مگر تاہو نظر آتا ہے کہ یہ اصل مقصد ہے۔

مگر آج ایک آدمی۔ ایک بے نوا غریب آدمی۔ مرکز کے کنارے بیٹھا ہوا  
بیمار و لاچار کتا ہے۔ ”خدا یا مجھ کو اتنی صحت دے کہ اٹھ بیٹھ سکوں۔ اس کی  
حالت سبھلتی ہے طرح طرح کی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں۔ چلنے پھرنے کو چاہتا  
ہے اور وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ لیکن اب وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے  
اگر اس وقت میرے پاس ایک روپیہ ہو تو کیا اچھا ہو۔ اس کو روپیہ مل جاتا  
ہے۔ وہ ایک سے دو کرتا ہے، دو سے چار، چار سے پانچ، چھ سات، دس  
بیس، پچاس، سو، دوسو، ہزار اور آخر اتفاقات زمانہ سے وہ لکھ پتی  
ہو جاتا ہے۔ لیکن اب وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ وہ ملک ملک گھومتا پھرتا ہے

دنیا بھر کی سیر سے جی سیر کرتا ہوا واپس آتا ہے گردنیا سے اس کا جی نہیں بھرا  
وہ جانا چاہتا ہے کہ یہ آسمان وزمین کیا ہیں۔ ہزاروں روپے پیدا کرتا ہے  
اور ہزاروں اس تلاش میں خرچ کرتا ہے کہ چاند کیلے؟ سوچ ایسا کیوں  
ہے؟ اور گویا اس کی زندگی اسی طرح کسی نہ کسی شخص میں لگی رہتی ہے۔ تو  
معلوم ہوا کہ اہل مقصد ضروریات کا ہم پونچنا ہی نہیں بلکہ کچھ اچھے، عیش و راحت  
ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ۔

کیا یہ مثال ہماری زندگی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہم جواب ”ہم“  
ہیں۔ کبھی شیر خوار بچے تھے۔ پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ پیہ کی لالچ نے ہمارے  
دل میں جگہ کی تھی۔ پڑھنا لکھنا، ہم نو سکھایا گیا تھا۔ ہم مال اڑھوئے نہ ہوئے،  
غرض ہاتھ پیر والے ہو گئے۔ ہماری حیثیت کے موافق خدانے عیش و آرام بھی  
دیا تھا۔ لیکن ہم مطمئن نہ بنے۔ اب ہم کو اطمینان ہے۔ ہم کچھ چاہتے ہیں اور  
مرتبہ وقت تک اور غالباً اس کے بعد تک اور شاید اس کے بعد ابجد تک کچھ  
چاہتے ہی رہیں گے۔ شاید اہل مقصد وہی ہے۔

وہ کیا ہے؟

یہ بڑی غلطی ہے کہ ہم عیش و راحت کی زندگی کا اہل مقصد سمجھیں انسان  
کی انسانیت کا دار و مدار اس پر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حصول عیش کے تھوڑے  
ہی عرصہ بعد محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہماری کوششیں اتنی ہی شے کے لئے بیخ  
تعبیر تو اہل مقصد بچائی ہے۔

سچائی! اس لفظ پر تو قسم خدا کی ہنسی آتی ہے بھلا یہ زمانہ اور سچائی  
کا حظ۔ ۴ دونوں باتوں سے تھکے دستار۔ لیکن اصل مقصد یہی ہے یعنی  
”سچائی کا کھوج“ اور عیش و راحت کی امید محض ایک۔ نہایت جو ہیں خدا  
کی تلاش کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کوشش میں اس جدوجہد میں نہیں  
معلوم کتنی مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ سب تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پہنچانی  
کرتی ہیں اس سچائی کے کھوج کیلئے۔ ہم سب تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت  
کرتے ہیں۔ عیش و راحت کے لئے نہیں یہ تو بہانہ ہیں۔ بخار ہوا کو سمجھانے  
کے لئے دیکھتے ہیں طائفہ کیلئے۔ ہم امتحان پاس کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہم  
پاس ہو جائیں بلکہ اچھے امتحانوں اور مزید تعلیم کے لئے۔ لیکن ہماری محنتوں  
اور غماز کے کچھ کچھ کیلئے، وقت کے طائفہ کائنات کے لئے، عیش و راحت کے لئے  
علا شمع صاحب زندگی کے لئے ہے۔ دونوں باتوں سے تھکے دستار (تعبیر)

اور کوششوں کا عارضی مطلع نظر امتحان کا پاس کرنا ہی ہوتا ہے یہی حال رات و سکون کا ہے۔ یہ تو زندگی کے عرصے ہیں۔ آگے بڑھنے کے لئے۔ جس طرح تیر صاحب نے مرنے کے شوق یہ کہلے اور خانہ باکل بیچ کہلے کہ۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے پیس گے دم لے کر ہاں تو ہمارا اہل مقصد حق کی تلاش ہے جو ہمیں باطل کی بھول بھلیاں میں سرگرداں رکھ کر ہم کو اپنے لئے اور بھی زیادہ گرویدہ بنا رہی ہے۔ یہ گویا تعلیم ہو رہی ہے۔ مرنے کا وقت کوشش مرنے دوستو

اور یہ حق ہے کہاں؟ شاید اس نیلے آسمان سے پرے عرش عظم پر انوار لاہوتی سے گھرا ہوا۔ دور اس کوہ کائنات کی سب سے اونچی چوٹی پر جس کے پرے کچھ نہیں۔ اسے وہ خیال خام اکاش اب گھرونا ابلانے کی عادت کو پھین کی عادت سمجھتے اور منصور کے ہم نوا ہو کر کہہ اٹھتے کہ ناہق اس دور انانیت سے جیل ہماری دنیا ہماری زبان کی نوک پر ہے جس سے کہنے میں کیا لگتا تھا۔ زنجیل صوفیوں میں ایسی ہی کچھ ہوا چلی تھی۔

کریں ہم کس کی پوجا اور گائیں کس کو جند ہم صنم ہم دیر ہم تہانہ ہم بت ہم برہمن ہم مگر نہیں صوفیوں کے حق اور ہمارے اہل مقصد سے متعلق حق میں ہریت برفرق ہے۔ ہمارا اہل مقصد تلاش حق ہے۔ حق سے مطلب حقیقت ہے۔ جس کے متضاد کو مجاز کہا کرتے ہیں یہی حقیقت ہم کو اس حق کی جھلک بھی دکھاتی ہے جس کو سب لوگ کسی زمانہ میں خدا کہا کرتے تھے اور اب بھی بخدا اساطیر یارینہ کے خدا کا نام ہی لیا جاتا ہے۔ مگر یہ وہ بہت دور ہے اور چونکہ ہم ابھی یہ بھی نہیں جانتے کہ حقیقت جو خدا انسان کے اندر پیدا ہے وہ کیا ہے اور دماغ اس کو حقیقت کسنا بھی چاہئے یا نہیں چاہیئے حقیقت مطلق پر لے زنی کرنا۔ اس لئے اسی حقیقت تک محدود رہ کر پہلے خود کو دیکھیں کہ انانیت کی طرف ہم جا رہے ہیں وہ کہاں تک حق بجانب ہے۔

ہاں تو حق یا حقیقت میں کا خود انسان حال ہے اور جس کو بعض لوگ کبھی کبھی خواہ مخواہ آج کل روح بھی کہہ دیا کرتے ہیں وہ انسان کا اہل مقصد ہے۔ اسی پر انانیت کا دار و مدار ہے اور اسی سے انسان انہ بن ہے ورنہ تو وہ خاک اس حقیقت کا رہنما کون ہے علم اور اس حقیقت سے ساز باز پیدا کرنے والا کون ہے؟ سچائی یا خلوص۔ گویا زندگی کا اہل مقصد اول علم ہے جس کی طلب ہر انسان مرد اور عورت پر فرض ہے نہ

اس کے بعد اس پر عمل جو سچائی اور خلوص سے ممکن ہے اور یہ علم خود انسان کے دماغ میں ہے کہیں باہر سے نہیں آتا۔ دنیا تو محض ایک تمثیل ہے۔ جیسے کوئی معلم اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ دیکھو مشر کے دل دونوں کی پشت پر جو بل صراط ہوگا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا تو یہ بال اور تلوار دینا ہے اور دنیا کی تمثیل اور بل صراط ابھی ہمارے دماغ میں ہے لیکن ابھی خود ہمارے دماغ بل صراط ہو سکتا ہے کیونکہ قول خدا جس نے خالق کے عالم تمام حلقہ دارم خیال ہے۔

اس طرح علم اور علم سے صداقت علم اور صداقت علم سے حقیقت اور حقیقت سے وحدانیت یہ سب مدارج اسی دماغ کے ذریعے ہو سکتے ہیں ان سب سے متعلق علم انسان کے دماغ میں نہیں ہے جو کچھ معلوم ہو جاتا ہے گویا ناقلم حاصل ہو جاتا ہے اور اس حد تک ہی ہم عالم ہو جاتے ہیں۔ منصور صاحب کو بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا مگر تھے طبیعت کے سچے۔ خورشید حقیقت کے طلوع کی گہری کرنوں نے ان کے دل کی آنکھیں پکا چاند پیدا کر دی۔ جس طرح تجلی طہرنے نوری علیہ السلام کو بخود کو دیا تھا وہی حشر منصور کا ہوا اور وہ علم جو ان کو وحدانیت کی سوسائٹی کی طرف لے جا رہا تھا ان کی زبان کی نوک پیا رہا۔ جیسے آج کل ہم بچے مسلمان ہونے کے مدارج طے کئے بغیر ہم مسلمان۔ ہم مسلمان۔ ہمارے باپ مسلمان۔ ہمارے دادا پر دادا مسلمان کہتے ہوئے نظر کرتے ہیں اور نوے فی صدی حق استیجاب کے لئے لڑتے مرنے ہیں یہی حال میاں منصور کا ہوا۔ شریعت کی گورنمنٹ نے آخر ان کو دکھائی دیا کہ وہ کتنے پانی میں تھے۔ جس طرح ہماری گورنمنٹ ہم کو تیار رہی ہے کہ ہم کس حد تک آزادی وطن کے حقدار ہو سکتے ہیں۔ یہی حال ان کا بھی ہے جو خود کو ہندو اور آریوں کا بیوت کہتے ہیں۔

غرض جو علم ہم حاصل کرتے ہیں خود ہمارے دماغ سے آتا ہے اور مجاز و حقیقت کا غیر فانی دارالعلوم اس طرح ہمارا دماغ ہی ہے۔ یہ کائنات محض ایک تمثیل ہے۔ کس لئے خیال و فکر کے لئے گویا کائنات دماغ کی یونیورسٹی کے لئے ایک دارالتمثیل ہے۔

کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے۔

حدیث طلب العلم فوریۃ الخ



ان فی اختلاف الليل وانهار لا یات لا ولی الا لک  
یہ سات اور دن کی تبدیلیاں نشانیاں ہیں سمجھ والوں کے لئے،  
الذین یزکرون اللہ قیاماً وقعوداً وحیاً جنوباً وشیماً  
وہ جو خدا کا ذکر قیام، قعود اور سجدہ میں کرتے ہیں اور فکر (بچار) کرتے  
فی خلق السموات والارض۔

ہیں آسمانوں اور زمینوں کے خلیق کے متعلق۔

اس طرح دماغ کی لا بُریری کے لئے کائنات ایک دار التمثیل ہے جو دماغ  
متعلق علم حاصل کرنے کے لئے رہنمائی کا کام انجام دیتی ہے۔ لیکن ہر حالت میں ہماری  
تعلیم کا اہل مقصد خود ہمارا دماغ ہے یعنی وہ حقیقت جس کی ایکسا دنی خاصیت دماغ  
ہے جس طرح پتھر میں شرارہ پنہاں رہتا ہے اسی طرح ہمارے دماغ میں وہ حقیقت  
پنہاں ہے۔ اس نے رگد کے پیر کے نیچے گوتم سدا رتھ کے دماغ میں بجلی کی سی چمک  
ظاہر کی اور گوتم کی آنکھ چمکی اور اسی بجلی کی حقیقت سامنے نظر آنے لگی،  
لیکن گوتم نے صرف اس حقیقت کو دیکھا جو مجاز کی حد ہے خدا معلوم اس حقیقت  
نے وحدانیت کی موسائٹی کی جانب بھی اس کی رہنمائی کی یا نہیں۔ اس کا ذکر  
تاریخ میں نہیں۔

ہاں تو ہر گناہ اور ثواب جو ہمارے تجربے میں آتا ہے محض اس لئے ہے  
کہ ہماری کوششوں کو برسرِ کار رکھے۔ اسے گناہ کو یاد کر کے رونے والے خوش ہو کہ وہ  
تیری روح کے پتھر پر ایک غریب تھے کا لیف آزمائش کی آہنی تھوڑے کی تاکہ اس  
سے چنگاری پیدا ہو اور تو نادیم ہو کہ کلمات کے خس و خاشاک کو جلا سکے۔ اپنی  
نیکیوں کو یاد کر کے خوش ہونے والے انسان بہت پھولا، سنا کیونکہ اس کا سبب باغ  
تیری روح کو آزمائش کیلئے ایک طلسم ہے کہ کہیں تو بھٹک کر صراطِ مستقیم سے  
پرے نہ ہو جائے۔ سنبھل اور کا لیف کی شک فارا ضرر میں اپنے اوپر بردا کر۔  
ولنبلو نکم بشیء من الخوف والجموع ونقص من الاموال  
والانفس والشرات (اور ہم تم کو کسی قدر بھوک، جان، مال اور  
شر (مقامد) کے خسارے سے آزمائیں گے)

یہ آزمائش اس لئے ہے کہ ہمیں تمہاری راہ میں کچھ شہر بھی ہے  
اور یہ ضرب تمہارے جسمانی درد عانی سنگِ خارہ پر اس لئے ہے کہ ہمیں کوئی  
چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ مبارک ہو اگر تم ایسے وقت حقیقت کی تلاش سے منہ  
نہ موڑو اور کہو کہ ہم تو اسی حقیقت منتظر کے تلاش میں ہیں جس کی طرف ہم پھر

لوٹ کر جانیے۔

ہاں تو تمہاری بڑائی اس میں نہیں کہ تم دو مقصد ہو جاؤ۔ اتنا روپیہ  
لے کر ہماری فورڈ سے بڑھ جاؤ یا شہر میں شیطان سے بازی لیاؤ، یا  
عبادت میں بائزید وقت اکلاؤ۔ یا شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال اور  
نیگور سے ٹکراؤ۔ تمہاری خوبی تو اس میں ہے کہ اپنے آپ کو انسان بننا  
ایک انگریزی کہاوت ہے۔

”موقع موقع سے ہر حق میرا ہو سکتا ہے“

لیکن انسان ہونے اور میرا ہونے میں بہت فرق ہے اور انسان کے  
خواص تو یہ ہیں کہ اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ فرائض کی تکمیل سے غافل نہ رہا جائے  
یہی راستہ ہے اصل حقیقت کی طرف پہنچنے کا جو زندگی کا مقصد ہے۔ چھوٹی چھوٹی  
باتیں ادنیٰ واقعات دراز ذرا سی حرکات ہی زینے ہیں منزلِ صداقت کے خدا را  
ان سیر ہیوں کو پھانڈنے کی کوشش نہ کرو آہستہ آہستہ چڑھو دیکھیں تو بھلا  
مقام مقصود تک کیوں نہ پہنچے گے پھر وہاں سے مقام محمود کا زینہ بھی ہے،  
”علم، علم سے صداقت مل اور اس سے حقیقت اور

## شاعری سیکھئے

اگر آپ کو اردو زبان دانی و شاعری کا شوق ہے تو شاعری کا سیٹ ”مغذ  
مولانا خواجہ عبدالروح صاحب عشرت لکھنؤی طلب فرمائیے اس میں علم عربی  
علم قافیہ، صنایع و بدایع، اصلاح دینے کے اصول، غرض کہ شاعری سیکھنے کیلئے  
ایسے آسان اور دلچسپ اسباق دیئے گئے ہیں جن کو پڑھنے اور من پر عمل پیرا  
ہونے سے ایک مبتدی بھی شاعر کامل بن سکتا ہے سیکڑوں شاعر اور غیر شاعر  
اس وقت تک اس سے مستفید ہو چکے ہیں۔

قیمت کل سیٹ دو روپے علاوہ محمولہ ڈاک (ع)

نیز تمام کتب مولفہ خواجہ عشرت اور دیگر مشہور مصنفین کی کتابیں  
ہم سے طلب فرمائیے۔

المش  
بینچر عشرت بکٹلو احاطہ خانسا مالینک سٹریٹ لکھنؤ

حقیقت سے وحدانیت کی سوسائٹی .... یہ ہیں مرحلے اہل منزل  
ہم پہنچنے کے اور یہی زندگی کا اہل مقصد ہیں۔

انسان مرکز ہے اور تمام کائنات دائرہ۔ بقول حافظ ۵

”دردِ دائرہ قسمت چوں نقطہ پر کارم“

ہونے اپنے مرکز کی طرف مائل ہوا کرتی ہے اور اپنے مرکز میں فرو کیو کے  
ماند ہے یا ایک تعاطیس ہے۔ مصائب، آلام، نیکی، بدی، عیش آرام سب  
اس کی طرف آتے ہیں اور جلتے ہیں۔ وہ تکلیف و راحت، امید و بیم، عیش  
و غم کو اس مع کی طرح جذب کرتا ہے اور اسی طرح اپنے سے خارج بھی کر دیتا ہے،  
لیکن اس نکلنے اور داخل کرنے میں وہ ایک بڑی مشق کرتا ہے جس کو تجربہ  
کھتے ہیں اور جو اس کو اس مقصد تک لے جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی حقیقت  
کا حال کھلائے۔ خاصیت جس کو انسانیت کہتے ہیں۔ جب انسان میں نشا  
آگئی تو علم، صداقت، عل، رویت حقیقت اور وحدانیت کی سوسائٹی تک  
پہنچنا کچھ مشکل نہیں۔ ”وحدانیت کی سوسائٹی ہی وہ سوسائٹی ہے جس  
کے تعلق اشارہ ہے کہ۔“

یا ایقھا النفس المطلبہ ترجیحی الی  
دلیل راضیۃ من صنیۃ،

اس لئے خدا کے واسطے ہم کو چاہئے کہ ہم خود اپنے آپ کو  
نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ یہ اتانیت نہیں بلکہ اس لئے کہ پہلے  
ہم کو خود اپنے پر اعتماد ہونا چاہئے۔ اس معنی کر کے کہ آیا ہم آگے  
بڑھنے میں بچکھاتے تو نہیں اور یہ کہ راہ پر صعب میں ہمارے داخلی  
قوی ہمارے ساتھ دیگئے۔

دوبارے خواص دریائے طلب

وصل جاناں گو ہر نایاب ہے

(بقول حسین احمد پوری)

عالمگیر کا مطالعہ آپ کے ذوق ادب کی  
دلیل ہے! کیونکہ عالمگیر اُردو کا بہترین رسالہ ہے

## جسٹڈ کی تمام بیماریوں کی پیٹ برائین کا شرطیہ علاج جسٹڈ

روئے زمین پر

کا کچھ تمام امراض کی ایک سیفٹ اور بلب اینڈ سنز میڈیٹ پی بھیت کا ایجاد کرو رگوں کو مٹانے جو بھول اور روک کا ہے۔ کہنے سے نیک سے سننے طرح طرح کی آوازیں بھنے بہا رہیں یا کہ بالکل نہ  
سننے۔ درد، غم، ورم، خشکی، کھل، کان میں کیڑے پڑ جانے، ناسوں کا کان کے تمام امراض پر ایک طبی دوا اور اچھی دوا ہے جس کی کوئی دیگر تفریح آپ سلیج زمین پر نہیں پاتے تازہ بائیں سال کی طویل زندگی  
اور غنا نہ کی چھائی کا ایک خاص ثبوت، جس جان کو اعتبار کی کمی ہو وہ شوق سے یہاں ہی شریف لاکر علاج کر سکتے ہیں۔ قیمت فی فیسی سواروپ پی پی ایک ساتھ تین فیسی طلب فرمائے پر حصہ ڈاک  
ویکیٹ مرفوٹا۔ کون بند و کان کے زخم اور قسم کی گندگی کو لاجھاگ لئے جو پانی و پکپاری خود صاف کر لاتی ہے قیمت فی فیسی ۸۔

بادشاہی منجن پتے دانت جادو ہے دانت کی ہر ایک تکلیف اور گندہ دہنی کو دور کرتا ہے۔ قیمت فی پکیٹ ۴۔

جہاں ہر زمین بگیا سچ پچھو دو تازہ عالم لوگوں کا تمام دوائے ہیں ان کی دوا جو والدہ رگوں اور صا کیلئے آپے طلب کی جی وہ میڈیٹ ہوئی جابجہ عظیم بگیا سچ پچھو دو تازہ عالم لوگوں کی دوا  
پچھو دو تازہ عالم لوگوں کی دوا بالکل اچھا ہو گیا اور میڈیٹ ہوئے۔ جابجہ شریف الطاف حسن صاحب ہی کلکٹر تمام فرمائے میں بلب اینڈ سنز کی بھیت کی ڈپنسی بہت کامیابی سے کام کر رہی ہے غریبوں کیلئے  
بہت مفید ہے جو اپنی دوا کے دم نہیں دیکھتے ایک قالی علاج ہیں اور کان کے امراض میں خاص عہدہ رکھتے ہیں دوا منگو لئے وقت اپنا پورا پتہ مہمالات صاف لکھئے۔

ہمارا پتہ { برائین کی دوا۔ بلب اینڈ سنز میڈیٹ پی بھیت (یو۔ پی) }

# عالمگیر کی چند قابل دیکھتاہیں

**شادی** آپ کی یا پاری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت علامہ مولوی صاحب کی شادی خانہ آڑی کے مرغھری حالات خود علامہ صاحب کے خاوند بن سے لکھے ہوئے کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگنا مشکل ہی نہیں بلکہ ممکن ہے اس پڑھنے اور لطف اٹھانے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف چار روپے چار آنے

**صبح لطافت** علامہ مولوی صاحب کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ تصانیف کا نایاب و قابل دید مجموعہ کتاب کے صفحات زعفرانی ناز گشیر کی کپڑوں سے کم نہیں پڑھتے جائیے اور نسبتہ جلدیے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف چار

مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب خجانی کے طرز تحریر کا تازہ کھوپڑا بہادر ترین شاہکار نہایت ہی بڑا قیاد و طرافت میں پلاٹ و مصنف اپنے شوخ اور مذاہر طرز بیان کے ساتھ نکران انظم کے جھگڑنے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے گوشے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہونناک و قوتہ خیز میں جھکا ہوا ہنس بھرنا دل اپنے پلاٹ کی مدت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی و دل رانی میں خجانی صاحب کے تمام اوصاف بڑا چر ہے قیمت صرف ۵۰ محمولہ اک ۵۰

**خطوط کی شتم ظریفی** معنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب خجانی ہندوستانی کی کتاب خجانی صاحب کے مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر فوراً طلب فرمائیے قیمت ۱۲۔

**روزنامی** علامہ مولوی صاحب کی ایک بلند پایہ اور بڑی شایانہ تصانیف میں ایک ہے جس کا نام ہے "روزنامی" دو جلدوں میں مشتمل ہے۔ کوثر میں چلی ہوئی زبان و بیانیات ادبیات مزاحیات کا انداز ترین ترنچ۔ چند روزناموں کے عنوان سے مراد ہے کہ انہوں نے صرف ذکر کر دیا۔ کتاب ہوں۔ بادشاہ کا دفن، قیصر کا روزنامہ، برسر ہلی کا روزنامہ، طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے تیار و کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انہوں نے مولوی صاحب کے ان کا روزنامہ، ایڈیٹر کا روزنامہ، و غیرہ۔ انہی راہی ملک تھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار دیا اب جاسے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ تابلیہ کتاب پھر علاوہ محمولہ اک میں لیکر کتاب کا حجم ہونے آئے نہ صفحات ہے۔

**کتاب التقدير** علامہ مولوی صاحب کی ایک بلند پایہ اور بڑی شایانہ تصانیف میں ایک ہے جس کا نام ہے "کتاب التقدير" دو جلدوں میں مشتمل ہے۔ کوثر میں چلی ہوئی زبان و بیانیات ادبیات مزاحیات کا انداز ترین ترنچ۔ چند روزناموں کے عنوان سے مراد ہے کہ انہوں نے صرف ذکر کر دیا۔ کتاب ہوں۔ بادشاہ کا دفن، قیصر کا روزنامہ، برسر ہلی کا روزنامہ، طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے تیار و کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انہوں نے مولوی صاحب کے ان کا روزنامہ، ایڈیٹر کا روزنامہ، و غیرہ۔ انہی راہی ملک تھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار دیا اب جاسے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ تابلیہ کتاب پھر علاوہ محمولہ اک میں لیکر کتاب کا حجم ہونے آئے نہ صفحات ہے۔

**موتوں کا تخت** علامہ مولوی صاحب کی ایک بلند پایہ اور بڑی شایانہ تصانیف میں ایک ہے جس کا نام ہے "موتوں کا تخت" دو جلدوں میں مشتمل ہے۔ کوثر میں چلی ہوئی زبان و بیانیات ادبیات مزاحیات کا انداز ترین ترنچ۔ چند روزناموں کے عنوان سے مراد ہے کہ انہوں نے صرف ذکر کر دیا۔ کتاب ہوں۔ بادشاہ کا دفن، قیصر کا روزنامہ، برسر ہلی کا روزنامہ، طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے تیار و کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انہوں نے مولوی صاحب کے ان کا روزنامہ، ایڈیٹر کا روزنامہ، و غیرہ۔ انہی راہی ملک تھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار دیا اب جاسے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ تابلیہ کتاب پھر علاوہ محمولہ اک میں لیکر کتاب کا حجم ہونے آئے نہ صفحات ہے۔

**موتوں کا تخت** علامہ مولوی صاحب کی ایک بلند پایہ اور بڑی شایانہ تصانیف میں ایک ہے جس کا نام ہے "موتوں کا تخت" دو جلدوں میں مشتمل ہے۔ کوثر میں چلی ہوئی زبان و بیانیات ادبیات مزاحیات کا انداز ترین ترنچ۔ چند روزناموں کے عنوان سے مراد ہے کہ انہوں نے صرف ذکر کر دیا۔ کتاب ہوں۔ بادشاہ کا دفن، قیصر کا روزنامہ، برسر ہلی کا روزنامہ، طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے تیار و کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انہوں نے مولوی صاحب کے ان کا روزنامہ، ایڈیٹر کا روزنامہ، و غیرہ۔ انہی راہی ملک تھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار دیا اب جاسے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ تابلیہ کتاب پھر علاوہ محمولہ اک میں لیکر کتاب کا حجم ہونے آئے نہ صفحات ہے۔

**مجموعہ قیاس و ال** علامہ مولوی صاحب کی ایک بلند پایہ اور بڑی شایانہ تصانیف میں ایک ہے جس کا نام ہے "مجموعہ قیاس و ال" دو جلدوں میں مشتمل ہے۔ کوثر میں چلی ہوئی زبان و بیانیات ادبیات مزاحیات کا انداز ترین ترنچ۔ چند روزناموں کے عنوان سے مراد ہے کہ انہوں نے صرف ذکر کر دیا۔ کتاب ہوں۔ بادشاہ کا دفن، قیصر کا روزنامہ، برسر ہلی کا روزنامہ، طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے تیار و کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انہوں نے مولوی صاحب کے ان کا روزنامہ، ایڈیٹر کا روزنامہ، و غیرہ۔ انہی راہی ملک تھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار دیا اب جاسے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ تابلیہ کتاب پھر علاوہ محمولہ اک میں لیکر کتاب کا حجم ہونے آئے نہ صفحات ہے۔

**مجموعہ قیاس و ال** علامہ مولوی صاحب کی ایک بلند پایہ اور بڑی شایانہ تصانیف میں ایک ہے جس کا نام ہے "مجموعہ قیاس و ال" دو جلدوں میں مشتمل ہے۔ کوثر میں چلی ہوئی زبان و بیانیات ادبیات مزاحیات کا انداز ترین ترنچ۔ چند روزناموں کے عنوان سے مراد ہے کہ انہوں نے صرف ذکر کر دیا۔ کتاب ہوں۔ بادشاہ کا دفن، قیصر کا روزنامہ، برسر ہلی کا روزنامہ، طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے تیار و کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انہوں نے مولوی صاحب کے ان کا روزنامہ، ایڈیٹر کا روزنامہ، و غیرہ۔ انہی راہی ملک تھا ہو گئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار دیا اب جاسے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ تابلیہ کتاب پھر علاوہ محمولہ اک میں لیکر کتاب کا حجم ہونے آئے نہ صفحات ہے۔

**شاہد سحرنا** علامہ مولانا قادی سر فراد حسین صاحب قمری مرحوم دہلوی ایک زبردست ناول طاق مطالعہ کتاب جن کی خوبیاں کا ذکر سلسلہ طلسم ہر شے کے بارے میں ضرور پڑھے قیمت چار علاوہ محمولہ اک

**شاہد سحرنا** علامہ مولانا قادی سر فراد حسین صاحب قمری مرحوم دہلوی ایک زبردست ناول طاق مطالعہ کتاب جن کی خوبیاں کا ذکر سلسلہ طلسم ہر شے کے بارے میں ضرور پڑھے قیمت چار علاوہ محمولہ اک

پچھلے کلے { عالمگیر بکڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

ہندوستان کے نامور مزاح نویس حضرت علامہ مولوی صاحب کی شادی خانہ آڑی کے مرغھری حالات خود علامہ صاحب کے خاوند بن سے لکھے ہوئے کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگنا مشکل ہی نہیں بلکہ ممکن ہے اس پڑھنے اور لطف اٹھانے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف چار روپے چار آنے

عالمگیر ہندوستان مجھ کے علمی ادبی (یا تصویر) مسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد (۲۴) فهرست مضامین ماهی ۶۱۹۳۶ نمبر ۱

| نمبر شمار | مضامین      | اثر خاصہ                          | نمبر صفحہ | نمبر شمار | مضامین              | اثر خاصہ                 | نمبر صفحہ |
|-----------|-------------|-----------------------------------|-----------|-----------|---------------------|--------------------------|-----------|
| ۱         | فہرست       | غنیخبر                            | ۱         | ۲۶        | مقالات باسط         | حضرت باسط بسوانی         | ۲۶        |
| ۲         | ملاحظات     | ایڈیٹر                            | ۲         | ۱۷        | نیولین اعظم اور ایک | جناب قاضی محمد شفیع صاحب |           |
| ۳         | تبرکات      | حضرت شاہ حکیم آبادی مدظلہ العالیہ | ۴         | ۲۷        | ہوا باز عورت        | بی۔ اے۔ ۱                |           |
| ۴         | سچی کہانی   | جناب طالب علی صاحب مابہ           | ۵         | ۱۵        | غزل                 | جناب سید جلال الدین      |           |
| ۵         | جذبات عالیہ | ایم۔ اے۔                          |           | ۲۹        | باسی پتھول          | حمید ردہ جوی             |           |
| ۶         | احیاء       | حضرت دل شاہ بھانپوری              | ۸         | ۳۰        | کلام نواب           | پروفیسر سید علی عباس     |           |
| ۷         | حدیث غم     | محترمہ خالہ ادیب خانم             | ۹         | ۳۱        | چیزوں کے خطوط       | صاحب حسینی               |           |
| ۸         | گناہ محبت   | جناب عزیز صدیقی ریلپوری           | ۱۴        | ۳۲        | گور کی کے نام       | مسٹر ایم آر فاضل دہلوی   |           |
| ۹         | ہائے جوانی  | جناب وسیم انصاری                  | ۱۵        | ۳۳        | اعجاز سخن           | جناب سعید احمد صاحب      |           |
| ۱۰        | افلاطون کی  | رد و لدی                          |           | ۲۰        | ساحرہ               | جناب سعید احمد صاحب      |           |
| ۱۱        | جمہوریت کا  | حضرت دعاؤ باٹوی                   | ۱۹        | ۲۱        | ہوش ہے              | اعجاز                    |           |
| ۱۲        | ایک باب     | جناب خلیل۔ بی۔ اے۔                | ۲۰        | ۲۲        | خاموش ہے            | جناب سعید احمد صاحب      |           |
| ۱۱        | طوفان نوح   | حضرت نوح ناروی                    | ۲۲        | ۲۳        | اشہارات             | سید محمد اسماعیل صاحب    |           |
| ۱۲        | پر ایسا پاپ | حضرت آسی رام نگری                 | ۲۳        |           |                     | رہا۔ ہمدانی              |           |
|           | .....       | .....                             |           | ۵۶        |                     | مشترکین                  |           |

اگر آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم عزیز ہو تو مکتبہ جامعہ اسلامیہ دہلی کا باقاعدہ پیر سالہ پیام تعلیم طلبہ فرمائیے۔  
 قیمت سالانہ (بیکر) فی پرچہ ہر سال گزرنمبر ۲۵ روپے ۸ پٹے کا پتہ - مکتبہ جامعہ ملیہ قزوینی دہلی

# ملاحضات

خدا متعالے کا ہزار ہزار شکر ہے کہ زیر نظر شاعت کے ساتھ عالمگیر ماہی زندگی کے پورے بارہ سال بخیر و خوبی ختم کر رہا ہے اس دورانہ سالہ دور میں گونا گوں تکالیف - اقتصادی بد حالی - دشمنان عالمگیر کی معاندانہوش مالگیر نے بفضلِ تعالیٰ ہم جہالت اور بہت سے مقابلہ کیا اور اپنی معمولی حیثیت ترقی کی جو موقع اور قابل رشک منزلیں طے کیں اس سے ہی خواہاں مالگیر جو وہ امن و امان میں - اب مناسب نہیں کہیں مالگیر کے گذشتہ دور جہالت کے نامساعد اور پریشان کن حالات اور مہاندین کی مذہبوجی حرکات یہاں اعادہ کروں -

سفید جبکہ کہ ہے آگاہ غالب و یو یو خدا سے کیا تم جو رہنمائی کے لئے

مالگیر کے سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء کی بھی اسی سائز پر شائع کرنے کا اعلان کر چکا ہوں اور زیر نظر تحریریں پھر اسی اعلان کا اعادہ کرتا ہوں کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء وسط جون میں اپنے خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح جاری سائز پر شائع ہوگا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے - کہ کیا واقعی عالمگیر اس قدر مستطیع ہوگی کہ وہ ہآسانی سیکڑوں روپے خلافت معمول خرچ کر سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ اور صرف یہ ہے کہ عالمگیر کو اپنا الیکٹرک بریس ہو جانے کے بہت دھکی کچھ سہولتیں ناقابل بیان پریشانیوں کے

مائل ہو گئی ہیں۔

لیکن اس کا مطلب

نہیں کہ عالمگیر

مستقل اور مستطیع

ہو گیا ہے کہ وہ

مالگیر کی خریداری

اپنے خریداروں کی خدمت میں دو قابل دید خاص نمبر مفت

دیکھ کر خیر رقم

چار روپے چار آنے (چار) بجلا وہ محصول ٹھاک - جو اس کی

تیار فرم - منیجر عالمگیر لاہور

میرے لئے بہت موقع ہے - لیکن میں دل کی خوشی کی خاطر ہر ممکن

قربانی اور بشارت کے لئے تیار ہوں۔

دل کی خوشی کی خاطر چمکے ڈال مال و دھن کو

گرم دھپ تو عاشق کو ڈی نذر کہ کفن

بہر حال - عالمگیر کا سالانہ نمبر و سائز میں ان تمام خبروں

خصوصیات کے ساتھ بڑے سائز پر شائع ہوگا جو عالمگیر کے خاص نمبروں

کیلئے مخصوص ہیں۔

## الکراپ

غالب یہ عرض کر دینا

غیر ضروری نہ ہوگا

کہ میں نے حتی الوسع

عالمگیر کو زندہ رکھنے

اور اس کو زیادہ سے

زیادہ کامیاب

ہونے کے لئے نہایت

نیک نیتی کے ساتھ

خوبیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں

ان تمام حقیر کنش

بروے کا دلایا - جو میرے حیطہ امکان میں تھیں - اب بھی میں یہی چاہتا ہوں

کہ عالمگیر کا آئندہ دور جہالت و تاریکی اور پاشا پاشا انداز سے کہ عالمگیر کی

موجودہ حیثیت اس کے سامنے نہایت غیر موقع ہو کر رہ جائے۔

دسمبر ۱۹۳۶ء میں ۱۹۳۶ء کے عالمگیر کا جو خاص نمبر خاص نمبر

۱۹۳۶ء کے نام سے بڑے یعنی جاری سائز پر شائع ہوا تھا - اگرچہ میں نے

اس پر بہت معمولی رقم خرچ کی لیکن اس کی قابل رشک کامیابی میرے

لئے اس قدر عمدہ اثر ثابت ہوئی کہ میں موجودہ کس اور بازاری کی بجائے

یہ واقعہ ہے کہ عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۶ء کو جس نے بھی دیکھا وہ اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوا۔

میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر بھی ہر حیثیت سے بہت شاندار اور متم با شان خرموں کا حامل ہوگا۔ ہن نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنے فی پرچہ ہوگی۔ لیکن اس کی صرف ایک تصویر یا ایک مضمون پر یہ قیمت سو مرتبہ قربان کی جاسکتی ہے میرے اس اعلان کو بالآخر سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے اور ایسی حقیقت جو ناقابل تردید ہے۔ میں مضامین اور نقاد پر کو دیکھ چکا ہوں۔ عالمگیر کے اس سالانہ نمبر پہلی ہزار روپیہ کی جو خطیر رقم خرچ کر رہا ہوں۔ اس کا مجھے علم ہے۔ اس لئے میں یہ عرض کرنے میں یقیناً حق بجانب ہوں کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر فی الحقیقت عظیم النظیر اور اعجاز اب ہوگا۔

میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں اس مختصر گفتگو میں سالانہ نمبر کی نقاد پر یا مضامین کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کر سکوں۔ بلکہ مجمل طور پر کچھ لکھنا بھی ناممکن ہے۔ اس لئے جو کچھ سالانہ نمبر کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے اسے کافی سمجھئے۔ چند یوم کے بعد جب عالمگیر کا یہ معرکہ آرا اور نہنگامہ پردہ سالانہ نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ تو مجھے یقین ہے کہ آپ خود اس کی خوبیوں کا اعتراف فرمائیں گے۔ اس تجویز کو ختم کرنے سے پیشتر میں آپ کی خدمت

.....  
.....  
.....

میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے حلقہ اجاب میں بھی عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرما کر کارہمداران عالمگیر کی حوصلہ افزائی کیجئے۔ آپ کی اس مدد سے عالمگیر زیادہ سے زیادہ خدمت گذاری کے قابل ہو سکے گا۔

عالمگیر کے آئندہ دور حیات کے متعلق جو خاکہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اگر حالات کی مساعدت نے اس کو عملی جامہ پہنائے گی اجازت دی تو آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ آپ کا عالمگیر مستقل طور پر ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین رسائل کی صف اول میں جگہ حاصل کر سکے گا۔

اگرچہ عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۶ء کے متعلق کوئی اعلان مردست قبل از وقت ہے۔ لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جون کے سالانہ نمبر کے بعد میں اس کی تکمیل و ترتیب کا کام پوری سرگرمی کے ساتھ شروع کر دینا چاہتا ہوں۔ اور نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۷ء تمام رسائل کے خاص نمبروں کے لئے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے قابل رشک ہوگا۔

میں اس پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس میں ایسی ہنگامہ خیزی۔ ایسی جدت اور ایسا تنوع پیدا کرنے کا آرزو مند ہوں۔ جو میرے عزائم اور حوصلوں کے عین مطابق ہو۔

وما توفیقی الا باللہ

حافظ محمد عالم عفی عنہ

**ضروری اطلاع**  
اگر آپ کی مباد خریداری ختم نہیں ہوئی تو عالمگیر کا معرکہ آرا اور متم با شان سالانہ نمبر جو حفاظت مائل کرنے کیلئے چار آنہ کی قیمت پر ہائے مصروف لٹاک بیچے گا کہ سالانہ نمبر جو چٹری کے ذریعہ ارسال کیا جائے۔ نمبر خریداری بھی ضرور کیجئے جس صورت کی مباد خریداری ختم ہو چکی ہے۔ وہ ٹکٹیں نہ بیچیں۔ ان کی خدمت میں سالانہ نمبر آئندہ سال کے لئے بذریعہ وی پی آر سال ہوگا۔

منیجر عالمگیر لاہور

# تبرکات

(از حضرت شاد عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ)

دل اپنی طلب میں صادق تھا، لہذا اگلے سوئے مطلوب گیا  
 دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا  
 پیری میں جوانی کا قصہ! کس منہ سے کہوں؟ شرم آتی ہے  
 وہ جوش گیا، وہ آن گئی، انداز گیا، اسلوب گیا  
 بے راحلہ و بے زاد سفر، رحمت پہ بھروسہ کر کے فقط  
 دنیا کی سراسرے جو اٹھ کر اس طرح گیا وہ خوب گیا  
 طاقت جو نہیں، اب حیرت سے، تصویر کا عالم رہتا ہے  
 وہ آخر شب کی آہ گئی، وہ غمرہ یا محبوب گیا  
 کوچہ میں ترے اب شاد نہیں، اللہ نے کر دی پاک زمیں  
 صد شکر سرائے فانی سے، اس حشر وہ سب محبوب گیا

شاد



# بچی کہانی

(از جناب طالب علی صاحب)

ہم نے تو سنا ہے آپ نے بھی سنا ہو گا کہ اپنی بیٹی جو یا پرانی بیٹی جو مزہ بھی باتوں میں ہے وہ کہانی میں کہاں۔ آج میں چاہتا ہوں کہ اپنے ایک بچہ کے بڑے بڑے بھائی کی کہانی آپ کو سناؤں۔ جلنے والے پہچان جائیں گے۔ بروکھنے کی بات یہ ہے کہ نہ جلنے والے بھی سمجھتے ہیں کہ نہیں +

کوئی آج سے ۸ برس اور ہر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ گھر میں اور بچے بھی تھے۔ اور یہ تو سدا ہی سے ہوتا آیا ہے۔ کوئی جانتا ہے کوئی آتا ہے۔ پر وہ سما ہی اور تھا۔ ہندو مسلمان کے جھگڑے ٹھنڈے نہیں تھے دو لڑوں ایک دوسرے کے دکھ اور امتد میں دل کھول کر ساتھ دیتے تھے اور جب تک ٹک ٹی مائی کا لال اپنے منہ سے نہ قبولے کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان کسی نئے آدمی کو کوئی پہچان نہیں ہوتی تھی مسلمان ہوں یا ہندو کرا کر اور شادی بیاہ کی بہت سی باتیں ایک سی ہوتی تھیں۔ یہ بچہ پیدا ہوا تو گاؤں بھر میں خوشی ہوئی بڑی دادوں نے بھی مبارک سلامت دی جسے دیکھو ہنسا چلا آ رہا ہے۔ پر جا کی بن آئی۔ بات بات میں دان پن کی کلیاں بھرنے لگیں۔ سوہل گائے گئے۔ ڈھلکیاں بجائی گئیں۔ کیا دن تھے کیا زمانہ تھا کیا لوگ تھے +

بچہ کا نام سید ساجد علی رکھا گیا۔ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ آنکھوں کا تار بنا ہوا کھیلتا کودتا۔ ہنستا ہنساتا پلوں اور دڑوں بڑھتا رہا۔ باپ طیب تھا اور چھوٹا موٹا دھندلا۔ دھندلے کے دن تھے۔ سستے کا زمانہ تھا۔ سنتے ہیں

روپیہ کا ڈھنڈا بھرا چٹا گھی بکھتا تھا۔ اس وقت کی زمینداری نہ تھی۔ اچھی خاصی لڑائی تھی۔ راجہ اور پر جا میں باپ بیٹے کا سایہ ہمارا رہتا تھا آج کل کا حال نہ تھا کہ زمینداری جلتے جلتے سونے کی ہنسیا ہے نہ نکلی جائے نہ آگلی جائے +

ساجد کی بیمار ماں پوری پانچ ماہیں بھی اپنے چھوٹے لاڈلے کی سیر نہ دیکھ سکیں۔ مالک نے بلایا۔ چپ چاپ چلی گئیں بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ ساجد کا بھائی اور ساجد کی بھانج دو لڑوں اپنی آنکھ کی ٹھنڈک اور اپنے کلچے کا جین سمجھ کر ہانسنے لگے بڑی بہن بھی چاہنے والی ہو تو مان سامان ہوتی ہے۔ ساجد کی بہن کا بیاہ ہو چکا تھا پر ابھی تک گود فانی تھی۔ ماں کے اٹھتے ہی بھگوان اسے اپنے لال کی طرح من موہن بھائی دیدیا۔ اب کیا تھا۔ ساجد ہی ساجد تھے۔ اور بچہ بھی ایسا سندرا ایسا ہنس مکھ کہ دیکھتے ہی بنے۔ چلبلی چال۔ موہنی صورت۔ انمول چنچل پنا سارے شہر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پھر بڑھنے لگنے میں ایسا تیز۔ کہ مولوی کی گھڑا کی کیسی آنکھ بھی کبھی نہیں دیکھی۔ بھانج اور بہن کے پاس بیٹھتا تو بارہ تک کے ہاڑے سنا دیتا۔ کلام پاک اردو اور فارسی کا آموختہ اور سبق دینا کی طرح دہرا دیتا +

بڑے بھائی نے شہر میں وکالت شروع کی تو ساجد کا بن گیا رہ بارہ سال کا ہو گا۔ واہ رے بچہ۔ حافظ خاقانی اور عرفی کے سینکڑوں شعرا زبرد تھے۔ بڑے ہوئے طوطے کی طرح نہیں۔ بلکہ جو چیز بڑھی پھرتی لکیر ہو گئی۔ ایسا مافوقی

یاد تو وہی جسے دے وہ پائے کسی کا اجارہ نہیں ہے  
اردو کی نہ پوچھئے وہ تو گھر کی لونڈی بھی اسے بی سہمی  
کرنے لگے۔ اسکول میں نام لکھ گیا۔ آنکھوں میں دھبے میں دلہند  
پایا دسویں میں اول درجہ میں پاس ہوئے۔ کالج میں مضمون  
نویسی اور فقرہ میں بہت سے نمٹے پائے۔ بایس برس میں  
دکالت پاس کی۔

باپ سماں بھائی زادہ کی دکالت کے ڈنکے بچ رہے  
تھے۔ بھٹ اور جرح۔ خوش کلائی اور واقعاتی چمان  
بین میں کوئی گرد کو بھی نہ پہنچتا۔ جفاکشی اور ذہانت ایسی  
تھی کہ موکل نے مقدمہ سپرد کیا اور تمام جھجھٹوں سے آزاد ہو گیا  
ضلع کی عدالتوں میں جھنڈے گرے ہوئے تھے۔ شہر بھر میں  
دھوم تھی۔ باپ دادا کا قرضہ کوڑی کوڑی چکایا اور ساری  
جائداد پر حصہ سمجھ کر بہن بھائیوں کا نام چڑھا دیا۔ شہر میں کوٹھی  
بن گئی۔ سچ ہے داتا جسے چاہے دے اور جتنا چاہے دے۔ وہی  
زادہ جو طالب علمی میں کرائے کی ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری لیکر  
سرائے رہتے تھے۔ آج وہی لاکھوں کی جائداد اور ہزاروں  
روپیہ کے مالک تھے۔

ساجد زورس کلی تھے۔ سپاسونا۔ محبت کی آگ میں  
تپا تو گدگدن کی طرح چمک گیا۔ بھائی کی سرپرستی میں ساجد کی  
دکالت بھی ایسی چلی کہ دھوم دھام مچ گئی۔ سرکاری وکیل  
ہوئے۔ ولایت گئے۔ خان صاحب کا خطاب ملا۔  
ہزاروں کے ساتھ سلوک کئے۔ گاؤں میں ایک کوٹھی

بنوائی۔ اور ایسے مشہور ہوئے۔ اتنے ہر دلعزیز ہوئے  
کہ بیماری میں ہزاروں دیکھنے آئے۔ اور جنازہ میں ہندو  
مسلمان۔ رئیس امیر۔ غریب اور متوسط لوگوں کے ٹھٹھکے  
ٹھٹھکے لگے ہوئے تھے۔

مکیہ عیب ذات اسی معبود کی ہے۔ ساجد میں جہاں  
تمام خوبیاں تھیں وہیں ایک کمزوری بھی تھی کہ روپیہ کو  
مٹی سمجھتے تھے۔ کبھی اپنی چادر اور اپنے قد کا حساب ان کو  
نہیں سوچھا۔ اگر بے مکان خرچ پر کوئی قتل جائے تو لاکھ دو لاکھ  
کیسے قارون کا خزانہ بھی چمک جائے۔ قرض لینے کی عادت  
پڑ گئی۔ لیا اور صرف کر دیا کمایا بہت کمایا لٹ کر کچھ باقی  
نہ رکھا۔

اکٹھ مہینے بیمار رہے۔ آخری مہینے میں صحت پرستیوں سے  
توبہ کی اور ۴۴ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے پاس ہمیشہ  
کے لئے سو گئے۔ کاش ابھی اور نہ مرتے تو دنیا کو دکھاتے  
کہ جب کسی کی کایا پلٹ ہوتی ہے تو ساری برائیاں اچھاٹیل  
سے بدل جاتی ہیں۔ ساجد نے سچے دل سے توبہ کی اور وہ  
قبول ہو گئی۔ پہلی محرم کا دن گزرا رات آئی اور وہ حسین کا  
شہدائی ہم سب کو جھوڑ کر چلا گیا۔

بیٹھے نہیں زمین پہ خزانے کو کھاڑ کے  
موت آئی اکٹھ کھڑے ہوئے دامن کھجڑ کے

طالب

## جہازی سائز

عالمگیر سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء جہازی سائز پر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ تصاویر مضامین افسانوں  
اور نظموں کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر رینی نظیر آپ ہے۔  
منہج عالمگیر لاہور

# جہازی سائز پر عالمگیر کا سالانہ نمبر

جون ۱۹۳۶ء کے وسط میں خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح جہازی سائز پر شائع ہوا ہے  
 باصو نواز تقویر، بلند پایہ مضامین، پیچیدہ لکشی افلاں، اور کیفیت باز نظموں کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر فضیلتاً اپنے نظیر آپ ہو گا۔

## اگر آپ عالمگیر کے خریدار ہیں

اپنا سلسلہ خریداری قائم رکھ کر دو زبان کے ایک پرانے اور بلند پایہ رسالہ کی مدد کیجئے۔ اس طرح کارپردازان عالمگیر کی حقیر مساعی کی  
 حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ زیادہ جرات، زیادہ ہمت اور زیادہ استقلال کے ساتھ آپ کی دلچسپیوں کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

## عالمگیر کی مدد اور دو زبان کی مدد سے

خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء بھی سال بھر کے خریداروں کو مفت ملے گا۔ عالمگیر پورے بارہ سال سے جاری ہے آج تک اس کی ایک  
 اشاعت کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ ہر سال اپنے خریداروں کی خدمت میں دو بہترین خاص نمبر جن کی علیحدہ قیمت سٹوا سٹوار روپیہ ہوتی ہے بالکل  
 مفت پیش کرتا ہے۔

## اور اس پر طرہ یہ کہ

بعض رسائل کی طرح دو ماہ کی اشاعتوں کو یکجا کر کے اس مشترکہ اشاعت کا نام خاص نمبر نہیں رکھا جاتا بلکہ جس ماہ میں عالمگیر کا  
 خاص نمبر شائع ہوتا ہے۔ وہ صرف اسی ایک ماہ کا شمارہ متصور ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ

## عالمگیر کے خاص نمبر فی الحقیقت خاص نمبر ہوتے ہیں

چند سالانہ چار روپیہ چار آنہ (لحم، علاوہ محصول اک ہے۔ اسی چندہ میں خاص نمبر اور سالانہ نمبر مفت ملتے ہیں۔ خاص نمبر ہمیشہ  
 دسمبر میں اور سالانہ نمبر ہمیشہ جون میں شائع ہوتا ہے۔

## اگر آپ

عالمگیر کے خریدار نہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے فرمائش خریداری بھیجئے؛

نیاز مند

منیجر عالمگیر لاہور

یاد تو وہی جیسے دے دے ہائے کسی کا اچارہ نہیں ؟

اردو کی نہ پوچھئے وہ تو گھر کی لونڈی بھی اسے بی سٹی کرنے لگے۔ اسکول میں نام لکھ گیا۔ آنکھیں درجے میں دلید پایا دسویں میں اول درجہ میں پاس ہوئے۔ کالج میں مضمون نویسی اور تقریر میں بہت سے تمغے پائے۔ بائیس برس میں وکالت یاس کی۔

باپ سناں بھائی زاہد کی وکالت کے دن تک بچ رہے تھے۔ محنت اور جرح۔ خوش کلامی اور واقعاتی چمن بین میں کوئی گرد کو بھی نہ پہونچتا۔ جفاکشی اور ذہانت ایسی تھی کہ موکل نے مقدمہ سپرد کیا اور تمام جھنجھٹوں سے آزاد ہو گیا ضلع کی عدالتوں میں جھنڈے گرے ہوئے تھے۔ شہر بھر میں دھوم تھی۔ باپ دادا کا قرضہ کوڑی کوڑی چکایا اور ساری جائداد پر حصہ سمجھ کر بہن بھائیوں کا نام چڑھا دیا ستر میں کوٹھی بن گئی۔ سچ ہے داتا جیسے چاہے دے اور جتنا چاہے دے۔ وہی زاہد جو طالب علمی میں کرائے کی ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری لیکر سرائے رہتے تھے۔ آج وہی لاکھوں کی جائداد اور ہزاروں روپیہ کے مالک تھے ؟

ساجد نورس کلی تھے۔ سچا سونا۔ محبت کی آگ میں تپا تو گدگدن کی طرح چمک گیا۔ بھائی کی سرپرستی میں ساجد کی وکالت بھی ایسی چلی کہ دھوم دھام مچ گئی۔ سرکاری وکیل ہوئے۔ ولایت گئے۔ خان صاحب کا خطاب ملا۔ ہزاروں کے ساتھ سلوک کئے۔ گاؤں میں ایک کوٹھی

بنوائی۔ اور ایسے مشہور ہوئے۔ اتنے ہر دلعزیز ہوئے کہ بیماری میں ہزاروں دیکھنے آئے۔ اور جنازہ میں ہندو مسلمان۔ رئیس امیر۔ غریب اور متوسط لوگوں کے مختلف گٹھ گٹھٹ لگے ہوئے تھے۔

مگر بے عیب ذات اسی عہد کی ہے۔ ساجد میں جہاں تمام خوبیاں تھیں وہیں ایک کمزوری بھی تھی کہ روپیہ کو مٹی سمجھتے تھے۔ کبھی اپنی چادر اور اپنے قد کا حساب ان کو نہیں سوچھا۔ اگر بے تکان خرچ پر کوئی تل جائے تو لاکھ دو لاکھ کیسے قارون کا خزانہ بھی چمک جائے۔ قرض لینے کی مادت پڑ گئی۔ لیا اور صرف کر دیا کمایا بہت مگر ایسا لکچر بانی نہ رکھا

آنکھ مینے بیمار رہے۔ آخری مینے میں صحت پرستیوں سے توبہ کی اور ۴۴ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے پاس پیشہ کے لئے سو گئے۔ کاش ابھی اور نہ مرتے تو دنیا کو دکھاتے کہ جب کسی کی کایا پلٹ ہوتی ہے تو ساری برائیاں اچھائیوں سے بدل جاتی ہیں۔ ساجد نے سچے دل سے توبہ کی اور وہ قبول ہو گئی۔ پہلی عجم کا دن گزرا رات آئی اور وہ حسین کا شہدائی ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔

میتھے نہیں زمین پہ خزانے کو کھاڑ کے موت آئی آنکھ کھڑے ہوئے دامن کو بھاڑ کے

.....  
"طالب"

## جہازی سائز

مالگیر سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء جہازی سائز پر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ تصاویر مضامین۔ افلاک اور نظموں کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر اپنی نظیر آپ ہے ؟  
منیجر مالگیر لاہور

# جہازی سائنز پر عالمگیر کا سالانہ نمبر

جون ۱۹۳۶ء کے وسط میں خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح جہازی سائنز پر شائع ہوا ہے۔  
 باصو لواز نقادیر، بلند پایہ مضامین، سید و لکش افلاؤں، اور کیفیت بار نظموں کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر فضلاء عالمی اپنی نظیر آپ ہو گا۔

## اگر آپ عالمگیر کے خریدار ہیں

اپنا سلسلہ خریداری قائم رکھ کر اردو زبان کے ایک پرانے اور بلند پایہ رسالہ کی مدد کیجئے۔ اس طرح کارپردازان عالمگیر کی حقیر مساعی کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ زیادہ جرات۔ زیادہ ہمت اور زیادہ استقلال کے ساتھ آپ کی دلچسپیوں کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

## عالمگیر کی مدد اردو زبان کی مدد سے

خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء بھی سال بھر کے خریداروں کو مفت ملے گا۔ عالمگیر پورے بارہ سال سے جاری ہے آج تک اس کی ایک اشاعت کبھی ناخفہ نہیں ہوئی۔ ہر سال اپنے خریداروں کی خدمت میں دو بہترین خاص نمبر جن کی علیحدہ قیمت سٹوا سٹوار روپیہ ہوتی ہے بالکل مفت پیش کرتا ہے۔

## اور اس پر طرہ یہ کہ

بعض رسائل کی طرح دو ماہ کی اشاعتوں کو یکجا کر کے اس مشنہ کہ اشاعت کا نام خاص نمبر نہیں رکھ دیا جاتا۔ بلکہ جس ماہ میں عالمگیر کا خاص نمبر شائع ہوتا ہے۔ وہ صرف اسی ایک ماہ کا شمارہ متصور ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ

## عالمگیر کے خاص نمبر فی الحقیقت خاص نمبر ہوتے ہیں

چند سالانہ چار روپیہ چار آنہ (الطیر، علاوہ محصول ڈاک ہے۔ اسی چندہ میں خاص نمبر اور سالانہ نمبر مفت ملتے ہیں۔ خاص نمبر ہمیشہ دسمبر میں اور سالانہ نمبر ہمیشہ جون میں شائع ہوتا ہے۔

## اگر آپ

عالمگیر کے خریدار نہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے فرمائش خریداری بھیجئے؛

نیاز مند

منیجر عالمگیر لاہور

# جذباتِ لہ

(اعتبار الملک حضرت دل شاہ جہانپوری)

سکون و ضبطِ خصت ہو گئے پرآرزو دل سے  
حجابِ حسنِ دل کش اٹھ گیا خود جذبہٴ دل سے  
حواسِ ہوش ایسے ہو گئے گم بجر الفت میں  
زمانہ میں جب آدمی رات کو ہوتا ہے سناٹا  
فضا میں پھول برسائے ہیں اندازِ تبسم نے  
اسی عالم کو فردوسِ تمنا ہم سمجھتے ہیں  
ریخِ زیبا سے اس نے مسکرا کر جب نقابِ الٹی  
جنتوں کی شورشیں اس حد میں ہیں کہ قافلہٴ الو  
یہ عالم ہے دل وارفہ کی آشفۃ حالی کا

الہی کون اٹھ کر چل دیا ہے آج محض سے  
نگاہِ قیس میں لیلیٰ اتر آتی ہے محسوس سے  
ہوا ہوں بے نیاز اب رازِ طوفاں سعیِ حاصل سے  
صد اک گونج اٹھتی ہر مرے ٹوٹے ہوئے دل سے  
نشاطِ روح ہو جانے نہ دیں گے تم کو محفل سے  
بدل جاتی ہے اک دنیا جہانِ دل گیا دل سے  
اٹھا اک نعمۂ پر کیف میرے بر بڑا دل سے  
جرس ہے مائل فریاد آوازِ سلاسل سے  
سیرِ منزل پہنچ کر بھی ہوں میں ہیگا نہ منزل سے

فضا اپنی نظر ہے اب آلِ موزینہاں ہے  
غضبِ ڈھائیگا ہر شعلہ بھڑک کر مضطرب دل سے

فضا جالندھری



## از محترمہ خالدہ ادیب خانم

یہ کچھ پاپ اور براہ معلومات مضمون جامعہ کی کسی گزشتہ شصت میں شائع ہوا تھا ہم ناظرین کی ضیافت بلج کے لئے اس گراں قدر مضمون کو عالمگیر میں درج کرتے ہیں۔

اخلاقی قوت کی ضرورت اتنی ہی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جتنی کہ ان اور انتظام کی۔

پہلی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تصوف کی ایک تحریک بنی تھی جو اناطولیہ میں دور مد تک پھیلی ہوئی تھی۔ ارباب فوت یا طلقہ افی پر اس کا جو اثر پڑا اسے بتانے سے پہلے یہ مناسب ہو گا کہ تیرہویں صدی کی اس ممتاز تحریک کی اصلیت تنظیم اور ادب کی وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی جائے۔

اس عہد کی تحریک تصوف کا آغاز تین بڑی شخصیتوں سے ہوتا ہے، تینوں کی تعلیمات کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی لیکن ان کے عقائد پر ایک حد تک ایرانی۔ نو فلاطینی اور لیرونی کی معرفت پسندی فلسفہ اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات مثلاً مذہب عیسوی اور مذہب مانوی وغیرہ کا بھی اثر پڑا تھا۔

اناطولیہ کے خیالات پر جن تین صوفیوں کا اثر پڑا تھا ان کے حالات زندگی ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سولانا جلال الدین رومی (رحمۃ اللہ علیہ) ان کے والد بلج کے ایک ترک تھے اور ان کی والدہ خوارزم کے شاہی خاندان کی ایک رکن تھیں۔ یہ اپنے والد کے ساتھ اناطولیہ آئے تھے اور اپنے عہد

۱۱۷۵ء میں اور دو سالوں نے چند سال سے تحریک تیلر سے بہت کچھ اپنا شروع کیا ہے فرانس بھی پرفیسر جن کی عنایت سے ان کی پیروی کر رہا ہے چونکہ تیرہویں صدی میں اس جماعت کے ہم مرکز انقرہ میں تھے اور چونکہ انقرہ اب جدید ترکی کا دار السلطنت بن گیا ہے اس لئے ترکی میں اب بھی اس مسئلہ سے بہت کچھ لے رہے ہیں اور اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لئے رانے ماخذوں کو چھان رہے ہیں۔

جب ماضی اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتا مستقبل میں جو ہونے والا ہے اس کا اندازہ کن ممکن نہیں ہوتا۔ اور حال ہزاروں متضاد قوتوں کا شکار ہوتا ہے کچھ لوگ مذہب سے تسکین حاصل کرنے کے لئے دنیا کو گذر گئی ہو جاتے ہیں اور کچھ موجودہ شورش و فتنے میں جو کچھ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اسے غنیمت سمجھ کر اس کے جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں یہی وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا کی تماشگاہ پر معاشرت کے نئے منظم کام کا مقدمہ تجلّیش نمودار ہوتا ہے۔

اناطولیہ کی تاریخ میں تیرہویں صدی کا ابتدائی حصہ اسی عہد کا زمانہ تھا۔ سلجوقوں کی ریاست کی بنیادیں بن چکی تھیں۔ اناطولیہ کے مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ملک کے باہر بھی جنگجوؤں کے حملہ کا خوف تھا۔ اور ملک کے اندر ہر شخص کے حق پر دوسرے کی نظر تھی۔ ان قوتوں میں جو باہم دست و گریبان تھیں کبھی آپس میں ٹکراتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی تھیں۔ حلقہ احمیہ کی قوت جس کا دوسرا نام ارباب فوت تھا، ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اس میں اس عہد کی تمام معاشرتی معاشی اور تصوف کی قوتیں جمع ہو کر ایک ہم آہنگ مشتمہ میں منسلک ہو گئی تھیں کیونکہ یہ زمانہ ایسا تھا جب کہ روحانی تسکین اور

ملکہ ابھی کچھ پیشہ ویرانگی تھی اس کے نام کی اصلیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ عربی لفظ تھی جسے جس کے معنی بھائی کے ہیں لیکن پرفیسر جن نے اسے ایک نادر مضمون میں جو سوائے ایشیا ٹک ڈوی پرس میں شائع ہوا ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کی اصلیت ایشیا ٹک ہے۔ بہر حال اس کے بچے۔ م۔ ی۔ جو عام طور پر جن اور فریضہ جنوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس لفظ کے ترکی لفظ کو صحت کے ساتھ نہیں کرتے ترکی لفظ کا انکار زیادہ تر بطریقہ اچھی اور احیہ سے کیا جاتا ہے۔



طور پر چاہیے جس قدر بھی روحانی بخیاں اور جہلی فکین کیوں نہ حاصل ہوتی ہوں  
لیکن اس عہد کی منتشر اور غیر منظم معاشرت کی کوئی تنظیم بڑے پیمانے پر نہ  
ہو سکتی تھی۔

(۲) محمد الدین عزی: علامہ تاج الدین، اس عہد کے دوسرے  
صوفی تھے جنہوں نے اناطولیہ میں تصوف کے خیالات کو پھیلا دیا۔ یہاں پہلی  
کے رہنے والے تھے۔ بہین پر جب حملہ ہوا۔ اور مسلمانوں پر ظلم کئے جانے لگے  
اس وقت انہوں نے اپنا ملک چھوڑ دیا اور اناطولیہ میں گریپناہ لی ابتدا  
میں انہوں نے قونیہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک ترکی بیوہ و شادی  
کی لیکن بعد کچھ وقت چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے  
فلسفہ کے متعدد پہلوں میں اور ان کی تصانیف کے بیشتر حصہ میں پیش گوئی کی  
طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کے سوتیلے ترکی فرزند، صدر الدین قونی  
نے ان کی تصانیف کے ترجمے اور شرحیں لکھیں اور ان کے خیالات کی اصطلاح  
کی بنیاد پر اپنی تصنیف ترکی خیالات کی تاریخ میں ان کا شمار بھی ان لوگوں  
میں کرتا ہے جنہوں نے ترکی تصوف پر بہت اثر ڈالا ہے لیکن عوام میں جس  
تصوف کو قبولیت حاصل ہوئی اور جس سے اس عہد کی معاشری، معاشی  
اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صوفیوں کے حلقے پیدا ہوئے  
اس کا سبب اور رچ رچا ہوا احمدی ہے۔

(۳) خواجہ احمد یوسفی سمرقند اور بخارا کے قرب و جوار میں پیدا  
ہوئے۔ وہ بھی اناطولیہ نہیں آئے۔ ان کی تعلیمات کو ان کے مرید  
تیرھویں صدی میں اناطولیہ لائے۔ اور ان کی ایک وسیع رقبہ میں رعیت  
ہوئی۔ ان کی خاص تصنیف دیوان حکمت ہے۔ اگرچہ یہ دیوان چرمان کا  
لکھا ہوا نہیں ہے لیکن اس کا اثر بہت گہرا اور وسیع ہے۔ یہ ترکی میں لکھتے  
تھے اور ان کی تعلیمات میں مابعد الطبیعیات کی کوئی پیچیدگی یا ایرانی تصوف  
کی مروجیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب اعمال اور کردار کا  
نام ہے۔ ان کے اور ان کے مریدوں کی تعلیم سے تمام اناطولیہ میں ہل  
صوفیوں کے حلقے پیدا ہو گئے جن بیک تاشی اور اچھی حلقے بھی شامل تھے  
انہوں کا سلسلہ بیک تاشیوں کے سلسلے سے جنس باتوں میں مشابہ تھا  
کم سے کم کچھ تو زاد سے نواد کا یہی خیال ہے۔ جو اپنی تصنیف ترکی ادب کے  
ابتدائی صوفیاء میں اس بات پر خاص زور دیتے ہیں۔

جوانی میں قونیہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور عالم  
نقوی فارسی میں لکھی تھی۔ ان کی اس تصنیف سے شری ممالک بہت متاثر  
ہوئے۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں  
کی زندگی پر کچھ بھی پیشوی اپنا اثر ڈال رہی ہے لیکن ترکی ذہن پر اس کا  
جواثر پناہ اور بھی زیادہ تھا۔ یہ ان کے ذہن پر چھ سو سال سے برابر  
حادی ہے اور صوفیاء کے جو سلسلے اس سے پہلے (جواب معدوم  
ہو گئے) میں ترکی کے بہترین شاعر اور ماہران موسیقی انہیں میں سے  
پیدا ہوئے۔ کچھ غالباً اس وجہ سے کہ فارسی سرکاری زبان تھی اور کچھ اس  
کہ مولانا جلال الدین رومی کو ایرانی فلسفہ سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے  
اپنی اس عظیم المرتبت تصنیف کو فارسی زبان میں ہی لکھا لیکن وہ ترکی اور  
عربی زبانوں سے بھی خوب واقف تھے۔ اور ان میں تصنیف و تالیف بھی  
کر سکتے تھے۔ ان کی فارسی تصنیفوں کے ترجمے اور شرحیں خود ان کے بیٹے  
نے کی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے عہد میں اس بات کی ایک عام  
خواہش پائی جاتی تھی کہ نہ سہی علم کو سادہ ترکی زبان میں منتقل کیا جائے  
اور عوام میں پھیلا یا جائے۔ مولانا کی تصنیف پر ترکی میں جو شرحیں لکھی گئی  
ہیں وہ سب ظاہر ہیں اور نقوی کا ترکی میں جو ترجمہ بھی نے کیا ہے وہ ابھی  
تک بہترین سمجھا جاتا ہے۔

بائیں ہمہ اپنے عہد میں مولانا کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صرف  
خواص کے لئے لکھتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق خیال تھا کہ ان کا خلاصہ  
عوام سے ہے مگر ان کی بین الاقوامیت، نسل و مذہب کے حدود کو تسلیم  
نہیں کرتی تھی۔ ان کا قول ہے "شاعر، ساقی اور شراب کو میں عالم  
مستی میں ایک ہی سمجھتا ہوں۔ میں وحدت کی ہر اسلام اور کفر دونوں پر  
لگتا ہوں" حقیقت یہ ہے کہ اپنی تعلیمات میں انہوں نے ملال انسانیت  
پر وحدت کی مہر ثبت کر دی علاوہ انہیں اپنی صلح جوی اور امن پسندی  
میں وہ کسی قسم کی باطنی گوارا نہ کرتے تھے۔ نہیں کسی ایسے جگہ سے  
جو آدمیوں کے درمیان تفرقہ ڈالے کبھی کوئی عہد دی نہ ہوتی تھی اور ان کی  
فہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتی تھی۔ اس لئے ان کے فلسفہ سے انفرادی

لے ان کے فلسفہ تصوف سے جو لوگ وابستہ تھے انہیں ترکی میں مولوی اور  
یورپ میں نقصان دہ پیش کیے جاتے تھے۔

اجی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ کا اعلیٰ زنی نشان ایک خاص قسم کی شکار دریا جاسم ہوتی تھی۔

مگر اس کے عکس یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ان حلقوں کے رٹنے والے عناصر کو جذب کرنے کے بعد عثمانیہ حکومت نے اس کے سیاسی اقتدار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ گو بہاؤ کبیر کی حکومت کمزور ہوتی تھی اجمی یا ارباب فتوت حکومت کو کراہتے تھے۔ انفرہ اور کرشمیر میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھی جب عثمانیوں نے جو دھویں صدی کے وسط میں انفرہ کو فتح کیا تو وسط اناطولیہ میں حلقہ اجمی کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے یہ لوگ اپنی معاشی قوت اور تنظیم کی بنا پر اٹھارہویں صدی تک بااثر رہے۔ بلکہ ان کی تجارتی انجمنیں جنگ عظیم کے آخری ایام تک باقی رہیں۔ اگرچہ مغربی تجارتی طریقوں اور مشین کی بنی ہوئی اشیاء کے رول سے ان کی حالت بہت زیادہ مائل بہ زوال ہو گئی تھی۔ چونکہ حلقہ اجمی کا طویل ترین اور موثر ترین رخ ان کا معاشی

رخ ہے۔ اس لئے ہمیں ان کا سراغ تیرہویں صدی تک جب اجمی اور ارباب فتوت کا آغاز ہوا تھا لگانا چاہئے۔ اجمی کتاب ترکی خیالات کی تاریخ میں ضیاء علمی خیالات کے اس رخ کو تنظیمی تصوف کے نام سے موسوم کرتا ہے معاشی تنظیم کی ابتدا اجمی ایوان سے ہوئی جو ان ہی برادر یوں میں ایک کے رکن تھے اور ان کا پیشہ چڑا رنگنا تھا۔ انھوں نے چڑا رنگنے والوں کی انجمن قائم کی اور خود اس کے پیرو مرشد بن گئے۔ دوسرے پیشہ والوں نے بھی یکے بعد دیگرے ایوان کی انجمن کے نمونہ پر انجمنیں بنانا شروع کیں لیکن عرصہ تمام صدیوں میں چڑا رنگنے والوں کی انجمن کو بہاؤ بزرگی و برتری حاصل رہی۔ یہ انجمنیں تمام اناطولیہ میں پھیلی ہوئی تھیں اور سترہویں صدی میں ان کو لیا سیمین نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیمینول کے پیروں کی تنظیم بھی اسی قاعدے کے ماتحت ہوئی تھی سترہویں صدی تک اجمی ایوان کی کرامات اور خرق عادات کے بہت سے افسانے زبان زد خلایق ہو گئے تھے۔ ان کا مقبرہ اگرچہ حقیقتاً کرشمیر میں تھا لیکن اس کو سیمینول اناطولیہ کے متعدد شہروں نے گئے تھے اور اجمی ایوان سے متعلق طور پر ایک زبردست جاں باز پیر شہید اور اس پیشہ کے تنظیم دینے والے بن چکے تھے اور ان سے انھوں نے مارنے اور دوسری ان صفات کو جن کا اسی ذات میں

ان صوفیوں کے حلقے میں برہنہ کے لوگ شہزادے، سپاہی، تاجروں، سبھی شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ اجمیل کو دیاب فتوت بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے معاشی پہلو پر بحث کرنے سے پہلے جو غالباً اس کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت ہے یہ مناسب ہو گا کہ اس اصطلاح کا مفہوم بتلادیا جائے۔

”فتوت“ کے معنی ہیں اسلامی جذبہ شجاعت و جاں بازی۔ اسکی ابتدا ان عظیم شخصیتوں سے ہوئی ہے جو بعض اہم رسالت میں موجود عقیدہ یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کی عبودیت جمعی حضرت علیؓ کا اقتدار زیادہ تھا۔ اس کا کچھ سبب تو یہ تھا کہ جہاں بازوں کے تمام خراج مثلاً اندھلوں کا مارنا کمزوروں کی حمایت کرنا وغیرہ وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ان کے ساتھ ہی منسوب کئے جاتے تھے اور پھر اس لئے کہ رسول اللہؐ نے ان سے متعلق کہا تھا کہ لا فتی الا علی کا شیخ لا اذ لا لغتک انہی علی کو مقابلہ کا کوئی جاں باز نہیں ہے۔ اور ذوالفقار کے فکر کی کوئی تلوار نہیں ہے۔ بعد اٹکے خلفاء کے زمانے میں فتوت نے عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیں لیکن اناطولیہ میں ان کی شجاعت اور جاں بازی ایک سلسلہ حقیقتاً ہی مشرق قریب کے سلطان جہاں باز صلیبی فوج کے ناسٹوں عیسائی جہاں بازوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ بہت مشہور تھے صلاح الدین ایوبی چڑا شیریں کا فیاض دشمن جس نے مغربی ادب اور خصوصیت کے ساتھ ڈانڈ اسکاٹ کے ”تلسمان“ میں اپنے لئے ایک لازوال نام پیدا کر لیا۔ سب سے ترکوں کے سلطان جہاں بازوں کے لئے ایک نمونہ اور مثال تھا۔ ان لوگوں کا تعلق یا تو کسی نہ کسی زوال پذیر سلجوق ریاست سے ہوتا تھا یا ان جہاں بازوں سے جو ترکوں اور کمانوں اور خصوصیت کے ساتھ عثمانی قبائل کے ساتھ اناطولیہ میں گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کا بانی عثمان خود بھی ایک اجمی تھا اور جب وہ سلطان ہوا تو ایک شہور اجمی ہی نے تلوار کا چھکا اس کی کمر سے باندھا تھا۔ تیرہویں صدی کے تمام تاریخی مواد سے یہ بات ثابت ہے کہ حلقہ اجمی کے فوجی اور جاں باز عنصر کا سلطنت عثمانیہ کے قیام میں بہت بڑا حصہ ہے۔ فوجی خراج کے نظام یعنی عیسائی فوجوں کو فوج میں اجمی کو سنے کے طریقہ سے پہلے ہی چری۔ اجمی اور بیک تاشی ہی ہو کرتے تھے سپاہی اور سوار جہاں بازوں کے ترک زمینداروں پر مشتمل ہونے سے یہ سلسلہ

اجتماع ضروری ہے منسوب کی جانے لگی تھیں۔

چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ کے تعلقات اسی کے حلقوں سے بہت گہرے تھے۔ اودھ ان کے طریقہ زندگی کے متعلق بہت مفصل اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کے دور کے وقت تک ان حلقوں میں محاطی خصوصیت کے ساتھ ساتھ جاں بازی کی خصوصیت بھی پائی جاتی تھیں۔ ان شہروں کے رواج کے مطابق جب کوئی سلطان مذہب متا تھا تو اسی حلقوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ابن بطوطہ کو قول کے مطابق اس کا حکومت کا اقتدار سزا کا حق اور شان و جلوس بادشاہوں سے کم نہیں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اس بات کو بھی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ ہر قسم کے ناجائز مطالبات کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ ابن بطوطہ کو اس قسم کی انجمنیں ہر جگہ شہر و دیہات میں جہاں جہاں ممکن آباد تھے موجود تھیں۔ وہ انجمنیں تمام پیشوں اور حرفوں کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ جوانوں کی انجمنیں کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ معاشی اور جاں بازی کی انجمنوں کے سردار کو اسی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے مشترکہ دستخطیں ہر چیز کو کام اور اجتماعی زندگی کو وہ نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برادریاں گلوں، سوغنم و حزب العمل کی مشترکیت کی ایک نئی مثال تھیں۔

ابن بطوطہ کے بیان کے علاوہ پہلی جی بی جی کی تفسیر میں ان انجمنوں کا ایک نہایت سیر حاصل بیان ملتا ہے۔

ابن بطوطہ کو اسی کے حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔ شہر و ملک میں اسی زمانہ میں اسی زمانہ کے پیروں کو اس سبب سیاحت کی ضیافت کے لئے قہر اندازی کرنا چڑی عید پریم کا دل تھا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں عید گاہ گیا جس طرح سلطان اپنی انور کے ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اسی کے لئے بھی سب سے بڑا کرتے ہیں۔ ہر تجارتی انجمن کا ایک ڈھول بجل۔ اور جہنم ہوتا ہے۔ اور ان میں اپنے پیروں کی خلاہری زینت اور اسلحہ کی نکیس کے لئے باہم مقابلہ ہوتا ہے۔

لکھنؤت نامہ۔ ۱۰۱۔ فتح کتب خانہ سماجی کے حلقوں نے جو تصانیف چھڑی ہیں انہیں لکھتے نامہ کہتے ہیں۔ اس خاص قوت نامہ کا مصنف جو ترکی زبان میں سب سے زیادہ قدیم ہے (ابن بطوطہ سے بھی پہلے صدی پہلے کا کہتا ہے۔) میں اپنی جگہ انہیں پڑھنا سکھانا نہیں جانتا تھا (صوفیہ کا دوسرا کام حفظ)

ان کی زندگی کے مکمل مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انجمنوں کی انجمنیں صحیح معنی میں ایک جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ جمہوریت موجودہ جمہوریت جمہوریت دہلی جس میں دیوبند و اسبقیت اور انفرادی خود غرضی کا دھڑ نظر آتا ہے بلکہ ایک ایسی جمہوریت تھی جس میں قناعت برصغیر تھیں۔ دولت اور جامعیت کی ہیبت کو سب سے زیادہ مقدم سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ اسی کا ایک سخت قانون یہ تھا کہ ان کی انجمن کا برآدی اپنی ذاتی کوشش سے بنا ہو۔ اگر کسی کو اپنے نسب پر تازہ ہو تو وہ اس دوسرے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کا قول تھا: "خواہ انسان سپر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ جوہر ذاتی نہیں رکھتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

ان کے نزدیک سات کا درجہ بہت کم سمجھا جاتا تھا۔ جب کوئی امیدوار کسی انجمن میں شریک ہوتا تھا تو اسے داخلہ کی تقریب کے موقع پر سات قسمیں اس بات کی کھانا پڑتی تھیں کہ وہ سات نیکیوں پر عمل کرے گا اور سات برائیوں سے بچے گا۔ ان کے استعارے میں اسے سات دروازے کھولنا اور سات بند کرنا پڑتے تھے۔

- (۱) بخل کا دروازہ بند کرنا اور سخاوت کا دروازہ کھولنا۔
- (۲) ظلم و جور کا دروازہ بند کرنا اور لطف و کرم کا دروازہ کھولنا۔
- (۳) حب جاہ کا دروازہ بند کرنا اور عقناعت کا دروازہ کھولنا۔
- (۴) عیش کا دروازہ بند کرنا اور زہد و ریاضت کا دروازہ کھولنا۔
- (۵) تالیف کلوب کا دروازہ بند کرنا اور عدل کا دروازہ کھولنا۔
- (۶) شہرہ و دنیا کا دروازہ بند کرنا اور علم و حکمت کا دروازہ کھولنا۔

(۷) بھوٹ کا دروازہ بند کرنا اور سچ کا دروازہ کھولنا۔

جو لوگ اسی کے حلقے میں شامل نہیں کئے جاتے تھے اسی فہرست حسب ذیل تھی۔

(بقیتہ کا لکھنا) لیکن میں نے دیکھا کہ اسی کی انجمنیں کابل ہو جی جباری ہیں اور انجمنیں رہنما کی ضرورت ہے۔ ساتھ قاضی نے قرآن میں کہا ہے: "وہا ارسلا بر رسول الا بالنساک" تو میں نے جتنے رسول جیسے وہ سب اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے میں نے انہیں ان فوٹ کو ان کی زبان میں تسلیم دینی چاہی میں نے چڑھنا سکھایا کہ ان کی کتاب میں پڑھیں اور ان کی کتاب سکھایا۔

خطاب دے دیا جاتا تھا اور دستاویز فیصلیت ہانڈھ دی جاتی تھی۔ اس کی مجلس کے بزرگ اس کے لئے آنا سنا یہ فراہم کر دیتے تھے جو ذاتی طور پر کام شروع کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ درجہ بدرجہ ترقی کی ہر منزل پر ایک مذہبی تقریب منائی جاتی تھی۔

ہر مجلس کی جماعت عالم کی صدارت تاجروں کا سردار اضافہ باشی کرتا تھا۔ سرف چڑا رنگے والوں کی مجلس کے سردار کو اچی بابا دھوپ کا باب کہہ جاتا تھا۔ اس کا حلقہ ماقبہ چڑا رنگے والوں تک محدود نہ ہوتا تھا بلکہ وہ مجلسوں میں جتنے اختلافات ہوتے تھے۔ ان میں حکم کے فیاض انجام دیتا تھا اس کا تول تمام مجلسوں کے لئے قانون کا مرتبہ رکھتا تھا وہ عموماً ان استادوں میں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ جن کے سامنے تین استادوں کی دستاویز کی رسم ادا ہو چکی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی پاکبازی۔ و جاہت اور نیکی کی تمام مجلسیں معترف ہو بروہ ہفتہ کے بعد مجلس جمع ہوتی تھی ہر مجلس آزادی سے اپنے معاشی بیت المال کی قوم اور قبوہ کے مشترکہ ذخیرہ کو خرچ کر سکتی تھی۔ ہر جلسہ میں معاملات و مسائل کے متعلق فیصلے کئے جاتے تھے جن میں سزا کے فیصلے بھی شامل ہوتے تھے مجلس کو چونکہ اپنے کام کی اعلیٰ ذمیت کا بہت پاس تھا اس لئے ہر ایسے کاریگر کو سزا دی جاتی تھی جو پیدائش اشیاء کے نیا کوپت کرتا تھا اس کی دکان عارضی طور پر بند کر دی جاتی تھی۔ اور اس کا خراب کام اس کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا اور وہ مجلس کی کفایت سے بھی خارج کر دیا جاتا تھا۔ تراہیزانہ میں اس تعزیری کا دوا کو ان روز یعنی برادری سے خارج کے نام سے موسوم کرتے تھے

مجلس سال میں ایک مرتبہ کسی مقام پر ایک عام جلسہ کا بھی اظہار کرتی تھی جو تقریبی جلسہ (کفرج) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس میں تمام اختلافات و دستانہ طریقہ پر طے کر دئے جاتے تھے۔

شین کی بنی ہوئی اشیاء کے سیلاب نے ترکی بلادوں پر قبضہ کر لیا اور ترکی حکومت نے تمام معاشی اداروں کو اپنی نگرانی میں لینے کا ارادہ کر لیا اور دستی صنعتیں ختم ہو گئیں تو ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے بعد ان مجلسوں میں سے جو مجلسیں آغوی سانس توڑ پڑی تھیں وہ بھی ختم ہو گئیں +

دور مع کو غیر موثر بنی۔ بھاٹ۔ بولج۔ قصائی پھیل اور زوروا ہر مجلس کی مجلس عالم کے سات ارکان ہوتے تھے۔ اور ان کے کامداری میں جمہوریت اور مساوات کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اوصاف کی بنیاد پر نون مراتب بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا اور درجہ بدرجہ حق حکومت تسلیم کیا جاتا تھا۔

ان مجلسوں میں جو نام رائج تھے وہ تجارت اور تزیین کی اصطلاحوں میں داخل ہو گئے تھے جو جنگ بانی میں۔ گھارڈیو سیک کا قول ہے کہ ان برادریوں کی بنیاد کاریگریدوں پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ان کا سیاسی اقتدار عثمانی سلطنت کے قیام کے بعد کم ہو گیا تھا لیکن صنعت کی مجلسوں کی حیثیت سے انھوں نے اپنی اہمیت اور شغل کو باقی رکھا تھا۔

مجلس کا پہلا درجہ امیدوار کا ہوتا تھا۔ ایک نوجوان یا تو فوجی مجلس میں شریک ہوتا تھا یا اس کے والدین امیدوار کی حیثیت سے اس کا داخلہ کراتے تھے۔ ایک ہزار ایک دن تک اسے کسی استاد کے ماتحت تربیت حاصل کرنا پڑتی تھی جس کے بعد اس کی امیدواری کا زمانہ ختم ہو جاتا تھا۔

اسی اثناء میں اس کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم (دینیہ و ملی مرکز) میں دو اطوار طریقت دیول (کروٹی) اور ایک پدر طریقت دیول (تاسی) کی نگرانی میں ہوتی رہتی تھی۔ امیدوار کو مزدوری نہیں ملتی تھی لیکن اس کا استاد اسے وظیفہ دیتا تھا۔ جسے وہ اس دعوت کے لئے جمع کرتا رہتا تھا جس میں اس کا درجہ بڑھا کر استاد کر دیا جاتا تھا۔

امیدواری کا زمانہ ختم کرنے کے بعد اسے چھ مہینہ تک تربیت طریقت جس کا نام کلفہ تھا کے درجے میں رہنا پڑتا تھا۔ بزرگوں کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے اسے کوئی خاص کام کرنا پڑتا تھا۔ اگر پیشہ کی اہلیت کے اس امتحان کا نتیجہ منفی نکلتا تھا تو اسے استاد کا

"LES SERVICES DE L'ORDRE D'ANIL  
EN TURQUIE" BULLE GORDLEVSKI  
EVRAH ET LES CORPS DE METIER  
DES SCIENCES DE L'O.U.R S.S. 1927 P 1172

TIN DE L'ACADEMIE

# غزل

(عزیز صدیقی رام پوری)

یاد آیا ہے کہ جب میں شاد تھا آباد تھا  
 فکیر دنیا تھی نہ کچھ غیبے کا تھا مجھ کو خیال  
 عیش کے دن تھے خوشی تھی جمع احباب تھا  
 دل نے مجھے ہی نہ تھے کچھ سستی شامِ ذرا  
 قصہ آوار خانِ عشق جب سنتا کہیں  
 اب دہی میں ہوں کہ سن کا دور سے سمور ہوں  
 وہ زمانہ عیش کا جب یاد آتا ہے مجھے  
 اب تو ہر دم پر گھڑی رونے سے مجھ کو کام ہے  
 یہ عنایتِ دل کی ہے۔ اور یہ کرم آنکھوں کا آہ  
 کاشش پر ہے ہی میں رہ جاتا وہ رے رے جیں  
 جس نے مجھ کو کہہ دیا یوں مبتلا ہے سو غم  
 میں تو جتنا تھا مجھی تو رسم بھی آجائے گا  
 بس اتنی ایسہ پر قائم تھی اپنی زندگی  
 معائے دل جو کچھ نکلا تھا با صد اضطراب  
 بدقول تھے رہی پھر رسم تحریر و پیام  
 مدعا اکثر دل کا تھا دکھ کا کہتا تھا یہ میں  
 تم نے اکثر آکے خود مٹا دیے احساں کیا  
 آسمان پر یہ کہ یہ رنگ جب بھایا نہیں  
 میں نے فرقت میں تمہاری جس قدر جھیلے سم  
 الغرض مر مر کے کاٹا وہ زمانہ ہجر کا  
 لیکن اب پہلی ہی شانِ لطفِ فریادی نہ تھی  
 غیر کی جھوٹی محبت پر ملاں آیا نہیں  
 ایک بیک نادانقتِ بیچارہ ہجران ہو نہیں  
 دل کو کیا کہہ سنبھالوں ہجر کی راتوں میں اب  
 اب نہ جینے کی خوشی ہے اور نہ مرنے کا ہے غم

آفتِ قیدِ غمِ الفت سے دل آزاد تھا  
 ناشناس میں درد تھا ناواقفِ رنج و ملال  
 چاندنی راتیں تھیں فرشتے گل تھا لطفِ خواب کا  
 آنکھ تھی نا آشنا سے ہر دہشِ جامِ نسوان  
 عقل کی کوتاہیاں ہوتی تھیں دل میں جاگزیں  
 ہوسش سے بے گانہ ہوں پیشِ طربِ سرور ہوں  
 ابر پاراں کی طرح پہروں تر لاتا ہے مجھے  
 آنکھ میں آنسو ہیں اور لب پر نکھار نام ہے  
 مل کے ان دونوں نے مجھ کو کہہ دیا بغیر تباہ  
 کاشش وہ آوازِ خوش کا دل تک آتی ہی نہیں  
 جس نے مجھ کو کہہ دیا یوں پیکرِ رنج و الم  
 خود نہ آئیں گی تو مجھ کو ہی بلایا جائے گا  
 کیا جرمی زندگی سے ہو گی یوں شرمندگی  
 مہربانی سے دیا تھا تم نے تسکین وہ جواب  
 اور اکثر شربت دیدار کے بھی پائے جام  
 اور تمہاری صحبتوں میں بیٹھ کر رہتا تھا میں  
 حالِ دردِ دل سنا اور دعا دریاں کیا  
 کچھ دنوں کے واسطے مجھ سے جدا تم ہو نہیں  
 ہو نہیں سکتے ہیں وہ کاغذ کے پر نہ بے رقم  
 جب تم آئیں شربت دیدارِ نازِ زیبا ملا  
 مرے دل میں وہ تھا۔ تم میں مسیحا ہی نہ تھی  
 کچھ نہ ایسے مرے واسے کا خیال آیا نہیں  
 اور پھر تم زینتِ بزمِ رقیبیاں ہو نہیں  
 جی اگر مجھ سے تو بہلاؤں کن باتوں میں اب  
 قابلِ قدر یہ ہوں مرجاتا در نہ تمہارے غم

مجھ پہ صداوت ہے یہ قولِ بیدل شیریں سخن  
 شاد و بایر زینتِ نا مشا و بایر زینتِ سخن

خاص برائے عالمگیر

# گناہِ محبت

ہر شخص اس امر کا متقی تھا کہ وہ اپنا تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ صرف کرے۔  
خود نواب صاحب کی یہ حالت تھی کہ بغیر سعید کے مشورہ کے کوئی کام نہیں  
کرتے تھے۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھا جن سیرت کے ساتھ ساتھ قدرت  
کے فیاض ہاتھوں نے اسے جن صورت بھی عطا فرمایا تھا۔ جو اسے دیکھتا  
اس سے ہم کلام ہونے کو اپنا فخر سمجھتا تھا۔ رشید بھی اس پر حد درجہ مہربان  
تھی۔ اس کی عنایتوں اور مہربانیوں کو لوگ ٹٹلگوں نگاہوں سے دیکھتے۔ اگر  
سعید کا چال چلن انھیں اس بات کی اجازت دیتا! اگر سعید تھوڑی دیر  
کے لئے بھی اس سے علیحدہ ہوتا تو یہ لمحات رشید کے لئے دیسے ہی ہوتے  
جیسے قفسِ نصیبِ نبیل کے لئے سویم بہار۔ اس کی تمام رنگینیاں اور سرخابیاں  
اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی تھیں اور وہ اکی صورت سے سعید کی منتظر  
ہوتی جیسے ایک مٹکا ماندہ مسافر شام کی آمد کا انتظار کرے۔  
وہ اخبار عشق کے ہر طریقہ کو اختیار کرتی کسی اس کے چہرے پر لچائی ہوئی شگاف  
ڈالتی۔ کسی اس صورت سے اس کو کھیتی جیسے ایک بھکاری۔ ایک بی جس  
دو ٹمنہ کو اپنی التجا کے بعد دیکھتا ہے۔ اس بھرتی۔ پھر فوراً آئینہ کے روبرو  
کھڑی ہو کر اپنے جذبات کا جائزہ لیتی۔ پھر بجا رہی کچھ ٹنگنہ لگتی۔  
سعید پران باقول کا اثر نہ ہوتا اور وہ طلق نہ سمجھ سکتا کہ رشید  
کا ان حرکتوں سے کیا مطلب ہے۔ آخر تنگ اگر ایک دن رشید نے پوچھا  
کہ وہ اپنی شادی کیوں نہیں کرتا جس کا جواب سعید نے یہ دیا کہ وہ ایک  
محمولی آدمی تھا۔ اس کی التجائیں فیض کی صدائے گدگدائی جانیں گی ان کا  
مٹکا اڑایا جائے گا۔ اس کا دل بے حد تنگ تھا۔ اگر اس کی التجا  
ٹھکرا دی جائے۔ اس کا شیشہ دل چور چور ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے  
طے کر لیا تھا کہ وہ کسی شادی کی درخواست پیش نہ کرے گا۔

(۱)  
رشیدہ۔ نواب غصہ کی پہلی بی بی تھی۔ دنیا کا سرگرم اور پیش  
پا پیش تھا۔ نواب صاحب کو دن رات یہی فکر تھا کہ وہ رشیدہ کے چہرہ کو  
بیشائش دیکھیں۔ جب رشیدہ کے ہنرٹوں پر وہ بسمِ رضاں پاتے سرت  
در زندگی کی ایک تازہ روح ان کے جسم میں دوڑ جاتی محبت نے نواب  
صاحب کو اس درجہ وارفتہ کر دیا تھا کہ ان کی نگاہ اس کے کسی عیب پر  
پڑتی ہی نہ تھی۔ اس کی پر فریب باتوں کو وہ معصوم زشتوں کا پریم گیت سمجھتے  
تھے۔ ان کے دل میں سوائے محبت کسی اور جذبہ کی گنجائش نہ تھی۔ ان کی  
محبت ہر دم اس کے قدموں پر چھکی ہوئی خراجِ عقیدت و خلوص پیش کیا  
کرتی تھی لیکن رشیدہ صرف اس محبت کی قائل تھی جو اس کے جذبات کو  
بیدار رکھے۔ اس کی لغت میں محبت نام تھا اس کھلنے کا جس سوزہ تھوڑی دیر  
کھیلے اور اس کے بعد اس وقت تک کے لئے اسے بھول جاؤ جب تک  
اس کا شوق پھر اس کے دل میں چپکیاں نہ لے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ بھونہ  
بھول پر صرف اس وقت تک بیٹھتا ہے۔ جب تک اس میں دس ریتا ہے  
اسی بنا پر بلبل کے عشق پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ اس کا عشق لادِ صحرائی  
نہ تھا جس کو ختم پاشی سے علاوہ ہو جس کی گھبراہٹ باغبانِ قدرت کرے  
اور جو خود ہی پردانِ چڑھے بلکہ وہ اس پودے کے مانند تھا جو مچھ گستاں میں  
پنے پھل پھول اور آب و رنگ کی بنا پر رنگایا جائے۔

(۲)

سعید۔ نواب صاحب کے یہاں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ انکی  
پرورش نواب صاحب کے یہاں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس کو  
بہت عزیز رکھتے تھے ہر شخص کے دل میں وہ اپنے برتاؤ سے جگہ کر لیتا تھا



رشیدہ: "فرض کرو کہ قسمت تمہاری یہ دہری کسے۔ اور میں خود  
بغیر نفیس تم سے درخواست کروں۔۔۔۔۔" ۹  
سعیدہ: "سرکار کا ایک اوسنے غلام۔۔۔۔۔"  
رشیدہ نے اپنے تمام وار خانی جاتے دیکھ کر کہا: "گستاخ مکینہ  
بے وقوف۔ مجھ سے یہ التجا کس نے کی تھی؟ ۹۔۔۔۔۔ خیر

(۳)

نواب: "میرے دل کی آرام۔ تم رنجیدہ کیوں ہو؟  
رشیدہ: "جیلے کو اور جلائے سے فائدہ ۹!  
نواب: "یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا دل میری موت کا دوسرا نام  
ہے۔ شاید میری موت تمہارے دل کا بھیس بدل کر میرے سامنے آئی  
ہے۔"

رشیدہ: "میرے پیارے کم از کم یوں نہیں نہیں کر سکتے زخموں پر  
نمک پاشی نہ کرو۔ ایک بخیلہ دل یہ طنز نہ برداشت کرسکے گا۔۔۔۔۔"  
نواب: "خدا را مجھے کچھ بتا دیجئیں کیا ہو گیا۔ تم ایسے کلمے زبان  
پر نہ لاؤ۔ اپنے رنج کا اظہار کرو۔"

رشیدہ: "کی ان آنکھوں میں جن میں ہمیشہ شراب سرت چھلکا کرتی تھی  
آنسو بھرائے۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا: "میری زندگی ختم  
ہو رہی ہے۔ الٹی تو مجھے اس دن کے لئے زندہ نہ رکھ کر میرے نواب کی  
میری وجہ سے رسوائی ہو۔۔۔۔۔"

نواب: "رشیدہ۔ پیاری رشیدہ۔ صاف صاف بیان کرو۔ خدا  
کے لئے تجھیں اپنی محبت کی قسم میرے اضطراب کو سکون سے بدل دو۔"  
رشیدہ: "تجھیں تعجب ہو گا۔ بیبیوں سے سعیدہ مجھ سے اظہار محبت کر رہا  
ہے۔ میں اسے ٹھکراتی رہی اور محض اس خیال سے تم سے نہ کہہ سکی کہ تم  
مجھے جھوٹی گھوڑا۔ اب پیمانہ صبر میرا بڑھ چکا ہے۔ میں تمہاری محبت میں کسی  
غیر شریک نہیں کر سکتی اور اپنی جان دے دوں گی۔۔۔۔۔"

نواب عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ اگر وہ رشیدہ کا پرستار تھا تو سعیدہ  
کا بھی شیدائی تھا۔ آج تک سعیدہ نے اسے بدگمان ہونے کا کوئی موقع نہ  
دیا تھا۔ وہ انتہائی رنج و غصہ کی حالت میں اپنی نشستگاہ میں کر بیٹھ گیا۔  
اور سعیدہ سے ایسی باتیں کرنے لگا جن کی اسے بھی توقع ہی نہ ہوتی تھی۔

آخر کار سعیدہ نے اپنی معصومیت کے بھروسہ پر التجا کی کہ کم از کم  
یہ تو معلوم ہو جائے کہ اس کو مجرم بنانے والی ہستی کون ہے؟  
نواب: "کیا تو مجھے اب بھی زہیم میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے؟  
گستاخ! اگر رشیدہ نے تیرے واقعات مجھ سے نہ بیان کئے ہوتے کہ  
تو نے اس سے اظہار محبت کی کس طرح جرات کی تو میں کبھی بار نہیں کر سکتا تھا  
سعیدہ: "سرکار یکم صاحبہ جو فرمائیں بجا و درست ہے لیکن خطا سنا  
کیا مشن بھی چھپائے چھپ سکتا ہے؟  
نواب کا فتنہ ہر بانی سے بدل گیا۔ اس نے رشیدہ کو غلط  
کا شکرا کچھ کر سعیدہ کو معاف کر دیا۔

(۴)

رشیدہ: "آخر تم اس جادوگر کی باتوں میں آگئے۔ رشیدہ کو تم نے  
ذلت دی اور اس کی عزت افزائی کی!!"

نواب: "تم کیا کہتی ہو۔ تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیا تم اس کا  
کوئی ثبوت پیش کر سکتی ہو کہ میں فرشتہ کو شیطان سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں  
رشیدہ: "ثبوت۔ اور مجھ سے۔ ایک اوسنے غلام کے مقابل میں  
خیر۔ یہ میری قسمت ہے۔ کیا اس کی جوانی اور پاک بازی اس کا ثبوت نہیں کیا  
شادی سے بار بار اس کا انکار کرنا اس کی دلیل نہیں کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار  
ہے۔ تم اس سے دریافت کرو کہ وہ کسی پر زلفیتہ ہے یا نہیں۔"

نواب نے سعیدہ کو فوراً غلیب میں طلب کیا۔ اور اس سے پوچھا کہ وہ دنیا  
میں کسی سے محبت کرتا ہے۔

سعیدہ: "عالیجاہ میں محبت کرتا ہوں لیکن۔۔۔۔۔"

نواب: "کس سے؟"

سعیدہ: "سرکار ہمارا معابد ہے کہ اگر میں راز فاش کروں تو وہ  
مجھ سے عمر بھر کے لئے علیل ہو جائے۔ اور اگر وہ راز فاش کرے تو یہی حق  
مجھے حاصل ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر حضور اس کا نام نہ دریافت فرمائیں تو  
زیادہ مناسب ہے۔"

رشیدہ نے نواب کو سعیدہ سے بیزاد کرنے کی ہر گز کوشش کی۔  
آخر نواب پر اس کی نگاہ ناز نے ایسا انسو کیا کہ وہ سعیدہ سے یوں غافل  
ہوا۔



(۵)

یوں تو ہمارے نواب صاحب کے یہاں روزی پہل پہل  
رہتی تھی لیکن آج جن سال گرہ کی وجہ سے محل کے ذرہ ذرہ سے عشرت  
ٹپک رہی تھی۔ وہ شیزہ لڑکیاں جام بدست دینا بدخل شراب اطروانی  
کے ساتھ ساتھ صہبائے بوانی چھلکا کی پھر رہی تھیں نظرت کی تہواری  
کے قائل اس کی زنگاری کے قائل ہو رہے تھے۔

رشیدہ۔ زنگس کو اپنے ساتھ لئے ہوئے رقص و سرود سے  
لطف حاصل کر رہی تھی۔ اس نظر نے نہ جانے اس کے دل میں کیسی  
چٹکیاں لیں کہ وہ زنگس سے یوں ہم کلام ہوئی۔

رشیدہ۔ میری پیاری بیٹی تیرا سنا زندگی محتاج عنوان ہے  
تو نے ابھی سترہ بہاریں دیکھی ہیں۔

زنگس۔ پیچی پیچی !!

رشیدہ۔ سننے کے لئے پروانہ گل کے لئے میل قبر کے لئے  
چکودہ۔ عرض حسن کا ایک شیدائی ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تیرا  
حسن محتاج ہو۔ پرستار کا۔ نامکن۔

زنگس۔ پیچی مجھے معاف فرماتے۔ مرحوم کی وفات کے .....  
رشیدہ۔ بے وقوف زنگس اپنی پرغما رنگیں کھول عشق۔ اور

مازداری۔ کیا کوئی کتا اس قدر ہنڈ بنا یا جاسکتا  
ہے کہ اس کی آواز نہ سنی جاسکے۔

پیٹنر غضبناک آندھی کا وہ جھونکا تھا جس نے زنگس کو کھلا دیا۔  
سعد نے اپنے الفاظ کا پاس نہیں کیا۔ کیا رشیدہ کی محبت نے  
اسے مجبور کر دیا تھا۔ آہ۔

وہ کمرے سے انتہائی اضطراب کی حالت میں باغیچہ کی جانب  
ردانہ ہو گئی۔ ایک خادمہ نے جب اسے اپنے دل سے ہم کلام پایا تو وہ  
دیں چھپ کر سننے لگی۔

زنگس۔ آہ۔ میں نے ابھی کیا سنا ہے  
محبت کا یہی صلہ تھا۔ اے میرے دل کیا تو نے ایسا خطرناک انتخاب کیا  
تھا؟ اے میرے بے زبان رازدار (کتا) تو نے میرے راز کو اپنی دل  
کی گہرائیوں میں دفن رکھا لیکن آہ مرو نے جس کے پیلوں درجہ کا دل تھا

کیا تم کام اس وجہ سے نہیں بتانا چاہتے کہ تم خود اقرار ہی ملزم  
ہو جاؤ گے؟

سعدیہ۔ یہ الزام میں نہ برداشت کر سکوں گا۔ میں نے ہمیشہ  
وفاداری کے دائرہ سے اپنے قدم باہر نہیں نکالے۔ میں نام بتاتا ہوں  
لیکن مجھے پرتنا رحم فرمائے محاکا سے دوسرے سے نہ کہئے گا میں صرف  
آپ کے اطمینان کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ آپ کی بھتیجی زنگس کو بیوہ ہو  
چکا رسال کا زمانہ گزرا۔ میری منہی حالت شادی میں مل نہ سکی۔ اس وجہ  
بہم نے عہد کیا کہ ہم غنیہ ملاقات پر قناعت کریں گے۔

نواب۔ تم جھوٹ کہتے ہو تمہاری رسائی وہاں کس طرح ہوتی ہے  
تم اس سے اتنی آزدی سے کیسے مل سکتے ہو۔

سعدیہ۔ سرکار جب میں زنگس سے شخصیت ہوتا ہوں تو دوسری  
ملاقات کا دن مقرر کر لیتا ہوں اور تا وقتیکہ زنگس کا کتا پائیں باغ میں  
پہنچ کر مجھے اس کی اطلاع نہ دے کہ لوگ اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئے  
میں وہیں چھپا رہتا ہوں۔ آج بھی مجھے زنگس سے ملنا ہے۔

نواب۔ میں مجھم خود دیکھنا چاہتا ہوں۔ پائیں باغ سے  
میں واپس آ جاؤں گا۔

پائیں باغ میں پہنچ کر نواب نے وہی دیکھا جو اس سے محبوبہ  
نے بیان کیا تھا۔ اس نے دو مصیبتوں کی محبت میں رخنہ اندازی پسند نہ کی  
اور وہ چپکا واپس چلا آیا۔

رشیدہ۔ اب تک میں سمجھ رہی تھی کہ میں اور تم ایک دل ایک  
روح اور ایک ہی جسم کے مالک ہیں لیکن تم اس کا ثبوت پیش کر رہے ہو کہ  
تم مجھے اپنی ہی سمجھتے ہو۔ آہ۔

لگاتار اس راز سے مجھے واقف کرتے تو تم کو یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ  
تم نے اپنے دل میں اس کا اعادہ کر لیا ہے۔ اب مجھے اس وقت کی  
آرزو ہے جب میری موت ہمیشہ کے لئے مجھے تم سے علیحدہ کر دے۔  
نواب۔ میری غیر مجھے ملامت کرتا ہے لیکن محبت مجبور کرتی ہے  
یہ سمجھو کہ اگر تم نے اپنی زبان سے ان الفاظ کو نکالا تو میں تمہارا  
قائل بھی ہوں گا۔



# ہائے جوانی

(از حضرت دعاؤ بانوی)

لطف دیتی تھی بدگسائی بھی      دل ربائی تھی جانستائی بھی  
 تھی عجب عشق کی کہانی بھی      خوب کشتی تھی زندگانی بھی  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 دل لگانے میں لطف آتا تھا      آنے جانے میں لطف آتا تھا  
 ہر فسانے میں لطف آتا تھا      غم اٹھانے میں لطف آتا تھا  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 ہر گھڑی شیش ہر گھڑی آرام      نہ خیال سحر نہ فکرِ شام  
 تھا فقط ہم کو اپنے کام سو کام      کچھ سمجھتے نہ تھے حلال و حرام  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 نہ کوئی فکر تھی نہ کچھ کھٹکا      جی میں جو آیا کام کر ڈالا  
 کس قدر دل میں جوش بہتا تھا      کچھ عجب رنگ تھا طبیعت کا  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 کوئے جاناں کے رات دن چکر      دل پہ ہوتا نہ تھا کسی کا اثر  
 بس وہی اک خیال آٹھ پہر      کہدیا جس نے کر لیا بار  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 رات دن دلہی وفا کوئی      چشم جاہل سے غفلت منوشی  
 وہ طبیعت کی اپنے سر جوئی      بے خودی اور خود فراموشی

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 وہ متنادہ جوش کا عالم      عالم و تاؤ نوش کا عالم  
 نالہ ہائے خوش کا عالم      بہشش میں بھی ہوش کا عالم  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 وہ محبت میں مشغول دل کے      کارنامے وہ من چلے دل کے  
 وہ نئے روز جو صلیے دل کے      وہ انگلیں وہ دلوں کے دل کے  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 بیٹھے اٹھتے ذکر الفت کا      سر میں ہر وقت عشق کا سودا  
 وہ بھی واللہ وقت تھا کیسا      جو میں خاص لطف آتا تھا  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 وہ مجھے دوستوں کا سمجھانا      وہ مرے دھیان میں نہ کچھ مانا  
 کوئے جاناں میں ہر گھڑی جانا      سختیاں سہ کے بھی نہ گھبرانہ  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی  
 وہ دعا ہر گھڑی الم بہنا      وہ کسی سے نہ راز دل کہنا  
 اشک آنکھوں سے متصل بہنا      رنج و غم بہنا اور خوش رہنا  
 ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

# افلاطون کی جمہوریت کا ایک باب

(از جناب مولانا خلیل - بی اے)

”ہرگز نہیں۔ تم سے باتیں کر کے مجھے بہت مسرت حاصل ہوئی۔“  
”بہت اچھا! میری عمر سیدہ انسانوں سے باتیں کرنے میں خاص طور پر  
لیتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نئی باتیں سیکھ رہا  
ہوں اور اس خازنِ رازِ روادی کے متعلق جس میں سے وہ گزر چکے ہیں۔ مجھے  
تحقیق و تدقیق کا موقع ملتا ہے۔ اور یقیناً تم سے میں بہت کچھ حاصل کر سکیں گا  
کیونکہ اس وقت تم بقول شخصے بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ہو۔ میں جانتا ہوں  
ہوں کہ بڑھاپے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا یہ ساری عمر کا دردناک  
اور غم انگیز حصہ ہے؟“

”سقراط! میں بلا کم و کاست اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ ہم بڑے  
ایک مجلس میں اکٹھے ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ اور جب ہم اکٹھے ہوتے ہیں تو ہمیشہ  
اپنی جوانی کے عشرتِ ناک لمحوں کو یاد کر کے بڑھاپے کو کوہنہ میں جب شباب کی  
مسرت انگیز گھڑیاں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں تو ہم جھنجھلا کر چیخ  
اٹھتے ہیں گویا ہماری زندگی کی غفلت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ اس وقت  
ہم کہتے ہیں کہ جو انی کے دن کیا خوب تھے! ہم اس وقت صحیح معنوں میں  
زندہ تھے اور اب تو مر دوں سے بھی بدتر ہیں۔ لیکن سقراط! افسوس ہے کہ یہ  
لوگ صحیح سار کو نہیں پاسکتے۔ بڑھاپے کو قطعاً نہ کرنا دشمنی نہیں۔ چونکہ  
حقیقت مجھ پر بے نقاب ہے اس لئے بڑھاپے کے قصور سے مجھے کبھی کوئی  
نہیں چوٹی۔“

”سو کس شاعر سے کسی نے پوچھا تھا۔“

”کونجی! اس بڑھاپے میں کیا حال ہے؟ وہ محبت کے نغمے اور شباب کی  
رنگینیاں یاد آتی ہوں گی؟“ اس نے کیا اچھا جواب دیا تھا۔

”میں ان رنگینوں سے دور رہ کر نہایت سرور ہوں۔ مجھے ایسا  
معلوم ہوتا ہے گویا میں نے ایک جابر اور وحشی آقا سے نجات حاصل کر لی ہے۔“

(افلاطون کی شہرہ آفاق کتاب جمہوریت اپنی نوعیت کے اعتبار سے)

ایک غیر فانی شاہکار ہے۔ یہ کتاب ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو چکی ہے۔ اردو زبان کا  
عظیم ترین مفکر کے جمہوریت پسند جذبات سے ہنوز تشنه ہے۔ تاریخین کی فیاضیت  
بلین کے لئے اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ غریب یہ کتاب  
اردو کا بامہر بہن کر دینا ہے ادب میں ایک انقلاب برپا کرے گی۔ خلیل  
کل میں اس طرح کی بیٹے غلاموں کے ہمراہ پریم میں دیوی کے حضور میں عقیدت  
پھول پڑھانے کے لئے گیا۔ نیز یہ خواہش بھی تھی کہ مکینوں کو اس تموار کو کسلج  
سمائیں گے۔ کیونکہ یہ سب سے پہلا تموار تھا۔ میرے ہوطنوں کے جلوس کی قطاریں  
نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھیں اور دیگر یونانیوں کے پرے بھی نہایت دلکش تھے  
اظہارِ حقیقت اور تموار کا منظر دیکھنے کے بعد ہم لوگ واپس شہر کی  
طرف جارہے تھے۔ کہ صفائے کے بیٹے پول مارکس نے ہم کو دور سے واپس جانے  
بوسے دیکھا تو اس نے ہمارے پیچھے اپنا غلام دوڑایا۔ غلام نے میرے پیچھے کا  
دامن تھام کر کہا کہ پول مارکس ہم لوگوں سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے ٹرلو دیکھا  
اور اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے

”جناب! وہ ابھی آیا جا رہے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔“

”بہت اچھا۔“ غلام نے کہا۔

اتنے میں مارکس بھی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ غلام سوکا بھائی ندی منڈو  
بھی تھا۔ پیچھے سے نسرطاس اور دیگر رفقا بھی آگئے۔

پول مارکس نے کہا۔ ”سقراط! این معلوم ہوتا ہے۔ گویا تم واپس

جارہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”تمہارا قیاس ٹھیک ہے۔“

”ہم تمہیں نہ جانے دیں گے۔ مگر تم ہم سب سے طاقتور ہو تو جاسکو گے۔“

”کیا اچھا ہوتا اگر آپ مجھے جانے دیتے۔“



# طوفانِ نوح

ناخداے سخن تاج الشعر افسیح العصر حضرت نوح ناری

بطور یادگار زہدے خانے میں رکھ دینا      مری لٹٹی ہوئی توبہ کو پیانے میں رکھ دینا  
 کہا تھا کہ دل کج فہم و نادان تجھ سے یہ کس نے      خدا خانے کی حرمت کو صنم خانے میں رکھ دینا  
 پسند آئے نہ آئے منحصر ہے یہ طبیعت پر      کسی کے سامنے دل ہم کو نذرانے میں رکھ دینا  
 مے تار یک دل کو داغِ الفت کی ضرورت ہے      یہ چلتی شمع لا کر تم سیہ خانے میں رکھ دینا  
 دوبارہ پھر کسی دن مجھے کام آئے گی اس ساقی      جو مے پینے سے بچ جائے وہ پیانے میں رکھ دینا  
 کہیں آئیں کہیں جائیں کہیں اٹھیں کہیں بیٹھیں      قدم ہر پھر کر اپنا ہم کو بت خانے میں رکھ دینا  
 چراغِ انجمن اپنی ضیا پھیلانے والا ہے      اٹھا کر شعلہٴ الفت کو پروانے میں رکھ دینا  
 کہاں ہم ڈھونڈتے تھے تجھ کو پھر گئے اس گٹھ ساقی      صبح کی کیلئے تھوڑی سی پیانے میں رکھ دینا  
 حفاظت ہو اگر منظورے اہل جنوں اس کی      خزانہ درد و غم کا دل کے ویرانے میں رکھ دینا  
 ہمارے دل کی رونق جلوہ رخ سے سوا ہوگی      یہ آئینہ بھی تم اس آئینہ خانے میں رکھ دینا

خطائے عشق پر کیوں نوح اپنی جان کھو بیٹھے

رقم اتنی بڑی اور اس کو جرمانے میں رکھ دینا

# پریا پاپ

(از قلم - آسی رام نگر سی)

آسائش کے یہ سامان کہاں سے لاتی ہو شہود اربیل - قیمتی مابین - قد آدم ٹہنہ  
نیل - کہریاں - غریب کہاں سے پاتی؟  
قسمت کی بات نازوں میں ملی - اور لاڈلہ بیاریں پروان چڑھی لاڈلی  
غریب گھر میں جانا تھا - اس کی دو بیوہ بہنوں کی شادی دو ان پڑھ و فتنہ  
سے ہوئی تھی - یہی وجہ تھی کہ لاڈلی کی ماں نے اسے رہتی زندگی تک سماگن بنی  
رہنے کے لئے غریب ہی سے بیاہنا طے کر لیا تھا -

لاڈلی کی بوڑھی ساس اس امید میں تھی کہ بھو آئی ہے - اب اسے کچھ  
آرام ملے گا - کبھی سر میں تیل ڈال دے گی - کبھی پیرو بادے گی - سب سے بڑی  
بات تو یہ کہ اب اسے رسوئی گھر میں جلد اندر پڑے گا -  
لیکن جب اس نے بھوکا یہ رنگ دیکھا کہ اس کی خدمت تو کونسی  
رہی - ملے اس کے - اور یہ حکومت جبار ہی ہے تو بہت جھڈائی -

شادی کے تین مہینے بعد -

"مجھے سیکے جانے دیں"

"کیوں جان کعباتی ہو؟ سیکے سیکے کی رٹ بگاڑ رہی ہے - یہاں تو تمہارا  
دل ہی نہیں لگتا - اجتو اسی کو تمہیں اپنا گھر سمجھنا چاہئے - میں مانتا ہوں کہ یہاں  
تمہیں اپنے گھر کی سائیکہ نہیں ملے - ہاں ہے - لیکن اس سے تمہیں دکھی نہ ہونا چاہیو  
کچھ دنوں تک اور صبر کرو - میں ایک دم نکلا ہی نہیں ہوں - قسمت کی بات  
ہے - ورنہ اچھے دن بھی ....."

میں فضول باتیں سننا پسند نہیں کرتی - مجھے سیدھے سے رخصت کر دیں  
میں ایک سیکہ بھی آپ کے ہاں نہیں ٹھہرتی - مٹی کے تیل کی ڈبیاں جلاتے  
جلاتے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو رہی ہے - ان رات لوٹنے والوں سے بھی

"وہ سول سرجن ڈاکٹر ہے - اس کا خاندان کچھ ایسا بڑا نہیں ہے -  
اس کے علاوہ ایک بوڑھی ماں اور سات آٹھ سال کا ایک بچہ ہے - ڈاکٹر اور  
معالج عام طور پر سخت دل ہوتے ہیں - لیکن یہ مریضوں کی کچھ اس طرح دیکھنا  
اور خدمت کرنا ہے - جیسے اس کے حقیقی بھائی ہوں - اس کی ہمدردی - خدمت  
اور دلجوئی دیکھ کر سب لوگ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں - ڈاکٹر صاحب انسان  
نہیں دیتا ہیں!"

ڈاکٹر اپنے بچے سے بے حد محبت کرتے ہیں - اس کی ہر چھوٹی بڑی بات  
پوری کرتا اور اسے راجکاروں کی طرح بنا سوار کر رکھتا ہے -

اسے ہنستا ہوا دیکھ کر اس کا دل محبت و مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے  
اور یہ پیارہ محبت کی مٹی مٹی باؤں سے اس کے نرم و نازک رخساروں کو  
گدگداتا اور اس پھول سے بچے کو ہر وقت سایہ کی طرح اپنے ساتھ رکھتا ہے  
اسے دیکھتا ہے اور دیکھتا ہی رہتا ہے - جیسے اس کے حسین چہرے پر اپنے ایام  
رفتہ کی تاریخ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے - درحقیقت بچے کے ساتھ اس کی زندگی  
ایک حیرت انگیز کہانی وابستہ ہے -

بہت زمانے کی بات ہے - جب اس کی بیوی لاڈلی پہلے پہل سسرال  
آئی تو اپنا گھر دیکھ کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا - اسے ہلکے بھی ٹھہرنا دو بھر تھا جیسے  
عیش و عشرت اور ناز و نعم کی آغوش میں ملی ہوئی لاڈلی کو جیل خانہ بھیج دیا  
گیا ہو - مکان میں برقی روشنی تھی - نہ کافوری خیاں - مٹی کے تیل کی ڈبیوں پر  
جھبر کرنا تھا - گھر کچے تھے - سیمنٹ کی دیواریں تھیں - نہ پتھر کے ستون - لاڈلی کا  
آنکھیں تلاش کر کے تنک گئیں - لیکن اونچی کھڑکیوں اور الماریوں کا کبیں  
سرخ نہ لگا - ایسی حالت میں جاذب نظر تصویروں - قد آدم آئینے اور  
ہری کاڈ کڑی فضول ہے -

بوڑھی ساس بھوکا ہر وقت ہاتھوں ہاتھ لٹے رہتی - لیکن آرام و



کھڑی روتی رہ گئی۔

لاڈلی میلے داپس آئی تو گھر کے سب ہی لوگ اس سے ناراض ہوئے۔  
لیکن جب اس نے ننگ پچ لگا کر بہت سی باتیں بیان کیں تو نقشہ ہی بدل گیا  
کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس کی بات پر اعتبار نہ کیا ہو۔ اسنے سسرال والوں  
مارپیٹ کی تہمت لگائی تو سارا خاندان ان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس کی  
ماں نے قوائے گناہوں کو کوسنا شروع کر دیا۔  
غرض لاڈلی کی تدبیر بروئے کار آئی۔ اور وہ پھر پہلے ہمیشہ وارمہ کی  
زندگی گزارنے لگی۔

نریندر کے متنی میں دس مہینے کام کرنے کے بعد اس کے صاحب دلاست  
جائے گئے۔ اس کے حق قابلیت سے خوش ہو کر صاحب نے اسے بھی ولایت  
چلنے کے لئے کہا۔ پھر کیا تھا اس کی تو منہ مانگی ملازمت برآئی۔ وہ اپنی اُندھ آنکھیں  
سوچ کر پھر لک اٹھا۔ لیکن بوڑھی ماں..... پیارے وطن..... اور کسی کو  
..... جیسے وہ اب بھی بہت عزیز رکھتا ہے۔ چھوڑتے ہوئے اسے بے حد  
رنج ہوا۔  
انگلینڈ پہنچ کر نریندر نے نئی دنیا دیکھی۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹری کی  
تعمیل کے لئے اس نے میڈیکل کالج میں داخل ہونے لیا۔ وہ آئی ایس سی  
تو تھا ہی۔ اس کے صاحب نے سنا کہ وہ آئی۔ ایس۔ سی ہے اور ڈاکٹر بن  
پڑنا چاہتا ہے۔ تو بہت خوش ہوئے۔ اور اسے میڈیکل کالج میں داخل  
کرا دیا۔

اس کی حیرت مندی دکاوت و ذہانت وہاں بھی رنگ لائی۔ اور  
سر جی کے اسرار و رموز سمجھنے میں وہ انگریزوں سے نمبر لے جانے لگا۔  
ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر اس کی طرف خاص توجہ مبذول کی  
اور وہ نہایت قلیل مدت میں نامور مہر سولہ رجن ہر کہ بہو ملان لوٹا دیا۔

جوانی سینے کی مفارقت کے غم میں بوڑھی ماں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی  
جسم پر گوشت کا نام نہ تھا۔ پڑوس کی ایک رحمدل عورت کی مہربانی تھی۔  
کراسے کبھی کبھی آکر کچھ کھانے کو دے جاتی۔ وہ بدلتی۔ بہ نریندر بھٹنن کا

بڑھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ نہ کھانے کا ٹھکانہ ہے۔ نہ سونے کا۔ مجھ سے تو میرے یہاں کی  
لوٹیاں اچھی ہیں۔ سائیس کھانا تو میرے ہاں کے تو کبھی نہیں کھاتے۔ نہ جانے میں  
اس خیم میں کون سا پاپ کیا تھا جو اس طرح دکھ بھوگ رہی ہوں۔ یہاں بھیجے  
بھائے اگر میرے ماں باپ مجھے زہر دے دیتے تو میں خوشی خوشی کھا لیتی۔ اس  
بھکاری.....

انسان غریب ہو یا امیر عزت سب کو پیاری ہوتی ہے۔ غامکہ یہی کی  
پچھکار۔ وہ تھلا اٹھا۔ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح آنکھوں کی  
پتلیاں پانی میں تیرنے لگیں۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر  
چلا آیا۔ اور کچھ دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔

”خوبی..... آہ خوبی ایک لعنت ہے۔ غریبوں کے لئے نہیں  
ٹھکانا نہیں۔ سماج انہیں ذلیل سمجھتا ہے۔ بھائی بند انہیں ہیچ سمجھ کر ان سے  
کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ انہیں کوئی انسان نہیں گنتا۔ خود اس کے گھر والے  
بھی اس کی بات نہیں پوچھتے۔ تنکا نکالنے سے پس ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔  
یہاں تک کہ شرمیکہ زندگی بیوی بھی.....“

چپ ہو کر پھر سوچنے لگا۔ پھر خوش میں آکر بول اٹھا۔ تب تب۔؟  
مجھے کیا کرنا ہوگا؟ پھر چپ ہو گیا۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ طیش میں آکر وہ اٹھ  
کھڑا ہوا۔ باہر آیا۔ مڑ کر ایک بار گھر کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔  
لیکن کچھ سوچ کر پھر گھر میں لوٹ آیا۔ اور پیار و محبت کی دیوی ماں کے  
پاس کھڑا ہو گیا۔ ساری ہمت پانی بن کر آنکھوں سے بہنے لگی۔ چپکلیاں بند کر  
بوڑھی ماں نے ایک بار نیند میں ہاتھ پاؤں ہلائے۔ وہ چونک پڑا۔ سوئی ہوئی  
ماں کو فوراً اسلام کر کے باہر نکل پڑا اور اس طرح بھاگ چلا جیسے کوئی اس کا  
پیچھا کر رہا ہو۔

خبر پہنچتے دیر نہ لگی۔ گھر میں۔ گھر سے پڑوس میں۔ پڑوس سے گاؤں میں  
اور پھر ہر طرف اسی کا چرچا ہونے لگا۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں۔

ادھر نریندر کی ماں روتے روتے بے دم ہو رہی تھی۔ غش پر غش آندھ  
تھے۔ ادھر داندے پر پالکی کھڑی تھی۔ بد نصیب ماں پالکی وینڈ کر اور بھی  
پھوٹ پڑی تو لوگوں نے لاڈلی سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دن رہ کر بوڑھی ماں کے  
آندر پہنچے۔ لیکن کون سنتا؟ لاڈلی پالکی میں سوار ہو گئی۔ بد نصیب ماں

دل لگاتی ہر مکر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔

ایک دن بوڑھا میا سوتی ہوئی موت کی آنے والی گھڑیاں گن رہی تھی کہ وہ انہی پر ہنر ہنر ہنر "موٹر کی آواز آئی۔ وہ سن کر چونک پڑی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ موت کا فرشتہ آگیا۔ گھر میں ایک سوٹے تازے جوان کو آتے دیکھ کر وہ ڈر گئی

"بابو! اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ آنے والے کی ماں! آنے اسے ہٹا بٹھا کر دیا۔

فریڈر بیٹا! لکھ کر بڑا رو پڑی۔ دو ربے ہی لمحہ میں ڈاکٹر اس کی گود میں رو رہا تھا۔

ڈاکٹر اپنے دروازے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ایک موٹر دروازے سے کچھ دور پر آ کر رکی۔ شہر کے مشہور وکیل بابو ادوہ کشور کو کتے ہوئے دیکھ کر ڈاکٹر استقبال کے لئے اٹھا۔ لیکن وکیل صاحب نے لمبا سلام کرتے ہوئے بیٹھنے کے لئے اصرار کیا۔

"کیسے کیسے تکلیف فرمائی اس وقت آپ نے؟ مزاج تو اچھا ہے؟" "کیا عرض کروں ڈاکٹر صاحب! بات ہی ایسی آپری ہے۔ وکیل نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی بیمار ہے؟" ڈاکٹر نے ہمدردی جتانے بھٹے کہا۔ "ایک دلدل میں پھنس گیا ہوں ڈاکٹر صاحب! اب تو صرف آپ ہی کا بھروسہ ہے۔"

ڈاکٹر نے وکیل پرستفراںہ بگاہ ڈالی۔ "آپ مجھے معاف فرمائے گا اطمینان دلائیں تو گستاخی کروں۔" "کیسے بھی! ڈاکٹر نے ایک لمحہ چپ رہ کر پوچھا۔

پانچھو کا نوٹ کھسکاتے ہوئے وکیل صاحب بولے۔ "ایک زمانے سے تعارف رہنے کی وجہ سے جرات کر رہا ہوں۔ اور پھر اب تو کوئی چارہ کار بھی نہیں..... بات یہ ہے کہ میں ایک خطرناک معاملے میں پھنس گیا ہوں۔ یہ اس کا ساتواں آٹھواں مہینہ ہے۔ آپ سے چھپا نا کیا ہے۔ میں امرکائی کو شش کر کے تھک گیا۔ لیکن کچھ ڈاڈہ نہ ہوا۔ کل رات

اسے نہایت تکلیف دہ رو ہے۔ اب موت اور زندگی کا سوال ہے۔

آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ میں تو.....

"نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا..... آپ کو شرم نہیں آتی..... ہجھی جی اتنے ذلیل۔ اتنے گئے گزرے ہیں آپ.....؟"

ڈاکٹر کا چہرہ تمنا اٹھا۔ اس نے زور سے پکارا۔ "ہام و من! ایک نوکر سامنے آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ میم صاحب کو جلدی بلاؤ۔ بغل کے کمرے سے فریڈی ڈاکٹر کھلی۔ ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہا۔ اور وہ جاکر موٹر سے عورت کو اتار کر پاس کے کمرے کی طرف لے چلی۔

ڈاکٹر آدھ گھنٹے تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ و زار ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور وکیل صاحب کو تو کاٹو تو لمبے نہیں بدن میں یکایک ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔ اس کیس کو میں پولس کے حوالے کروں گا۔ یہ کلمہ وہ فون پر با بیٹھا۔ وکیل صاحب نے بیہ بکرہ لئے۔ اس نے انہیں ٹھوکر لگا کر بائیں ہاتھ میں فون کا چونکا اٹھایا۔ اسی وقت میم صاحب دوڑی ہوئی آئیں۔

"بچہ تو ہو گیا۔ لیکن زچہ پر غشی طاری ہے۔ حالت ابھی نہیں معلوم ہوتی۔ ڈاکٹر خود چلا۔ دیکھا کہ ایک حسین عورت بے ہوش پڑی ہے۔ اور ایک نرم و نازک پھول سا بچہ رو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے فوجوان عورت کو دیکھا ایک بار دیکھا۔ دوبار دیکھا۔ آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد عورت نے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اور اس نے بھی ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت مسرت و شادمانی۔ حیرت و استعجاب۔ شرم و ندامت اور رنج و غم کے نقوش نمایاں ہو گئے۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔ کچھ بول نہ سکی۔ صرف اس کے ہاتھ ڈاکٹر کے قدموں کو بیتا بان چھو پٹے اور ڈاکٹر فرط جوش اور وفور حیرت سے چلا اٹھا۔

"لاڈلی..... تم؟؟"

لیکن سننے والا کون تھا۔؟ صرف ننھا سا بچہ اس بد نصیب ماں کا

قسمت پر رو رہا تھا۔

(خاص) (آسی رام نگری)

# مقالاتِ باسط

(مصور قلم ماسٹر باسط بسوانی)

چھایا ہے تو چین پر رنگ بہا رہو کر      دل ہے فدا ہمارا تجھ پر ہزار رہو کر  
مٹی میں مل گئے ہیں رنگیں جمال کیا کیا      قصر جہاں کے دو دن نقش و نگار ہو کر  
تم خاک کر چکے ہو۔ دل خاک ہو چکا ہے      پنچے کا تابہ دامن آہ غبار ہو کر  
سیر چین سے تم کو فرصت ملے تو دیکھو      دل اور کچھ ہوا ہے اب داغدار ہو کر  
سفاک تیری چتون۔ قاتل تری نگاہیں      جانبہ ہوا نہ کوئی۔ ان سے دوچار ہو کر  
گل نہیں پڑے چین کے کلیاں بھی سکرانیں      گلشن میں آپ آئے رنگ بہا رہو کر  
دعوائے عشق میرا باطل سمجھ رہے ہیں      جینا عبت ہے باسط بے اعتبار ہو کر

دل دے کے انکو باسط اسطرح چپ ہوا ہوں

رہ جائے کوئی جیسے بے اختیار ہو کر

# نیولین اعظم اور ایک ہوا باز عورت

نیولین اعظم کا ہوائی جنگ کے امکانات پر غور کرنے سے انکار کا دلہ روز واقعہ  
از جناب خالص صاحب قاضی محمد شفیع صاحب بی ایس علیک

## الہامی الفاظ

تمہارا مستقبل ہوا سے وابستہ ہے۔ تم اپنے آپ کا سرف پرواز  
کر دو گی۔ فن پرواز کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ اس کے امکانات  
اس وقت کسی لے و بزم گمان میں ہی نہیں آ سکتے۔ مستقبل بعید میں جنگ  
فیصلہ کر دہ ہوائی میں ہوا کرے جو مگر —۔۔۔ تم خود دیکھنا ایک مکان کے  
خطہ سے بچنا۔

برالفائن من کر صوفیا بلا پنچر کا دل بلیوں سے بھرنے لگا۔ اس کی انگلیوں  
میں نئی روح دوڑ گئی۔ پرواز اس میں تو اس کے مرحوم شوہر کو خاص  
انہماک تھا۔ اس نے دل میں کہا کہ میں اپنے شوہر کی خواہشوں اور  
ارادوں کی تکمیل کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گی اور کر دہ ہوائی پر  
قابو پانے کے لئے اپنا تن۔ من۔ دھن و بان کر دوں گی۔

اپنے مکان کو داپس باتے ہوئے صوفی بلا پنچر وغیب اس باکرہ عورت کے  
الفاظ کا اعادہ دل ہی دل میں کر رہی تھی۔ مستقبل میں جنگوں کا فیصلہ کر دہ  
ہوائی میں ہوا کرے گا۔

اگرچہ شہنشاہ ایک کامیاب مہم کے بعد ابھرا، اچھی ویشیادار حکومت  
آسٹریا سے واپس آیا ہے۔ مگر ایک نئی جنگ کا ذکر ابھی سے باخبر حلقوں  
میں چورہا ہے۔ اپنے سابق دوست زار روس کے ساتھ شہنشاہ کے  
تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں  
کہ روس سے ایک ہلاکت آفریں جنگ چھڑ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو کسی  
قسم کی پرواز کرنے والی مشینوں کے استعمال کے لئے موقع نہ ملے گا۔  
جس سے پرواز کر دہ ہوائی کے دل و دل جائیں۔ جن کی باکرہ لینوریاں نے  
پریشین گوئی کی ہے۔ چند اڑن کھٹولے — کچھ ہوائی گولہ باری۔

یہ سب امر کا واقعہ ہے جب نیولین اعظم کی سلطنت انتہائی طاقتور  
پہنچ چکی تھی۔ شہنشاہ کے اقبال کا ستارہ نصف النہار پر تھا۔ اور اس کی زد  
آئندہ بادی کسی کے دہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

جدید طبقہ رؤسا نے نئی جمہوریت کا متلاشی تھا۔ پرتس میں تاریکی  
فروائی تھی۔ لوگ منت نہی فتوحات کی اجار سے ہر وقت ایک سوجان میں تھے  
”باکرہ لینوریاں“ کی چل پہل ہیں۔ اس کی کمال غیب دانی کے قصے زبان  
خاص۔ مام ہیں۔ اس کے کمرہ ملاقات میں متفسرین خطہ و ترست کی بھٹی لگی  
رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کو ملک جو زمین کی نظرات کا فخر حاصل ہے بلکہ خود  
شہنشاہ نیولین اعظم اپنے محل خاص میں اسکو طلب فرما کر مراحیم خسروانہ سے  
منتاز فرما چکے ہیں۔

ایک دن اس کے کمرہ انتظار میں بین الاقوامی سیاست دانوں اور  
خانہ لباس میں لباس خواتین کے نمبر مٹ میں ایک ایسی عورت نظر پڑتی ہے  
جس کے بدن پر لباس متوسط درجہ کا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے مگر آنکھیں  
چمکدار ہیں۔ اس کے انداز سے آزادی نمایاں ہے۔ اس خاتون کا نام صوفیا  
بلا پنچر ہے اور وہ ایک متوفی موجد کی بیوہ ہے۔ اس کے شوہر فرانسیس  
بلا پنچر نے جو عالمی ری میں انتقال کر گیا ہے۔ ایک ایسی گاڑی ایجاد کرنے کی  
کوشش کی تھی جو خود ذاتی طاقت سے بلا گھوڑوں یا دوسرے خارجی  
ذرائع قوت کے چل سکے۔ ہوا بازی سے اسکو خاص شغف تھا۔ حتیٰ کہ  
چند مرتبہ اپنی بیوی سمیت اڑن کھٹولہ میں پرواز بھی کر چکا تھا۔ یہ خاتون  
صوفیا بلا پنچر ہی تھی جو اس وقت اپنے متعلق باکرہ لینوریاں کے اہمام  
آئینہ الفاظ سننے کی منتظر تھی۔

۴۴ م نواس طرح پورا ہو گیا۔ دوسرے کے پورا ہونے کو کئی سال چاہئے تھے۔ آخروہ دوسرا حصہ آگندہ جنگوں کا فیصلہ کرنے ہوا کرتا تھا۔ پچیسویں اور بارہواں (نومبر)

جیتا دوس کی نیم تربیت یافتہ سپاہ خوف کے مات بھاگ نکلتے گی۔

### نیپولین سے ملاقات

ایک طویل زحمت اور درباری جوڑ توڑ کے بعد صوفیا بلا نچر کو نیپولین اعظم کے حضور میں شرف باریابی حاصل ہو گیا۔ آج وہ شہنشاہ کے سامنے اسٹاؤہ تھی۔ وہ اس کی تجاویز کو بغیر سن رہا تھا بلکہ بظاہر ان سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے خاتون کے رخسار پر ہلکی سی ہنسی بھی دی۔ جو اس کی منتقل و بہت کی داد دہی کے مترادف تھی اور جو شاہی اطمینان قلب کی نادر علامت تھی۔

بالآخر شہنشاہ نے جواب دیا۔

خاتون! اگر تمہارا خیال ہے کہ جنگوں کا فیصلہ کسی قسم کے جدید آلات فضاہیہ سے ہو سکتا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ لڑائیوں میں فتح و ہزیمت کی شکار حاصل ہوتی ہے۔ میں کا سبق ہم نے وہی اسلاف سے سیکھا ہے۔ میری کاپیلاگا راز ہمیشہ اس صحت عملی میں منہم رہا ہے کہ متحدہ جیش سے حریف کے کمزور ترین مقام پر دھنڈہ مہل کر دیا جائے۔ سپاہ کی جرات۔ جبارت اور گرجوشی صرف استمداد کی جلتے ہوئی غبار کا محض نمائندہ ہیں۔ وہ بازیچہ اطفال ہیں۔ معوز فن حرب سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔

ملاقات ختم ہو گئی۔ صوفیا بلا نچر و شہنشاہ کو قابل کرنے سے قاصر رہی وہ گھر واپس آگئی مگر اس کی ہمت و استقلال حوصلہ جرات پہلے سے دو چند ہو گئے۔ اس نے دل میں کہا کہ میں ذاتی طور پر ہی فن پرواز کو ترقی دینے کی جدوجہد کروں گی۔ وہ بغیر کسی کی مدد کے اکیلی تیرس کے مضائقہ میں غبارہ میں چھ پرواز ہوئی۔ حتیٰ کہ کامیابی پرواز سے اس کی بے حد شہرت ہو گئی۔ بایں ہمہ بقول شہنشاہ نیپولین غبارہ سے نمائش کا وہ کئے کمال زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ ہادی النظر میں غبارہ سے بازیچہ اطفال سے زیادہ وقیع ثابت نہ ہو سکے۔

لوئیز۔ مارسیلز۔ لون۔ اور دوسری مشہور نمائش گاہوں میں ہو باز حسینہ کی غبارہ بازی جاذب توجہ ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک انگریز نے بھی انگلستان میں نمائش پرواز کے لئے اس کا اجارہ کر لیا اور صوفیا بلا نچر کا نام یورپ بھر میں مشہور ہو گیا۔

### بے سود تاسف

نیپولین کی ہزیمت خوردہ فوج روس کے برف پوش پہاڑوں پر ہے سپاہی ہو رہی ہے۔ صوفیا بلا نچر و زہر خندہ کر رہی ہے۔

کاش شہنشاہ نے میری بات پر کان دھرا ہوتا مگر شے کے بعد از جنگ یاد آید یہ کٹہ خود باید زد۔ ہزیمت خوردہ نیپولین سینٹ ہیلینہ قید میں پڑا رہا ہے۔ مگر صوفیا بلا نچر و کا کوکب بخت ابھی اس کے دام اقبال میں ہے۔ وہ اب تک ۶۰۶ مرتبہ کامیابی کے ساتھ پرواز کر چکی ہے آخر کار اب بڑے بڑے سائنسداں بھی قائل ہو گئے ہیں کہ صوفیا بلا نچر و مساعی محض بازیچہ اطفال نہیں۔

۶ جولائی ۱۹۱۹ء کو مشہر کیا گیا کہ صوفیا بلا نچر و پیرس کے نواح میں ایک شاندار پروازی نمائش دکھائے گی۔ بے شمار مخلوق جمع ہوئی کیونکہ لوگوں میں اب یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ یہ ہو بازی محض نمائشی ہی نہیں بلکہ یہ بات آہستہ آہستہ واضح ہو رہی تھی کہ فن پرواز کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

فوجی باجنج رہا تھا۔ صوفیا کے غبارہ نے حرکت کی۔ پرواز میں آیا اور فضا میں بلند ہونے لگا۔ بے شمار آتش گیر مادہ کی شعلیں نہیں تود ہو باز حسینہ چوڑی تھی اپنی دنیا باری سے منظر کی لطافت میں اضافہ کر رہی تھیں و شعلہ ایک غیر معمولی شعلہ نمودار ہوا۔ یہ کیا تھا۔ سوئے اتفاق سے ایک مشعل غبارہ کے گیس دان (gas bag) سے ٹکرا گئی گیس شعل ہوئی۔ شعلہ قابو سے باہر ہو گئے ایک لمحہ تک تو تاشائی ہی سمجھتے رہے کہ ان کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے کسی غیر معمولی اتنی بڑی شعل کے اتہاب کا خاص طور پر انتہام کیا گیا ہے۔ جو روشنی اور آتش بازی دونوں کا بیک وقت کام دے سکے۔ مگر خجعتہ غبارہ نیچے گرنے لگا۔ وہ اب محض ایک شعلہ ہی رہ گیا تھا۔ بھڑے ہولناک آہیں نکلیں۔ مجمع میں نظرائی ہل چل پڑ گئی۔ ایک کرام بپا تھا۔ دل و وجہوں سے آتشیں نظر بالکل بھینک ہو رہا تھا۔ غبارہ کو ٹوکر چھیں ہو باز حسینہ بیٹھی ہوئی تھی ایک منظر کی چھت پر گر کر پاش پاش ہو گئی۔ پینیں گئی پوری ہو کر رہی۔ آخر لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ ایک فاجعہ کا نظارہ کر رہی ہیں جلتی ہوئی چھت

۴۴ م نواس طرح پورا ہو گیا۔ دوسرے کے پورا ہونے کو کئی سال چاہئے تھے۔ آخروہ دوسرا حصہ آگندہ جنگوں کا فیصلہ کرنے ہوا کرتا تھا۔ پچیسویں اور بارہواں (نومبر)

# غزل

(جناب سید جلال الدین صاحب حیدر دہلوی)

اب خیالِ ماسوا سے دور ہو کر دیکھئے آپ ہی کو ہر طرف ہنگامہ پرورد دیکھئے  
 سامنے اس برقِ روش کو جلوہ گستر دیکھئے جس طرف سے کوشش فطرت الٹ کر دیکھئے  
 اس کا قامت کس نظر سے دیکھئے جس کے قنوں کو قیامت کی برابر دیکھئے  
 تا بچے ظلم و ستم عرض و فاپر دیکھئے اب زمانہ کی طرح کروٹ بد لکر دیکھئے  
 اپنے در و عشق کا اک اک کو غور دیکھئے ہر گ تین دیکھئے دل دیکھئے سر دیکھئے  
 رنگ آہوں سے تصویریں اُڑا دوں تو سہی اک ذرا تصویر کی مانند کھینچ کر دیکھئے  
 میں وہ قدیمت کہ میرے سائے سے تورم کرے تو وہ خود آرا کہ تجھ کو زندگی بھر دیکھئے  
 در بدر کی ٹھوکریں ہفت آسمان کی گردیش کیا مقدر میں دھرا ہے کیا مقدر دیکھئے  
 ابتدا اگر حسن کی اُن سے ہوئی تو کیا ہوا ختم حجتِ عشق کی اک روز ہم پر دیکھئے  
 میرے نالوں کا سبب اپنے تغافل کا اثر آنکھ سے آنکھ اور دل سے دل ملا کر دیکھئے  
 جسکا ہر انداز ہو وجہ شکستِ کائنات کس طرح اُس کی طرف اے دیدہ تر دیکھئے  
 کس قدر مضبوط ہے عشق و وفا کا سلسلہ بے حجابانہ کبھی انگڑائی لے کر دیکھئے  
 خونمائی سے نہ دامن چھٹ سکیگا شہر تک فار بنجائینگے آئینے کے جوہر دیکھئے  
 اتنا کچھ کرم رنگیں لبوں کا واسطہ ہو چکا ہے عمر کا لبریز ساغر دیکھئے  
 سخت غفلت ہے گر اسکو دلِ باہر ٹھونڈے ہر عقیدہ کفر ہے جب حد سے بڑھ کر دیکھئے  
 حیدر حق دوست سے ہر لمحہ کمر وقت ہند کافروں کے جبرِ فہمانِ خدا پر دیکھئے

# بائی پھول

(از جناب پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے)

دوسرے کے ساتھ اس ذکر ہی کو ناپسند کرتا۔ لیکن پھر بھی مابہرہ کی طرف سے اس سر کی سلسلہ جنبانی بھیتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھی۔ غور کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ عورت جو شوہر و اولاد و خاندان داری کے علائق میں گرفتار رہنے کے باوجود ہر سال میری محبت کی یادگار مناتی رہے۔ جب میرے لئے رفیق تنہائی کی تلاش کا کام بھی اپنے ذمہ لینے کے لئے خود کو کشش کرے تو اس کی اس نئی حیثیت سے دل میں جذبہ امتحان بڑھے گا یا نہیں اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگا یا نہیں؟ مابہرہ کی محبت کو اگر کوئی شے پھر اس کی پچھلی صورت میں لاسکتی تھی تو اس کی یہ تحریک تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس آخری خط کے پانے کے بعد میں اپنے میں وہی دالمانہ کیفیت پانے لگا جو آٹھ برس پہلے مجھ میں موجود تھی۔ گویا آتش محبت کی بجھتی ہوئی چنگاری جو ملائق کے خاکستر میں دبئی پڑی تھی۔ مابہرہ نے اسے پھر اپنے ہاتھوں ایک شعلہ جوالہ بنا دیا۔ میں سات دن متواتر شب و روز اس آگ میں جلتا رہا۔ بالآخر آنکھوں میں دل میں نے مابہرہ کے خط کا جواب بھیجا۔ اس خط میں میں نے خدا جانے کتنی قسموں کے ساتھ اپنے اس حمد کو دہرایا تھا کہ میں اب تمام عمر یوں بن بیابا رہوں گا اور خط ختم اس فقرے پر کیا تھا کہ مجھے تامل کی زندگی سے اپنی ہی زندگی پسند ہے جب اتنی فرصت ہے کہ:-

بیشمار ہوں تصور جانناں کے بغیر

مابہرہ نے جو اس کا جواب لکھا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس لئے اس کی نقل آسانی ممکن ہے۔ ملاحظہ ہو:-

”میرے دیوانے! آپ کا خط ملا۔ اسے پڑھ کر مجھے جتنی خوشی ہوئی ہے زیادہ رنج ہوا۔ دنیا میں بھلا کون سی عورت ہے جسے اس یقین سے خوشی نہیں ہوئی کہ اس سے ایک شریف تعلیم یافتہ مرد محبت کرتا ہے اور وہ

مابہرہ کی خدمت کے چھٹے سال برس کا زمانہ گزر چکا تھا۔ میں بھی نوجوانی کی حدوں کو پار کر کے اور طالب علمی کی بے فکری کو خیر باد کہہ کے اب ایک ذمہ دارانہ کام طرح اور ایک باقاعدہ وکیل کی حیثیت سے دن بھر کچر یوں کی خاک چھانٹا اور بار بار بچے رات تک۔ مابہرہ کی یاد میں نہیں بلکہ محض قانون حفظ کرنے اور نظریں ڈھونڈنے کے لئے لیٹ بچ جاتے اپنے دفتر میں بیٹھا کام کیا کرتا تھا۔ میں ہرگز ہرگز بھولی نہیں کر سکتا تھا کہ مابہرہ کی یاد مجھے مٹاتی تھی۔ اس لئے کہ امتداد زمانے نے دل کو اس تکلیف سے اس قدر انوس بنا دیا تھا کہ اب الم کی جگہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ سن کے بڑھنے کی وجہ سے احمسابی ہیجان مفقود اور عذبات کا وہ فور محدود ہو گیا تھا۔ گویا چشمہ محبت میں برساتی جزر و مد کی جگہ اب موسم گرما کی سبک دوزم روانی تھی۔ ہیجان و ہوسناکی کے خس و خاشاک تر نشین ہو چکے تھے اور طغیان و طوفان کی جگہ صفائے قلب و استوار رجحان نے لے لی تھی۔ اگر دل میں درد تھا تو وہ بالکل دلیلا محنت شاقہ سے عضا میں پیدا ہو جاتا تھے اور جس کی وجہ سے جسم کے دبائے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس درد کو چوڑوں کی اس جوش سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جو تپ دلائی میں چمک اٹھتی ہے۔ مابہرہ کی یاد کے لئے پردائی کا کام وہ مرجع ہائی ہوئی لگی کرتی تھی۔ جو اب بھی ہر سال حقد کی تالیخ کو میرے پاس پڑنے میں لٹھی ہوئی بیٹھ جاتی تھی۔ پچھلے دو برسوں سے پرزوں نے خط کی صورت اختیار کر لی تھی ان دونوں خطوں میں ظہار خلوص کے ساتھ ساتھ اس امر کی نصیحت کی گئی تھی کہ مجھے اب جلد سے جلد شاہی کر لینا چاہیے اور آخری خط میں مناسطی کے فرائض کی انجام دہی کی آمادگی بھی ظاہر کی گئی تھی!

میں جھوٹے دہلوانے گا۔ مجھے شادی کے نام سے نفرت نہ تھی اور نہ اب مجھ میں مابہرہ کے متعلق وہ دالمانہ کیفیت باقی تھی کہ میں سوائے اس کے کسی



بھی شریفوں کی طرح محبت کرتا ہے؟ آپ نے جس شرافت سے میری اور اپنی محبت کو نباہا ہے اس کی قدر نہ کرنا عشق و وفا کا نام رسوا کر رہا ہے لیکن واقعات خواہشات کے پابند نہیں ہوتے۔ جو کچھ میرا اور آپ کا جی چاہتا تھا اور جو کچھ میرے اور آپ کے معاملے میں واقعات پیش آئے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں بیاہی جا چکی۔ خیر سے شیکے والی بھی ہوں انصاف سے زندہ رکھے۔ میرا پتہ چدریس کا ہو چکا ہے۔ سچائی ضرور ہے مگر ظاہر واقعہ اس موقع پر غالباً واجب و لازم ہے اس لئے عرض کرتی ہوں کہ میرے سہارے کے دن ختم ہو چکے۔ میری آنکھوں کا دس میرے ہاتھ پاؤں کا کس بل زائل ہو چکا۔ میں نواب نوجوان ہوں۔ نہ بن بیاہی اٹھرا! آپ ابھی تک گرفتہ ایام کی تصویریں کھینچ لکھتے بیٹھے ہیں! آپ کی مآثرہ سات آٹھ برس قبل والی مآثرہ اس دنیا میں نہیں ہے! پھر اس کی یاد کیسی؟ اور اس یاد پر دنیا کا کچھ دینا کیسا؟ کیا آپ کی اس محبت۔ آپ کی اس وفا کے بعد بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں آپ کو آرام سے دیکھوں؟ آپ کہیں گے میرے لئے گزرے ہوئے دنوں کی تصویریں بہت ہیں! میں عرض کروں گی تصویریں میں وہ گرمی نہیں جو عورت کے دل میں ہے۔ وہ خدمت کی ملاجعت نہیں جو عورت کے نازک ہاتھوں میں ہے اور وہ تسکین دہی کی طاقت نہیں جو زندہ عورت کے سینے میں ہے! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔

ہائے کجفت تو نے پی ہی نہیں

میں اس لئے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دلاتی ہوں اور آپ کو اپنے ہی سر کی قسم دیتی ہوں کہ اب بن بیاہ رہنے کے خیال کو دل سے نکال ڈالئے اور اپنا گھر بسائے! زندگی کی گاڑی بغیر دونوں پہیوں کے نہیں چلتی۔ آپ دنیا میں رہ کر سفاس لئے بیٹھے ہیں اور وہ بھی مجھ نصیب جلی کے لئے وفا ہو چکی محبت کے امتحان کی حد تک کب کی گزر گئیں۔ اب تو سچی خودکشی اور قطع نسل ہے! اگر مجھے آپ کی قدر نہ ہوتی۔ اگر میں آپ کے اسقلال اور آپ کی پامردی کی قائل نہ ہوتی۔ یا میں آپ ہی کی مآثرہ نہ ہوتی۔ تو میں اپنی جگہ پر اس۔

خوش ہوتی کہ آپ نے اپنی زندگی میرے بچے تباہ کر دی! لیکن میں بچ کشتی ہوں کہ مجھے آپ کی اس موجودہ زندگی کا جب خیال آتا ہے تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ میری سی حقیر و ذلیل عورت کے لئے آپ سامرو اور جوگ لے! یہ میرے ادھاتا بڑا بار ہے جو میرے کمزور کا ندھوں سے اٹھایا نہیں جاسکتا لہذا اپنے ہر اور مجھ پر رحم کیجئے اور اپنا گھر بسائیے! آپ اگر یوں نہ مانیں گے تو میں خود کوئی لڑکی نکاش کر کے آپ کے متعلق سلسلہ صبا فی شروع کر دوں گی۔ پھر تو آپ اپنی مآثرہ کو سمجھ لیں نہیں بتا سکتے!..... میں آپ کے جواب کا بہت صحتی انتظار کرتی رہوں گی!

اس خط کے پڑھنے کے بعد جو میری حالت ہوئی اس کا اندازہ انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو صاحبانِ دل ہیں۔ ایک طرف تو میرے دل میں مآثرہ کے اس نئے اشار اور اپنی یاد کی قربانی کی ترغیب پر مرتضیٰ والا پیراؤ نامہ دوسری جانب عقل سلیم یہ کہتی کہ مآثرہ کی رائے صحیح و درست ہے! پھر عقل کی خشک ہیڑی رائے میں اوصافی و جوان ہاں میں ہاں ملا کر زمی اور گرمی شامل کر دیتا۔ مرد و اب مرد جس کے قولے عقلی و دینی درست ہوں۔ جس کی تندرستی ٹھیک ہو اور جس کو کوئی بھجانی بیماری نہ ہو۔ تابل کی زندگی کے لئے فطرہ تجو رہے۔ یہی فطرت میری عقل کے ساتھ تھی۔ دل کتنا سآرہ کی سی شریف۔ غیور اور با حیا قانون کی یاد مجھ میں اب تک بسی رہی۔ میں اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس گھر میں کسی دوسرے کو جگہ نہیں مل سکتی! جسم کتنا میں ایک خیال اور ایک تصویر کے لئے اپنے کو کب تک مارتا رہا ہوں؟ پھر یہ امر تو عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی۔ اس بحث میں بوالہوسہ بھی آکر شریک ہو جاتی اور اپنے مقصد خاص کے حصول کے لئے اور شیدہ اہل نظر کی شکست کی غرض سے یہ بہانہ پیش کرتی کہ مآثرہ تو خود ہی اس پر مصر ہے کہ ہر چہ چلیدیکا بھرم ٹوٹے اور وہ بھی کن الفاظ میں! خدا و رسول کا واسطہ! اپنے سر عز کی قہر غرض رات دن ہر اسیدہ و لوانی کچری تھا کہ جہاں دو مختلف لہجہ خیال وکیلوں کی جرح اور بحث بڑی گہما گہمی سے جاری رہی اور میں ان کی سچ کی طرح سب کچھ سننے کے لئے مجبور تھا! میں نے چوتھے دن اس خانگی جنگ سے عاجز آکر مآثرہ کے خط کے جواب میں لکھ بھیجا:۔

کردوں۔ لیکن مآبرہ سے زبان باز چکا تھا اور یہ الموسیٰ اور جہاننی لذات کی خواہش  
ماہر آستیں بنی موجود تھی۔ اس نے پھر میز باغ دکھانا شروع کیا اور میں جاوید کے  
احکام کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔

تین چار دن بعد جب میں ایک اچھی خاصی دوکان کھولنے کا سامان ساتھ  
لے کر کھٹو واپس آیا۔ تو جاوید ایشیون پر موجود ملے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شاہی کی  
تایچ محض اس لئے بٹھا دینا پڑی کہ لوڈ کی والوں میں سے کسی عزیز قریب کا دفعہ  
انتقال ہو گیا اور اب جب تک کہ انکی برسی نہ ہو جائے شادی نہیں ہو سکتی جس نے  
ذرا اطمینان کی سانس لی اور گھر پہنچ کر میاں جاوید تو اپنی فرمائشات کی فہرست سے  
خود شدہ شائع ملاتے وہے اور میں اس تھکے ہوئے مزدور کی طرح جو بار گراں  
منزل مقصود تک پہنچانے کے بعد بکدوش ہو جاتا ہے۔ بڑے سورا۔ قریب شام  
میں سوکے اٹھا تو جاوید گھر جا چکے تھے۔ منشی جی بھی نہیں آئے تھے اس لئے میں درپیک  
حمام میں بیٹھا نہایا گیا۔

اس دیر کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے نہانے میں خاص لطف آرہا تھا۔ بلکہ حمام میں  
پہنچتے ہی مجھے اپنا وہ نہانا یاد آ گیا جو مجھے عشق کی ابتدائی منزلوں میں بارہ بجلی کے  
سفر کے بعد پیش آیا تھا۔ اور پھر آٹھ برس پہلے والی صورت و ماغ نے نظروں کے  
سامنے پیش کر دی اور پھر وہی رپوڈگی دہی بدحواسی پیدا ہو چلی تھی کہ یہ خیال  
آیا کہ ہونے والی سسرال میں موت مآبرہ کو خطا لکھنے کی نوید ملے کہ آئی ہے۔  
میں نے اس آٹھ برس کے عرصے میں نہ تو مآبرہ کے میاں سے ملنے کی کوشش  
کی تھی۔ اور نہ خود اسے کبھی خطا لکھنے میں سبقت کی تھی۔ لیکن آج بہاد ہا تھا گیا  
تھا اس حادثہ کے متعلق مزید تفصیلات جاننے کی کوشش نہ کرنا خلاف انساب  
و مروت ہوتا۔ اس لئے میں نے جلدی جلدی جسم خشک کر کے کپڑے پہنے اور مآبرہ کو  
خطا لکھنے بیٹھ گیا۔ پورا خط مجھے یاد نہیں لیکن بعض حصے اب بھی حافظے میں محفوظ  
ہیں۔ میں نے کلکتہ سے واپسی کی خبر دینے اور اس کی خوشی کے لئے اپنے کزن شاہی کی  
دیوی پر پھیلینٹ چڑھا دینے کا تازہ وعدہ کرنے کے بعد اس حادثہ کی نوعیت کے  
متعلق اطلاع چاہی تھی اور پھر ایک بار لہجہ حاجت سے لکھا تھا۔

”صبر آرم مآبرہ! یہ یاد رکھو کہ یہ رشتہ میں نے تمہارے حکم سے منظور کیا ہے  
لیکن یہ میری محبت کا تم سخت ترین امتحان لے رہی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ

”خوش ہونے والی مآبرہ! تمہارا خط ملا۔ میں تمہیں اس کے جواب  
میں کیا لکھوں؟ زہر دے اس پر یہ تاکید کہ پینا ہو گا! میں تمہارا  
مید۔ تمہارا گرفتار۔ تمہارا غلام! تم مجھے اپنا بندے رکھو۔ کسی دوسری کو  
تحفہ دیدو یا پیشہ کے لئے کلا گھوٹ دو! تم مالک و مختار ہو۔ میں نہ  
اپنے قبضہ قدرت میں ہوں۔ نہ مجھ میں فیصلہ کرنے کی اور نہ حرم علاوہ کی  
صلاحیت ہے! اس اتنا جانتا ہوں کہ قرض یا قید خانے کے بدلے سے  
میں نہیں بدل سکتا۔ میں تمہارا بھول اور تمہارا ہی درہوں گا!“  
دوسرے ہی دن جواب آیا۔

”بہت خوب میں اپنے ہی اختیار فیضی سے کام لوں گی اور آپ کا گھر  
بسکے دم لوں گی۔ اب آپ کو اپیل کا اختیار نہیں!“  
اس کے بعد ایک ہفتہ تک کوئی خط نہیں آیا۔ پھر ایک پرزہ ملا۔  
”نواب..... کی صاحبزادی میری دیکھی بھالی ہیں۔ حین۔  
سلیقہ شعار۔ بڑی مہم اور نیک چلن۔ میں نے ان سے بات طے کر دی  
ہے۔ شاید آدھ کے لوگ آپ سے کسی دن ملنے آئیں۔ خدا کے لئے کوئی  
ایسی بات نہ کہہ دیجئے گا کہ ان لوگوں کو ناگوار ہو اور میری سبکی ہو!“  
میں نے لکھ بھیجا گیا بھال!“ اور ان آنے والوں کا اسی جذبہ سے انتظار  
کرنے لگا۔ جس جذبہ سے ہرنیو لاد بیچہ قصاب کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔

برہماں وہ حضرات آئے۔ گفتگو ہوئی اور پند کا اظہار ڈھکے پردوں فواکر  
میرا فوٹو لے گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست جاوید صاحب کو تایچ وساعت کا دن  
اور وقت کا تقرر اور تمام انتظامات کا اہتمام سپرد کیا اور خود ایک کمیشن کے سلسلے میں  
دو ہفتہ کے لئے کلکتہ چلا گیا۔

کلکتہ کی میرو تفریح میں بہت کچھ دل بہل گیا تھا اور ہونے والی شادی کا  
خیال وہاں کے مختلف اسٹوڈیوں کے دیکھنے کے سلسلے میں ذہن میں دھندلا سا رہ گیا  
تھا کہ دفعہ میاں جاوید کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ عقد کی تایچ مقرر کر دی گئی ہے  
اور اب اسکے صرف میں دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے تمہیں جلد سے جلد واپس  
آنا چاہئے۔ نیز اپنے ہمراہ دو اپیز میں لیتے آنا جو فہرست مسئلہ میں درج ہیں۔  
جی تو چاہتا تھا کہ میں اس مہمل خط کو ”ورق بے معنی“ کہہ کر دیر لے لگتا میں غرق

ج۔ بت سامنے رکھ لینا اور یاد خدا کرنا! " مگر وہی یہ محسوس  
اس کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ جو جسم و جسمانیات سے منزہ ہے  
نہ کہ اس کی حوص جو جن ہم ہوا! تمہارے پرستار کے لئے پتھر کی دیوی  
میں دل بھونکنے والی گرمی کہاں؟ تم کو گرمی وہ پتھر کی نہیں بلکہ  
جوان ہے! مجھے یہ تسلیم ہے پہلو ضرور گرم ہو گا میں کوئی واسطہ نہیں!  
لیکن..... لیکن میری صابروہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ تم تاہل کی  
زندگی میں مجھے بھول سکیں؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے جواب دو۔  
کہا کسی خیالی تصویر کو دل سے لگائے بیٹھے۔ ہنسنا اس حالت میں بھی آتا  
ہی آسان ہے؟ تم کو کوئی میں عورت ذات ہو کر یہ مرحلہ جھیل ہی  
ہوں تم مرد ہو کر اس مصیبت سے کیوں ڈرتے ہو۔ میں کہوں گا کہ یہ  
تو متفقہ دوسری نہیں کہ کہا جائے۔ " ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے  
ڈوبیں گے! " تم ایک شریف گھر والے کی لے بس خاتون تھیں اور  
میں ایک آزاد و مختار مرد ہوں۔ تمہیں زبردستی بیڑیاں پہنائی  
گئیں۔ تم چاہتی ہو میں خوشی خوشی خود سے پہن لوں۔ بتد اب سے  
اپنے بندہ پر رحم کرو!

جب سے میں نے اس حادثہ کی خبر سنی ہے۔ فرصت کے لات دیا ہے  
شیریں خواب پھر دیکھنے لگا ہوں۔ کاش یہ خواب تمہارے ہاتھوں  
شرمندہ تعبیر نہ بنتا.....

غرض مختلف پیرایوں میں بہت سی خرابیاں اور لجاجت لکھ کر فائدہ بند کیا۔  
ہر رنگی اور اپنے سب سے معتد آدمی کو بلا کر حوالہ کیا۔ نواب صاحب کی حویلی کا  
بہتہ بتایا۔ اور تاکید کر دی کہ سوائے رسوں ماما کے جو میرے اور صاحب کے خطوط لایا  
اور لے جایا کرتی تھی کسی دوسرے کو خط نہ دے۔

کوئی دو گھنٹہ بعد صابروہ کا جواب آیا۔ میرے ہی خط پر لکھا تھا۔  
" رشید صاحب۔ آپ کی شادی مجھ ہی مانگ اجڑی کی وجہ سے  
رک گئی آج پانچواں دن ہے کہ میرا بچہ متیم ہو گیا۔"

اس خبر کا مجھ پر جرات ہو اس کا تجزیہ مشکل ہے۔ میں کبھی روتا تھا اور کبھی  
ہنسنا تھا۔ روتا اس لئے تھا کہ صابروہ نے میرا گھر بدلنے کی کوشش کی اور اس کا گھر

خود اجڑ گیا۔ ایک رنجور و مجبور انسان میں اپنے کو خاص طور سے قسمت کا ستایا سمجھنے کی  
ملاجیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بہت آسانی سے یقین کر لیتا ہے کہ اس کے دست  
اجاب پر بھی جو مصائب آتے ہیں ان سب کا باعث وہی ہے۔ میں نے اپنے کو بہت  
وہوں سے قسمت کا ستایا مجھ رکھا تھا۔ اس لئے صابروہ کے اس نئے غم کا سبب بھی  
اپنے ہی کو مان لینا بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ میں ان مصائب و تکالیف سے  
ابھی طرح واقف تھا جو ایک ہندوستانی بیوہ کو آئے دن برداشت کرنا پڑتی ہیں  
میں اس کو خوب جانتا تھا۔ کہ ہمارے اس ملک میں بیوہ کے معنی بعض موقعوں پر بالکل  
اجھوت کے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس کا سماگ چھن جاتا ہے اور وہ دنیاوی جنگ کیلئے  
بالکل یکدھرتا رہ جاتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے اس طرح کے آلام و مصائب ذرا کم کثرت  
جاتے ہیں جو دیگر ممالک کے باشندوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے دو لکھا کا  
ہر عزیز اسے سبز پیرا۔ منحوس اور قاتل سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنی اپنی ذہنیت، اور  
ملاجیت کے مطابق اس کے لئے سزائیں تجویز کر رہے۔ صابروہ واقعی اس کا بھائی تھی  
اس کا تحمل۔ اس کی بردباری۔ اس کا استغفال بے مدیل و نظیر تھا۔ لیکن پھر بھی  
میاں کا سہارا اٹھ جانے اور ایک باجمعت پردہ دار خاتون ہونے کی وجہ سے  
اس پر کو۔ الٹ پڑا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کس طرح اس کے پاس  
پہنچے اسے تسکین دوں۔ اس لئے اپنی اور اس کی بے بسی پر دل گرہا تھا اور اکثر  
بڈھتے تھے۔

ساتھ ہی نہیں بھی آتی تھی۔ اور وہ اس بات پر گرنی صابروہ خوشیاں منانے  
اور مجھے دلدھا بنانے چلی تھیں۔ گویا اس صنفی لطافت و نزاکت کے باوجود آپ نے  
میرے لئے قیام نزل اور کا تب تقدیر سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا! ایک لحاظ  
ایک بری چہرہ کے دست میں دوسری جانب مغرور کاغذ کا فلاں پیچہ! پھر اٹھال پر  
بھی نہیں آتی تھی کہ جہاں تک اس ہونے والے رشتہ کا تعلق تھا مجھے اس کے ٹل جانے سے  
خوشی تھی مگر، حرد، سری جانب خدا جانے کیا کیا چہ میگوئیاں ہو گئی اور بہت  
ممکن ہے کہ ناکردہ کار جو میرے سر منڈھی جانے والی تھی اپنے دل میں گھس گئی۔  
کر دھتی ہو۔ اور اس خیمے سے چھوٹنے پر اطمینان و اطمینان کے جذبات۔ اور حراس  
نئی رکاوٹ کے باعث ایک مست شہاب حسینہ کے چہرے پر غم کے آثار!  
میں صبح عرض کرتا ہوں کہ میرے دل میں سوائے ان جذبات کے اس وقت تک

کرنا شرافت وغیرت نہیں بلکہ خودکشی ہے اور فحش کا صریحی خون ہے۔ یہی کرنا تھا تو دنیاوی زندگی اور جہد البقا میں حصہ ہی کیوں لیا۔ راہب بن گئے ہوتے ہی شخصیت ہی مٹا ڈالی ہوتی۔ اپنے کو اس طرح فنا کر دیا ہوتا کہ بجائے رشید کے خود بھی مآبرہ ہو گئے ہوتے!

یہ طعن و تشنیع۔ وار اور رد۔ حملہ اور دفاع۔ میرے بسنے کے اندر برابر جا رہی ہے۔ میں نے بڑی شکلوں سے اس جنگ زرگری کو بند کیا اور مآبرہ کو حسب ذیل تعزیت کا خط لکھا:-

”میں تمہیں کس منہ سے تسکین دوں۔ نہ میں تمہارے گرد و پیش کے لوگوں سے واقف اور نہ ان واقعات کا مجھے علم جو تمہیں اس وقت پیش آ رہے ہوں گے۔ بے بس ہوں ورنہ تم تک کی طرح پہونچتا اور اپنا خون بہانا مگر تمہاری ترگی آنکھوں سے آنسو نہ نکلنے دیتا۔ لیکن اگر کسی قسم کا کام ہو تو ذرا اپنے غلام کو نہ بھولنا۔ اس وقت یہ نہ سوچو کہ میں کیا ہوں۔ کون ہوں۔ بس اتنی سی بات یاد رکھو کہ خداوند عالم نے تمہاری خدمت کے لئے ایک منین نما انسان بنا دیا جو تمہاری خوشی کے سامنے دنیا میں کسی امر کی پروا نہیں کرتا۔

خدا ہی تمہیں مہر دے۔ یہ غم عورت کے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ خدا تمہارے بچہ کو اپنی جہالت، دماغت میں رکھے وہ ابھی اس نعمت کی قدر کیا جانے جو اس سے چینیں لی گئی ہے۔ تمہیں اب باپ اور ماں دونوں کے فرائض ادا کرنے ہیں..... ہیں تمہارے احکام کا ہر وقت منتظر رہوں گا۔“

مابعد فی اس خط کا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن دسواں۔ بیسواں۔ چلم وغیرہ جو نواب صاحب مرحوم کے لئے کیا گیا ان سب کی مجھے باقاعدہ اطلاع دی گئی اور میں ہر ایک رسم میں برابر شریک ہوا۔ اس آمد و رفت میں وہاں کے عیال اور دار و دروغ وغیرہ سے ملاقات ہو گئی۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ نواب صاحب پانچ سو کا وثیقہ تھا اور شہر میں چند مکانات بھی تھے جن سے خاصا کرایہ ہوتا تھا۔ جس مکان میں مآبرہ مقیم تھی وہ پرانے محلوں کی شان کا تھا۔ مردانہ اور زمانہ حصہ علیحدہ علیحدہ کافی وسیع اور کشادہ لیکن چونکہ نواب صاحب کے

کوئی اور خیال نہ آیا تھا۔ لیکن شام کو جب جاوید آئے اور ان سے گفتگو ہونے لگی تو انہوں نے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا کہ جس سے میرے خیالات و جذبات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ جاوید میری اور مآبرہ کی حالت پر افسوس کہتے رہے۔ اس کے بعد کچھ دیر چپ رہے۔ پھر یکبارگی مسکرا کر بول اٹھے۔ ارے یار رشید تم بھی عجیب سو دلتی ہو۔ اب تو میدان صاف ہے۔ مآبرہ بیکہ تو اب تمہاری ہیں!

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیت جاوید نے میرے قلب پر اپنا نگہ بھر کاوا کر دیا ہو۔ میری اور مآبرہ کی محبت ایسی نہ تھی کہ میں اس کی مصیبت کے وقت ان لغویات پر غور کر سکتا۔ میں نے اسی لئے جاوید کو بہت ہی تیکے تیوروں سے دیکھ کر کہا۔ ”جب تمہیں شریفوں کے احساسات و جذبات کا علم نہیں ہے تو تم خاموش ہی رہنے کی کوشش کیوں نہیں کیا کرتے۔ جو بھی مہل بات منہ میں آئی کہہ کر رہے! وہ کچھ شرمندہ و منفعل ہو کر اپنی صفائی میں بحث کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں نے نہ! اڈاٹ کر کہا۔ ”بہتر ہے کہ آپ اس وقت خاموش ہی رہیں ورنہ ممکن ہے کہ آپ پھر کوئی ایسی بے تکلی بات کہیں کہ میرے لئے اور بھی باعث آزار و تکلیف ہو۔“

انہوں نے آزر دہ ہو کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر گھر چلے گئے۔ تھوڑی تو میں ان کو جیکے جیکے خوب برا بھلا کہتا گیا۔ پھر بدظننتی اور خود غرضی سے آہستہ آہستہ ان کی وکالت شروع کی۔ میں نے گھبرا کر ٹھٹھا شروع کر دیا۔ اب میں لاکھ بے لیسے ڈگ لگاتا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا ہوں۔ مگر دماغ میں وہی ایک فقرہ گونج رہا ہے۔ ”اب میدان صاف ہے۔ مآبرہ بیکہ اب تو تمہاری ہیں!“

شریف جذبات کہتے کہ اس طرح کا خیال بھی اس وقت دل میں لانا کیونکہ بن ہے وہ تو میدان کے سوگ میں بیٹھی ہے۔ اسے اپنی خوشیوں کے پامال ہونے کا رنج ہے اور اپنے بچہ کی بیٹی کی ازیت سے اور تمہیں اپنی خود غرضی سے ظاہر بظاہر نہ ہسی مگر خفیہ طور پر مسرت ضرور ہے۔ نہ تو اس کی تکلیف کا خیال اور نہ اس کا دھیان کہ تم دسے کس طرح تسکین دے سکتے ہو پس اپنے حلوے مانڈے کی فکر ہے! مذیل جذبات کہتے اٹھ برس تک بیٹھے رہے۔ زندگی برباد کی۔ اب بیکہ امید کی جھلک دکھائی دی تو خوش نہ ہونا اپنے کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب اس ستارہ امید کو بھی زبردستی اگنی بے تال سمجھ کر اس سے گریز

ہٹے بھائی اب تک حیات تھے اس لئے یہ مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک میں ان کے حمال رہتے تھے اور دوسرے میں صاحبزادہ بیکم اور ان کا بچہ۔  
چلم کے بعد عدہ کی مدت تک صاحبزادہ کی والدہ بیٹی کے ساتھ مقیم رہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ مدت ختم ہوئی۔ انہیں اپنے ہمراہ لے کر اپنے گھر چلی آئیں۔ پانچ سال پر صاحبزادہ نے رسولن کے ذریعہ میرے پاس کھلایا۔ کہ مجھے ان کے چہلے مل کر تمام واقعات معلوم کر لینا چاہئے اور وثیقہ و مکان کا داخل خارج بچے کے نام کر دینا چاہئے۔ نیز اس کی ولایت کے متعلق ساری قانونی کارروائی کرانا چاہئے۔ میں نے اس سلسلے سے صاحبزادہ کے میکے میں آنا جانا شروع کیا۔ دو ایک بار تو صاحبزادہ کے چچا بڑے صاحب کا درمیان رہا۔ پھر براہ راست صاحبزادہ کے ہاں تمام قضیہ میں نے کھانا شروع کیا۔ ادھر صاحبزادہ کی سسرال والوں نے طرح طرح کے الجھاوے ڈالنا شروع کئے۔ بالآخر مقدمہ ہاڑی تک فوت آئی۔ میں بچہ اس امر میں کامیاب رہا کہ میں نے نواب صاحب کا وثیقہ اور تمام املاک صاحبزادہ کے بچے کے لئے بچالی اور صاحبزادہ کو باقاعدہ اس کی ولایت پر تسلیم کرالیا۔

ان تمام معاملات کے سلجھا نہیں آئے۔ ایک سال کا عرصہ لگا۔ مہری ہونے والی سسرال والے چونکہ صاحبزادہ کے ذریعہ مخالفت کے بعد ردوں میں تھے اس لئے مجھے ان کے ہاں رشتہ سے انکار کرنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ اس کی اپیل اگر ہو سکتی تھی تو صاحبزادہ ہی کے ہاں۔ لیکن اب وہاں تک ان لوگوں کی رسائی نہ تھی۔

ہمارے نجی معاملات اتنے ترقی پذیر ہو گئے تھے کہ زمانے اور مردانے حصے میں جو ٹیلیفون تھا مجھے اس پر عائد ہو کر ہر ہفتے مقدمات کے سلسلے میں صاحبزادہ کے گفتگو کرنا پڑتی تھی۔ جس دن تک صاحبزادہ کی حالت سے مقدمات کا آخری اور قطعی فیصلہ نہیں ہو گیا میں نے کوئی بات سوائے قانون۔ گواہ اور مقدمے کے نہیں کی۔ میں ایک وکیل تھا اور صاحبزادہ موکلہ۔ لیکن..... جب میں نے صاحبزادہ کی زبان سے فیصلہ اپنے موافق سنا تو میں کچری کے سارے کام چھوڑ کر سید صاحبزادہ کے مکان پہونچ۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی اور صاحبزادہ کے "ہلو" کہنے پر مبارکباد دی۔ وہ اپنے بچے کے حقوق کے محفوظ ہونے سے اس قدر

خوش ہوئی کہ رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں رگ رگ کے بولی۔  
"رشید صاحب آپ نے مجھ پر اور میرے بچے پر وہ احسانات کئے ہیں کہ ان کا شکر یہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا۔ "صاحبزادہ فلاں کا شکر یہ نہیں ادا کیا کرتے۔"  
وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ "کمل صاحب میں تو خود کو آپ کی کنیز سمجھتی ہوں آپ میرے محسن ہیں۔ میرے بچے کے محسن ہیں! اللہ اب غلام کا لفظ کبھی اپنے نام کے ساتھ نہ استعمال کیجئے گا۔ مجھے حد درجہ تکلیف ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ بہت خوب۔ لیکن پھر تم بھی کبھی شکر یہ کا لفظ میرے پاس میں منہ سے نہ نکالنا اس سے بڑے غیرت آتی ہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ میرا فرض تھا۔ میرا قانون پڑھنا اب جا کے پڑھا۔

صاحبزادہ نے کہا۔ "یہ آپ کی نیکی و شرافت ہے۔"  
میں نے کہا۔ "جی نہیں یہ میری خود غرضی و فضاہیت ہے۔"

صاحبزادہ کے لب و لہجہ سے استعجاب کا پتہ چلتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟"  
میں نے کہا۔ "خود غرضی کا یہی توفیق صاحبزادہ ہے کہ جو کام کیا جائے وہ اس غرض سے کہ اس سے اپنی مصیبتیں گھٹیں۔ اپنی فکریں کم ہوں۔ اپنا درد دل نکال دوں۔ اپنے قلب کو اطمینان و سکون حاصل کروں میں نے بھی یہی کیا ہے اور صرف یہی۔ جس کام سے تمہاری تکلیفوں میں کمی ہو سکے۔ جس سے تمہارے آرام دور ہوں۔ جس سے تمہارے آرام دور ہوں۔ جس سے تمہاری راحت میں اضافہ ہو۔ وہ میرے لئے سب سے زیادہ موجب انصاف و مسرت ہے۔ اس لئے میں نے جو کچھ اس معاملے میں کہا وہ محض اپنی ہی تکلیفوں کے کم کرنے کے لئے اور اپنی ہی سرتوں میں امانت کی غرض سے یہ اگر خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں کسی پرامل کیا اور مفت مغفرت کے شکر یہ کی کہاں گنجائش؟"

صاحبزادہ دیر تک خاموش رہی۔ پھر رگ رگ کے بولی۔ "تو پھر..... اتنی محنت..... اتنے انکار کا..... کچھ تو عوض میری طرف سے بھی ہونا چاہئے!"

میں نے کہا۔ "اگر معاوضہ ہی لینا ہے تو پھر منہ مانگا ہی لوں گا۔"  
صاحبزادہ نے کچھ گھبرائے کچھ ڈر کے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

میں نے بہت ہی مبتلائی سے کہا۔ کیا آج آٹھ برس کی پرنس کے بعد بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ تم اور صرف تم!“

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر مابراہ آہستہ آہستہ بولی۔ ”اگر آپ کی جگہ کسی دوسرے نے یہ بات کہی ہوتی تو شاید میں اس سے زندگی بھر کے لئے خفا ہو جاتی۔“

میں نے عرض کیا۔ آخر اس خفگی کا نتیجہ کیا ہوتا؟ زائد سے زائد یہی کہ اس سے زندگی بھر ملتیں۔ اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہ دیتیں۔ تو یہ غلام یہ ادب عرض کرے گا کہ خوشنودی کی حالت میں بھی تو اس پر یہ عتاب ہے۔ آخر خفگی و خوشی میں فرق کیا ہے؟“

پھر تھوڑی دیر سکوت رہا۔ اس کے بعد جواب ملا اور یہ جو میں آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور.....“

جب وہ کہتے کہتے رک گئی تو میں نے جواب دیا۔ میں اس کا شکر یہ ادا کرتا ہوں لیکن شاید اتنا تو ہر موکل کو اپنے وکیل سے کرنا ہی پڑتا.....“

مابراہ نے پوچھا اسی خلوص سے؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں ورنہ خلوص سے کام بھی نہ ہوتا!“

مابراہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔ مابراہ مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے کا نتیجہ! تم جانتی ہو کہ مجھے دنیا میں صرف ایک چیز کی خواہش ہے اور وہ تمہاری ذات ہے۔ مجھے نہ دولت کی ضرورت ہے نہ عورت کی۔ نہ دجاہت کی۔ میرے لئے ساری کائنات سمٹ کر صرف ایک ذات میں محدود ہو گئی ہے۔ مجھے اگر وہ ذات نہ ملی تو میرے لئے زندگی ایک مستقل غذا ہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی کے لئے دجھو جہنم کا ڈر اور نہ جنت کی پروا!.....“

مابراہ نے بات کاٹ کر کہا۔ رشید صاحب میں نے مانا کہ آپ میری وجہ سے بڑی اذیتیں ہوئیں۔ مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ دین و ایمان سب بھول کر جہنم و جنت سب سے انکار کر کے کفر کینے لگیں!“

میں نے غصہ میں کہا۔ ”یگم صاحبہ میں نے خدا و رسول والی ہی بات کہی تھی جو آپ اس قدر ہم ہو گئیں کہ زندگی بھر کے لئے خوش ہوئے کو تیار تھیں۔ کیا خدا نے میرے عقد کا حکم نہیں دیا ہے؟ کیا

رسول اللہ نے خود اس پر عمل کر کے نہیں دکھا دیا ہے؟ لیکن آپ نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ سوائے ہندوستان کے کسی ملک میں اسے نہ معیوب سمجھتے ہیں اور نہ خلافت عقل و شرع.....“

مابراہ نے پھر بات کاٹ کے پوچھا۔ ”اور ہم لوگ اس وقت ہیں کہاں؟ ہندوستان میں یا کسی اور ملک میں؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں ہندوستان ہی میں ہیں۔ لیکن اب ہندوستان کے باشندے بھی نہ اسے معیوب سمجھتے ہیں اور نہ قابل مضحکہ۔ ہندوؤں نے یہ مذہب خیال اپنے دل سے نکال ڈالا۔ اب ان کے ہاں قابل شادی بیوائیں بٹھائی نہیں جاتیں اور نہ ان کے سر مونڈے جاتے ہیں!“

مابراہ نے کہا۔ ”لیکن قابل شادی نا؟ یہاں قابل شادی کون ہے؟ جس کا کافی بن آچکا ہو ایک بچہ کی ماں ہو چکی ہو اور اپنے میں بڑھاپے کے تلم آثار رہا ہو۔ وہ قابل شادی کیونکر ہو سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مابراہ خدا کے لئے ہمارے ہوئے حریف کی طرح جھوٹ بولنے پر نہ اتر آؤ۔ تم اپنے سن و سال کے متعلق اس شخص سے گفتگو کر رہی ہو جو ایک سال سے تمہارا وکیل ہے۔ اور آٹھ برس سے تمہارا عاشق ہے۔ کیا مجھے اتنا بھی حساب نہیں آتا کہ میں ہندوہ میں آٹھ جوڑوں اور اپنی عمر میں بھی اتنے ہی برسوں کا اضافہ کر لوں؟ اگر تم اب ۲۳ برس کی ہوئیں تو میں بھی ۳۰ برس کا۔ پھر خادی سے اور سن سے کیا تعلق؟ کیا میری اور تمہاری محبت بھی بوالہوسی اور جودانیت پر مبنی ہے کہ ہمارے عقد میں بھی جتنا جینا و کیفیات کا لحاظ کیا جائے؟ مابراہ یگم یہ جسم کی نہیں روح کی پیاس ہے یہ وہ پیاس ہے کہ اسے سوائے تمہارے سارے عالم کے دریاؤں کا پانی میاں تک کہ کوثر و تسلیم کا آب شیریں بھی نہیں بجھا سکتا!“

مابراہ نے کہا۔ ”لیکن وہ چشمہ جس سے آپ سیراب ہونا چاہتے ہیں اب خشک ہو گیا!“

میں نے خوفزدہ آواز میں دریافت کیا۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں رہی؟“

صابرہ نے کہا۔ میں نے شاید مثال دینے میں غلطی کی۔ چشمہ خشک نہیں ہوا ہے۔ بلکہ وہ اس قدر گندہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اب اب اس کی پیاس بجھانے کے قابل نہیں رہا۔

میں نے پوچھا یعنی؟  
وہ بولی۔ یعنی یہ کہ میری محبت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی اور کی بیوی بننے کے بعد آپ کی بنوں۔  
میں نے پوچھا۔ یہ محبت کس کی۔ جس کی بیوی نہیں اس کی یا میری؟

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ آپ کی؟  
میں نے کہا تو یہ اظہار محبت کا بالکل ہی اٹوکھا طریقہ ہے چونکہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اس لئے میں ہمیشہ کے لئے عزم بنا دیا جاؤں صابرہ نے کہا۔ سچی نہیں یہ آپ کو ایک طرح کی خودکشی سے بچانا ہے!.....

صابرہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک معطلہ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً ادھر متوجہ ہوئی۔ اس لئے کہ کسی نے پوچھا۔ کون ہے بیٹا۔ وکیل صاحب؟  
صابرہ نے کہا۔ جی ہاں انہوں نے کہا۔ میری طرف سے ان کو دعا کہو۔

میں ٹیلیفون سے سن رہا تھا۔ میں نے صابرہ کو پیغام کی زحمت بچایا اور خود اس سے تسلیم عرض کرنے کو کہا اور مقدمہ جیتنے کی مبارکباد دی۔ وہ خود ٹیلیفون لے کر دعا دے کے بولیں۔ خدا آپ کو بھی مبارک کرے۔ یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ آپ نے میرے قیمتی بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے محتاجی اور غریبی سے بچالیا۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا ہم غریب دکھاریوں کے پاس کیا ہے جو ہم اس کا بدلہ کر سکیں مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتی کہ اگر صابرہ اور اس کا لڑکا شریف ہے تو دونوں یہ احسان کسی وقت نہ بھولیں گے اور جان و مال عزت و آبرو کی چیز سے آپ کے معاملے میں دریغ نہ کریں گے۔

میں نے عرض کیا۔ یہ آپ کیا فرماتی ہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ وہ بولیں۔ تمہارا یہ نہاری شرافت ہے کہ تم اب اسے کہتے ہو مجھے

تو ہمارا تک معلوم ہے۔ تمہیں شاید اب تک کوئی فیس بھی نہیں دی گئی ہے۔

پناہ معطلہ نے سنا، سے اس کی تصدیق چاہی اس لئے کہ وہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ امی میں نوکیتے کہتے تھک گئی۔ اب آپ بھی ارشاد فرمائے دیکھ لیجئے۔

معطلہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ کیوں یہاں میں یہ کیا کہتی ہوں کہ فیس نہیں لینا چاہتے؟

میں نے جواب و شرم کو بالائے طاق رکھ کر موقع سے فائدہ اٹھایا اور عرض کیا۔ بیگم صاحبہ یہ کس نے کہا کہ میں فیس نہیں لینا چاہتا میں تو حضور خود مانگ رہا ہوں۔  
وہ بولیں صابرہ کہتی ہے میں فیس دینا چاہتی ہوں۔ وہ نہیں لیتے۔

میں نے عرض کیا۔ جی ان کا بھی فرمانا ایک حد تک صحیح ہے اور جو کچھ میں نے عرض کیا وہ بھی صحیح ہے۔

وہ بولیں۔ تمہیں میں یہ پہیلی نہیں بوجھی۔ وہ بھی سچی۔ یہ بھی سچے۔ وہ کہتی ہے آپ فیس نہیں لیتے آپ کہتے ہیں میں مانگ رہا ہوں وہ نہیں دیتیں۔ آخر یہ معہ کیا ہے؟

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ بیگم صاحبہ آپ نے ابھی اپنی عورت افزائی اور بندہ نوازی سے یہ فرمایا تھا کہ تو نے وہ کام کیا ہے کہ صابرہ بیگم اور ان کے صاحبزادے کو چاہئے کہ وہ تیرے لئے جان و مال عزت و آبرو تک سے دریغ نہ کریں۔

وہ فرمائیں۔ میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو شریف نہیں۔ جس شخص نے کہ ایک سال سے اپنا خون پانی ایک کر دیا ہو۔ اپنے ہمیشہ کا کام ان کے پیچھے خراب کر دیا ہو۔ دنیا بھر سے ان کے کارن دشمنی مول لی ہو۔ جس نے دیہی ہمدردی کی ہو یہی سگا باپ اور حقیقی بھائی مشکل سے کرنا ہو۔ اس کا امان بھول جانا کینوں کا کام ہے شریفوں کا نہیں۔

میں نے کہا۔ تو معطلہ اس طرح کے کام کی فیس تو صابرہ بیگم نہیں ادا کر سکتی ہیں حضور ہی حلف فرما سکتی ہیں۔



اور نیکی سے کون واقف نہیں ہے۔ پھر پڑھے لکھے۔ وال روٹی سے خوش اندر رکھے تم ہو ہی۔ مجھے ان باتوں کی فکر نہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اب مایہ کنواری بن جایا نہیں ہے۔ بیوہ بچے والی ہے اب اس کی خواہش درفامندی ضروری ہے۔ ذرا اس کا عندیہ لے لوں اور دوسرے اعز سے پوچھ لوں.....“

میں نے کہا۔ تو مجھے اس وقت اجازت دیجئے۔ پھر اشارہ اللہ ضرورت ہوگی تو حاضر ہوں گا“ انہوں نے فرمایا ”اچھا خدا کو سونپا۔ سدھارو“ میں نے تسلیم اور وہاں سے چلا آیا رات کو رتولن ایک خط لے کر آئی۔ مایہ نے لکھا تھا۔

”یہ آخر آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے کہ دوستی اور دشمنی کی باتوں میں فرق نہیں سمجھا جاتا۔ اور اپنی دھن میں چھوٹے بڑے کی تمیز بھی لکھ بیٹھے۔ اسی سے بھلا اس طرح کی خواہش کا کیا موقع تھا۔ وہ میرا بھلا دیکھیں گی یا آپ کا؟ میں آپ سے منت کرتی ہوں کہ اب سے اپنے خیال سے باز آئیے۔ یہ بھینس ہوئی دھوپ ہوں جس میں نہ آپ کو کوئی چکا دیک نظر آئے گی اور نہ کسی قسم کی گرمی محسوس ہوگی میرے ہاں اچھی طرح خزاں آچکی ہے۔ آپ کے ابھی بہار دن ہیں۔ اپنی جوانی پر رحم کیجئے اور اس خیال بد کو دل سے نکال ڈالئے“

میں نے جواب میں لکھا۔

”مجھے دھلتی ہوئی دھوپ اور خزاں یافتہ بہار پڑتا ہے خود میری محبت میں اتنی حدت ہے کہ وہ پروت کو سارا محزون جلا سکتی ہے۔ میرے دل کی آگ تو تم ہی ہو جو برف کی قاش میں بھی حرارت پیدا کرکشی ہے!“

مایہ بیگم صاحبہ! آپ میری ناصح مشفق نہ بنیں بلکہ اس محبت کا مظاہرہ فرمائیں جس میں علیحدگی جڑا

وہ بہت ہی سادگی سے بولیں۔ ”تو مہاں تم بناؤ تو مہی ساخر کیا فیس ہوئی میں ہی ادا کرونگی۔ تم میرے ہی ہاتھوں لینا“ میں نے رکتے رکتے عرض کیا۔ ”تو حضور میں تو اپنی محنت کی فیس ہی سمجھتا ہوں کہ حضور مجھے اس کا حق حلال فرمائیں کہ میں تا عمری طرہ آپ کی صاحبزادی اور آپ کے نواسے کی خدمتیں کرتا رہوں“ وہ بیجاری اس گھاؤ کی بات کو نہ سمجھیں۔ گھر کے بیٹی سے پوچھنے لگیں کہ یہ وکیل صاحب کیا فیس مانگتے ہیں۔ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ بولیں۔ ”اتنی ٹیلیفون پر آپ سے انہوں نے کیا کہا۔ میں اسے کیا جانوں۔ آپ انہیں سے پوچھئے وہ خود ہی اپنا مطلب بتائیں گے“ جتنی دیر میں ماں بیٹی میں گفتگو ہوئی اتنی دیر میں میں نے جلد ذہن میں ترتیب دے لیا تھا اس لئے قبل اس کے کہ بیگم صاحبہ مجھ سے کچھ پوچھیں میں نے عرض کیا۔ ”جناب معطلہ نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور اپنے اس غلام کو اپنی فرزند ہی میں لے لیں“ بیگم صاحبہ میرا یہ فقرہ سنتے ہی ساکت ہو گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سکوت کا باعث استعجاب تھا یا غصہ۔ البتہ میری حالت یہ تھی کہ پٹیکے لگے تھے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا دیکھئے اتنے دنوں کی امیدوں پر پانی پھر مانا ہے یا سوکھے دھانوں پانی پڑتا ہے۔ ساری ساری عمروں کا اضطراب چند لمحوں میں آگے جمع ہو گیا تھا تین با پیشانی سے پسینہ پوچھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ شاید آخر دن قبل فیصلہ ہی کیفیت ہو گئی!۔۔۔ بارے ہر سکوت ٹوٹی۔ بیگم صاحبہ آہستہ آہستہ بولیں۔

”میاں تم نے اس وقت اچانک ایسی خواہش پیش کر دی جو خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ میں بڑے سوچا میں پڑ گئی کہ تمہیں کیا جواب دوں۔“

میں نے جلدی سے عرض کیا کہ حضور میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے اسوقت جواب مل جائے حضور میری ذات میرے خاندان کے متعلق فرمائیں۔ میرے چال چلن کی تحقیق کر لیں.....“ وہ بولیں۔ ”نہیں میاں تمہارے چال چلن۔ تمہاری شرافت

جگہ اتحاد و اتصال کی خواہش کی جاتی ہے۔ میں صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر اب بھی اتکار کیا گیا تو مجھے اس امر کا یقین آجائے گا کہ میں آج ہی نہیں بلکہ پورے آٹھ سال تک بیوقوف بنایا جا رہا ہوں اور پھر وہ بکلیوں کے تحفے نے جس امید کو ہر سال تازہ کیا تھا وہ محض مویوم تھی۔ اس یقین کے بعد میرا کیا حال ہو گا اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ ابھی تک تو خیال تھا کہ تیریں زینم و بریں بگڑم، لیکن جب یہ امید بھی جاتی رہے تو میری حالت اس عار کی ہو گئی جس کا متون چانک گردا یا چلے اور جس کی بنیاد کھود کر پھینک دی جائے

بندہ بے زیادہ دل نہ دلھائے! ع

”رحم کر دینی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے!“

اس خط کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن تیسرے دن بیگم صاحبہ کی مہر کا خط لے کر آئی۔ لکھا تھا۔

”جس رشتے کی خواہش تھی وہ مجھے اور تمام اعز اکوٹ

جان سے پسند ہے۔ مگر صابرہ نہ مرے کھیلتی ہے

اور نہ منے بولتی۔ میری بھویں نہیں آتا کہ میں

کہا کروں“

میں نے مہر سے کہا کہ اچھا تم جاؤ میں جواب بھیج دوں گا اور

صابرہ کو خط لکھا۔

”بیگم صاحبہ کی رہنمائی کا صحیفہ آگیا۔ لیکن آپ کے

ہاں ابھی وہی مند جاری ہے۔ خیر میں نے بھی

فیصلہ کر لیا ہے۔ آج آپ کے سارے بچے خطوط اور ہر سال کی پڑمروہ کلیاں اسی لغز میں ارسال ہیں یا تو آپ ان کی عوض ایک تازہ پھول بھیج کر میری استدعا قبول فرمائیں گی یا پھر اپنے سکت سے اسل امر کو دقت فرمائیں گی کہ میری زندگی کا سب سے بہتر و شیریں خواب نہت کس تعبیر نہ ہو گا! میں ہم گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس طرح روپوش ہو جاؤں گا کہ اللہ تمام عمر پرک پتہ بھی نہ لے سکے گا۔“

کچھ ہی دیر بعد جواب آیا۔ ”آپ، نہ نہ ہوں پھول جاتے۔ مگر باسی ہے!“

میں نے بڑی سرستی و خوشی سے لکھا۔ ”کچھ پروا نہیں۔ میں

اسی پھول کو خون دل سے سینچ کر پڑمروہ کر لوں گا!“

اسی دن بیگم صاحبہ کو بھی اطلاع ہو گئی۔ اور.....

..... اور..... آج تک وہ پھول میری دستار کی

زیب ہے اور بجحدہ اب تک ترو تازہ ہے! س

ان کے گلے کے باسی ہار دیتے ہیں بڑے جالفا

جن پر خزاں سی آچلی میں وہی گل بہا رہا!

.....

.....

..... (ادب) .....

**اگر آپ** عالمگیر کا سالانہ نمبر سب سے پہلے بخفاظت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی چار آنے کے ٹکٹ برائے نمبر ۱۹۳۶ وصول فرمادیں۔ یہ نمبر خیر ساری ساری دنیا میں عالمگیر لاہور

**zaci**

# کلام نواب

(مشرایم - آر - نواب دہلوی)

عجبت ہے ناصح یہ سرکھپانکے کا تیرے اثر نہیں ہے  
ستم یہ ان کا ہے یا کرم ہے تیس کچھ اس کی خبر نہیں ہے  
نگاہ تم سے ٹپ ہے جب سے ہوا ہے بیگانہ خو ز مانہ  
کہاں تک آخر اٹھائے صدمے یہ دل ہے آخر نہ سمجھو پتھر  
طبیعیات رفیق صامت مریضِ فرقت کی غیر حالت  
رو عدم پر چلا ہوں تنہا ترے کرم کا ہے بس سہارا  
نصیب کو ہم جگا رہے تھے نصیب جاگا تو سو گئے خود  
خدا کا شاکی عجبت ہے ناداں قصور ہے یہ تیری سمجھ کا

بھلے بڑے کو وہ خاک سمجھے جسے خود اپنی خبر نہیں ہے  
ہوس میں احساسِ رنج و راحت وہ دل نہیں جگر نہیں ہے  
یہ دل بھی اپنا نہیں ہے اپنا جگر بھی اپنا جگر نہیں ہے  
یہ شام غم شامِ زندگی ہے جہاں میں اس کی سحر نہیں ہے  
دوا میں کوئی شفا نہیں ہر دوا میں کوئی اثر نہیں ہے  
کٹھن یہ رستہ ہے دور منزل پھر اس پہ زادِ سفر نہیں ہے  
ہوئے ہیں پرسانِ حالِ دل وہ تو اپنی کچھ خبر نہیں ہے  
دعا میں بیشک اثر ہے لیکن زباں میں تیری اثر نہیں ہے

خدا ہی جلنے مال کیا ہو سمجھ میں نواب خاک آئے

کہاں ہے جانا کہ حرجلا ہوں جنوں میں اتنی خبر نہیں ہے

# چیتخوف کے خطوط اور کی کے نام

چیتخوف کے خطوط کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ہم وہ مکتوب جو گور کی نام لکھے گئے ہیں۔ یہاں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے قارئین انہیں دلچسپ پائیں گے۔

صفحہ ۱۸۷

یاں۔  
..... آپ اپنے افسانوں کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ میری رائے؟ ..... آپ بلاشبہ نہایت بلند ذکاوت کے مالک ہیں۔ مثال کے طور پر دشت کی رات میں یہ ذکاوت اس غیر معمولی قوت سے ظاہر کی گئی ہے کہ میں یہ افسانہ مطالعہ کرنے کے بعد رشک محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے قلم سے نہیں ہے۔ آپ آرٹسٹ ہیں اور نہایت خوشعنوان انسان۔ آپ کا احساس باحفظت ہے۔ آپ ہیئت گر (منظوم) ہیں۔ یعنی جب آپ کسی چیز کو بیان کرتے ہیں تو آپ اسے دیکھتے ہیں اور ہاتھوں سے چھوتے ہیں یہ فوج مجھ ہے۔ یہ ہے میری رائے آپ کے متعلق اور میں خوش ہوں کہ میں اسے ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں دوبارہ کہتا ہوں کہ میں بہت مسرور ہوں۔ اگر میں ایک دوسرے سے ملنے اور ایک دو گھنٹے گفتگو کرنے کا موقع ملے تو آپ یقیناً معلوم کر سکیں گے کہ میرے دل میں آپ کی کس قدر وقعت ہے اور آپ کی ذکاوت طبع سے میں نے کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ کیا مجھے چند خامیوں کا تذکرہ کرنے کی اجازت ہے؟ مگر یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ کسی کے جو ہر کی خامیاں نکالنا اس عظیم انسان سے بہ خط لکھتے وقت چیتخوف کی عمر ۲۰ برس کی تھی اور گور کی ۲۹ برس کا تھا۔

..... میں گور کی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا اور اس نے چیتخوف اپنے افسانوں کے متعلق رائے دریافت کی تھی +

..... "روسی افسانے" میں جو راقم کی مرتب کردہ کتاب ہے یہ افسانہ شامل ہے +

دشت کی خوابیاں بیان کرنے کے مرادف ہے جو باغ میں اگ رہا ہو۔ اس وقت زیر غور چیز درخت نہیں ہوتی بلکہ اس شخص کا مذاق جو اس درخت کو دیکھ رہا ہے۔ کیا میں صحیح نہیں کہہ رہا ہوں؟

میری رائے میں آپ بقدر کفایت ضبط کام میں نہیں لاتے آپ تھیلو میں ایک ایسے تماشائی کے مرادف ہیں جو اپنے وجد کا اس بے پرواہ انداز میں اظہار کرتا ہے کہ نہ تو وہ خود سن سکتا ہے اور نہ دوسروں کو سننے دیتا ہے۔ ضبط کا یہی فقدان نیچر کو بیان کرنے کی تفصیلات میں عام ہے۔ یہ آپ کے مکالموں میں مغل ہوتا ہے۔

نراکت۔ غدد بہت۔ طراوت۔ اور سرگوشیوں کا عام تذکرہ ان تفصیلات کو ایک آہنگی اور عایانہ رنگین کلامی کا رنگ چڑھا دیتا ہے یہ چیز قارئین کو اچاٹ اور بدول کر دیتی ہے۔

یہ فقدان ضبط عورتوں سے متعلق تفصیلات میں بھی جھلکیاں دیتا ہے۔ اسے شباب فکر یا وسعت نظر نہ سمجھنا چاہئے۔ یہ محض عایانہ ہی ہے آپ کے افسانوں میں ایسے الفاظ کا کثرت سے استعمال پایا جاتا ہے جو اس قسم کی تحریروں میں بالکل نامناسب ہیں۔ یہ الفاظ خوبصورتی کو مسخ کر دیتے ہیں۔ آپ اکثر لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں

..... گور کی کے بیشتر افسانوں میں لڑکوں کا ذکر عام ہے ہم پہلے ان افسانوں کی مثالیں دیکھ چکے ہیں پیش کرتے ہیں +

..... یہاں سفند کی ناز و دلہن لگیں دیواروں میں قید اور بھاری وزنوں کے نیچے بیٹھیں جیسا کہ بن کر اپنی بھائی کو لٹتی ہیں۔ شکایت کرتی ہیں (از چلاش) ..... ہم نے ان کا روشن کیا اور اس کے قریب لیڈٹ گئے۔ رات بہت شاندار ہوئی +

۱۲ گریسبز مسند کی لہری نیچے پٹاؤں سے لنگر اُپر تھیں۔ قریب ہی کوئی خوش گلو  
پردہ راگ الاپنے میں مصروف تھا۔ اس کی نقرئی آواز خنایں جو لہروں کے  
تھیلوں کی جھٹی آوروں کو از حد اسے معمور تھی آہستہ آہستہ مل ہوتی معلوم  
ہو رہی تھی (ازمانی فیلوٹر پور) موسم بہار کے سورج کی کرنیں بادلوں سے  
چھن چھن کر لہروں پر زنگیابی کا کام کر رہی تھیں (از آن سے ارفضا  
سٹوگر کی کسی جائے پیدائش تزیینی چھوڑ کر وہ عرصے تک روس کی  
سرحدوں پر آوارہ پھرتا رہا۔ ۱۹۹۰ء میں وہ فرانسیسی رنگرڈ بھرتی ہو چکے  
ٹھے آیا انگلوس مقدس میں رہا۔ چنانچہ وہ پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔  
خانہ رخی کہ ۱۹۱۰ء کے زمانے میں اسے اپنا قلم اٹھایا۔ کچھ عرصے کے بعد جب  
روسیوں نے پھر روس سے روپیہ برار کر کے وہ دوبارہ فرانسیسی دھنوں میں

آئی تھیں۔ پڑا نیکو مزاج حکمران جو موت کے گھنے دلوں میں سے تدمر کی تحریروں پر ہلکا بہت کہنچسپیں  
 (جی ایچ ماسن نے ہنگامہ ۱۹۱۶ء-۱۸۵۲ء) افتادہ نویس جبکی بیشتر تحریروں (Mash  
 کی کتابوں کے مزدوروں کی ہزار مضامین زندگی کی دردناک داستانیں ہیں۔  
 ایوانوویخ اٹرٹل :- (۱۹۵۰ء-۱۸۵۵ء) مشہور روسی افتادہ نگار  
 ہے۔ اس کے یہ ناول (The enemies) اور (The death of Ivan Ilyich)  
 اچھی ادبی شہرت رکھتے ہیں۔ خاص کر اس کے لئے یہ چیز قابل فخر ہے کہ طاسطائی نے  
 اس کی ایک کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ طاسطائی اس کی تعریف میں کہتا  
 ہے :- جو لوگ روسیوں کی زبان سیکھنا چاہتے ہیں وہ اس کی تصانیف کا مطالعہ کریں  
 فائدہ ہی جو بھی لکھتے ہوئے اس سے ملاقات کرنے کے لئے کہا۔



# اعجازِ سخن

سو طرح گرفتار ہے دل اس کی ادا کا  
 کتنا کفِ قاتل پہ کھلاخوں شہدا کا  
 جو آنکھ بہ آغازِ محبت تھی فنوں ساز  
 کشکولِ ہنرمند دولت دیدار سے چر ہے  
 مرجائیں کیوں جتے می نگھوں میں جھلک جا  
 اے باہر ہیں! دیکھ کے گردوں پہ مہِ عید  
 اک شمع تھی سو گل ہوئی اب خاک اڑے گی  
 ہوں رندِ بلا کوشش میں، لا اطل گراں ہے  
 وہ تندرستِ شعلہ رہوں کہ بہت کو ہے جس کی  
 کرتی ہے تری یاد یوں نہیں دل کو فرحناک  
 کھولے ہوئے بالوں کو وہ نکلتے پئے ماتم

شوخی کا شرارت کا تبسم کا جیسا کا  
 ممنوں نہیں تار و زارِ ابد رنگِ حنا کا  
 منظر نہیں مچ سکتا ہے اس چشمِ حیا کا  
 پھر عرش پہ ہے آج دماغِ ان کے گدا کا  
 ہائے وہ تبسم کہ ہے پروردہ جیسا کا  
 اٹھنا بھی کوئی دیکھے ترے دستِ دعا کا  
 پھر زور بندھا گور غریباں پہ ہوا کا  
 کیا چیزِ غم دہر ہے کیا خوفِ فنا کا  
 کچھ تبسم تلاطم نہ حذرِ موجِ بلا کا  
 جس طرح علی الصبح کوئی جھونکا صبا کا  
 اے چشمِ ذرا دیکھ یہ منظر بھی عزا کا

صد حیف کل اس شوخ نے پتھر پہ وے مارا

اعجاز وہ شیشہ کہ تھا پیمان وفا کا

سعید احمد اعجاز



# سارہ

(مشہرہ آفاق روسی افسانہ نگار چیخوف کا ایک عجیب افسانہ)

رات کی تاریکی چھارہ بجی تھی کلیسا کا محافظ سیٹلے گلیکس اپنی جھونپڑی میں سو کر جاگے ساتھ ملے تھے۔ اپنے لیے چوڑے بستر پر دنا تھا۔ گوا سے مرفوعی روح جھوم جانا کی عادت تھی، مگر وہ ابھی بیدار تھا۔ اس کے سرخ اور کچھسے ہوئے بال میلے کھیلے خاف سے باہر نکلے ہوئے تھے اور بھاری غلیظ پاؤں دوسری طرف سے نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ سننے میں مصروف نظر آتا تھا۔ اکی جھونپڑی اس دیوار سے ہم کنار تھی جو کلیسا کا اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ اس کے دیہیے میدان کی طرف کھلتے تھے۔ باہر میدان میں ایک بنگلہ کار رہا۔ برپا تھا۔ یہ معلوم کرنا کہ کس کی ہستی مصروف گیتی سے نابود کی جا رہی ہے۔ پاکس کی تباہی کے لئے قدرت اس قدر مضطرب و ہنگامہ آرا ہے بہت دشوار تھا لیکن پھر بھی یہ سب سمجھ دینا۔ اسے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور گرفتار ہلا ہو۔

میدان میں کوئی فاتح لشکر پورے جوش و خروش سے اپنی سرگرمی کا مظاہرہ کرتا معلوم ہوتا تھا۔ تند ہوائیں جھل اگلیسا کی چھت سے دست و گریباں ہو رہی تھیں۔ اور کچھ کیوں کو اپنے گھوڑوں کا تختہ مشق بنا رہی تھیں اور اپنے ہیبس بچوں سے ہر چیز کے بجائے ادھیڑنے میں مصروف تھیں۔ اسی مشرقی فضا میں محسوس کی رقت انگیز آواز و زاری اور نالہ و بکا کی صدا آ رہی تھی۔

چھت۔ آتش و دھواں یاد دیکھے میں کوئی غیر مرئی چیز سسکیاں بھر رہی تھی، یہ صد کسی مدد کی طالب معلوم نہ ہوتی تھی۔ بلکہ انتہائی صدمے کی ایک لہر اس پہنچ تھی جو اس بات کی مظہر تھی کہ اب وقت گزر چکا ہے اور تلافی کا خیال بے بیجا۔

برفانی تودوں پر تھ کی بائیک چاہیں بھی تھیں۔ ان پر اور دشمنوں کے ہتھ پائندوں کے قطرے غر غر رہے تھے یہ شرکوں اور گنڈہ گنڈوں پر کچھ اٹھاتی ہوئی برف کا سیلاب کڑوں لے رہا تھا۔ تھہرے تھہرے نظر سخت ہولناک تھا مگر شاید افلاک کی نظروں سے ظلمتِ شب نے اس بلاخیز طوفان کو اوجھل کر رکھا تھا کہ وہ بدستور برف ہاری میں مشغول تھے۔ جو کسی عمدہ کی طرح

مجھے معلوم ہے۔ مجھے اس کی وجہ اچھی طرح معلوم ہے۔ کھڑکی کے پاس محافظ کی بیوی عسیرہ غلو فنانا ایک معمولی بڑی جوتی تھی۔ ایک دوسرے سٹول پر لٹائیں بڑی مٹی جوتی کی دم اندر نزل مٹھوں اس کے چوڑے شانوں، سٹول اور جاذبِ نظر جسم کے نقشے، اسیلہ بالوں پر جو دراز ہوئے کی وجہ سے کمرش کو چوم رہے تھے۔ تھیں کڑی تھی۔ وہ سوئے اور کھڑوے ٹاٹ کی بوریاں بنانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھ پھرتی کام کر رہے تھے لیکن اس کے تمام اعضاء، ابرو، ہونٹ، اسیلہ گدن، لیکن تھے ایسا معلوم ہوتا۔ گویا وہ محض خواب ہیں۔

کبھی کبھی وہ اپنا سر اوپر اٹھاتی مگر گردن کی تھکان دھک دھک سے اچھڑ لحوں کے لئے دیکھے کی طرف کچھ کمرش کے باہر طوفان ہا دہاراں غصہ بٹھا رہا تھا۔ وہ پھر گردن جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔

اس کے خوب صورت چہرے ابھری ہوئی اماک اور گلوں کو کڑوا کر کسی قسم کی مسرت۔ خواہش یا غم کے آثار مہریدانہ تھے۔ خوبصورت فدا رہا اگر جاری نہ ہو تو کچھ ظاہر نہیں کر سکتا۔

آخر کار اس نے ایک بوری کو غم کر لیا اور اسے ایک طرف پھینک دیا پھر اپنے جسم کو بڑے تھک سے سیدھا کر کے اس نے اپنی غیر متحرک و بے نور آنکھیں کھڑکی کی طرف گاڑ دیں۔ کھڑکی کے شیشے اشک آساقطوں کے ہمراہ تیرتے معلوم ہوتے تھے اور برف کے ان گلوں



صبح کو باہر نکلا اندھ میں نے اس کی حالت دیکھا تو اس کی آنکھوں کے نیچے  
جلتے موزوں تھے۔ گال اندر پچکے ہوئے تھے۔ گت کے دہل میں دہندہ  
آئیں اور ان کے ساتھ ہی یہاں دشکاری آن موجود ہوئے۔ یہ سب کچھ  
میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لعنت ہو ان پر!!  
مگر اب تم کیکڑے کی طرح مریں گے۔ جو رہی ہو؟  
”تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”کیا معلوم نہیں ہے۔“ تو اس سال سردیوں  
میں گرمی کے موقع پر جب دن رات اندھی چلتی رہی تھی۔ کیا ہوا تھا؟  
ایک منشی راستہ بھول کر یہاں آگرا

سگ ناہنجار:۔۔۔۔۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ تمہیں وہ پسند آگیا  
لعین کہیں کا! یہ ہودہ، قازمین سے ایک نٹ اونچا چہرے پونپیل و  
مردن مڑی ہوئی:۔۔۔۔۔ اگر شکلیں ہوتا تو عیسویہ بات تھی  
مگر وہ۔۔۔۔۔ آف۔۔۔۔۔ وہ تو شیطان

کی طرح مکر و صورت تھا؟

یہ کہہ کر ہی غلطے سانس لیا اور ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے سینے

لگا۔ غصی کی صدا سنائی دے رہی تھی لیکن ہوا بدستور چھت کے ساتھ مل کر  
شور پیدا کر رہی تھی۔ یکایک تاریکی میں پھر وہی جھنکار دہندہ ہوئی۔

”اب وہی کچھ ہونے والا ہے۔“ سیٹھ نے سلسلہ کلام جاری  
رکھتے ہوئے کہا: ”اکیس یونہی گراہ نہیں پھر رہا ہے۔ میری آنکھیں ٹکڑا دینا  
اگر وہ تمہاری تلاش نہ کر پاو۔ آہ۔ شیطان اپنے کام سے اچھے پیسے  
بنالیتا ہے۔ اور تمہاری اچھی طرح مدد بھی کر سکتا ہے۔“ وہ پھر پھر کہہ رہی جا رہی  
میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ خوب سمجھتا ہوں: تم اسے چھبنا نہیں سکتی  
سو۔۔۔۔۔ تم شیطان کی خالہ۔۔۔۔۔ چالاک کافرہ!  
جونہی اندھی شروع ہوئی مجھے پتہ لگ گیا تھا کہ تم کس سے جاگ رہی ہو؟  
”اب تم اور کسی حق میں کیا فرق ہے؟“ بیوی نے مسکراتے ہوئے  
کہا: ”کیا کہہ رہے گے؟ اندھیاں میں لاتی ہوں۔۔۔۔۔ دماغ میں  
بھروسہ بھرا ہوتا تھا۔“

”ہوں!۔۔۔۔۔ دانت دکھانے ہو؟  
پھر دانت دکھانا دیا۔۔۔۔۔ حال میں تو سمجھتا ہوں کہ جب کبھی تم راخون چشما

# بچوں کی وقت بڑھانے والی مشہور دوا دوگر عمر کا بال امرت

نہ خریدنے

تقلی دوا

یہ دوا بچوں کے کال بال امرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے خوشی سے پیتے ہیں۔ بچوں کی کھانسی بخار، ہڈی  
پیش و غیرہ امراض جو اکثر ناگہانی کے بجائے پیدا ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور بچوں  
کا بدن تھوڑے عرصہ میں گوشت سے بھر کر فربہ اور وزن دار بنتا ہے۔

لاہور ایجنٹ

سکاٹلینڈ ریموڈ ایجنٹ مسٹر۔ ڈی۔ ایم۔

”تم خواہ مخواہ مجھے اپنا تفریق مشق کیوں بنا رہے ہو؟ بے ایمان کہیں کے!“ اس کی بیوی صبر کھو چکی تھی: ”آخر تم کو کتنا سکی طبع اس بات پر کیوں جگے ہوئے ہو؟“

”میں اپنی بات پر اس لئے جاہرا ہوں کہ اگر خدا بچائے . . . . . اسی قسم کا راتھ پھر پھر پڑے رہا سنتی ہو؟ اگر کج رات پھر کوئی ایسی دوسری بات ہو تو میں صبح اٹھنے ہی سیدھا قافہ نکو دم کے پاس جاؤں گا اور صاری رام کہانی کہیں اداں گا میں صاف الفاظ میں کہہ دوں گا: ”گستاخی معاف۔ مگر بیوی ضرور جاوے گی ہے“ وہ پوچھے گا: ”کیسے؟“ ہوں، ”کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ تم کیسے جاوے گی ہو؟“ . . . . . میں اسے بتا دوں گا مگر لعنت ہو تم پر اسے عورت۔ روزِ محشر ہی کو نہیں بلکہ تم ہی زندگی میں ہی اپنے کئے کی سزا بھگت لو گی! میں یونہی نہیں کہہ رہا۔ بخاری نوعیت کے لوگوں کے لئے مقدس کتاب میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔“

”ایک کھڑکی پر ایسی بلند اور فرعونی دستک برقی کہ سیٹیلے کاؤنگ زرد پڑ گیا اور قریب تھا کہ وہ خوف کے مارے پیچھے کی طرف گر پڑے۔ اس کی بیوی بھی سخت خوف زدہ ہو گئی۔“

”ادراؤ خدا ہمیں اندر آنے دیجئے۔“ ہم باہر سردی سے ٹھہرے ہیں۔ ”حافظ اور اس کی بیوی نے ایک لمناں اور بھدی آواز کو کیسے سنہوڑا سنا۔ یہاں کون صاحب رہتے ہیں؟ خدا کے لئے رحم فرما کہ ہمیں اپنے یہاں پناہ دیجئے۔ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔“

”تم کون ہو؟ عیب سے دریافت کیا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکے سے خائف تھی۔

”مڈا کے“ دوسری آواز نے کہا۔

”تم اپنے شیطانی ارادے میں کامیاب ہو گئی ہو؟ سیٹیلے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”عطی کا کوئی امکان نہیں۔ میں بجا کہہ رہا ہوں خیراب دروازہ کھول دو۔“

”یہ کہہ کر حافظ مدھچلا لگوں میں اپنے بستر پہنچ کر پتوں والی چٹائی پر لیٹ گیا۔ اندوہ کی طرف نہ موڑ کر بڑبڑانے لگا۔ فوراً ہی اس نے اپنی پشت پر سر دھکا جھونکا محسوس کیا۔ دروازہ کھلا اور ساتھ ہی ایک لمبا

سب تو طوفانی موسمِ طوفانی ہو تو سر پھرے فوجیوں کی یہاں پر آمد سہلات میں سے ہوتی ہے جب اسی قسم کے واقعے کی بارشیں چلے ہیں تو یقینی امر ہے کہ تم ہی ان سب کی محرک ہو۔“

اپنی گفتگو کو زیادہ مؤثر بنانے کی خاطر حافظ نے اپنی انگلی پیشانی پر رکھی۔ بائیں آنکھ کو بند کر لیا اور ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کرنے لگا۔ مگر تم واقعی نسلِ انسانی سے تعلق رکھتی ہو؟ اور جاوے گی نہیں ہو تو تمہیں خود کرنا چاہئے کہ یہ سب ستری منشی اور شکاری انسان نہیں تھے بلکہ شیطان ان کا بھیس بدلے ہوئے تھا۔ آہ! تمہیں اس کے متعلق ضرور فکر کرنا چاہئے۔

”سیٹیلے“ نے جاہل بد اس کی بیوی نے اس کے چہرے کی طرف ہمدردانہ نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

جب آواز زندہ تھی تو بایں ہر قسم کے گزیر یا کے علاج کے لئے آیا کرتے تھے۔ وہ ہر روز ہی آتے مگر اس وقت کسی نے بھی انہیں شیطان کے نام سے نہ پکارا مگر ان دنوں جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر طوفانی موسم میں پناہ لینے کے لئے یہاں آجاتا ہے تو تم اس کی آمد پر حیرانی ظاہر کرتے ہو۔ اور جاہلوں کی طرح ہر قسم کے شبہات کو اپنے دل و دماغ میں جمع کر لیتے ہو۔

بیوی کی عقل درست لال سیٹیلے پر اثر انداز ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں کھڑا سر جھکائے اس پر غور کر رہا تھا۔ اصل ابھی تک اسے اپنے شبہات کی صحت پر پورا یقین نہ تھا۔ بیوی کی معنی خیز گفتگو نے اس کے شک کو تھوڑی دیر کیلئے بالکل رفع کر دیا۔ مگر فونڈا ہی اسے کچھ خیال آیا اور وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔

”مگر یہ بھی نہیں ہو کہ بورے۔ بلکہ دسے یا اپنا بیچ پناہ لینے کے لئے آئے ہوں بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ فونڈا ہی رات کاٹنے کے لئے یہاں آدھمکے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟“ اگر ان کی آمد آرام طلبی تک ہی

محدود ہو تو کنگ بات ہے مگر وہ تو شرارتیں کیا کرتے ہیں۔ . . . . انہیں، دنیا میں تمہاری صنف سے بڑھ کر چالاک اور ریاکار اور کوئی مخلوق نہیں ہو سکتی جس سلیم کا مادہ تم میں رتی بھر بھی نہیں مگر ریاکاری آف آف، کچھ تو چھوٹی نہیں۔ . . . . خدا بچائے پھر ڈاکے کی گھنٹی

کی آواز آ رہی ہے! آندھی شروع ہونے پر ہی میں تمہارے دل کی بات جانا گیا تھا۔ . . . . یہ سب تیری فنوں سازی سے۔ . . . . مگر ڈی“

ترہ مگاجوان برف سے لت پت دلیز پر نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی اسی ہیئت کذا فی میں دکھائی دے رہا تھا۔

”تھیلے بھی اندر لے آؤں کیا“ دوسرے آدمی نے اپنے ساتھی سے بھدی آواز میں کہا۔

”تم انھیں باہر کو نکال چھوڑ سکتے ہو“ یہ کہتے ہوئے پہلے شخص نے اپنی برساتی کو اتارنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی یہ عمل ترک کر کے اسے اپنی ٹوٹی کیت کھینچ کر انگلیشی کے پاس پھینک دیا۔ پھر اپنا بڑا کوٹ اتار کر ایک طرف گھٹنے کے بیڑیک سلیک کے بغیر چھوڑ بیٹھ گیا اور دھڑ دھڑاتا شروع کر دیا۔

یہ ڈاکو ایک خوب رو فوجوان تھا۔ ایک بھدی سی دروی اور بڑے بڑے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ادھر ادھر ٹیلے سے جب اس کے سر جو ہم میں حصار عود کرتا تو وہ ایک میز کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ آؤد پاؤں بور یوں پر پھیلا دیئے اور ٹھوڑی کو ہاتھ کا سہارا دے کر خاموشی سے سوچنے لگا۔ اس کا چہرہ بعض جگہوں پر ہمدردی کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس طرفان کی کوفت کے استار بھی اس کے چہرے پر نمایاں طور پر ظاہر تھے جس سے وہ بھی بھی رہائی حاصل کر کے آیا تھا۔ مگر غم و غصے نے اس کی حالت میں ایک تغیر پیدا کر رکھا تھا۔ مگر وہ اس گھلتی ہوئی برف کے باوجود جو اس کے ابروؤں کو چھو ل رہا تھا پر جم رہی تھی خوش شکل معلوم ہو رہا تھا۔

”یہ بھی گتوں ایسی زندگی ہے!“ ڈاکو نے دیواروں پر اس انداز میں نگاہیں گھماتے ہوئے دہی زبان میں کہا جیسے وہ یقین نہیں کر رہا ہے کہ وہ کسی گرم جگہ میں محو ہے۔ ”اگر آپ کو بخشنی دکھائی نہ دیتی تو ہماری تباہی یقینی تھی! خدا ہی جانتا ہے یہ طرفان کب تھے گا! اس ڈیل زندگی کا کوئی انجام نہیں! ہم اس دقت کس جگہ موجود ہیں۔ اس نے محافظ کی بیوی سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔

”گلو لیسکی پہاڑی پر . . . . . جذبی کانی نوٹکی کی جائگہ کے پاس“ عرصہ نے چونک کر شرماتے ہوئے جواب دیا۔

”سن رہے کی ہیں؟“ ڈاکو نے مرد کر اپنے ساتھی کو چوان کو کہا۔ جا بھی تک اپنے کا نہ حوصلہ پر ڈاک کا تھیلہ اٹھائے دروازے میں کھڑا تھا۔

”ہم لوگ گلو لیسکی پہاڑی پر پہنچ چکے ہیں“

لوگو چلان نے ایک بھدی آہ سنا آہ ازیں کہا اور ساتھ ہی باہر جا کر ایک اور تھیلہ اٹھا لیا۔ ایک بار پھر باہر گیا اور ڈاکو کی تلوار اور بیٹھی اٹھا لایا۔

ان چیزوں کو احتیاط سے دیوار کے ساتھ رکھ کر وہ باہر والے کمرے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر سگریٹ پینا شروع کر دیا۔

دشیا یاد آپ اس سفر کے بعد ٹھوڑی سی چپائے پسند فرمائیں گے؟ رعیت نے ڈاکو سے دریافت کیا۔

”ہم یہاں چائے پینے کے لئے کیونکر ٹھہر سکتے ہیں“ ڈاکو نے تیوری پر ٹھکانے ہوئے کہا۔ ”ہمیں جلدی کرنی چاہئے۔ ٹھوڑی دیر آگ سے اپنے کے بعد ہمیں جلد روانہ ہو جانا چاہئے۔ درنہ اندیشہ ہے کہ ہم ڈاک ٹھوڑی کو کھو بیٹھیں گے۔ دس منٹ اور سستانے کے بعد ہم یہاں سے اپنی راہ لیں گے۔ آپ ہمیں راستہ دکھا دیجئے گا۔ یہی آپ کی عنایت ہوگی!“ یہ تو ہم بھی ایک مذاپ ہے“ رعیت نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ہوں . . . . . جی ہاں“ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔

”ہم یہاں گرجے کے ساتھ رہتے ہیں۔ پادری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ . . . . وہ میرا خاندان ہے جو سو رہا ہے۔“

تھیلے اٹھوا دیا اپنے ہمانوں کی خیر و عافیت دریافت کر دے۔ . . . . آج سے اٹھارہ بیسین پہلے یہ گرجا ہوا کرتا تھا۔ بے شک

جب یہاں شرفا سکونت پذیر تھے تو عبادت کے لئے بہت سے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے مگر اب کہ شرفا قریب قریب یہ جگہ چھوڑ چکے ہیں۔ یہاں کیہنا غالباً فضول ہو گا کہ اب پادری کا مذبح معاش بالکل محدود ہو چکا ہے۔

تھیلے دیکھا کہ وہ قریب ہے۔ ان دنوں وہ گرجے کی رکھوالی پر رہتا ہے۔ اس کے بعد فوراً ہی ڈاکو نے یہ بھی بتایا کہ اگر سنیٹے جنرل کی بیوی کے پاس جلسے اور ملاٹ پادری کے نام ایک سفارشی خط کی درخواست جیتے

تو ایک چچی نوکر والی جانا مقننی ہے۔ . . . . لیکن سنیٹے جنرل کی بیوی کے پاس جاتا ہی نہیں وہ سخت کابل ہے اور لوگوں سے ڈرتا ہے۔ . . . . ہر کثیف ہم گرجے سے منسلک ہیں۔

رعیت نے اپنی انگلیوں میں ان الفاظ کا اضا کرتے ہوئے کہا۔



سے بھری ہوئی اور سیخیلے کی جھڈی اور کڑھائی ایسی ٹانگوں سے کہیں ملے۔ وہ  
خوب صورت تھیں۔ حقیقت سیخیلے اُڑا کئے کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

”میں جہدِ شیطان ہی ہوں“ سیٹھ نے چند لمحات کے توقف کر کے  
 کہا: ”مگر ان لوگوں کا یہاں سونے سے کیا مطلب ہے؟“  
 وہ سرکائی کلام کہتے ہیں، اگر دیر ہوگئی تو اس کے لئے ہمیں جواب دینا  
 پڑے گا۔ اگر کسی کا فرض خطوط کے نیچے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہے۔ تو  
 پھر سوچا جا کیا معنی رکھتا ہے۔ فرض کی ادائیگی لازم ہے۔

اے میاں! ستیفیلے نے باہر والے کمرے کی طرف رخ کر کے پکارا۔ اے  
 میاں کو چوان . . . . . تمہارا نام کیا ہے؟ آؤ میں تمہیں راستہ  
 بتا دوں۔ ڈرا کے گھوڑے اس طرح سوننا نہیں چاہئے!“

اسے استیقن سے بھر کر گھنٹہ بٹرنے لگا۔

..... اگر جانے کا ارادہ نہیں تو یہ دست طراز عمل نہیں ہے۔

س سطح سو بنے سے کام نہیں چلے گا“

”مگر جاگ رہے ہو تم میاں؟“ سیٹھ نے بولنا گیا۔ ”تمہاری نوکری  
یہ ہے کہ وقت مقررہ بڑا دک کے کمرے پہنچو۔۔۔۔۔ سن رہے ہو کیا؟  
جیو آؤ۔ میں تمہیں راستہ دکھا دوں!“

اگر جسم آرام کا عادی ہوگا تو انہیں خواہ وہ حالت میں اسے محافظ کی سوئی کی

سپید گردن اور غیر متحرک انھیں نظر آئیں۔ وہ سسکا دیا اور انھیں بند کر لیں۔ مگر یاد  
کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

”مگر اس موسم میں آپ کیونکر گھرتے باہر قدم رکھ سکتے ہیں۔ ڈاکے نے  
نیم خواجہ کی حالت میں ایک زمانہ آواز سنی“

”آپ کو تھوڑی سی نیند اور لمبے لمبی چائے مفید ثابت ہوگی۔“  
”مگر ڈاک کی ترسیل کا کیا انتظام ہوگا؟“ ساتھ ہی عیسے کے خاوند کی

”میرا ذرا بڑا بھائی کون ہے جسے گناہ“



وہ نگلیوں سے عشیہ کی گردن کو چھوا اور یہ دیکھ کر وہ بڑا نہیں مان رہی اس کی گردن اور شاؤں پر ہاتھ پھرنا شروع کر دیا۔

”تم بہت . . . . .“

”تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرو . . . چائے تو پیتے جاؤ“  
”اسے یوں نہ رکھئے۔ اس طرح قیام دیجئے۔“ باہر سے

کوچان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”آپ کو ٹھہرنا ہوگا . . . دیکھئے نا ہمارا کس تیزی سے چل

رہی ہے۔“

یہ سن کر ڈاکہ ایک ایسی خواہش سے بالکل مغلوب ہو گیا جس کی موجودگی میں ڈاک کے تھیلے ڈاک کی گاڑی . . . . . دنیا کی ہر ایک چیز بھول جایا کرتی ہے۔ اس نے خوف زدہ انداز میں دروازے کی طرف منگھایا، اٹھائیں جیسے وہ اپنے آپ کو چھپانا چاہتا ہے۔ یاد ہاں سے فرار ہو جانا چاہتا ہے پھر عشیہ کو کمرے پر کڑ کر روشنی مٹا کرنے کے لئے لمپ کی جانب بھٹکا مگر فڈائی پر سے ہٹ گیا۔ باہر والے کمرے میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی کوچان دلیزمین آؤدرا ہوا۔

”گاڑی تیار ہے“ اس نے آتے ہی ڈاکے سے کہا۔

یہ سن کر ڈاکہ چند لمحوں خاموش کھڑا رہا۔ پھر عزم کرنے کے بعد کوچان کے ہمراہ باہر چل دیا۔ عشیہ اب اکیلی رہ گئی۔

”آئیے اب ہمیں راستہ بتائیے“ اس نے بڑے سے میں ڈاکے کو اپنے خاوند سے گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھنٹی کی صدا آئی کچھ توقف کے بعد دوسری گھنٹی کی ٹن ٹن کا ایک سلسلہ فضا میں پھیل گیا جب تھوڑی دیر کے بعد گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ غائب ہو گئی۔ تو

عشیہ اٹھی اور ادھر ادھر ٹھہلنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل وہ زندہ تھی مگر اب اس کے پہرے پر ہر شے قفس کر رہی تھی اس لئے بھول رہی تھی۔ اور انھیں کسی جہت خیز غصے سے چک رہی تھیں جنہوڑی ہیں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی وہ ایک پھری ہوئی شیرنی کی طرح معلوم دے رہی تھی جسے کسی نے بچرے میں سلاخ سے چھڑ دیا ہو ایک لمحے کے لئے کھڑی ہو کر اس نے اپنی جائے رہائش کا جائزہ لیا۔ کمرے کا قریب قریب نصف حصہ چار پائی نے روکا ہوا تھا جس پر ایک ٹیٹا بستر اور میسلے کچے اونٹ سے سیدھے چڑے ہوئے تھے بستر پر چھوڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ بالکل

سینے کے مستشرق کو درے بالوں کے مانند معلوم ہو رہا تھا بستر سے اس کے دروازے تک جو باہر والے سرد کمرے کی طرف کھلتا تھا آتشکدن بنا ہوا تھا جس کے آس پاس برتن بکھرے پڑے تھے۔ کمرے کی ہر شے مع غیر حاضر سینٹیلے کے اس درجہ غلط۔ بعد دی اور کمرہ مٹی کر اس گدلی نضام میں کسی عورت کی سپید گردن اور نازک بدن کی موجودگی سخت حیرت خیز تھی۔

عشیہ ڈاکر بستر کی طرف لپکی اور اس انداز میں ہاتھ پھیلانے لگی جیسے وہ اس بستر کو بوائے اچھا اچھا کر اس کی دھیمان بکھیر دینا چاہتی ہو مگر نورانی غفلت سے ہاتھ بھرنے کا خیال کر کے وہ نیچے بٹ گئی۔ اور پھر ادھر ادھر ٹھہلنا شروع کر دیا۔

جب دو گھنٹے کے بعد سینٹیلے کھٹکا ہوا اور بھٹ سے لٹ پٹ واپس آیا تو اس وقت عشیہ کپڑے اتار کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی جو اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر اس کے چہرے کے رنگ کا تغیر و تبدل صاف طور پر چہلیاں کھا رہا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے مگر واپس آتے وقت سینٹیلے نے قسم کھائی تھی کہ وہ دوسرے روم تک اپنی بیوی سے ہم کلام نہ ہوگا۔ بلکہ اسے ہاتھ تک نہ لگائے گا۔ مگر وہ طنز کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”دھری رہ گئی نا تمھاری سب جاو گری۔۔۔۔۔ کہاں ہے۔ اب وہ تمھارا ہے۔“

اس کی بیوی خاموش رہی مگر تھوڑی دیر تک ہی اس کی لڑائی خود اڑھوئی سینٹیلے نے لباس اتارا۔ اور عشیہ کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔  
”میں کل ہی فائدہ کو دم کو تمھاری ساری کرتوت کہہ سنائیں گا۔“  
اس پر عشیہ نے کر دٹ بدلی اور اس کی طرف چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

”کسی جنگل میں دوسری بیوی کی تلاش کرو۔۔۔۔۔“  
مرد وہیں کے! میں تم اپنے کہینے۔ سحرے اور انسانی انسان کی بیوی نہیں بن سکتی۔ خدا مجھے معاف کرے!!“

”بس بس اب سو رہو۔“  
”میں کس قدر جلے نصیب والی ہوں!“ عشیہ رونی آواز میں بولی۔  
”کر تم نہ ہوتے تو میں یقیناً کسی اچھے مرد کے پتے بندھتی!“  
”مہربان میں کیوں منجھد نہ ہو گئے! تیری برف کے نیچے قبر کیوں نہ بن گئی!!“

ہجے میں کہا۔

مگر تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد جب وہ خاموش ہو کر بولی تو سیٹھ نے اس کے سر کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔۔۔۔۔ اس کی ایک گھنی زلف کو چند لمحوں کے لئے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ وہ نیند میں اپنے خاوند کی اس حرکت سے بے خبر تھی۔ یہ دیکھ کر سیٹھ نے اور جرات پا کر اس کی گردن تھپکنا شروع کر دی۔

”ہٹو پرے“ رعیدہ چلائی اور ساتھ ہی اپنی کہنی اس شدت سے اس کی ناک پر ماری کہ سیٹھ کے کانچوں کے سامنے تارے نظر آ گئے۔

اس کی ناک کا درد بہت جلد رفع ہو گیا۔ مگر دل کا درد بدلتا رہا۔

سچینوف (سعادت حسن منٹو)

تھوڑی دیر اور چلا کر رعیدہ نے ایک آہ بھرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔۔۔۔۔ باہر طوفان بدستور جاری تھا۔ جھونپڑی کی دیواروں۔ دو گوش اور انگوٹھی میں سے کسی غیر مرئی چیز کے سسکیاں بھرنے کی آواز ابھی بھی سیٹھ کے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صدائے گریہ خود اس کے کانوں اور سینے میں موجود ہے۔ کرات کے واقعہ نے اس کے دہریہ شبہات کو صحیح ثابت کر دیا تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی شیطان سے مل کر آندھیاں لائی ہے۔ مگر اس کے غم میں یہ امر اور اضافہ کرتا تھا کہ یہ اسرار، یہ مجر العقول قدرت۔ اس عورت کے حسن کو زیادہ تابانی بخشنے میں جو اس کے پہلو میں لٹی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ جب وہ بلا ارادہ اس کی طرف شاعرانہ انداز میں نگاہیں اٹھاتا ہے تو وہ پہلے تکتی ہیں زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے۔

”مساحرہ۔۔۔۔۔ ذیل عورت۔۔۔۔۔ اس نے فطرت آمیز

## حسرد کاں کی تمام بیماریوں اور نپٹ براہین کا شیطانی علاج حسرت

روئے زمین پر

کاں تمام امراض کی ایک ایسی صفت اور غیظہ و الجب اینڈ سنر میڈ پی بھیت کا ایک دوا کہ رومن کرنا ہے جو چون بڑی کھنکھن کھنکھن سے بیک سے سنے طرح طرح کی آوازیں ہونے پر پناہ یا کہ بالکل نہ دردم۔ دم خشکی کھنکھن کاں میں کیسے بڑ جانے ناسودا کاں کے تمام امراض پر ایک ایسی جادو اثر اور حکمی دوا ہے جس کی کوئی دیگر دوا آج آپ طرح زمین پر نہیں پائے گئے زائد اس سال کی طویل زندگی کا راز۔ ہذا کی سچائی کا ایک خاص ثبوت ہر جاندار کا ہذا کی کسی عہدہ شوق سے یہاں ہی تشریف لاکر علاج کر سکتے ہیں قیمت فی شیشی سو روپیہ عہدہ ایک ساتھ تین شیشی طلب فرمائے پھر لٹواک دیکھیں کہ مزدور صاف کھان بنواں کاں کے زخم اور جسم کی گندگی کو باجھا گئے بلایا پانی دیکھا ری خود صاف کرتی ہے قیمت فی شیشی ۸۔

باجر شاہی محجن بے دانت جلاوت ہے دانت کی ہر ایک خلیف اور گندہ دہلی کو دور کرتا ہے۔ قیمت فی پکیٹ ۴۔

جناب سر مرزا حسین علی صاحب نیچر و تانہ عالمی (دکن) : فافم لے ہیں کان کی دوا جو والد بزرگوار صاحب نے اسے طلب کی تھی وہ مفید ثابت ہوئی جناب سر عظیم علی صاحب نے فافم لے میں آپ کی دوا پہلے ہنگوئی تھی کان بالکل اچھا رہا اور بعد میں جناب سر علی صاحب نے فافم لے میں بلانڈ سنر میڈ پی بھیت کی دوسری بہت کامیابی سے کام لے کر ہی ہے یہ غریبوں کے لئے بہت مفید دوا اور مرد و تندرستوں کو بہت امداد دیتی ہے جو اپنی دوا کے نام نہیں دے سکتے ہر ایک قابل علاج ہیں اسکا کہ امراض میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ دوا لگوائے وقت اپنا پورا تپہ موہالات صاف لکھئے۔

یہ دوا بیتہ بہرین کی دوا۔ بلانڈ سنر میڈ پی۔ پیلی بھیت (یو۔ پی)

# شہ

(انسیہ محمد اسماعیل رتسا ہمدانی ٹریسبل ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) اینڈ کیٹ)

دم لبوں پر آچکا ہے غم کا ایسا جوش ہے      نام اس کا لے رہا ہوں پھر بھی اتنا ہوش ہے  
تیرا دیوانہ نئے عالم میں ہے وہ جوش ہے      جذبے، وارفتگی ہے بے خودی ہی ہوش ہے  
جب خودی کو کھو کے ہم بخود ہوئے سمجھے یہ راز      رخنہ گردیدار جاناں میں جو ہے وہ ہوش ہے  
تیرے صدقے اے مے ساقی کی چشم نیم باز      مجھ کو آدمی بے خودی ہے اور آدھا ہوش ہے  
جب گرامیں لڑکھڑا کر پائے ساقی پر گرا      نشہ میں سرشار ہوں اس پر بھی اتنا ہوش ہے  
ہم صاف محشر میں بھی ہیں محبتِ چشم یار      داد خواہی کس کی ہو کس سے ہو کس کو ہوش ہے

ساری محفلِ مست چشمِ نازِ جاناں ہے رتسا

بزم سے اب کیا اٹھے گا کوئی کس کو ہوش ہے

# خاموشی

(از سید محمد امین تہسار ہدانی گیارہویں ٹریل ایم۔ اے۔ گولڈ میڈلسٹ، بی۔ ایل۔ اینڈ وکیٹ)

چور ہے زخموں سے کوئی خاک پر ہیوش ہے      بال بکھرائے ہوئے بالیں پہ وہ خاموش ہے  
شمع کو ضبطِ غمِ الفت میں کتنا ہوش ہے      گھل کے پانی ہو گئی لیکن زباں خاموش ہے  
پردہ داری رازِ الفت کی دم آخر بھی کی      دل میں اس کی یاد ہو لیکن زباں خاموش ہے  
خندہ گلِ نغمہ بلبیل ہے ہر سو باغ میں      محو حیرت صرف اک زگس ہے وہ خاموش ہے  
دیکھو وہ بیٹھا ہوا ہے کوئی بزمِ یار میں      دور سے تکتا ہے منہ نکھیں میں تر خاموش ہے  
ایک پاؤں پر کھڑی ہے شمع اس کی بزم میں      شام سے تہا صبح جلتی ہے مگر خاموش ہے

بات اک پُلف کہہ کر روک لی اپنی زباں

لطف یہ ہے سب مُصر ہیں اور رہا خاموش ہے

# عالمگیر بک ڈپو کی قابل دید کتابیں

**گھر پاب ساور** مشہور مزاح نگار جناب علامہ عظیم صاحب کی شادی کے طرز تقریر کا تازہ ترین شاہکار جس کی ہدایت ہی فرق اور لطافت آمیز بات پر مصنف نے اپنے شوخ اور مذاقہ طریزیان کے ساتھ ملکر انظم کے جگاتے کھول دیے ہیں عشق و محبت اور دو گنا کے کوشش اور فغانی شریک سازوں کے ہولناک قسمہ خیز سین دکھائے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھے پن نیز طریزیان کی شوخی اور دلہانی پر جتنی ماحککہ تمام دور مادوں سے بڑھا چڑھا ہے گھر پاب کو پڑھ کر آپ شرر کے دیوار حرام پور کو بھول جائیگے۔ بہترین کھائی چھپائی، نوٹو پکا رنگین سرورق قیمت معمول اور

**خطوط کی شتم طریق** مصنفہ مرزا عظیم صاحب جتانی، ہنسٹے عالی نئی کتاب جتانی صاحب کے مخصوص اور ان کے طرز تحریر کی تصویر۔ بالکل نئی کتاب ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ نور ا طلب فرمائیے۔ قیمت ۱۲

**کتاب التقدیر** علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلند پایہ ادیب سے آپ نے قدیم کے سکہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور غیر کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کریم بخش صاحب نے طبع کیا ہے صرف ایک کثیر کرایا کتاب طبع ہونے پر شائقین اور داناں ابن القیم نے ہمارے دل کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی انوس کو بولی صاحب نے فضلہ الہی راہی ملک بقا ہوئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا اب ہمارے پاس پانچ سو کے قریب اس کی جلدیں موجود ہیں۔ اس کتاب کی اعلیٰ قیمت ہونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو صرف پندرہ روپے کے محمولہ ایک میں ملے گی۔ کتاب کو پونے آٹھ سو صفحات سائز بڑا ہے۔

**شادی** آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور ناول نگار حضرت علامہ روزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے دہائی حالات خود علامہ روزی صاحب کے فاد میں بن سے لکھے ہوئے کتاب کی دہائی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھائیے

جسم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے کے

**صبح لطافت** علامہ روزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابل دید مجموعہ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی گیارہویں سے کم نہیں پڑھتے جانیے اور پڑھتے جانیے۔ جسم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف دو روپے چار

نوٹ:- ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت ایک ساتھ خریدنے پر تین روپے چار آنے (پے) علاوہ محمولہ ایک میں ملیں۔

**موتیوں کا خستہ جسم** علامہ جرجی زیدیان کے دو بہترین تاریخی ناول

جسم ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲

جسم ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲

دفتر عالمگیر کی طرف سے بحرف زر لکھنؤ تبول کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ کتاب کی کچھ سیلے جرجی زیدیان کا نام کافی ہے۔ آج سب سے پہلی قیمت میں طلب فرمائیے۔

رسالہ عالمگیر کے مستقل خریدار ہو آپ جلدی عالمگیر کچھ پڑھیں

مائل کر سکتے ہیں۔ آج ہی ایک لکھنے طرہاری بول فرمائیے سالانہ عالمگیر

بازار سید مٹھا Alamgir Book Depot  
Bazar Said Mitha  
عالمگیر بک ڈپو

2 4 (2, 2 5, 6



طرد



عالمگیر ہندوستان بھوکے علمی ادبی، بالتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

# جلد ۲۰ فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۳۶ء نمبر ۱۲

| نمبر شمار | مضامین              | اثر خاں                           | صفحہ | نمبر شمار | مضامین           | اثر خاں                        | صفحہ |
|-----------|---------------------|-----------------------------------|------|-----------|------------------|--------------------------------|------|
| ۱         | فہرست مضامین        | از منیجر                          | ۱    | ۱۵        | مقدس پیار        | از حضرت امین حزیں              | ۳۷   |
| ۲         | ملاحظات             | ادارہ                             | ۲    | ۱۶        | غزل              | " " "                          | ۴۰   |
| ۳         | افری جوانی!         | علامہ شاد مہموم                   | ۴    | ۱۷        | حقائق            | حضرت طالب باغی                 | ۴۱   |
| ۴         | یہود اور موسیقی     | از "معارف"                        | ۵    | ۱۸        | دوست             | مستر ظفر واسطی شاہ آبادی       | ۴۲   |
| ۵         | تغیلات عالیہ        | عالیجناب اب معین اللہ دہلوی بہادر | ۸    | ۱۹        | غزل              | خان جمیل نسائی رامپوری         | ۴۴   |
| ۶         | فاطمہ               | مستر حن عزیز جاوید                | ۹    | ۲۰        | افریقہ کے جادوگر | جناب شبیر مارہروی              | ۴۵   |
| ۷         | ہندوستانی عورت      | علامہ امجد حیدر آبادی             | ۱۷   | ۲۱        | کلام اعظم        | جناب ڈاکٹر اعظم صاحب کیلوی     | ۴۷   |
| ۸         | مرزا حسرت دہلوی     | مولانا خواجہ عبدالرفیق عسکری      | ۱۸   | ۲۲        | منازل آخر        | جناب ابوسعید صاحب قریشی        | ۴۸   |
| ۹         | واردات قلب          | قائد تھانوی                       | ۲۳   | ۲۳        | نظر محبت         | عمر تنہیکید آخر صاحبہ          | ۵۰   |
| ۱۰        | آئینہ               | جناب ایس۔ جلیل صاحب بی۔ اے        | ۲۴   | ۲۴        | جذبات تبسم       | جناب قاضی محمد رمضان صاحب تبسم | ۵۱   |
| ۱۱        | غزل                 | جناب ظفر ہاشمی                    | ۳۱   | ۲۵        | خواب ادا فسانہ   | جناب لطیف انور گورداسپوری      | ۵۲   |
| ۱۲        | میٹھی کچھری کی مسجد | جناب سید اشفاق حسین صاحب منوخی    | ۳۲   | ۲۶        | ناامیدی میں امید | جناب محمد اختر صاحب منوخی      | ۵۴   |
| ۱۳        | محبت اور زندگی      | جناب محمد فاروق صاحب الکیانوی     | ۳۵   | ...       | ...              | ...                            | ...  |
| ۱۴        | نقش وفا             | جناب باقر حسین صاحب وفا           | ۳۶   | ۲۸        | اشتہارالت        | مشہرین اصحاب                   | ۵۶   |

مکتبہ جامعہ دہلی اگر آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم عزیز ہو تو مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا بالتصویر سالہ پیام تعلیم طلب فرمائیے قیمت سالانہ چھ سالگرہ نمبر ۸ رنی پرچہ ۴ رنی کا پتہ مکتبہ جامعہ قریب محلہ دہلی

حافظ محمد عالم صاحب انڈسٹریل ٹرنیٹیشن نے عالمگیر المذکرہ ریسرچ لایبریری میں جو دو سالہ عالمگیر مآثرات جمع کئے ہیں انہیں

# ملاحظات

موقع کو جو ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد و معاون ہندوستان کی مختلف قوموں میں سیاسی اتحاد پیدا کرنے کی قابلیت نامہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہاتھوں سے کھو رہی ہے، ایک ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں رہنے والوں میں اتحاد کی یہ تین صورتیں موجود ہوں۔

۱۔ اتحاد ذہنی ۲۔ اتحاد سیاسی ۳۔ اتحاد لسانی  
یعنی عناصر ضروریہ ہیں اس کی موجودگی ایک ملک کو بام ترقی پر لے جاسکتی ہے۔ اگر یہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اتحاد لسانی کی صورت سب سے زیادہ ضروری صورت ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے مذہبی عقائدات ہی سے واقف نہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے مذہب پر عمل نہ کرے۔ لاعلمی تعصب کی بڑ ہے۔ لسانی اتحاد سے سیاسی اتحاد کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔

آج کے کچھ عرصہ پیشتر ہمارے محترم برادران وطن کو اردو سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کی باتوں کا پچھلے عینہ نہایت آب و تاب کے ساتھ جابازی کی تھے اس کی ترقی کے خواہاں تھے اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس صورت میں دسمبر میں شائع ہونے والا مکرر کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے تھے اس کو آج کیا وجہ ہے کہ وہ اردو کے ملنے کے باوجود اس سالانہ مفید لکچر علاوہ محفل کے درپے ہیں۔ اس کا جواب ہم اوپر درج کر کے ہیں۔ یعنی فرقہ دارانہ مصیبت اور کچھ نہیں، ان کے مانعوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے یا مجاہد کی ہے کہ اردو قرآنی حروف کی صورت میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں کی کوششیں ہی اس کی ترقی کا باعث ہوئیں۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اسی زبان کو انتہائی فروغ دے سکتے تھے مگر انھوں نے یہ کچھ کر کے اردو کے ذریعہ ہندوستان کی تمام قوموں میں اتحاد ہو سکتا ہے اپنی وادری زبان کی نجات کو قربان کر ڈالا اور اردو کی نشر و اشاعت کی طرف اپنی توجہ نہ

اردو ان حضرات کی نگاہوں سے دلانا عداوتی مصائبی اسے (ملک) آئری سی سیکریری انجن ترقی اردو حیدر آباد دکن کا حقیقت افروز مقالہ بھارتیہ سہایت پرشد کی اصل حقیقت، گزرجہا ہوگا اور انہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہمایہ قوم کے وہ جلیل القدر افراد جن کی کوششوں کو فرقہ دارانہ مصیبت کے زہر سے بالکل پال ہونا چاہئے اس طرح ملک کی لسان عمومی یا مشترکہ زبان اردو کو تباہ کرنے سے بچنے ہیں برادران وطن، اردو دشمنی کے اتحاد سوز مظاہر ات کرنے میں مصروف ہیں اور ملک کی وعتوں میں نہایت سرگرمی کے ساتھ اردو کو مٹا کر ہندی کی نشر و اشاعت میں شبانہ روز مشغول!

یہ ایک حقیقت واضح روشن ہے کہ ہندوستان پر اگر کوئی زبان تمام اقوام ہند کی مشترکہ زبان بننے کی صلاح نہ لے اندر رکھتی ہے تو وہ اردو کے سوا اور کوئی نہیں نکالی بنگال کے حدود سے آگے نہیں بڑھی۔ گجرات کے لئے وقف ہے۔ غرض کہ ہر صوبے کی مخصوص زبان اصح ہر زبان پر شائع ہو چکا ہے بالکل ضعف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال پہلے ملے۔ اس کی ترقی کے خواہاں تھے اس صورت میں دسمبر میں شائع ہونے والا مکرر کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے تھے اس کو آج کیا وجہ ہے کہ وہ اردو کے ملنے کے باوجود اس سالانہ مفید لکچر علاوہ محفل کے درپے ہیں۔ اس کا جواب ہم اوپر درج کر کے ہیں۔ یعنی فرقہ دارانہ مصیبت اور کچھ نہیں، ان کے مانعوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے یا مجاہد کی ہے کہ اردو قرآنی حروف کی صورت میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں کی کوششیں ہی اس کی ترقی کا باعث ہوئیں۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اسی زبان کو انتہائی فروغ دے سکتے تھے مگر انھوں نے یہ کچھ کر کے اردو کے ذریعہ ہندوستان کی تمام قوموں میں اتحاد ہو سکتا ہے اپنی وادری زبان کی نجات کو قربان کر ڈالا اور اردو کی نشر و اشاعت کی طرف اپنی توجہ نہ

اگر آپ

میں لکچر



# اُفِ رِی جَوانی!

علامہ شاد رحیم منور

ایک ستم اور لاکھ ادائیں۔ اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے  
ترجی کلاہیں تنگ قبائیں۔ اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم۔ ابرہہ ساراں، دیدہ پُر نس،  
منہ کہ ہیں وہ آپ پلائیں، اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

اپنی ہوا سے آپ بھگنا، اپنی اداسے آپ کھنکنا!  
چال میں لغزش، منہ پہ حیا میں اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوجھ!  
قصہ کہ پھر جی بھر کے ستائیں، اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں بھولے دھانی دم پٹے لٹ چھسکائے  
مجھ پہ یہ قدغن، آپ نہ آئیں، اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

پچھلے پر اٹھ اٹھ کے نمازیں تاک رگڑنی سجدے کرنے  
جو نہیں جائز اس کی دعائیں، اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی  
بچھ کو کہاں سے دھونڈ کے لائیں، اُفِ رِی جَوانی! ہائے زمانے

# یہود اور موسیقی!

یہود کے نزدیک لفظ زمری (بانسری بجانے والا) ادبائش کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا اسی طرح مسلمانوں میں لفظ زمارہ (بانسری بجانے والی عورت) فاحشہ کے ہم معنی ہو گیا۔

تاہم جس طرح مسلمانوں میں موسیقی کی حرمت پر کامل طور سے عمل نہ ہو سکا، اسی طرح یہودیوں میں بھی اس کی ممانعت کا اثر محدود ہی رہا۔ حجاز اور یمن کے یہودیوں میں یہ حرمت تسلیم نہیں کی گئی، روم میں چوتھی صدی تک پیشہ در یہودی گانے والے ایکڑ اور شاعر تھے، سلطنت بابل اور دوسری جگہوں میں غیر مذہبی موسیقی کے عدم جواز کی مخالفت کی گئی اور یہ مخالفت اتنی پر زور تھی کہ بالآخر اس مسئلہ میں ترمیم ہو کر رہی، اب جو مخالفت باقی رہ گئی، وہ صرف اس قدر کہ آلات موسیقی عام طور پر ممنوع قرار دیئے گئے اگرچہ تقریب پیورم (Purim) اور شادی کے موقعوں پر ان کے استعمال کی عام اجازت دی گئی۔ یعنی یہود نے اس قانون سے بچنے کی یہ صورت نکالی کہ مسلمان اور عیسائی گانے والے رکھ لئے۔

مشرق میں بارہویں صدی عیسوی تک یہودیوں میں موسیقی کا پیشہ پایا جاتا تھا۔ اور عراق میں تو نوجوان واقعہ تعطیل کے دنوں میں موسیقی کے نغمہ زبور پڑھتے تھے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اطراف میں موسیقی کا اثر بہت کم رہ گیا تھا۔ مغرب میں علاوہ اسپین کے یہود نے موسیقی کو پیشہ کے طور پر اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ البتہ اسپین میں عرب سلاطین اور خلفاء کے دور میں یہود نے اسے پیشہ اور علم دونوں حیثیتوں سے ترقی دی چنانچہ جب عیسائی اس ملک کے مالک ہوئے تو انھیں یہود کا عیسائی امراء سے شان و شوکت میں بڑھا ہونا ناگوار ہوا اور انھوں نے اس امر کی شکایت کی کہ یہود اپنے بچوں کو فن موسیقی میں دوسروں پر فوقیت دے جانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ نویں صدی میں المنصور سے لیکر بارہویں صدی میں

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غیر مذہبی موسیقی کی ممانعت سقوطِ یروشلم کے ساتھ ہی وارد ہوئی اور اس کے متعلق متن یہ پیش کیا جاتا ہے "اے اسرائیل قوموں کی طرح مارے خوشی کے ست پھول۔" (تورہ، یسعیاہ باب ۹ آیت ۱) لیکن واقعہ یہ ہے کہ آلات موسیقی اور غیر مذہبی غنا کی ممانعت سقوطِ یروشلم سے بہت پہلے کی ہے۔ یسعیاہ، عموس اور عیسیٰ بن سیرا نے اس سے قبل ہی مندرجہ بالا اور موسیقی کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس شدید مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ فن موسیقی سے متعلق بہت سے غیر ملکی رواج بنی اسرائیل کے ملک میں داخل ہو گئے تھے، چنانچہ جب یونانی موسیقی نے فلسطین میں بڑھنا شروع کیا تو یہود نے حقیقتاً اس کو روکنا چاہا۔

معبد کی تباہی کے بعد یروشلم کا نالہ و بکا ہونے لگا۔ موسیقی کے معنی تھے مسرت اور یہود کے نزدیک برباد شدہ معبد کی موجودگی میں کسی مسرت کا امکان ہی نہ تھا۔ یہ اور وہ قدیم ممانعت جو شراب، عورت اور موسیقی سے متعلق ملی آتی تھی دونوں نے مل کر غیر مذہبی غنا کو حرام قرار دیدیا۔

اسلام کی آمد کے بعد موسیقی کی مخالفت کو اور تقویت پہنچی اور ائمہ اربعہ نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں علماء یہود اور اکثر علمائے اسلام کی رایوں میں بہت کم فرق ہے چنانچہ جس طرح

۱۔ موسیقی سے مراد اگر گانا، غنا، ہے تو مشدّد علمائے احناف کے سوا اور کسی کے ہاں وہ ناجائز نہیں اور اگر اس سے مراد ساز اور باجے ہیں تو گو بعض علمائے ظاہر اس کی حرمت کے قائل نہیں، مگر جمہور ائمہ و علماء اس کو حرام کہتے ہیں۔ ابن حزم ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ مذہبی موسیقی حرام ہے اور غیر مذہبی مباح!

اسحق بن سمان تک متعدد یہود ہیں جو فن موسیقی کے نہایت ممتاز ماہر شمار  
کئے جاتے ہیں۔ ان کی نسبت بھی مثلاً یوسف بن افرام جو انفسو  
بشتمہ شاہ تیسرے شاہ کا نازن تھا اس فن کے ماہر تھے۔ بارہوی  
صدی سے چودھویں صدی تک اسپین کے یہ سانی دربارہ میں یہودی موسیقی  
داں پائے ملتے تھے۔

یہاں تک علم موسیقی کا تعلق ہے یہ علم اسحق بن سلمان (متوفی ۹۳۲ء)  
کے وقت سے جو آتی۔ ایٹلی کے نام سے زیادہ مشہور ہے اعلیٰ تعلیم کے نصاب  
میں داخل تھا۔ اسحق کا قول تھا کہ موسیقی علوم ریاضی میں آخری اور تہترین  
علم ہے۔ بعض دوسرے اکابر جو دینے بھی علم موسیقی کی تفصیل فصل و  
کمال میں شمار کیے۔

پندرہ صدی کا خیال ہے کہ موسیٰ بن میمون جو قرون وسطیٰ کا مشہور  
یہودی فلسفی تھا ہر قسم کی شاعری اور موسیقی کا سخت مخالف تھا۔ لیکن  
یہ خیال صحیح نہیں اور موسیٰ کے کسی قول یا تحریر سے اس کی تصدیق نہیں  
ہوتی۔ بر خلاف اس کے اس نے بعض حالات میں معبد کے لئے موسیقی کی  
اجازت دی ہے۔ وہ خود شعر کہتا تھا اور اس کی طرف سے گانے کی مخالفت  
در اصل نفس شاعری کی مخالفت نہ تھی بلکہ مضمون شعر کی مخالفت تھی،

غیر مذہبی موسیقی کے متعلق موسیٰ بن میمون کی رائے تھی کہ رواج عام نظر  
الہ از نہیں کیا جاسکتا اور اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ عقل قانونی صرف  
اکثریت اور رائے عام کی مخالفت کرتی ہے۔ اسپین کے یہود کا ذکر اوپر آچکا کہ  
مصر کی بھی تقریباً وہی کیفیت تھی۔ ایک ایسے فن کو جو تینوں طور پر یہود کی مذہبی  
اور معاشی زندگی کا جزو بن گیا تھا مذہباً حرام قرار دیدینا بے اثر رہتا۔ ان حالات  
میں جو ممکن تھا وہ صرف اسی قدر کہ اس کو ایک مضمون جس سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے  
علاوہ بریں موسیٰ پر تقدیر کا بھی کافی اثر تھا۔ جن یونانی مصنفین سے

وہ عربی زبان کی وساطت سے واقف تھا ان میں اس نے افلاطون اور  
ارسطو کو فن موسیقی کا ملج پایا تھا۔ عرب مصنفین میں جنین بن اسحق —  
(متوفی ۸۵۷ء) الفارابی (متوفی ۹۵۰ء) ابن سینا (متوفی ۱۰۳۷ء)

الفرغانی (متوفی ۱۰۱۱ء) اور ابن ماجہ (متوفی ۱۱۴۸ء) نے موسیقی کی اعلیٰ  
نظری، اور اخلاقی حیثیتوں سے بحث کی تھی۔ ان دلائل کی موجودگی میں موسیٰ  
بن میمون موسیقی کی قدیم مخالفت کی مطلق تائید نہیں کر سکتا تھا۔

اسپین کے ایک دوسرے ممتاز یہودی ابن جبرول متوفی ۱۱۵۷ء نے  
اس شکل کو آسان کر دیا تھا اس نے اپنی اصطلاح الاخلاق میں لکھ دیا تھا کہ جن  
نعمات کا سنا ممنوع نہیں بلکہ ان ناشائستہ باتوں کا سنا ممنوع ہے جو ان  
نعمت کے ساتھ کسی گیت میں شامل ہوں تاہم صیحا کہ اس نے لکھا ہے انسان  
کو ان مقامات سے واقف ہونا چاہئے جہاں گانے پر توجہ کرنے کی ضرورت  
ہے۔ اور جہاں مطلق گانا سننا ہی نامناسب ہے!

موسیٰ بن میمون کہتا ہے کہ بن علن اعتدال سے انحراف کرنے سے  
جسم بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح روح بھی بیمار ہو جاتی ہے اور جس طرح جسمانی  
طیب انسان کے جسم کا علاج کرتا ہے اسی طرح روحانی طیب انسان کی روح  
کا علاج کرتا ہے چنانچہ بحیثیت ایک اخلاقی طیب کے وہ حواسوں کی اصلاح کیفیت  
سب ذیل ہدایات پیش کرتا ہے:

سامعہ۔ تار اور بانسری کا نغمہ سننا!

باصبرہ۔ خوبصورت تصویروں کا دیکھنا۔

شامعہ۔ خوبصورت باغوں میں چل قدم کرنا!

لاسمہ۔ نفیس پوشاک پہننا!

واقفہ۔ نہایت مزدار غذائیں کھانا!

وہ کہتا ہے کہ ان چیزوں کو غیر اخلاقی یا غیر ضروری نہ سمجھنا چاہئے اور  
قدیم ربیوں کے خیالات اپنے دعویٰ کی دلیلیں پیش کرتا ہے۔

اس باب میں موسیٰ بن میمون بعض مسلمان ارباب فکر سے متفق تھا۔

اس کے وقت میں اس موضوع پر عربی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود  
تھا ان میں سے بعض کتابوں مثلاً ابن ابی الدینا (متوفی ۹۹۲ء) کی ذلم الملائک  
میں موسیقی کی شدید مخالفت کی گئی تھی دوسری کتابوں مثلاً امام غزالی کی  
”احیاء العلوم“ اور آپ کے بھائی ابو الفتح محمد الدین کی بوارق الاسماء میں  
اس فن کی موافقت میں مقول دلیلیں دی گئی تھیں امام غزالی اور دوسرے  
مصنفین جنہوں نے موسیقی کے حوالہ میں لکھا ہے یہ بھی صحیح ہے کہ حسب ذیل  
صورتحال میں موسیقی ممنوع ہے!

(۱) اگر گانے یا بجانے والی کوئی عورت ہو!

(۲) اگر آلودہ موسیقی چلے سے مندرج اور ناجائز ہو!

(۳) اگر گانے کا مضمون ناجائز ہو!

تغلب کرنا چاہے جو ایک ممنوع فعل ہے تو اس سے علم ریاضی ناجائز نہ ہو جائیگا  
یہی صورت موسیقی کی ہے، اس کے نزدیک مطلق فن موسیقی ناجائز نہیں  
لیکن اسی سوال یہ ہے کہ  
"اس کا استعمال کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟"  
"معارف"

(۴) اگر موسیقی کسی شخص کو ایک ایسے کام پر آمادہ کر دے جو ممنوع ہو۔  
(۵) اگر کوئی صرف فن کیلئے گانا سنے اور تفریح مقصود نہ ہو۔  
خیر قتنا ہی چیز موسیٰ بن میمون کے یہاں بھی ہے یعنی آزاد اور اس کے  
در بیان فرنی و اتیار کرنا وہ دماغ کو تیز کرنے کی غرض سے علم ریاضی کی تحصیل  
مناسب خیال کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ریاضی کی مدد سے حساب کتاب یا

حزبیداران عالمگیر کیلئے!

## اشد ضروری اعلان!

عالمگیر کے انتظامی معاملات میں رد و بدل اور حربوں کی ترمیم و تنسیح کے باعث تمام خریدار حضرات کے  
نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں۔ آئندہ ہر قسم کی خط و کتابت کے وقت جس دینمبر خریداری  
(جو اس ماہ میں آپ کے نام کی چٹ کے اوپر چھپا ہوا ہے) تحریر کیا کریں۔ آپ اپنی یادداشت  
کی کتاب پر سابقہ نمبر کاٹ کر جدید نمبر لٹ کر لیں تاکہ خط و کتابت میں سہو نہ ہو۔ نمبر خریداری کے ساتھ،  
(ر.ش.س) دو ٹروف پیسے ہیں، جن حضرات نے نمبر کے ساتھ شب ان کی میعاد خریداری خاص نمبر (دسمبر)  
سے شروع ہو کر نومبر میں ختم ہوتی ہے، وہ جن نمبروں کے ساتھ ان کی میعاد خریداری جون سالانہ  
سے شروع ہو کر دسمبر میں ختم ہوتی ہے۔

ہر قسم کی خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری تحریر کرنا ضروری ہے۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت  
معارف! —  
نیازمند میجر عالمگیر لاہور۔



# تخیلاتِ عالیہ

مسلماں القاب العلیبت امیر اکبر نواب اعانت جنگ میں المدولہ بادد ام قبلہ امیر پانگنا

اس ستم کیش نے کی ترکِ جفا میرے بعد  
دہر سے نامِ محبت کا مٹا میرے بعد  
خلقِ کمدے نہ اشارے سے کہ قاتل ہے یہی  
پھولِ شمعِ سرِ دفن کے پریشاں کر کے  
شرحِ بیتاب ہے پھر جسم میں آنے کیلئے  
میرے دم تک ہے یہ سب سلسلہ ناز و نیاز  
از گئی آہ سے تاثیر تو نالوں سے کشش  
میرے ہی خون کی پیاسی تھی مگر اے قاتل  
خندہ گل وہ نہیں نغمہ ببل وہ نہیں  
قبر میں بھی دلِ صد چاک کو یہ ابھن ہے  
لے کے جاتی تو ہے مٹی مری اس کوچے میں  
میں نے اس رنگ سے کی بادہ کشی عالم میں

لشہ احمد کہ اتنا تو ہوا میرے بعد  
اٹھ گئی رسمِ ورہ ہر دوفا میرے بعد  
ان کے دشمن نہ ہوں انگشتِ نہا میرے بعد  
گل کھلائے گی نئے بادِ صبا میرے بعد  
لبِ جاں بخش ہیں مصروفِ دعا میرے بعد  
یاد آئے گاہتوں کو بھی خندا میرے بعد  
راسِ آئی نہ کسی کو یہ ہوا میرے بعد  
خشک لب کیوں ہے تری تیغ ادا میرے بعد  
رنگ بدلا چمن دہر نے کیا میرے بعد  
کون ہوشانہ کش زلفِ دو تا میرے بعد  
ہو نہ جائے کہیں بدنام صبا میرے بعد  
لبِ ساغر پہ ہے افسانہ مرا میرے بعد

اس قدر پاس رہا خلق کی راحت کا معین

اپنے جینے سے ہیں دشمن بھی خفا میرے بعد

# فاطمہ

از منظر حسن عزیز صاحب جاوید !

فاطمہ کی سہیلیوں نے کہا : چنے بھی دو۔ تمک جاگتی تو ہم لوگ تو ہیں۔  
تھوڑی تھوڑی دھڑکیوں میں لیں گے !  
فاطمہ نے سسکا کر کہا : — خیر جانی چلو تم نے جھگل نہیں دیکھا ہے۔

۲

مولوی نجیب الدین کا یتیم خانہ وسط شہر میں تھا۔ فقیر آباد والے نواب  
کی غدر کی پہلے والی کوٹھی میں واقع تھا جس کے درو دیوار شق ہو گئے تھے،  
کچھ گر گئے تھے چمت چمکتی تھی، کال کی جھمکی تھی سفیدی نہیں پھرائی جاتی تھی،  
کھنڈ کھڑے تھے۔ تاریک کمروں میں مناک بدبو آتی تھی۔ اجابت عند لاکھ  
ڈھیلوں، نجاست اور بکڑی کے جالوں کا آماجگاہ تھا۔ اور ایک ہی تھا جس کی  
سیاہی مائل دیواروں پر کوٹے۔ پسل سے رہنے والوں نے ایک دوسرے  
کو بیشمار گالیاں لکھ کر اپنے گندے اخلاق کا نقش دوام چھوڑا تھا۔ کھٹل  
ان گنتی تھے اور خدا جانے ان کی کتنی پشتیں اس یتیم خانے میں گز گئی تھیں  
مولوی نجیب الدین کا کام تھا چند سے کی رسیدیں چھپو کر، ہمراہ لیکر جا بجا  
دعوت کہنا، زیادتوں میں جانا اور دوسرا اور عوام سے یتیموں کے لئے چندہ  
فراہم کرنا۔ اس کے بعد چونکہ وہ ٹھک جاتے تھے اس لئے تیمانی کو یتیم خانے  
کے رحم پر اور یتیم خانے کو تیمانی کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ ان میں جمع  
عمل کب پیدا ہوتا تھا جب عید ہو، بقر عید ہو، یا شب برات ہو، میلہ کھیلے  
کپڑے پہنے ہوئے سچے بچیاں ملی قطار میں تمام شہر کا گشت کرتے تھے۔  
ان کے ہاتھ میں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا علم ہوتا تھا۔ یتیموں کو بھولے  
ان کے آگے آگے ہوتے تھے خود مولوی صاحب۔ عید گاہ میں ایک ایک فقیر  
تیمیدی نمازیوں سے دھول کی جاتی تھی۔ بقر عید کے وقت قربانی کی کھائیں  
زکوٰۃ اور شب برات کے وقت حلوہ مانگنے خود مولوی صاحب اپنی فوج کے

آیا ماں! آج فرصت کا دن ہے اگر آپ اجازت دین تو ہم چہ چہ کیا  
جنگل میں چھپی منڈے جائیں! اچھی آیا ماں اجازت دیدیجئے!  
اس دن خدا فخر کیوں آیا ماں کی کالی، تولاد کی طرح چمکدار آنکھوں  
میں ایک ایک بات پر آنسو اٹھاتے تھے۔ اتنی بات پر ان کی آنکھیں پھل پھل  
ہو گئیں۔ اپنے سفید دوپٹے کے پوسے بوڑھی آیا ماں نے آنسو پونچھے،  
فاطمہ پر محبت بھری اور غار آنکھ ڈالی پھر کہا : — تمہاری خواہش  
مسترد کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ اذیت ہوتی ہے بھائی، اچھا جاؤ، لیکن دیکھو  
خبردار زیادہ دور نہ جانا کیونکہ شاید تمہاری ضرورت پڑے۔  
”ایسا ہے تو ہم نہیں جاتے، لائے کیا کام ہے کریں؟“  
”نہیں نہیں جاؤ، میں بلا لوں گی، اور نون کون جا رہی ہیں؟“  
”میں نہیں، کینہہ مائتہ ہے، سبیر، زبیدہ، احفاظ، اور کون ہے بس؟“  
”اچھا جاؤ، دیکھو پھر کتنی ہوں بت دور نہ کل جانا۔“  
فاطمہ نے بہت بہتر کہا اور اچھلتی کودتی اپنی سہیلیوں کو اجازت مل جانے  
کی خوشخبری دینے کے لئے روانہ ہو گئی۔  
فاطمہ کی چھوٹی بہن صدیقہ نے جو دیکھا کہ یہ لڑکیاں یتیم خانے کے باہر چلی  
ہیں تو وہ دوڑی دوڑی آئی، اپنی بہن کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور لاجب  
کے ساتھ بولی : — ”اچھی آپا بان، ہم بھی جائیں گے!“  
فاطمہ نے اس کے خوبصورت سہری بالوں پر دست شفقت پھرتے ہوئے  
کہا : — ”نہیں صدیقہ تم نہیں رہو، نعمت کے ساتھ گزیاں کھیلو ہم بہت  
دور جنگل کو جا رہے ہیں، تم تمک جاؤ گی؟“  
صدیقہ نے سر اٹھا کر پھرست کی : — ”نہیں تھکیں گے، سنے چلے  
اچھی آپا، ہم نے کبھی جنگل نہیں دیکھا۔“

سرخ بن کر جاتے تھے لوگ کہتے تھے کہ مولوی صاحب کے مالی شانِ مبلغ میں دس سیر گھی فی ماہ کا خرچ ہے۔ بہترین قدر پر پکتا ہے لیکن کیسا خرچ ہے اور کیسا قدر پر پکتا ہوگا اس کا علم ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو مولوی صاحب اور ان کی محنت اور طاقتور سرخ و سپید اولاد کو دیکھ کر کہتے ہوں گے اور ان کے مقابلے میں تیمانی کو زرد و مرہض، سست دیکھ کر خیال کرتے ہوں گے کہ انھیں شاید ابالی دال کا پانی دیا جاتا ہوگا۔

بہر حال ان کے یتیم خانے کو دیکھنے کیلئے ایک دن مس مراد بی۔ اے تشریف لائیں۔ ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹوہ بھی تھا۔ اگر دوسری کوئی خاتون آتیں تو مولانا اپنے دونوں چوڑے چوڑے ہاتھوں سے کھینچ ڈھانپ کر نعوذ باللہ منہا پڑھنے لگتے مگر وہ مس مراد کو بے پردہ اور درانہ یتیم خانے میں آتا دیکھ کر اور پھر بڑوہ دیکھ کر محض اس خیال سے ایسا کرنا، بھول گئے کہ ان کا خیال اس ٹوہ ہی میں انک کر رہ گیا کبھی ادھر کبھی ادھر گردن پیر بھی کر کے مولانا اول سے آخر تک اسی ٹوہ کو دیکھتے تھے شاید وہ اسی شش چرخ میں تھے کہ اس میں کیا ہوگا؟ اور جب مس مراد نے چپے وقت اپنا ٹوہ کھول کر بھی نہ بتایا کہ اس میں کیا تھا تب کہیں مولوی صاحب کا خیال دوسری جانب مائل ہوا اور آپ نے اپنی اتلیدس کے حساب سے ثلث داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے الوداعی فقرے چندا حدیث سنائے کے بعد فرمائے ”بے پردہ پھر نا برا عیب ہے۔“

مولوی صاحب انھوں سے زیادہ بالغ ہونے والی یتیم لڑکیوں کا خیال رکھتے تھے اور اگر کسی کے ساتھ ان کا ازدواج بھی عمل میں لاتے تو بادل ناخواستہ اور پھر دو لٹامیاں سے خاص یتیم خانے کے لئے سو روپے کے نوٹ سے کسی طرح کم نہیں اپنی جیب میں ڈالوا لیتے تھے۔

مس مراد نے معاینہ کے دوسرے ہی دن شہر سے باہر ندی کے کنارے جس کے اس پار مختصر محل تھا ایک نئے یتیم خانے کی بنیاد ڈالی اور چھ ماہ کے اند اندہ شاندار عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ یتیم خانے کے صحن میں سبز لان، پھولوں کی کیریاں، کھیل کے چوڑے کی لکڑیوں سے مزین میدان تیار ہو گئے۔ اسی کمرے اور پینچے ملا کر قلعے کئے گئے تھے۔ وہاں پان کوئی نہیں کھا سکتا تھا تاکہ کی بلی رلویت کے نشان تک نہ لگا سکتا تھا۔ ہر کمرے سے ملحق علاحدہ غسل خانہ تھا۔ خوبصورت نیلے رنگ کے سستے کپڑے کے پردے ہر کمرے کے

معاذ سے اور دیپچوں میں آفریںاں کئے گئے تھے۔ ٹوہ کا سبز ٹوہ کی دو کیریاں، ہر ایک کمرے میں رکھی گئیں۔ پینچ بھی ٹوہ کے تھے کیونکہ بقول مس مراد ان میں کھل نہیں ہو سکتے تھے۔ روٹی کے دس اور پندرہ برس تک ایک بار بھی نہ دھنے والے گدیوں کے بجائے آپسنے یہ ترکیب کی تھی کہ فی پینچ چند سفید گدی بے غلاف بنوائے تھے اور ان میں چاول کا پیال بھر کر بچھا دیا جاتا تھا اور ہفتے کے بعد بدل کر دھونے دیدیا جاتا تھا صبح چار بجے پہلی گھنٹی بجتی تو بلا لحاظ موسم، تمام بچے بچیاں اور اساتیاں انک کمرے میں جمع ہو جاتیں، غسل، لباس، آرائش سے فارغ ہو کر ٹوہ ہال میں جمع ہو جاتے۔ باجماعت نماز ہوتی۔ پندرہ منٹ تک تلاوت قرآن کی جاتی تھیں کچھ بچے ناشتے کی گھنٹی بجتی، صاف پشترواں اور کابیاں، ساڑ جو کے ستواؤں پر لٹا کر ایک ایک کالج کے گلاس میں پانی ہر ایک کے سامنے رکھ دیتے جاتے۔ میز پر سے گلاس اٹھا کر اپنے ہاتھ سے سب متون بنا کر پیتے پھر باہر نکل کر ایک میدان میں پرا باندھ کر سب کھڑے ہو جاتے اور تھنوں سے اقبال کا شعر ترانہ ”مہین دھرب ہارا ہندوستان ہارا“ پر جوش بردہ پڑھ لیتے میں گاتے تھے کیونکہ مس مراد کی دانست میں اچلے ملت کے لئے اس ترانے سے بہتر نہ کچ نہک مولوں کیا گیا ہے۔ کیا چاہے گا۔ پھر خود مس مراد صرف پانچ منٹ تقریر کرتیں جو کبھی الوداعی نعمت پسندی، نصفت شعاری، اخوت، مساوات پر مبنی ہوتی کبھی پانچ منٹ میں تاریخ اسلام کے کسی واقعے کی یا صحابہ کرام کی سیرت پر ایک اجمالی تعارفی ارشاد فرماتیں، اس کے بعد ۱۲ بجے تک درسی تعلیم، پھر کھانا، پھر بچے تک فنی تعلیم جو متعدد قدیم اور جدید فنون پر مشتمل تھی دی جاتی تھی، بچے سے کھیل کود شروع ہو جاتا۔ رات کو تمام کمرے اندر گھس کر مس مراد خود اپنے اساتف کے ساتھ دیکھتی تھیں۔

مس مراد نے شادی نہیں کی تھی۔ عمر بھی تیس کے قریب ہو چکی تھی۔ ان کے والدین کی یہی اکلوتی بیٹی تھیں اور ابھی بی۔ اے پاس بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ دونوں جیسے ہی بھرمیں یکے بعد دیگرے دنیا کے بھیروں سے بکدوش ہو کر عدم کے سکون میں مقتود ہو گئے تھے، مس مراد نے غارتوں کا اتنا گہرا اثر لیا کہ تمام دولت قوم کے تیمانی اور مساکین کی فلاح میں خرچ کرنے کا تہیہ کر لیا اور گورنمنٹ کی ضمانت میں لیا

سز رفیق کہنے لگیں۔ "وہ بچہ تو دکھائیے جو آپ کتنی ہیلا بھی آیا ہے۔"  
مس مراد نے کہا۔ "آیا ماں! نرس سنجیدہ کے پاس گھر ہو گا۔"

نندائے لانا۔  
آیا ماں گئیں، تھوڑی دیر میں ایک سانولے سے بچے کو گود میں اٹھا لیں۔  
جو بہت تھوڑے لباس میں لایا گیا تھا۔ آیا ماں نے اسے میز پر بٹھایا، پیرسٹر  
صاحب اور ان کی بیوی اس کے قریب گئیں اور اسے ہنس ہنس کر  
چٹکی بجا کر کھلاتی رہیں۔ پھر اپنے شوہر سے انگریزی میں کہا کہ واقعی مس مراد  
کے یتیم خانے کا سیار کسی جرمنی اور فرانس کے یتیم خانے سے کم درجے کا  
نہیں ہے انہوں نے آیا ماں سے کہا کہ بچے کو لے جاؤ۔ چنانچہ نرس سنجیدہ  
کو بچہ واپس کر دیا گیا۔

یہ صابجہ نے اپنے شوہر سے کہا۔ "رفیق! مجھے تو یہ سنہری بالوں  
والی بچی پسند آتی ہے۔ کیسے پارے بال ہیں۔ کتنا خوبصورت اور مصوم چہرہ،  
آنکھیں بڑی جھلدار ہیں۔ بالکل انگریزی بال اور انگریزی آنکھ ہے!" پھر وہ  
صدیقہ کے بالوں سے کھیلنے لگیں۔

ان کے شوہر نے۔ "مارگریٹ ایہ جھلدار سیاہ پٹیوں والی  
لڑکی میں کا مشن خند و ستانی خوبصورتی کا مکمل نمونہ ہے اسے لو۔ مجھے تو بھی لڑکی  
بہت پسند آتی ہے۔"

مارگریٹ کہنے لگیں۔ "نہیں میں اسی کو پسند کر چکی ہوں۔ اچھا تمہیں  
اگر وہ پسند ہے تو دونوں کو رکھ لو۔ ایک میری لڑکی کھلائیگی ایک تمہاری۔  
پھر ایک تہقہ لکھایا۔

پیرسٹر صاحب نے بھی اسی طرح تہقہ لکھایا اور مس مراد بھی قند سے متہم ہوئی  
مارگریٹ نے پوچھا۔ "اچھا صابجہ ان بچیوں کے نام کیا ہیں؟"

مس مراد بولیں۔ "صدیقہ اور ممتاز۔"  
مارگریٹ نے کہا۔ "رفیق! ہندوستانی نام بہت بھلے گتے ہیں اچھا صدیقہ  
ہم تمہیں اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ ڈرو نہیں، تمہیں اچھے اچھے کپڑے پہنا دیں گے  
بہت کھلونے منگوا دیں گے۔ اچھی اچھی کتابیں دیں گے۔ خوب مٹھائی کھلا کر بیٹے  
دو نہیں تمہارے لئے خوبصورت طوطے اور چڑیاں عمدہ بچے منگوا دیں گے  
تم ہمارے ہمراہ چلنا اچھا... آج سے انہیں آبا جان کہا کرو اور ہم  
تمہاری ماں بنے جاتے ہیں۔"

اور اس کے سود سے یتیم خانے کے مصارف پورے کرنے لگیں۔ گودہ باہر کے  
چندوں کی شرمندہ احسان نہیں تھیں لیکن اخبارات میں چند سطور ان  
کے یتیم خانے کی مع میں جو شایع ہوئیں انہیں بڑھ پڑھ کر مولوی بنجید الدین  
کو رونہ آنا کہ ہم جو یتیموں کی خاطر مارے مارے پھرتے ہیں دن کو عیدائے  
رات کو شب برات نہیں سمجھتے وہ تو بڑھ کھاتے ہیں گئے اور توصیف کی سختی  
وہ ٹھہریں جواز سرتاپا یتیموں کو اس کردار سے رکھیں کہ انہیں اپنی یتیمی اپنی  
غربت اور اپنے افلاس کی یاد بھی بھول کر نہ آنے پائے۔ نیز جس دن سے  
مس مراد کا یتیم خانہ کھلا مولوی بنجید الدین یتیموں پر زیادہ مہربان رہنے  
لگے مگر اپنے گھروالوں شلائقینوں لڑکوں سعید، اسعد، مسعود پر اور اپنی  
اہلیہ پر بہت بگڑتے تھے۔ مارتے بھی تھے۔ کہتے بھی تھے اور فقیر کا غصہ فقیر  
کی جان پر بھی نکالتے تھے۔

جس دن لڑکیاں شگل کی سیر کرنے گئی تھیں اسی دن کا ذکر ہے۔  
فاطمہ نے پوچھا۔ "آیا ماں! آپ نے غطین خاں کو بھیج کر ہم لوگوں  
کو اتنی جلدی کیوں بلالیا؟  
آیا ماں بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگیں۔ "بچی مس صابجہ نے بلوانے  
کا حکم دیا تھا۔ صدیقہ کہاں ہے؟ اسے سنا تھا دھلا کر اچھے کپڑے پہنا کر لاؤ  
تم سے ذنبے تو میں لنگھی کر دوں گی اور ہاں اس کے سر میں وہ ریشمی لال  
فیت بھی باندھ دینا۔"

فاطمہ نے پوچھا۔ "کیوں! کیا بات ہے؟"  
آیا ماں نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "اب کیا بتاؤں! پھر خندہ اسانس  
فاطمہ اپنی بہن کو بتا سنا اور کر لائی تو آیا ماں نے اسے گود میں لے کر دو دو  
گالوں کا بوسہ لیا اور مس مراد کے دفتر میں لگیں جہاں مسز رفیق پیرسٹر ایٹ  
اور ان کی انگریزی دلہن مارگریٹ جن کا اسلامی نام زینب رکھا گیا تھا۔  
کرسیوں پر بیٹھتے اور مس مراد سے یتیم خانے کے متعلق گفتگو ہر دو ہی سختی  
بارہ تیرہ اور بھی لڑکیاں لا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ فاطمہ نے جھک کر سلام کیا  
آیا ماں نے صدیقہ سے کہا تم بھی سلام کرو۔ صدیقہ نے آداب کیا۔ پھر اسے  
آیا ماں نے گودی سے اتار کر لڑکیوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔  
مس مراد نے نوازدوں کو مخاطب کیا۔ "بیجے جناب آپ کی سبکدوشی"

سولہ سالہ فاطمہ اب تک تیر کھڑی ہوئی تھی لیکن آخری کلمات سن کر وہ چونک اٹھی اور صدیقہ کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے گویا ہوئی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میری بہن ہے۔ میں اسے جدا نہ ہونے دوں گی۔ ہرگز نہ ہونے دوں گی۔ پھر وہ آبدیدہ ہو کر لرزرتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنی سسکیوں کو دباتے ہوئے اس مراد کو خطاب کرنے لگی۔ "میں صاحبہ! رحم کیجئے! اب کی دہائی کے وقت یہ ایک برس کی تھی۔ کچھ برس ہو گئے ہیں اسے اپنی چھاتی سے لگائے رکھا ہے۔ آپ میری بہن کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں آپ اور دوسری لڑکی دیدتے ہیں لیکن اسے نہ بھیجئے۔" پھر وہ رونے لگی۔ صدیقہ بھی رونے لگی۔ دونوں میاں بیوی ہٹا ہٹا کر ایک دوسرے کی پھر مس مراد کی صورت تکلفے لگے۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر مارگریٹ نے فاطمہ کے ساتھ بوجھا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

اس مراد نے کہا۔ "صدیقہ کی بڑی بہن۔" مارگریٹ نے بنا کر کہنے لگی۔ "بڑی کریمہ النظر لڑکی ہے دیکھتے ہی بدی صورت ہے۔ ناک کیسی چوٹی اور بونڈی ہے آنکھیں زرا زرا سی اندر کو گھسی ہوئی ہیں۔ دانت کتنے بڑے بڑے ہیں جیسے نکلے پڑے ہوں۔ صدیقہ تو ایسی نہیں ہے؟"

آیا ماں بول اٹھیں۔ "ادھنہ! ماں کا پیٹ کھار کا آوا۔" فاطمہ کی صورت کالی پڑ گئی۔ اس نے اپنی بد صورتی کی نقشہ کشی آج ہی نہیں سنی اور دیکھی تھی۔ اسے ہمیشہ سے اس قسم کی نکتہ چینیوں کی عادت سی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے جی میں افسوس اور ملامت کر رہی تھی کہ خدا نے مجھے ایسا کیوں پیدا کیا ہے؟

اس مراد کرسی سے اٹھ کر فاطمہ کے پاس گئیں۔ سر پر ہاتھ پیرتے پیرتے کہا۔ "کیوں روتی ہو فاطمہ! پیاری بچی! کیا میں تمہاری بہن ہوں؟ ایک رئیس اسے اپنی گود میں لے رہے ہیں۔ بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کریں گے۔ تعلیم و تربیت کا بار اٹھائیں گے۔ شادی کر دیں گے اپنی جائیداد اس کے نام سے ہر کر دیں گے تو اس میں کون سی بُری بات ہے تم نا سمجھی کا ثبوت نہ دو۔ آخر متا ز بھی تو جا رہی ہے۔ دونوں کا دل ایک دوسرے سے بہل جائیگا۔"

فاطمہ کو بچہ پہلے سے بھری بیٹھی ہو۔ وہ ناز و قطار نہ منے لگی اور اٹھ اٹھ

کو کہا۔ "آپ کو ہم لوگ۔ اپنی۔ ماں۔ اپنا باپ۔ بچتے ہیں۔ ادھاپ ہی ہم پر۔"

اس مراد نے شفقت کے ساتھ کہا۔ "اں صحیح ہے ماں میں تمہاری محنتی ماں ہوں مگر فاطمہ! تم جانتی ہو سترہ سال کی عمر ہونے کے بعد یہ یتیم خانے میں نہیں رہنے دیا جاسکتا کچھ نہ کچھ کام دلایا جاتا ہے۔ خود تم کو سال چھ مہینے میں ملازمت دلائی جائیگی یا عقد کر دیا جائیگا۔ اس صورت میں کیا تم صدیقہ کو یہاں ایکلی چھوڑ دو گی کہ نہیں اور اگر اپنی سسرال میں لگاؤ گی تو کتنی مصیبت اور بد مزگی کا سامنا ہو گا؟ ماں جاؤ اس میں تمہاری اور صدیقہ کی بھلائی ہے۔ اتنی مزا بھی نہیں۔ اسکا ساتھ مہینے والے قبر میں جاسوئے تو تم کب تک ساتھ دو گی؟"

فاطمہ نے رو کر کہا۔ "خود تو دونوں چل بسے ہیں تمہاری خدا بھیلنے کیلئے چھوڑ گئے۔"

اس مراد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں بہہ کر رخسار پر جم گئیں وہ سکتے کے عالم میں خدا خبر کیا سوچنے لگیں پھر کہا۔ "تم قرآن پڑھتی ہو تم ہر سنتی ہو، خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس میں بھی کوئی اس کی مصلحت ہو گی۔ ہر مصیبت کے وقت صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا تم راضی رہنا نہیں ہونا چاہتی ہو؟"

فاطمہ نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "اچھا تو مجھے اعازت ملنی چاہئے کہ صدیقہ کو ہمیشہ دیکھنے جایا کروں۔"

مارگریٹ نے کہا۔ "ہمارے بچے کا چھانک تھیں خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ کھلا رہیگا۔ تم شوق سے دیکھنے آیا کرو۔" صدیقہ کو گود میں لینے کیلئے جب مارگریٹ بڑھیں تو وہ چل گئی اپنی بہن کی بہاری کی اپنے ہاتھ جڑا لے۔ فاطمہ بولی۔ "تو آپ جبر نہ کیجئے میں خود بہلا کر موڑ میں بھاؤں آتی ہوں۔" پھر وہ صدیقہ کو چھاتی سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

جب سب موٹر کی طرف انہوں نے فاطمہ نے متاز سے کہا۔ دیکھ متاز تو بھی جا رہی ہے میری صدیقہ کو کوئی تکلیف نہ دینا۔ متاز نے جسارت کے ساتھ کہا۔ "بڑی آیا اس دن صدیقہ کو اختر علی مارتا تھا تو میں نے کیسا پیہر کھینچ کر مارا تھا۔ کچھ طفیل کو صدیقہ کے بٹلے دو پیہر مارے کہ نہیں عید نے صدیقہ کے چکلے کی تھی میں نے کس بُری طرز نہ چاہا تھا۔ اچھی! میرے روبرو کسی کی ہمت ہے جو اسے سالے؟"

اطلاع کر دو کہ یتیم خانے کی فاطمہ آئی ہے۔

دہتانی ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں مارگریٹ برآمدہ میں کھڑی ہوئی ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھیں۔ فاطمہ نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔

”وہیں رہیں ہو کر گردن ہلا کر پوچھنے لگیں۔ کیا کام ہے؟“  
”صدیقہ سے ملنے آئی ہوں۔ اپنی بہن سے۔“

”تم تو سسر عادل کی نرس ہو گئی ہو نا؟ میں اپنی بچیوں کو ذلیل اور بد صورت نرس کا رشتہ دار نہیں ظاہر ہونے دینا چاہتی۔ تم یہاں سے جلی جاؤ۔ لڑکیوں کو نظر مت آو ورنہ ان کا جی تھوڑا ہو گا۔ اچھا ٹھرو۔“

مارگریٹ اندر گئی اور پھر آکر پانچ روپے کا ایک نوٹ فاطمہ کے سامنے پھینک کر جلدی سے کہا۔ ”آج سے میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ خبردار تم مت آنا۔ جاؤ یہ بخشش لے جاؤ۔“ اور پھر کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

فاطمہ کو برا غصہ آیا اور روندا بھی۔ اس نے زور سے نوٹ کو پھاڑ کر ہتھیلی میں تمام کر کے دکھ کر دروازے کی طرف جہاں درزوں میں سے مارگریٹ جھانک رہی تھی پھونک مار کر اڑا دیا اور کہنے لگی۔ ”دھوکے باز اور مکار عورت! کیا میں تیرے نوٹ کی بھوک کی ہوں۔ خدا کرے میرا صبر کچھ پر پڑے۔ تو نے مجھے اپنی بہن سے چھڑا دیا۔“

دہتانی ملازم ڈانٹ کر کہنے لگا۔ ”نکلتی ہے کہ نہیں نکلتی ہے۔“  
فاطمہ نے رو کر گرج کر کہا۔ ”جاتے ہیں۔“ اور پھر روتی ہوئی بدلتی ہوئی۔ باہر نکل گئی، ملازم کہہ رہا تھا۔ صورت چڑیلوں کی مزاج پر یوں کے۔ یہ بھنگ فاطمہ کے کان میں پڑی اور اس نے صاف طور پر سنا۔

خیر خواہ بچے کو ام العبدیان ہو گیا۔ سسر اور سسر عادل سینا دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ فاطمہ گھبرا گئی۔ اس نے فوراً غلام بخش ملازم کو پکارا اور پھر پھر کانبر دیکھ کر سیول لائسنس کے پرائیویٹ ڈاکٹر مینز کو فون کیا۔ تھوڑی دیر میں نوٹ کار میں بیٹھ کر ڈاکٹر مینز آئے۔ بچے کی نبض دیکھی، دوا دی اور سسر عادل اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق استفسار کیا۔ فاطمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ آپ جو دوائیں دینے کی ہیں وہ مجھے دیکھائیں میں پلائی ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس وقت تک جو دوا دینے کا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ نہ آجائیں۔

۴

سسر عادل نے اخبار میں نرس کی ضرورت کا جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں سسر عادل نے فاطمہ کو ان کے ہاں اپنا خط لے کر بھرا دیا اور سسر عادل نے اسے رکھ لیا۔ لیکن پہلے پہل تو دونوں میاں بیوی اس کی صورت کو دیکھ کر کچھ استحقار کی نظر سے اسے دیکھتے تھے ان کی آنکھ سار لڑکی ساجدہ اور لڑکا ماجد بھی اس دن باہر سے کھینچے کھینچے آئے تھے تو نرس فاطمہ کو دیکھ کر اس کے منہ پر اپنی ماں سے دونوں کہتے تھے۔ امی جان! اس نرس کی کیا بری صورت ہے کیا آبا میاں کو ننھے کے واسطے کوئی اور بچی کھلائی نہیں مل سکتی تھی۔ سسر عادل کی بیوی بہت پشیمان ہوئی نہیں اور ان دونوں کو مارنے دوڑی تھیں۔

فاطمہ نے جلتے ہی چھوٹے ایک سالہ بچے کا چانچ لے لیا۔ بچہ بھی اس سے اس قدر ہل گیا کہ ایک لمحہ اس کے بغیر نہ رہتا۔ وہ اتوں کو اٹھ کر اسے چھاتی سے لگائے لگائے پھرتی۔ اراروٹ کھلاتی۔ جھولا جھولا اور شام کو صاف ستھرے کپڑے پہنا کر ننھی سی گاڑی میں بٹھا کر تمام سول لائن کی ٹرک پر بڑا خوری کیلے لے جاتی تھی۔ صدیقہ میں بہت دن سے اس کا جی نکلتا تھا۔ فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ اس لئے ایک دن پانچ بجے شام کو اس نے سسر عادل کے ننھے کو اس کی گاڑی میں بٹھایا اور بڑا خوری کے بہانے سے گاڑی ڈکھلتی ہوئی رفیق صاحب بیرسٹراٹ لکے بنگے پر جا پہنچی۔ پھاٹک کھلا تھا وہ گاڑی لئے لئے اندر جا پہنچی۔

سامنے برآمدے میں جو دہتانی ملازم کھڑا تھا اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ”اے بغیر پوچھے پانچے کون چلا آتا ہے، ٹھہر جا۔“ اور خود پاس آکر بولا۔ ”کیا ہے؟“

”میں صاحبہ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”میں صاحبہ کو نرس کی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس ابھی دونوں بچیوں کے واسطے دو دو نرسیں لگی ہیں۔“

”میں نرس نہیں ہوں۔“

”تو کیا بھکارن ہے۔ اب تک تو بھکاریں اپنے بچوں کو میلے کپڑے پہنا کر گود میں لے کر آتی تھیں۔ تو گاڑی میں بٹھانا سنوا کر لائی ہے۔“  
”میری بہن کو ہم صاحبہ نے گود میں لیا ہے۔ اس سے ملنا ہے۔ تم



ڈاکٹر نے مسکرا کر دیکھا اور دھواں اڑاتے اڑاتے فاطمہ سے پوچھنا چاہا کہ تم کون ہو؟ یہاں کب سے آئی ہو؟ تمہارے والدین کہاں ہیں؟ کیا کہتے ہیں؟ مگر فاطمہ نے کسی سوال کا بھی جواب نہ دیا پتا تو ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ البتہ نرس کے خط و خال دیکھ کر وہ مسکراتا رہا۔ فاطمہ کو یہ خیال ہوا کہ وہ اس کی بھتیجی صورت کا دل ہی دل میں ٹھکرا رہا ہے۔ وہ بہت سنجیدہ، طول اور خاموش رہی۔

جب مسٹر عادل اور ان کی اہلیہ سینا دیکھ کر آئے تو خیریت ہی پریشان ہو گئے۔ اندھ آئے مگر ڈاکٹر کے اطمینان دلانے پر کہ بچہ سو گیا ہے انھیں تسکین ہو گئی، تاہم مسٹر عادل کا جی نہ مانا۔ میرے بچے! کہہ کر انھوں نے جو بچی بچے کو گود میں لیا وہ چونک گیا اور رونے لگا اور بچہ نے گما۔ نرس فاطمہ نے جب اسے اپنے سینے سے لگا کر اوپر اٹھا کر کھانا شروع کیا تو بچہ چپ ہو گیا۔ پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ فاطمہ اگر ذرا لیکر بیٹھے یا اور کوئی گود میں لے تو روتا اور اگر وہ لے کر نہ لیتی تو آنکھیں بند کر کے گردن لٹکا کر اس کی چھاتی سے گھارتا اور چپ ہو جاتا۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد فاطمہ تمام رات بچے کو اسی طرح لے کر نہ لیتی رہی۔ گھڑی کا تین بجے کا اٹارم ہو رہا تھا مسٹر عادل کی فینڈ کھلی دیکھا کہ فاطمہ باہر نکل رہی ہے۔ مسٹر عادل بھی بار بار آکر دیکھ جاتے اور ٹھکانہ لہجے میں اسے کہتے ہیں سو جاؤ فاطمہ! وہ مسکرا کر کہہ دیتی کہ مجھے فینڈ نہیں آتی۔

صبح تک وہ نہ لیتی ہی رہی دو نوں میاں بوی اس کی نسبت تعریفی کلمات استعمال کرتے تھے جب دوسرے دن ڈاکٹر منیر دیکھنے آئے تو ان کے سامنے بھی فاطمہ کی خوبیوں کا تذکرہ ہوا۔ وہ سن کر مسکرا کر چپ ہو گئے۔

۵

مسٹر رفیق بیرسٹر کے یہاں اس سے جو بدسلوکی کی گئی تھی وہ مسٹر عادل مسٹر عادل، ڈاکٹر منیر پر ظاہر کرنے کے بعد وہ اکثر سوچتی تھی کہ ایک دن میں اس مراد کے یہاں بھی جاؤنگی اور ان سے بڑے بیان کر دوں گی۔ کچھ میں نے مدلیقہ کو بول نہیں دیا ہے لیکن تمہیں جانے کی نیت نہ تھی نہ ہی تمہیں ملتی تھی کیونکہ تمہیں اس سے اس قدر ہل گیا تھا کہ ایک لمحہ اس کے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اسی دوران میں پلیگ نمودار ہو گیا۔ سول لائنس خالی ہونے لگی جو مسٹر عادل اپنے بیوی بچوں کو باہر روانہ کرنے والے تھے۔ فاطمہ کو کسی نے

ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ اس کی بہن مدلیقہ کو پلیگ ہو گیا ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ فطر قہر کا اپنے گلی، پھر مسٹر عادل کے پاس جا کر روتے گئی انھوں نے کہا میں اس گھر میں جہاں پلیگ کا مریض موجود ہے اس وقت تک جانے کی اجازت نہیں دے سکتی کہ تم میرے یہاں کام کر رہی ہو فاطمہ نے اسی وقت کہا اچھا اب مجھے آپ کی نوکری کی ضرورت نہیں ہے اور پھر باہر نکل گئی۔ وہ اپنی بہن کو اس حالت میں کس طرح چھوڑ سکتی تھی؟ جب وہ پہونچی روتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ مدلیقہ کھانگ مرمر کی صورت کے مانند لاشہ باہر میز پر رکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر منیر اسے خور دیکھ رہے ہیں۔ وہ جانتے ہی مدلیقہ پر ٹھک گئی اور اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گال چومنے لگی اور چیخیں مارنے لگی۔ وہ مار گریٹ کو دیکھ کر چلا کر بولی۔

”تم ظالموں نے میری بہن کو مارا ہے۔“

مار گریٹ سو اسے گھورتے اور اپنے ہونٹ چبانے کے کچھ نہ کہہ سکتی تھیں۔ ڈاکٹر منیر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کہا۔ لاش سے الگ رہو تمہیں نہ پلیگ ہو جائے۔ تو فاطمہ نے کہا میں چاہتی ہوں کہ ہو جائے اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سر میز پر ٹک ٹک کر کھڑا کیا۔ وہ ڈاکٹر منیر کے سنبھالنے نہ سنبھل رہی تھی۔ اس کے بعد وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

مار گریٹ نے کہا۔ ”خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب اس خبیث روح کو کسی طرح یہاں سے دفنان کیجئے۔“

ڈاکٹر منیر نے برہم ہو کر کہا۔ ”اگر یہ خبیث روح ہے تو اسے میں اپنے ہمراہ لے جاتا ہوں، آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں اور دیکھئے وہ دوسری بچی کے بیٹے کی بھی اس نہیں ہے وہ صرف ایک گھنٹہ کی همان ہے پھر ڈاکٹر منیر نے خود فاطمہ کو اٹھا کر کوٹریں ڈالا۔ مار گریٹ نے ملازموں کو ہاتھ لگانے کا اشارہ کیا لیکن ڈاکٹر نے سب کو ڈانٹ بتلوی کر کے کوئی ہاتھ نہ لگانا۔

۶

فاطمہ ڈاکٹر منیر کے بچے پر ایک ہوا دار کوسے میں صاف بستر پر چڑھا تھا تھی آج دس دن ہوئے جب مسٹر رفیق کے بچے سے ڈاکٹر صاحب اسے اٹھا لئے تھے۔ اسے پلیگ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے راتوں کی فینڈ حرام کی۔ اپنی



بڑی بہن رقیہ پر بھی اعتماد نہیں کیا جو فاطمہ کے آنے کے وقت ہی سے منہ بٹا بنے پھرتی تھیں اور دینی زبان سے کہہ دیا تھا کہ یہ لاثانی لڑکی کیوں لئے ہو؟ دوسروں کی بلا اپنے سر کیوں لے رہے ہو؟ اب یہاں ایک پھیل جائیگا، مگر ڈاکٹر نے درشت منہ سے گھور کر کہہ دیا تھا۔ رقیہ آپا تم میرے معاملات میں ہرگز دخل نہ دیا کرو۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اگر اپنی جان کا خوف ہے تو اپنی لڑکی کا ہاتھ پکڑو اور جاؤ۔ رقیہ سہم گئی اور پھر کچھ نہ کہا لیکن درپردہ نوکر چاکر اور آنے جلنے والوں سے ڈاکٹر کی حاکمیتوں اور مجنونانہ حرکات کا تذکرہ کرنے لگی۔ اسے سب سے بھاری خوف یہ تھا کہ ڈاکٹر کہیں اس لڑکی کو متبنتی بندے کے لئے تو نہیں لایا ہے کیونکہ اس صورت میں خود اس کی بیٹی زہرہ کا ٹھکانہ نہ رہے گا جسے ڈاکٹر کے اپنی بیٹی بنالینے کی امید کی جاتی تھی۔

پلیگ کے بعد اسے سر سام ہو گیا تھا لیکن زندگی کی نجف کر میں طلوع ہو رہی تھیں اور انجام کار فاطمہ رو بصحت ہو گئی۔ اس نے ہوش میں آنے وقت پوچھا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اور صدیقہ آؤ، صدیقہ تم ہو ایسے اڑ رہی ہو۔ وغیرہ براتی تھی۔ ڈاکٹر مینر نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کر دی تھی اور جب وہ اچھی ہوئی تو ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ پیاری فاطمہ! آج سے تم ہماری بیٹی کہلاؤ گی۔ دیکھو تم اس گھر کو ناپسند تو نہیں کرتی ہو؟ یہ تمہارا گھر ہے۔ رقیہ نے سب آدیں کھڑے ہو کر سن لیا تھا۔ اس کے منہ پر بھائیوں اندیشہ تھیں اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اپنی بچی کی راہ میں سے اس کاٹنے کو ہٹا دے۔

ڈاکٹر نے اپنی بھانجی زہرہ کو ہدایت کر دی تھی کہ تم فاطمہ کے کمرہ کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ اپنی بہن کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر تم میرے ہمراہ رہنا چاہتی ہو تو فاطمہ کے خلاف کسی قسم کی کوئی حرکت نہ کرنا۔ اسے اذیت دینا۔ ملازموں کو حکم دیدیا تھا کہ اس گھر کی مالک آئندہ فاطمہ اور صرف فاطمہ ہوگی اس لئے تم لوگ اس کا حکم نہ ماننا اور اس کی خاطر داری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرنا۔

ڈاکٹر مینر جب کبھی باہر سے آتے سب کے پہلا لفظ یہی نکلتا تھا۔ فاطمہ تم کہاں ہو؟ ادھر آؤ۔ رقیہ اور زہرہ کو ڈاکٹر کی حرکات بہت شاق گذرتی

تھیں۔ ڈاکٹر فاطمہ کی دلجوئی میں اپنا سارا وقت گزار دیتا تھا۔ زندگی کی تین بہاریں ختم ہو چکی تھیں مگر ڈاکٹر نے شادی نہیں کی تھی اس کے دن اور راتیں بقرہ کے المناک ماحول میں گزر رہی تھیں لیکن جس دن سے فاطمہ آئی اس کا دل اداس نہیں رہے گا۔ جس طرح کوئی اپنے طوطے سے باتیں کرتا ہو ڈاکٹر مینر فاطمہ سے گفتگو کرتے تھے۔ وہ اس کے بغیر چاہے ایک نہ پیتے تھے۔ فاطمہ کو اجازت تھی کہ ان کے خاص کمرہ میں تنہا جب تک چاہے رہے۔ کھے۔ پڑے۔ لیکن رقیہ بہن اور زہرہ بھانجی کو اندر داخل ہونے تک کی ممانعت تھی۔ وہ دونوں مسجد کی آگ میں جل رہی تھیں بہن رقیہ بہن فاطمہ نے بارہا سنا کہ رقیہ آنے جانے والی عورتوں سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہتی کہ بھائی پاگل ہو گئے ہیں۔ کہیں سے اس چیزیں کو پکڑ لئے ہیں اور اس کی محبت میں لئے جا رہے ہیں۔ پھر سب مل کر قہقہے لگاتے فاطمہ دل ہی دل میں کڑھتی لیکن کبھی ڈاکٹر سے شکایت نہ کرتی۔ ایک دن زہرہ کی تمام ہم جماعت لڑکیوں کی دعوت تھی کیونکہ اس کی سالگرہ کا دن تھا فاطمہ کو شرکت کی دعوت دی گئی مگر وہ قصداً نہیں گئی۔ البتہ اس نے پاس سے نکلتے ہوئے سنا کہ زہرہ لڑکیوں سے کہہ رہی تھی۔ ہاں یہی ہے وہ لڑکی بہت بد صورت ہے اس لئے صورت دکھاتے شرماتی ہے اس دن سسر مادل نے اس کا رنگ اور اس کی زس گری کی تنخواہ کا بقایا میں روپے بیسے تھے۔ سجان انڈرنگ دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ حضرت لوح کی بیٹی نے دس دن کے طوفان کے وقت اپنے کپڑے لئے اسی میں سنبھال کر رکھے ہونگے۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور فاطمہ خفیف ہو کر جلدی سے چلی گئی وہ بہت دیر تک اپنے پینگ پراوند سے منہ کر کرتی رہی اور پھر ٹرنگ کھولا۔ جس میں سے صدیقہ کے کچھ پرانے کپڑے بھی نکلے جنہیں دیکھ کر اس کے بچھڑا دل کے زخم ہرے ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ اتنا روئی کہ لگھی بندھ گئی۔

ملازمنے آتے ہی کہہ دیا تھا۔ ڈاکٹر مینر دو دن کیلئے باہر گئے ہوئے تھے اسی اتنا میں واردات رونما ہوئی۔ فاطمہ نے باوجود رقیہ کی منت حیات اور ہاتھ پکڑ کر روکنے کے اپنا مختصر سامان باندھ لیا اور دوبارہ تیم خانے کو چلی گئی۔ ڈاکٹر مینر کو رقیہ نے سبکیں بچا ہوں سے دیکھا اور سلام بھی کیا لیکن

فاطمہ نے سب کو قسم دیدی تھی کہ اگر کوئی آئے تو اسے حوالے نہ کیا جائیگا اور نہ بتایا جائے کہ وہ یتیم خانے میں موجود ہے لیکن ڈاکٹر کو ایک نچوڑی کے

حسن سزیز جاوید

کے لئے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ  
افسانہ کہانی کی ایک نئی شکل ہے  
جس کا نام ہے کہانی کی ایک نئی شکل  
جس کا نام ہے کہانی کی ایک نئی شکل

از علامہ

# ہندوستانی عورت

بجز محرابی

خانہ دل کی تکیں ہندوستان  
 تہن پرودہ میں ہندوستان  
 نعتی کوئی اس کے کعبے  
 لکھو ہو کر بھی نہیں از عورت  
 ضبط سے مری کیوں دلگھٹ جائے  
 اے کبھی منہ سے نہ کہنے والی  
 کوئی ایسی فائے کو خبیثہ  
 کہ نہ نام پرانے والی

ماں شوکتہ کو تو نہیں  
 اب اس کے سوا کیا باقی  
 کوئی سمجھ کر جو اس کو نہیں  
 طلب نام خود اس کو نہیں

۱۔ نازد کبریاں دل محبوبیت  
 گرمی زدہ راہے غل محبوبیت  
 زان توں چھوٹے محبوبیت  
 زان بیخ فتن و بیخ محبوبیت  
 ۲۔ زان بہت گندہ درویش  
 در عالم خلق منظر حق  
 ۳۔ زان بجز حق شے کبر  
 راہ راہ توہ مطلق

# مرزا حسرت دہلوی!

از جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی،

غیم کے لشکر نے سارے شہر کو ایسا دیران کیا جیسے بادخزاں سے باغ برباد ہوتا ہے کوئی سیل ایسا نہیں لاسکتا تھا جیسا افغانیوں کے ظلم نے طوفان پکایا ہے ایسے عین جن کی زلفیں سنبل سے بہتر تھیں جن کے خط و خال پر بارغ کو رنگ تھا خالوں کے دست تقا دل سے ایسے برباد ہو گئے کہ سب نقشہ مٹ گیا۔

جس شہر کی بہار سے کشمیر غرق شرم تھا جس کا ہر مکان بہشت تعمیر تھا۔ جس کے تمام مکان آئینہ خانہ تھے جس کے ہر کوچہ میں نہر جاری تھی۔ نہ اب وہ نہر ہیں نہ شفاف پانی۔ جہاں عطر گلاب تھا وہاں مرزب پڑا ہوا ہے قلعہ معلیٰ کے پتھر اور ستون اور محراب جہنم کے کنارے شکستہ پڑے ہیں جس جگہ فرشی ادب سے پیشانی گھستے تھے وہاں شریر دجال کا لشکر پڑا ہوا ہے۔

آخر ایسی حالت ہو گئی جو لوگ دولت رولتے تھے وہ خاک چھلتے پھرتے ہیں جہاں بلبل کا آئینہ تھا وہاں اُلو بولتا ہے۔ اب نہ آئینہ خانہ ہے نہ آئینہ دیکھنے والے۔ پاؤں میں آبلے پڑے ہیں۔ جہاں کی جان شہر کا جسم شاہ عالم بادشاہ کو فلک نے ایسا غم دیا ہے کہ اس کے غم میں ہم کہتے ہیں۔ جس کے سخن میں طراوت اور زبان میں حلاوت تھی جس کی نگاہ سے بہار ایمان کو رونق تھی جس کے قدم سے زمانہ میں برکت تھی جو ہر علم و فن میں کامل تھا اور جس کے دم سے ہزن و نہر کے اہل کمال جمع تھے، کسی کو من پرستی کا شوق تھا۔ کسی کو موسیقی، کسی کو زہد کا ذوق تھا۔ وہ سب دام بلا میں گرفتار ہیں۔ ساری خوش الحانی جاتی رہی۔ تمام بلبل گلستاں اسیر غم ہیں۔ آب و دانہ کی حیرانی ہے۔ وہ شلخ کٹ گئی ہیں پر کربال کرتے گئے۔

مرزا جعفر علی حسرت دہلوی خلف مرزا ابوالخیر دہلوی، ان کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ عطار نے پیشہ تھے اور اکبری دروازہ دہلی میں ان کی دکان تھی۔ لیکن یہ ایسا ہو لیکن ۱۷۷۱ء میں جب عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ سربراہ لے سلطنت ہوئے اور تمام شعرائے دہلی ان کے دربار میں ملازم ہوئے تو حسرت بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ اسی زمانہ میں غلام قادر افغان خلف ضابط خاں کچھ افغانیوں کی فوج جمع کر کے لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کے دار السلطنت میں آیا اور بادشاہ سے ملازمت کی درخواست کی۔ بادشاہ خود اس سے بدظن تھے اور اسی کے خوف سے ہمارا چہرہ سندھیا کے نام طلبی کا فرمان جاری کیا تھا مگر اتفاق سے بادشاہ کا وہ فرمان اس کے ہاتھ لگ گیا۔ پھر کیا تھا وہ اسی وقت فوج لے کر بادشاہ کی بارگاہ میں گھس آیا اور چند افغانوں نے بادشاہ کو زبردستی تخت سے کھینچ کر بہت اذیت پہنچائی اور چھری سے بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور بیرحمی سے ایک سو اسی محلات کی بھرتی کی اور ان کو مارا۔

مرزا جو ان بخت اور سلیمان سکھ اور مرزا اکبر شاہزادوں کو لائیں سے مار کر قریب بہ ہلاکت پہنچا دیا اور خزانہ دریافت کرنے کے لئے محلات کو سخت تکلیف میں مبتلا کیا۔ شب کو فاقہ دیا۔ ذی الحجہ کے آغاز سے ۳۰ محرم تک ان بکیوں پر آب و دانہ بند کیا۔ جب سب محلات کا نقد و جنس لوٹ لیا اور خزانے خالی کر دیئے تو تمام اسباب کشتیوں پر بار کر کے غوث گڑھ کو چلا گیا۔ حسرت نے یہ تمام واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس کا ایک مرثیہ نظم کیا جس میں لکھتے ہیں۔

”جہاں آباد کا حال بھی مرثیہ سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ فلک نے اس پر یہ زوال نازل کیا ہے مگر اب بکار و مال مٹنے پر کھ کر روتا ہے

بادشاہ صاحب تخت و تاج اپنی اولاد کی روزی کا محتاج ہے جب کو ساوا ہند خراج دیتا تھا اس سے خیم خراج لے۔ یہ تو وہی شہل ہوئی کہ شیر کو شہال شکار کوئے۔

آخر فکر محاش سے تنگ آکر حسرت نے دہلی سے فیض آباد آنے کا قصد کیا کیونکہ اس وقت فیض آباد ہی اودھ کا دار السلطنت تھا اور نواب شجاع الدولہ سربراہ اُسے سلطنت تھے۔ فیاضیوں کے شہرے ہو رہے تھے۔ اہل دہلی اسی طرف متاٹھائے آتے تھے اور برسر روزگار ہو جاتے تھے من اتفاق سے ایام گری میں اودھ کا سفر اختیار کیا جس کے متعلق خود کہتے ہیں۔

گری کا سفر ہے اور نہ سر پر سیاہ خورشید نے عشر کا سماں دکھلایا، جھل اور دھوپ العیش کی فریاد فریاد کہ دشت کربلا یاد آیا، اتفاق سے پہلی جو کرایہ کی تھی اس کے بل بھی سست تھے اس کے متعلق کہتے ہیں۔

جیسا کہ سفر کیلئے میں ابکی بار ایسا نہ کبھی سفر کیا تھا زینار کہتی ہے مجھے دیکھ کے گاڑی ہر بار حسرت ہوئے شیطان کے چپے پروا راستہ کے گرد و غبار سے تنگ آکر کہتے ہیں۔

چتنے کہ سفر میں ہم کو دن تیرے ہیں کھانا نہ تو کھاتے ہیں کچھ پیتے ہیں اور چینی کا اسلوب جو ہم سے پوچھو ہم ان دنوں خاک پھانکے جیسے ہیں غرض بوجہ طے منازل فیض آباد میں داخل ہوئے اور اس شہر کی آبادی دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا اس میں بھلا شہر اور اہل شہر کی مدح کی ہے۔

کوئی قصیدہ ایسا ہے کہ مجھے ایک ایسے شہر کا موقع کھینچدے جس کی سرخی غیرت گھمائے چمن ہو اور سبزہ اس کا سبزہ جنت۔ بلخ شہر عمارت و خست، گھانس، چاروں طرف ہو۔ قلعہ ایسا ہو جس پر جنگی توپیں چڑھی ہوئی ہوں قلعے کے برج برج افلاک ہوں۔ ان میں ایسی تعاشی زرد ہو جیسے ستارے چمکتے ہیں بارگاہ ایسی جمہا ہو کہ خسرو میر ترز کہنے۔ فرش بر ایک ایسی مرقع کرسی کچی ہو جس کی روشنی عرش تک پہنچتی ہو۔ زیب کرسی ایسا جوان ہو جس کا شہ و نظیر آج تک خلق نہ ہوا ہو۔ جابجا قریلوں سے منصبدار کھڑے ہوں۔ در دولت پر فیل سوار اور امیر کھڑے ہوں

ایک طرف ارباب نشاط آکر حاضر ہوں کوئی گلے کوئی ناچے کوئی مجھے کو کھڑی ہو کر کے نال دے دھوکہ بھائے۔ سب کے پاؤں سے گھونگر کی صدا آتی ہو۔ کوئی گت لینے میں ٹھوکر لگائے۔ اس شہر کا نام فیض آباد ہے اور والی اس کا شہل الدولہ بہادر ہے۔

اس قصیدے کے ویلے سے دربار تک رسائی ہوئی اور کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ جب آصف الدولہ بہادر ۱۸۵۸ء میں سربراہ اُسے سلطنت ہوئے تو ان کی خدمت میں بھی ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع یہ ہے۔ یونہی اگر شگفتہ کر گئی ہمار گل لائے نہال خشک تنک ابکی بار گل ۱۸۵۵ء میں آصف الدولہ بہادر نے بیت السلطنت لکھنو کو زینت بخشی تو مرزا صاحب بھی لکھنو آئے اور متحدہ خاں کے اصرار سے لکھنؤ میں گھنڈ بیگ کی گریہ پر سکونت اختیار کی۔

نواب محبت خاں ان سے بہت محبت کرتے تھے اور نقد و مکار خدمت سے دریغ نہ کرتے تھے۔ بعد نواب آصف الدولہ بہادر میں دہلی کے تمام شعرا لکھنؤ چلے آئے۔ شہزادہ مرزا جواں نخت، مرزا جامنا شاہ بھی دہلی سے لکھنؤ میں آئے اور اپنی ناروا حرکتوں کے سبب بنارس جانے پر مجبور ہوئے۔

شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ نہایت نزک احتتام سے لکھنؤ میں داخل ہوئے اور بوجہ شاہ کے تکیہ پر قیام فرمایا۔ انھیں کے ساتھ میاں جرات تلیڈ رشید مسرت بھی آئے مگر نواب آصف الدولہ بہادر نے مرزا سلیمان شکوہ کی طرف التفات نہ فرمایا۔ بہت سی سفارشوں کے بعد نواب کا مخالف بہادر نے چھ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی اور جنگ مرزا خلیل سکونت کو مرحمت فرمایا۔ بعد چندے مرزا سلیمان شکوہ نے جزل مارٹین کی کوئی خرید کی اور اس میں ان کا دیباہ چھنے لگا۔

جرات کی بھی تنخواہ مقرر ہو گئی۔ لیکن جرات اپنے استاد کے مکان کے قریب سکونت پذیر ہوئے۔ اس زمانہ میں دہلی کے لوگ خاص خاص محلوں میں سکونت پذیر تھے۔

جرات اور حسرت لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور داد سخن لیتے تھے لکھنؤ اپنے دہلوی ہانوں کی حد سے زیادہ تدر دانی کرتا تھا یہاں تک کہ یہ غریب نصیب اپنے وطن کو بھول گئے اور غریب الوطنی

میں بادشاہی کی حسرت جو لوئی پھٹی پہلی پردہ سے فیض آباد آئے تھے ان میں کیا وہ کھنڈ میں آنے ہی نفس پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ اسی ٹوک سے شہر آ کر کھنڈ نہ لیا۔ دیکھئے ایک عطار پیشہ بھی کھنڈ آ کر شعرا میں داخل ہو گیا۔

دہلی کے شاعر تو ملک الشعراء میر تقی میر، مرزا اسودا، سوز، انتشار میر حسن، شاہ قاتم، میر درد وغیرہ ہیں لیکن اب تو دہلی سے جو کوئی آتا ہے شاعر آتا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ مرزا حسرت بھی دہلی کے متقدمین میں شامل تھے اور فن شاعری سے بخوبی باہر تھے کلام بہت اچھا تھا دہلی تباہ نہ ہوتی تو ایسے لوگوں کی صورت کھنڈ کو دیکھنا نصیب نہ ہوتی غرض کہ کھنڈ میں وطن فراموشوں کی ایک خاص جماعت ہو گئی تھی آپس میں رقابت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک شاعر دوسرے کی منفعت چاہتا ہو گیا لکھتا تھا۔ گالی گلوچ اور مار پیٹ کی نوبت آجاتی تھی۔

حسرت کی بہت منفعت کی گئی۔ مرزا رفیع السودا نے ان کی جو لکھی ہے مگر حسرت نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ صرف ایک مرتبہ حکیم صاحب نے ان کی روزی کے بابے میں کچھ رخنہ ڈالنا چاہا تو حسرت نے بھی قلم اٹھایا۔ جو کلمی اور خوب لکھی جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔

”احتیاج کی بیماری میں ہر شخص مبتلا ہے۔ بہت سے پیٹ کے لئے طبیب بن بیٹھے۔ جس فصل میں بیماری کا زور ہوا دو چار مریض ان کے پاس بھی آتے تھے۔ اپنے گھر میں عطار کو بٹھا کر مریضوں کو لوٹنے لگے۔ نبض پر ہاتھ رکھا۔ کچھ نسخہ لکھ دیا ان میں سے ہمارے بھی ایک آٹا ہے کہ ادویہ کو خدا کے واسطے قتل کیا کرتے ہیں۔ خود جنوں ہیں مگر طبابت کرتے ہیں۔

جب آپ قلم ہاتھ میں لیتے اور نسخہ لکھتے ہیں تو اہل بھی رونے لگتی ہے کہ نہ معلوم کس بگناہ کے قتل کا فرمان جاری ہو رہا ہے۔ اس غریب کی قیمت میں موت نہ تھی مگر یہاں آکر بے اہل مرا۔ ملک الموت نے آپ کو ادبِ سلطنت کو لے لیا کہ ہر چند میرا پیشہ ہے کہ کسی امیر و غریب کو نہیں چھوڑتا لیکن آپ سے ایک عرض ہے کہ خدا کے واسطے اس کی جوانی پر رحم کیجئے۔ آپ اس کی جان سے مرگند کیجئے۔ تمہارا نسخہ، نسخہ سامری ہے۔ ایسی سامری نہ کرو۔ مریض تو نسخہ دیکھتے ہی مر جائیگا۔ اس کے اعزہ و اقربا تباہ ہو جائیگا گئے قلم کو کیا ملے گا۔

غرض حکیم صاحب کی ذات سے موت کا بازار گرم ہے۔ گھر گھر سے دہلی کی آواز آتی ہے۔ اس کے ہاتھ سے اتنے ذی حیات فنا ہوئے ہیں کہ مردہ شو اور گور کن دو لہند ہو گئے ہیں چوتھائی کمیشن کفن و دفن اور ٹلٹ گورکن سے مقرر ہے۔ جہاں گور و تابوت دیکھئے کچھ لیجئے کہ حکیم صاحب کی کارستانی ہے ان کے ہاتھ سے قلم سینہ چاک دعا کرتا ہے کہ حکیم صاحب ہلاک نہ ہوں تو میری گردن سے منظرہ جاتا رہے۔ خدا اس ظالم کو دنیا سے جلد اٹھالے۔

صرف یزان طلب پڑھی ہے اور مطلب کا نام مان رکھا ہے۔ اس پر ارسطو اور فلاطون کو نام رکھتے ہیں۔ تپ میں ساتویں دن جلاب دیتے ہیں۔ اور بواسیر میں شاکا پھلی استعمال کرتے ہیں سنگرہنی کے استعمال میں حب السلاطین بتاتے ہیں۔

مجھے کئی دن سے بخار آتا ہے میرے دل میں خیال آیا کہ یہ شفق ہیں علاج کر لیتے تو سو مزاج سے نگر ہو گا سب حال اپنا بیان کیا آپ نے نبض پر ہاتھ رکھا بہت خود فکر کے بعد کہا۔

ہر بان میری عقل گم ہے کہ اس درد سے تم کیونکر زندہ ہو۔ اس پر مسلم بھی ہے آپ کی نبض نرمی اور مسرتی ہے اس بیماری کا علاج تو فلاطون سے بھی نہ ہو سکتا مگر میں مزاج پا گیا ہوں کچھ روپیہ خرچ کرو تو علاج ہو سکتا ہے نہیں تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔

میں نے کہا کہ ہر بانی سے نسخہ تو لکھ دیجئے حکیم صاحب نے فرمایا مچ اور کا فدا ایک ایک دام عیشہ مغربی ۶ ہاشمہ انیس کھل کر کے دی کے ساتھ بنی جاؤ۔ خدا اسے کا ساگ کھانا پھر کل آکر نبض دکھانا۔

بھلا بیمار کو شفا کس طرح حاصل ہو جب حکیم صاحب کی تشفی کا یہ حال ہے کسی نے آج تک سرخ اور سرسام کو جمع ہونے نہ سنا ہے۔ سرخ اور سرسام دونوں کے مواد ناقص ہیں۔ دونوں امراض سر میں نبض نرمی اور مسرتی ایک جامع نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا تھا ہے۔ مجھے کسی کی ہجو مقصود نہیں ہے حقیقت حلال بیان کر دی۔

مرزا حسرت نے دو ایک رباعیاں بھی جو میں کہی ہیں۔ ایک دیوان قصائد کا ہے دو دیوان عاشقانہ غزلوں کے ہیں ایک دیوان جنس مسدس اور ترجیع بند کا ہے۔ ایک دیوان رباعیات کا ہے مختلف صنعتوں میں



رہے ہیں کئی ہیں۔ یہ مجموعہ کلیات ۱۲۰ میں تیار ہو گیا۔ حج رسالتاب میں جو قصیدہ کہلے اس کا مطلع یہ ہے۔

شیخ و سجادہ اسلام جو ہم چاہوں ایک عاشق و تکیہ و کھروم چاہوں ایک تذکرہ میں لکھا ہے مرزا صاحب دے سر پہ نگہ دیوانہ کے شاگرد تھے او وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ حسرت کی شاعری کا فروغ دہلی سے ہوا۔

حسرت اور جرات کا مکان دیوار بدلیوار تھا۔ ایک اندسے اور ایک مگر زبان نے دونوں کی تقدسی۔ مرزا حسرت ہمیشہ روس کے دیوار میں پاکی پر سوار ہو کر جاتے تھے اکثر اوقات سارا دن ملاقات میں گذر جاتا تھا۔

ایک سال برسات کی شدت سے مرزا حسرت اور شیخ جرات دونوں کے مکان نہند ہو گئے۔ بضرورت نواب محبت خان کے بنگلے میں جانا پڑا۔ جو بہت دنوں سے بے مرمت پڑا ہوا تھا۔ اس کے حال میں رباعی لکھی ہے۔

حسرت یہ سخن میری زبان سے نکلا بنگلے میں رہا سو خانہ اس سے نکلا پانی میں جو ڈوبے تو نکل سکتا ہے پیر کیچ میں جو پھینسا نہیاں سے نکلا مرزا حسرت بھی معنی کی طرح کثیر التلاذم تھے مگر ان سب شاگردوں میں شیخ جرات کا مرتبہ بلند ہے اول تو انھیں استاد کی یکجائی نصیب ہوئی ہر وقت کا پاس بیٹھنا پاس اٹھنا۔ دوسرے خدمت گزاری تیسرے طبع خداداد۔

کہتے ہیں کہ ۱۲۱۵ھ میں حسرت کا انتقال ہوا مگر یہ بات قرین قیاس سے بعید ہے اس واسطے کہ شہزادہ مرزا ایلیاں سکھ خود ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ آئے تھے اور برسوں کے بعد انھیں وفار حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد حسرت کا سلسلہ ان کے یہاں قائم ہوا اور کچھ تنخواہ مقرر ہوئی۔ بہر حال ان کے سن وفات کا صحیح پتہ نہیں معلوم ہو سکا۔ محلہ گھنٹا بیگ کی گڑھیاں انتقال فرمایا اور وہاں کسی مسجد کے قریب پختہ قبر بھی ہے لیکن کوئی کتبہ اس پر نہیں ہے۔ حسرت کچھ بیمار نہ تھے۔ دت سے بوجہ ضعف پیری گوشہ نشین تھے۔ شہر کے امرا اور وسایا گرد بہت کچھ خدمت کرتے تھے۔ راجی طرح بسر ہوتی تھی۔ جب سے لکھنؤ آئے ہمیشہ فتن پر سوار ہو کر گھر سے نکلا کئے۔ باوجود اس اعزاز اس جاہ و شہم اس قابلیت کے آج نہ ان کے خاندان کے کسی آدمی کا پتہ ہے نہ کوئی شخص ایسا ہے جو قبور معراج صحیح پتہ بتا سکے۔

کیوں مرے خون شیش کو آلودہ کیا آپ نے بچ اٹھایا مجھے آلودہ کیا اٹھ گئے داہر دیتے تھے سخن کی حسرت کس کے اشعار میں ظلم کو بھی فرمودہ کیا

دل پر نہیں اُفتیا۔ اپنا افسوس گیا تہہ دار اپنا لایا نہ کوئی چراغ و گل یاں بیس ہی ۱۴ مزار اپنا

کون سا رنج فلک ہم لے گوارا کیا شہرہ مخبروں کا دیا نام ہمارا کیا

غیر کو عید کے دن تم نے ہم آغوش کیا سال بھر رشک سے یہ سخن بجز خوش کیا روزن سے جو دیکھا کہ صدا سن کر شمع مغل کے تیل آگے خاموش کیا ہم نہ کہتے تھے کہ حسرت نزل ان جو باں تلے دیوانے کسی کا نہ سخن گوش کیا

تلف ہونا تھا جی کھونا تھا، گھر اپنا ڈوبنا تھا دلا سب کچھ تجھے کرنا تھا اک عاشق نہ ہونا تھا

کسے ہے کل شے بنم مرغ میں دونوں تھے ہم لیکن، تری قسمت میں نہنسا تھا میری قسمت میں نہنسا تھا بہایا تو نے حسرت ل کو اس چاہ و مخندانیا مرا جی خوش ہوا ایسی ہی جا اس کو ڈوبنا تھا

بھلا عشق کی وحشت جو کچھ بکھاتا سبھی آبادیاں دیکھی تھیں اک صحرا نہ دیکھا تھا خدا جانے کہاں بھی عقل حبیبین لیا ہو کسی نے قدیر کام تو بجا نہ بکھا تھا

سہوا ظم سے سکھ جو تیرا رقم ہوا فوراً زبان چاک ہوئی سر قلم ہوا

نہو تا آہ میں پردہ چمن لے کاش قفس ہی تو ہما سدا مرا وطن لے کاش

ہم کو نہ درد نہ فتنے کیا ہلاک اس کے ستم اور اپنی وفات کیا ہلاک

لگی سر لے پاؤں تک اس کے آتش کچے شمع موز منائی کہاں تک



دہے عہد عمر سو بوجھ ہے بیاں یار کی نربانی کہاں تک  
مرا دکھ دیکھ ہے نہ پر گواہی چھے عشق کی پھر کمانی کہاں تک

میں کیا کہوں کیا ہے بھگا دیکھ لے آتش کہ بھگ ہے تو ماتم کہہ لے دل  
ناج تو آہ دینے کی مت منج کر بھے کیونکر نہ روؤں میں مرا گم ہو آہ دل

آہ عباد تو کیا پوچھے ہر بادل کی خبر دیکھ ہم جگے چمن میں دیو وار کا مال  
قطعہ

کل روئے ہوئے جو اتفاقا حسرت کے مزار پر گئے ہم  
پڑھنا تھا یہ شعر وہ تہ خاک بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم  
واماندوں پہ دیکھئے کہ کیا ہو اپنا تو سبہ کر گئے ہم

گو میں نہیں جلا دکی تلوار سے محروم پر چشم ہی باندھے دکھا دیدار محروم  
جب فصل گل آئی تو پھٹنے ام میں جا کر ابکی ہے ہم یوں گل گلزار سے محروم

غینت جانو جو دم بیاں ہیں ہم کوئی دم میں کہاں تم پھر کہاں ہم  
بغیر از گریہ جو آتا ہے گاہے نہیں رکھتے کوئی اب نہر بیاں ہم  
نہ ہم کو گل دیا نے کچھ شہر ہی کسی لائق نہ تھے اے باغباں ہم

کٹ نہیں سکتی شب غم اور کوئی ہر دم نہیں  
یا یہ شب ہے سخت دل یا صبح تجھ میں دم نہیں

یہ غلط گمان کریں ہیں سب کہ فدا کے بعد بقا نہیں  
ترے عشق میں جو کوئی ہوا اسے زندگی ہے فنا نہیں  
کسے حسرت اتنا دل ہے کہ ہر اکے ناز اٹھائے  
جو ہے زندگی تو میں گئے ہم وہ منم کسی کا خدا نہیں

ہر چہ کشتہ بھل کر کیا کرے گل آتشیں اصبا بیدا کرے یا اتلا دل آتشیں  
لے جنوں آسوی اپنے پوچھنے کو کچھ نہیں جیتے ماں سب کچھ کچھ بھل کر  
وہل کا دہرہ کیا تھا اس نے کھلا جو کوئی  
یکھنے لی دھوکے سے میں نے بے تامل آتشیں

دل کا جگر کا دھو یا جی کا اپنے غم کریں کس کس دین میں بھل کر کس کس کا ہم غم کریں  
نالے پر کم قتل ہے دین میں تو دین میں کس طرح فریائے جو کچھ ہیں سہرا بیاں اب ہم کریں  
کچھ حال حسرت کا بھجے دکھلائی دیتا ہر زبوں  
کیا خوف ہر اس وقت گریں میں اس پر دم کریں

اس لئے میری چشم پر غم ہیں ایک دل اور سیکڑوں غم ہیں  
حسرت اس کی رضا جو ہو سہرا ہو ہر طرح ہم تو شاد و خرم ہیں

بزرگ لار دل دا خدا رکھتے ہیں جہاں کے باغ میں ہم بھی بہا رکھتے ہیں

بھٹے ہم سب کے بندے ہر دم سے ماہ کھٹے ہیں حرم کے بندے: تو تم غم عشق اللہ رکھتے ہیں

دوستوں کا دیکھنا اس دور میں ہر دم کہاں  
دم غینت ہے عزیز و غم کہاں اور ہم کہاں  
لوگ کہتے ہیں کہ ہیں ابرو ترے مانند تیغ  
تیس کے مانند ہیں پر تیغ میں یہ غم کہاں

اب تو یہ دل اک بت نا آشنا کے ہاتھ ہے  
جس کے ہاتھوں چھوٹا اس کا خدا کے ہاتھ ہے

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

عالمگیر کا مطالعہ آپ کے ذوق ادب کی دلیل کیونکہ عالمگیر اردو کا بہترین رسالہ ہے

# قُرُونِ وَارِدَات

حضرت عابد تھانوی

جس کو جہاں میں چشمِ حقیقت نگرے  
ہیں ہم بھی کس قدر نگہِ ناز آشنا  
کچھ وہ بھی سرگزشتِ محبت سمجھ سکیں  
تو نے نیاز مند بنایا، ہزار شکر،  
ہیں نشہ ہم بھی دیدہٴ مینخانہٴ نوش کے  
یہ کیا کہا کہ ہم نہیں جاتے کسی کے گھر  
اہلِ چین کو راحت پنہاں کہاں نصیب  
اس درجہ نامتامی الفت میں لذتیں،  
مکن نہیں کہ ان کو بھی تیری خبر ملے  
ہر شے میں ہر کی ہیں تم جلوہ گر ملے  
یارب! انہیں بھی لذت درِ جگر ملے  
اب اس قدر دعا ہے ترا سنگِ در ملے  
ساتی! ہیں بھی جُرعہٴ جامِ نظر ملے  
تم جب کبھی ملے ہیں، دشمن کے گھر ملے  
گلشنِ میرچاک چاک گلوں کے جگر ملے  
یارب! مری دعا کو نہ بابِ اثر ملے

عابد سناؤں ہجر کی غمناک سرگزشت  
گراہ میں کہیں وہ بُتِ فتنہ گر ملے

# ایک بہترین فراموشی افسانہ کا محرکہ آراؤ و ترجمہ

از جناب ایس کے جلیل صاحب بی۔ سی۔

بی۔ سی۔

پسلا خط

پیاری اپنی

تمہاری خواہش بھی کتنی عجیب و غریب ہے۔ تم ایک ایسی ہستی کے خط کی آرزو مند ہو جس کو قدرت نے بنیانی کی نعمت سے محروم کر دیا ہے اور جو نہیں دیکھ سکتی کہ اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے حروف کا غلط پر کیسے نقوش پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ایک نابینا کے لکھے ہوئے خطوط کتنے غیر دلچسپ اور خشک ہوں گے۔ تم ایک بنیانی سے محروم ہستی کو بھی اپنی ہی طرح خوش و خرم سمجھتی ہو۔ کاش تم کو ایک اندھی لڑکی کے دل کا صحیح علم ہوتا۔

پیاری اپنی، تم ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہو۔ آہ دیکھنا! ہاں صرف دیکھنا۔ قوت بنیانی بھی کتنی عجیب و غریب شے ہے نیلا آسمان، چمکتا سورج، شام کا جھنڈا، صبح کا سماں وقت۔ تاروں بھری رات اور دیگر۔۔۔ دل خوش کن مناظر، اندھیوں کے نصیب میں کتنا یہ سچ ہے کہ ایک زمانہ میں میں قدرت کے اس بے باعظیہ کی مالک تھی مگر اس زمانہ کو بھی زمانہ گزر گیا۔ جس وقت میں نے اپنی بصارت کھوئی اس وقت میں دس برس کی تھی۔ اب میری عمر پچیس سال کی ہے آہ! پندرہ سال کا طویل عرصہ! جن چیزوں کو میں نے دس سال کی عمر تک دیکھا تھا اب ان کا نقشہ تک میرے ذہن میں نہیں۔ میں گلاب کے پھول کو اس کی خوشبو سے پہچان سکتی ہوں۔ میں پھول کو ہاتھ میں

لے کر اس کا نام بتا سکتی ہوں مگر میں اس کے دل آویز رنگ کو نہیں دیکھ سکتی جس سے خوبصورت اور حسین عورتوں کے مسکرت رنگ کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ بعض اوقات تاریکی کی چادر میں مجھے کچھ چمکتے ہوئے دھبے نظر آنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ دوران خون کی علامت ہے اور اسی وجہ سے ان کو امید ہے کہ شاید میں اپنی بصارت قدرت کے بے باعظیہ کو دوبارہ حاصل سکوں! مگر یہ سب مجھ کو مطمئن کرنے کی ترکیبیں ہیں جو لڑکی پندرہ سال سے بنیانی کی نعمت سے محروم ہو وہ اب اسے دوبارہ حاصل کر سکے۔ یہ خیال خام ہے۔ ہاں شاید دور دنیا میں خدا اتنا ناہربان نہ ہو۔

کل ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جب کہیں ٹول ٹول کر اپنے کمرہ میں داخل ہو رہی تھی۔ میرا ہاتھ ایک آئینہ پر پڑا۔ بس اس کے مقابل کھڑے ہو کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ ایک عجیب و غریب خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ کاش میں آئینہ میں اپنی شبیہ دیکھ سکتی۔ کاش میں دیکھ سکتی کہ میں خوبصورت ہوں یا بد صورت کاش مجھ کو معلوم ہو جائے کہ علاوہ نابینائی کے میرے چہرہ میں اور کوئی نقص تو نہیں۔ بچپن میں سنا تھا کہ جو لڑکیاں دیر تک آئینہ دیکھتی ہیں ان کو اس میں شیطان نظر آنے لگتا ہے۔ مگر افسوس میں اس سے بھی محروم ہوں۔

تم نے اس خط میں جو مجھ کو ابھی پڑھ کر سنایا گیا ہے۔ دیا گیا ہے

”صرف آپ کے والدین ہی سے مجھ کو ہمدردی نہیں ہے۔“  
”ان کے علاوہ اور کس سے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ سے“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”مجھ سے؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مجھے آپ سے محبت ہے۔“

”مجھ سے؟ مجھ سے محبت ہے؟ آپ کو؟“

”بچی والہانہ محبت۔“

ان الفاظ کو سن کر مجھے شرم آنے لگی اور میں نے اپنے منہ پر رومال رکھ لیا۔ وہ خاموش رہا۔

”آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا

”کیا میرے الفاظ میں ایراجہ اور میرے جذبات میرے اقبال کا ثبوت بہم نہیں پہنچاتے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ مگر میں تو اندھی ہوں، نامیاد اور بنیائیں بہت فرق ہیں۔“  
”مجھ کو اس کی پرواہ نہیں نعمت بنیائی کی محرومی کی وجہ سے میں آپ کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔“

اس نے کہا اور اس کے لہجے سے بناوٹ قطعی نہیں ظاہر ہو رہی تھی

”میرا اس سے کوئی ہرج نہیں۔ کیا آپ کا چہرہ سحر کن نہیں؟ کیا آپ کے اعضا متناسب نہیں؟ کیا آپ کی چال فتنہ انگیز نہیں؟ کیا آپ کا رنگ سفید نہیں؟ کیا آپ کے بال سنہرے اور ملائم نہیں؟ کیا آپ کا تبسم دل خوش کن نہیں؟ بنیائی کی غیر موجودگی آپ کے دیگر اعضا کی خوبصورتی پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ آپ یقیناً بہت خوبصورت ہیں۔“

وہ اپنی تقریر ختم کر چکا مگر اس کے الفاظ برابر میرے کان میں گونج رہے تھے۔ کیا سچ میں ایسی ہی ہوں؟ جیسا اس نے بیان کیا۔ کیا دراصل میں خوبصورت ہوں؟ کیا میں بھی حسین چہرہ، لائبنے اور سنہرے بال متناسب الاعضا اور سحر کن تبسم کی مالک ہوں؟ میں ایک لائندہ می

پیاری امینی! دوسری لڑکیوں کے لئے ان کا عاشق کچھ بھی ہو مگر ایک لائندہ می لڑکی کے لئے اس کا عاشق کسی طرح ایک آئینہ سے کم نہیں۔

میں نے کہا۔ ”تو کیا دراصل میں حسین ہوں؟“

”اتنی حسین کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔“ اس نے جواب دیا۔

کہ آیا یہ سچ ہے کہ بیک کے قیل ہو جانے کی وجہ سے میرے والدین کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنایا

خیال سے تو ایسا نہیں ہوا۔ میرے والدین خوش قسمتی سے کافی اریزیا میری ہر آرزو فوراً پوری کی جاتی ہے۔ سامان عیش کی کسی وقت کمی نہیں۔ کمرہ میں جس طرف میرا ہاتھ پڑتا ہے۔ نخل۔ رشیم اور بہترین کپڑے ہی پڑ پڑتا ہے۔ میرا کمرہ قیمتی ساز و سامان سے سجایا ہوا ہے اور

مجھ کو ہر روز بہترین سے بہترین اور مزیدار سے مزیدار کھانے کو ملتا ہے اس لئے میری پیاری امینی میں کہہ سکتی ہوں کہ تم کو یہ خبر غلط ملی ہے۔

پیاری امینی! تم ابھی حال میں انگلینڈ کی سیر و تفریح سے واپس آئی ہو کیا اپنی غریب اندھی بہن کو بذریعہ تحریر دوران سفر کی چند تفصیلات سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دوں گی۔

## دوسرا خط

پیاری امینی! تم نہیں خیال کر سکتیں کہ میں تم کو آج کیا لکھنے والی ہوں۔ تم اتنا ہنسو

کہ تمہارے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور کچھ عجب نہیں کہ تم کو یقین ہو جائے کہ میں بصارت کے ساتھ ہی ساتھ عقل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔ سنو!

میرا بھی ایک چلہنے والا پیدا ہو گیا ہے۔

سچی بہن! مجھ اندھی کو بھی خدا نے ایک عاشق صادق عطا کیا ہے اس میں تعجب ہی کی کون سی بات ہے کیا محبت کا اندھی ہونا ثابت نہیں۔ اگر دو اندھے ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو کیا تعجب ہے؟

وہ ہمارے گھر کس طرح آیا اس کا مجھ کو علم نہیں۔ مگر ہاں میں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ کل دوپہر کے کھانے پر میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا اور

میرے ساتھ بہت ہمدردی ظاہر کر رہا تھا۔

”یہ پہلا موقع ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کہ مجھ کو آپ سے شرف نیاز حاصل ہوا۔“

”سچ ہے۔“ اس نے جواب دیا ”مگر آپ کے والدین سے میرا پہلے سے تعارف ہے۔“

”چونکہ آپ کے پاس میرے والدین کیلئے جذبہ ہمدردی موجود ہے لہذا میری طرف سے بھی خوش آمدید قبول فرمائیے۔“ میں نے کہا۔

”آہ! ان غریبوں کی حالت یقیناً قابلِ رحم ہے۔ دلال پھر موجود ہیں ایک بولا۔“  
”مگر غریب لڑکی کو اس صورت حال کی قطعاً خبر نہیں۔ اس کو خیال تک نہیں کہ اس کی بھارت کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے والدین اس کو خوش رکھتے ہیں۔“  
”آخر تمہارا کیا مطلب ہے؟“ پہلے نے پوچھا۔

”یہ سچ ہے۔ دوسرے نے جواب دیا: کہ جس طرف وہ اپنے کمرہ میں ہاتھ ڈالتی ہے اس کو نخل اور دریشم ہی ملتا ہے اگرچہ دریشم کا رنگ اور نخل کے روئیں تک اڑ گئے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنی میز پر اس کو بہترین اور لذیذ کھانے چنے ہوئے ملتے ہیں مگر اس کو کیا معلوم کہ کس کا سیلابی کے ساتھ اس کے والدین اپنی غریبی کو اس سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس کو کبھی یہ گمان تک نہیں ہو سکتا کہ اس کے ساتھ ہی دوسری میز پر اس کے والدین کو کھانسی ہوئی روٹیوں کے سوائے اور بھی کچھ کھانے کو ملتا ہو۔“

بیاری اپنی کیا کہوں! مجھ پر تو بجلی گر پڑی۔ باوجود اپنی تباہ حالی کے وہ مجھ کو خوش کر رہے تھے۔ میرے لئے لذیذ سے لذیذ غذا موجود تھی۔ آہ ماں باپ کی محبت! کیا دنیا میں اس سے زیادہ اور کوئی نعمت مل سکتی ہے؟ بڑی سے بڑی دولت بھی اس محبت کو نہیں خرید سکتی۔

### چوتھا خط

میں مگر کی حالت سے واقف ہوں۔ میں نے کسی پر اس راز کو ظاہر نہیں کیا۔ میری ماں کو یہ سن کر کس قدر صدمہ ہوتا کہ ان کی بیٹی کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہم غریبی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں اب تک اسی طرح زندگی بسر کر رہی ہوں جس طرح پہلے بسر کرتی تھی۔ مگر میں نے اپنے والدین کو اس تکلیف سے جو ان کو میری وجہ سے پہونچ رہی ہے نجات دلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔  
میرا ذمہ ایک دن مجھ سے ملنے آئے اور میں نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ چھڑا کیا آپ اب تک میرے لئے اپنے دل میں وہی جذبہ رکھتے ہیں؟  
”جی ہاں“ انھوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی محبت سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔“

”مگر آپ کو مجھ سے کیوں محبت ہے؟“ ایک اندھی سے:

”اور مجھ سے آپ چاہتے کیا ہیں؟“  
”میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“  
میں بہت زور سے ہنسی۔ آپ کی ستم ظریفی کی بھی حد ہو گئی۔ آپ کی میرے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ایسی ہی ہے جیسی دن کی خواہش تارا کے ساتھ شادی کرنے کی ہو۔ میں ہرگز کسی کے لئے وبال جان ہونا پسند نہ کر دوں گی۔ میں کیسی ہی مبین سہی مگر یقیناً میں اپنے شوہر کے لئے وبال بنا ہو گئی۔ نہیں! مجھے شادی کی کوئی ضرورت نہیں، میرے والدین کافی امیر ہیں۔ میں اپنی تمام عمر اسی طرح گزار دوں گی۔“

### تیسرا خط

میری پیاری اپنی!  
آج میں تم کو ایک بہت ہی دلچسپ خبر سنانے والی ہوں۔ آہ! جبکہ میں تم کو یہ واقعہ لکھ رہی ہوں میری بے نور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اس اجنبی کی ملاقات سے چند روز بعد ایک دن جبکہ میں اپنی والدہ کے گمذہ پر ہاتھ رکھے ہوئے باغ میں ٹہل رہی تھی ملازمت پر پشانی کے لمحہ میں میری ماں کو آواز دی۔

”کیا بات ہے اماں؟“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔  
”کچھ نہیں بیٹی! اماں نے جواب دیا۔“ میری کی زندگی بھی ایک لعنت ہے۔ ہر وقت ہم کو سوسائٹی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔“

”اچھا تو آپ چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ کو اس صورت میں نہیں روک سکتی اپنے ملاقاتی کو شرفِ ملاقات بخشے۔“  
میں نے اپنی والدہ کے سر ہونٹ اپنی پشانی پر محسوس کئے ادا کے بعد میں تنہا رہ گئی۔

ابھی اماں کو گئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا گویا دو شخص آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کو میری موجودگی کا علم نہ تھا۔ پیاری اپنی جب خدا کسی انسان سے ایک قوت چھین لیتا ہے تو دوسری قوت زیادہ تیز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ ایک مینل کے نابینا کی قوت سامعہ زیادہ زبردست ہوتی ہے اگرچہ وہ دونوں بہت آہستہ باتیں کر رہے تھے مگر میں ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ صاف سن رہی تھی۔

کمزور اور نحیف لجنہ اور اسی وجہ سے ایک لڑکی کے ساتھ شادی کا ارادہ اس بات کا پتہ ثبوت ہے کہ میں خود غرض ہوں۔  
میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔  
”جو کچھ آپ نے فرمایا ممکن ہے درست ہو مگر مجھ کو یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ ہمیشہ نیکی اور اچھا سلوک کریں گے۔ میں رشتہ کے لئے تیار ہوں۔ میرے خیالات کو کوئی شے آپ کی طرف سے نہیں بدل سکتی آپ کی محبت میرے تارک اور بھر رگیتان میں خلستان ثابت ہوگی۔“  
میں بڑا کر رہی ہوں یا بھلا۔ پیاری اپنی میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی گراں! میں اس طرح اپنے والدین کی نجات کا ذریعہ ضرور بن رہی ہوں۔ شاید بعبارت کی عدم موجودگی کے باوجود میں نے سید ہا راستہ ٹول لیا ہو۔

### پانچواں خط

پیاری اپنی!

تمہاری مبارکباد کا شکریہ! ہاں میری شادی کو دو ماہ کا عرصہ ہو گیا اور میں بہت آرام دہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ دنیا میں شاید ہی مجھ سے زیادہ اور کوئی عورت خوش ہو۔ مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بغیر میرے کہے ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے۔ میرے والدین نے بھی مجھ کو نہیں چھوڑا ہے اور منڈ میرے ساتھ ہی میرے والدین کا بھی خیال رکھتا ہے۔

جس دن میری شادی ہوئی تو میرے خاوند نے جس کو میں اب تک ایک آئینہ سے مخاطب کرتی ہوں۔ مجھ کو بتایا کہ میری شادی کس شان سے ہوئی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ میری نقاب بہت بہترین تھی۔ میرا لباس امیرانہ تھا اور میرا جسم رنگ برنگ کے پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ جلی آئینہ بھی اور کیا بتانا؟ شام کو ہم دونوں ہاتھ ڈالکر بارش میں بیٹھے ہیں۔ وہ ہر رنگ کا پھول توڑ کر مجھ کو دیتا ہے اور اس کا نام اور رنگ بتاتا ہے۔ چڑیوں کی آواز سے ان کی شناسائی کرتا ہے پھل توڑ کر ہاتھ میں دیتا ہے اور ان کا نام بتاتا ہے۔ میں ٹول کر اس کو یاد رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بعض اوقات ہم تھیر ڈیکھنے جاتے ہیں اور وہ اپنی عقل اور قوت بیان سے مجھ کو ہر وہ بات ذہن نشین کراتا ہے

”آہ! آپ بہت حسین ہیں۔“

”اور میرا جسم؟“

”سرو کی طرح سیدھا“

”اور میری پیشانی؟“

”ہاتھی دانت کی طرح سفید اور چمکدار۔“

”کیا سچ مچ؟“ میں نے کہا اور زور سے ہنسنے لگی۔

”کیوں؟“ آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟

”مجھے اس خیال سے ہنسی آ رہی ہے کہ آپ میرے لئے ایک آئینہ کا کام کر رہے

ہیں، میں آپ کے الفاظ میں اپنا عکس دیکھ رہی ہوں۔“

”کاش ہمیشہ ایسا ہو، کاش آپ ہمیشہ کیلئے مجھ کو اس خدمت کے

لئے منتخب کر لیں۔“

”تو کیا آپ راضی —“

”ہاں ہاں! میں آپ کا وفادار آئینہ بننے کے لئے تیار ہوں۔ میں ہمیشہ

کامیابی کے ساتھ آپ کے اوصاف اور آپ کے من کا عکس اپنے الفاظ کے

ذریعہ آپ کے دماغ پر ڈال کر دکھاؤں گا۔ بس ایک لفظ ہاں! اور اس لفظ کے ساتھ

آپ ایک وفادار کو حاصل کر لوں گی۔ خدا کے فضل سے میں کھانا پیتا ہوں

آپ کو میری ذات سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ اور آپ کی ہر خواہش کی

کمبیل کو میں اپنا فرض منصبی خیال کروں گا۔“

فورا ہی مجھ کو اپنے والدین کی بے بغاوتی کا خیال آیا جن کو میری

شادی میری فکر سے نجات دلا سکتی تھی۔

”اگر میں آپ سے شادی کا اقرار کر بھی لوں تب بھی مجھ کو ایک گور،

افسوس ہی ہوگا۔ تھوڑے دن بعد آپ کو رنج ہوگا اور آپ کو زندگی بھر اپنے فعل

پر پھپھتا نا پڑیگا۔ خوب غور کر لیجئے میں اندھی ہوں۔“

”آہ! اس نے ایک دلہن کو جو میں کہا۔ مجھے بھی آپ سے ایک بات کہنی

ہے۔ اب تک میں نے اس کو آپ سے چھپایا۔ مگر اب میں اس کو ظاہر کرنا

ضروری سمجھتا ہوں۔“

”کئے کئے۔“

”میں بھی خدا کا ایک قیمتی بندہ ہوں۔ حسن اور خوبصورتی سے مجھے

دور کا لگاؤ بھی نہیں چھپکے میری چہرے کو خاصہ بگاڑ دیا ہے۔ بد صورت

جس کو میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔  
خود نہیں معلوم کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ مگر ہاں ہے یہ ضرور معلوم ہو گیا  
ہے کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔  
”اچھا بہن! وہ دماغ! دعا کرو کہ میری بہن بے خزاں رہے۔“

پیاری اپنی!

اب میں ایک ماں ہوں۔ ایک چھوٹی سی بچی کی ماں۔ مگر افسوس  
میں اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ نیلا آسمان دیکھنے کی مجھے خواہش نہیں رہی  
بڑی بگ کے پھول اور خوبصورت پرندوں کو دیکھنے کی مجھے آرزو نہیں۔ تاروں بھری  
رات سے اگر میں لطف اندوز نہیں ہو سکتی نہ سہی۔ شام کا جھپٹنا اور صبح  
کا ہٹنا منظر اگر میری قسمت میں نہیں تو نہ سہی۔ اپنے ماں، باپ، عزیز و  
اقارب حتیٰ کہ اپنے خاوند کو نہ دیکھنے پر میں صبر کر سکتی ہوں مگر میں افسوس  
یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی بچی کو نہ دیکھ سکوں۔ جتنے عرصہ تک بچی  
کی چمک ٹھہرتی ہے۔ میں تمام عمر خوش و خرم رہوں گی اور میری زندگی  
آرام و سکون سے گزر جائیگی۔ آہ! — ماں کی محبت،  
اس وقت میرا خاوند بھی میرے لئے آئینہ ثابت نہیں ہو سکتا اس کا  
یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ میری بچی کے بال چمکدار ہیں۔ اس کی آنکھیں  
بڑی بڑی ہیں اور ہر وقت اس کے ہونٹھوں پر تبسم — سحرانہ تبسم،  
کھینٹا رہتا تھا۔ یہ سب کچھ سہی مگر آہ! جس وقت وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ  
میری طرف پھیلاتی ہوگی — میں نہیں دیکھ سکتی۔

### ساتواں خط

میرا خاوند میرے لئے کسی طرح فرشتہ رحمت سے کم نہیں۔ کیا تم  
سمجھ سکتی ہو وہ آج کل میرے لئے کیا کر رہا ہے؟ وہ گزشتہ سال سے  
میری لاعلمی میں یہ کوشش کر رہا ہے کہ میں کسی طرح اپنی بنیادی گود و باو  
حاصل کروں۔ وہ بذات خود ڈاکٹر ہے — ایک کامیاب ڈاکٹر —  
مگر میری خبر گیری کی وجہ سے اس نے اپنے پیشہ کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے اس  
نے مجھ سے کل پوچھا۔

”کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے خدا کی ذات سے کیا امید ہے؟“

”ہاں ممکن ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ لوٹن جس کے متعلق تم نے  
دریافت کیا تھا کہ کس لئے ہے اور میں نے کہا تھا کہ یہ تمہارے حسن کو دو بالا  
کرنے کے لئے میں تیار کر رہا ہوں مد اہل وہ ایک اپریشن کے لئے تیار کر رہا  
تھا یہ اپریشن اپنی نوعیت کا ایک ہی ہوگا۔“

”کس اپریشن کے لئے؟“

”تمہاری آنکھوں کے۔“

”مگر تمہارا ہاتھ تو نہیں کانپے گا؟“

”جو کام دل سے متعلق ہو اس میں ہاتھ نہیں کانپتا۔“

اور میں نے اس سے بے تعلک ہوتے ہوئے کہا — ”پیارے رستم!“

نہیں فرشتہ ہو۔“

”پیاری!“ اس نے کہا۔ ”ایک فخر بھرا سی گر محوشی سے میرا بوسہ لوموجود“

خوشی اور خواب کے دن مجھے اچھی طرح گزارنے دو۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے پیارے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ خدا کی عنایت سے تم بہت جلد اپنی بھارت  
دوبارہ حاصل کر لو گی۔“

”اور پھر؟“

”اور پھر، تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ تمہارا خاوند کتنا بد رو، کتنا غیظ  
اور خفیف الجشتہ ہے۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گئی اور میں نے آنکھوں میں آنسو لانے ہوئے

کہا۔ ”پیارے اڈمنڈ! اگر تم کو میری محبت پر بھروسہ نہیں۔ اگر تم کو یقین

ہے کہ بنیادی حاصل کرنے کے بعد میں تم سے نفرت کرنے لگوں گی تو تم مجھ کو اس

تاریکی ہی میں بھٹکنے دو۔ مجھ کو بھارت کی قطعی ضرورت نہیں۔“

اس نے جواب میں صرف میرا ہاتھ دبایا۔ میری ماں نے مجھ کو بتایا کہ

اپریشن ایک ماہ بعد ہوگا۔

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ان روایات کے مطابق جو

معتبر کہی جاسکتی ہیں اپنے خاوند کی تصویر تیار کرنا شروع کی۔ اماں نے بتایا تھا

کہ ان کے چہرے پر بچک کمرے بڑے اور گہرے گہرے داغ ہیں۔ پاپانے

کہا تھا کہ ان کے سر پر ایک بال تک نہیں اور ملازم کہتا تھا کہ وہ —



بناسوار چکی تر بولی۔ بیٹی بیٹی کھول ڈالو۔  
میں نے بیٹی کھول ڈالی اور اگرچہ ابھی سویرج نہ نکلتا مگر صبح کی روشنی  
میں مجھ کو ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے والدین اور بچی کو باکی  
باہی لگے گھایا۔

”بھئی تم نے سب کو تو دیکھ دیا مگر ابھی تک اپنے آپ کو نہیں دیکھا۔“  
”مگر یہ سناؤ وہ“ میں نے چلا کر کہا۔ ”کہاں میں وہ؟“

”وہ تم سے چھپ رہے ہیں۔“ والدہ نے کہا۔ ”وہ تمہارے سامنے  
کھڑے نہ رہے ہیں۔“

مجھ یاد آگیا۔ میری نظر کے سلسلے ایک منہنی۔ کمزور گنچے خیف  
اور بصورت چھپک زدہ، خمیدہ پشت بوڑھے کی تصویر کھینچ گئی۔  
”آد عربی آدمی“ میرے منہ سے نکلا۔ ”اُنے دو انھیں، میرے لئے“  
دنیا کی ہر شے سے زیادہ حسین ہیں۔

”اچھا جب تک ہم تمہارے خاوند کو تلاش کر کے لائیں تم اپنے آپ  
کو آئینہ میں تو دیکھ ہی لو۔“ اماں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ آئینہ میں تم ایسی  
سینک ہو گی کہ تمہیں کسی بات کا دھیان ہی نہ رہے گا۔“

میں کچھ شرم اور کچھ شوق کے ساتھ آئینہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھی  
جب میں آئینہ کی طرف بڑھ رہی تھی میں نے سوچا کہ اگر میں بھی بد صورت  
ہوئی تو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ کو اس بارے میں بھی دھوکہ دیا جا۔  
ہو۔ میں رک گئی مگر آخر کار اماں کے اصرار سے پھر آگے بڑھی اور ذرا  
دیر میں ہی میں ایک قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ پر نظر  
پڑتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ واقعی میں بہت خوبصورت تھی۔ بالکل اسی  
خاوند کی کھینچی ہوئی تصویر کے مطابق۔ سرو قد، نازک بدن، گھرو۔  
مگر میں زیادہ دیر تک اپنے عکس سے لطف اندوز نہ ہو سکی۔ کیونکہ کچھ ایک  
آئینہ کو جنبش ہونے لگی اور ساتھ میرا عکس بھی ہلنے لگا۔ میں نے ذرا ہٹ کر آئینہ  
کے پیچھے نظر ڈالی تاکہ معلوم ہو کہ آئینہ کیوں ہل رہا ہے؟

ایک خوبصورت نوجوان آئینہ کے پیچھے سے نکل کر آئینہ کے قریب  
کھڑا ہو گیا۔ یہ خیال کر کے کہ ایک اجنبی اتنی دیر سے اور اتنی بے باکی کے  
ساتھ میرے حسن کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہا ہے میرے ذہن شرم  
سے سرخ ہو گئے۔

بوڑھے میں۔ اگر ان کے چہرے پر تھک کے گہرے گہرے داغ ہیں تو یہ خدا  
کی مرضی ہے۔ سر پر بال نہ ہونا عقلمندی کی دلیل ہے۔ مگر ہاں بوڑھا ہونا  
انقباضِ قلبِ رحم ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ کیسے بڑھاپے کی وجہ سے وہ  
جد مر گئے تو میری دلہنی کون کرے گا۔

بیاری بہن میں اس وقت عجیب چمک رہی ہوں۔ نہ اسے دعا کرو کہ  
وہ میری مدد کرے۔

## آخری خط

میری بیاری اپنی!

نبض معلوم کرنے کی خوشی میں کہیں خط کا آخری حصہ نہ دیکھنے لگ۔ مگر  
اگر تم بھی تو میری طرح رنج اور خوشی کے متضاد جذبات کو تیرے ہی ذہن  
کرو۔ دو ہفتہ گزرے میری آنکھوں کا پریشاں ہوا۔ ایک کا پتا ہوا تھا میں  
نے اپنی آنکھوں پر محسوس کیا اور دودل زچھوں کے جد میں نے دیکھا کہ  
مجھ کو دن کی روشنی صاف نظر آ رہی ہے۔ تو ذرا ہی میری آنکھوں پر پٹی  
باندھی گئی۔ میں نے کھوئی ہوئی بصارت پھر حاصل کر لی تھی۔ صرف چند  
دن کی ہمت اور تھوڑا سا صبر اور دیکھ کر تھا۔ زندگی کا بہترین عطیہ حاصل کرنے  
میں میں آدمی کی ممنون تھی۔

دورانِ علاج میں میں نے ایک ایسی ہیوتونی کی کہ سب کی کرائی محنت  
خاک ہو جاتی۔ ہوا یہ کہ نوکر میری کچی کو میرے پاس لایا تاکہ اسے میں پیار  
کر لوں۔ جیسے ہی میری کچی نے مجھ کو پیارے لہجے میں پکارا ”اما“ میں ضبط  
نہ کر سکی اور میں نے پٹی پھاڑ پھینکی۔

”میری بیاری کچی، میری بیاری کچی!“ میں نے کہا۔ ”آج میں نے  
تجھے دیکھ لیا۔“ نوکر نے جھٹ سے میری آنکھوں پر پٹی چڑھا دی مگر باوجود  
آنکھوں پر پٹی ہونے کے مجھ کو تاریکی سے اب کوئی الجھن نہ تھی۔ میں نے  
اپنی کچی کو ایک لمحہ کے لئے دیکھ لیا تھا۔ اور یہ ایک لمحہ ہی میری  
دیکھیں کا سامان تھا۔

کل میری ماں صبح ہی میرے پاس آئی۔ وہ دوزخِ آگ میرے کپڑے  
تبدیل کیا کرتی تھی۔ اس وقت اس نے مجھ کو بہترین ریشمی لباس پہنایا  
اور بہت ہی انماک سے میرے بالوں سنوارے۔ جب وہ بالکل مجھے

”دیکھو تو“ میری والدہ نے بغیر اجنبی کو دیکھے ہوئے کہا: ”دیکھو تو تم کتنی خوبصورت ہو۔ جو ہر جوہر، گلاب کی طرح سفید“  
 ”اماں“ میں نے چلا کر کہا۔  
 ”اور یہ کچھ؟“ اماں نے میری آستین اوپر چڑھتے ہوئے کہا: ”تمہارے بازو کتنے زیادہ سفید اور چمکدار ہیں“  
 ”اماں“ میں نے چپکے سے کان میں کہا: ”تمہیں کچھ خبر بھی ہے ایک اجنبی ہم کو اتنی دیر سے آزادانہ گھور رہا ہے؟“  
 ”اجنبی؟“ اماں نے متعجب ہو کر کہا: ”کیا آئینہ بھی تمہارے لئے اجنبی ہے؟“  
 ”میرا مطلب آئینہ سے نہیں بلکہ اس خوبصورت لکڑی بھیا نوجوان سے ہے جو آئینہ کے قریب کھڑا مجھے اتنی دیر سے گھور رہا ہے؟“  
 ”پگلی کہیں کی؟“ پاپا نے چلا کر کہا: ”تم کو شرطنے کی کوئی ضرورت نہیں کوئی بھی اپنے خاوند سے شرماتا ہے۔“  
 ”ہائیں! اڈمنڈ“ میں نے کہا اور غلگیر ہونے کیلئے آگے بڑھی۔  
 میں نے قریب پونچھ کر آنکھیں مل کر دیکھا۔ مجھ کو یقین نہ ہوتا تھا کیا اصل

یہی میرا خاوند ہے مگر یہ تو بہت خوبصورت اور نوجوان ہے، بڑی بڑی آنکھیں لاناقد لگتا ہوا جسم۔ بے داغ صاف، شفاف چہرہ، میری مسرت کی کوئی حد نہ رہی اب میرے دل میں اپنے خاوند کیلئے محبت اور زیادہ بڑھ گئی، خوبصورت نوجوان اور شریف، مجھ اندھی کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے سب کو ہدایت کر دی کہ وہ اس کا ردی سے ردی اور کرہیہ سے کرہیہ نقشہ میرے سامنے کھینچیں۔  
 میں دوڑ کر اڈمنڈ سے لپٹ گئی اماں اور پاپا الگ کھڑے ہوئے اپنی آنکھوں سے مسرت کے افسوس مان کر رہے تھے۔  
 ”بیاری اس وقت تو تم معمول سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی ہو“  
 ”خوشامدی“ میں نے چپکے سے کہا اور آنکھیں میچی کر لیں۔  
 ”ہرگز نہیں؟“ انھوں نے اپنے ہاتھ سے میرے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا: ”دیکھو جب تک میں تمہارا آئینہ رہا میں نے تم کو ہمیشہ خوبصورت بتایا اور اگر تمہیں یقین نہ ہو تو دیکھو میرا ہم نام جو تمہارے سامنے رکھا ہے“  
 میرے بیان کی تائید کر رہا ہے۔ (توجہ)

# بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوا دوگر کا

نہ خریدیے

بالامرت

تقلی دوا

یہ دوا مجھے بالامرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے خوشی سے پیتے ہیں۔ بچوں کی کھانسی، بخار، پیٹھ پیچش، وغیرہ امراض جو اکثر ناطاتی کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں اور بچوں کا بدن تھوڑے عرصے میں گوشت سے بھر کر فرہ اور وزندار بنتا ہے۔  
 لاہور ایجنٹ

بھگت رام پوری - سوتر منڈی - شہر لاہور،

# غزل!

اک کہانی ہے فقط ہستی فانی میری      ایک افسانہ عبرت ہے جوانی میری،  
 باعثِ فتنہ و آشوب ہے قصہ تیرا      سببِ عبرتِ دنیا ہے کہانی میری،  
 ذوقِ نجش ہے مجھے خیتِ کرم ہے تیرا      عشق کرنا بھی تو عادت ہے پُرانی میری،  
 زخمِ دل گرمی گریے رواں رہتا ہے      دیکھ جا سبیلِ محبت میں روانی میری  
 سامنے آئے تو ہیں تابِ کیبائی دے      آبرو ہنسنے دے اے دردِ نہانی میری  
 محتسبِ پینے دے دو چار گھڑی جینے دے      ذوقِ فانی نہیں ہے زندگی فانی میری  
 دیدہ شوق کی رسوائی کا عالم مت چوچھ      درتے درتے کی زباں پر ہے کہانی میری  
 زینتِ عرش پر مرغِ تحسین میرا،      مہ و انجم سے درخشاں ہے جوانی میری

نکتہ چینیوں کو سخن کے یہ سنا دے جا کر

فیضِ وحشت ہے ظفرِ حشرِ بیانی میری

ظفر ہاشمی

غیر مطبوعہ

# مٹھی کھچری کی مسجد

جناب سید محمد اشفاق حسین صاحب، رضوی لکھنؤی،

جامعہ آتے اور فیضیاب ہوتے تھے۔

محلہ میں ایک مچ خوان نامی متمول آدمی تھے۔ شاہی فیلی نے میں نوکر تھے ایک مرتبہ ان کے ہاتھی نے ایک آدمی کو مار ڈالا جس کی بادشاہ کے طرف سے سخت باز پرس ہوئی۔ مچ خوان نے شاہ صاحب سے اپنی پریشانی بیان کیں اور دھوکے خواستگار ہوئے۔ شاہ صاحب نے دعا کی نتیجہ یہ ہوا کہ مچ خوان صاف بری ہو گئے اس وقت سے محلہ والے اور مقتدر ہو گئے تھے۔ مچ خوان نے ایک مسجد تعمیر کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ محلہ کے لوگ بھی متفق ہوئے اور مسجد کی تعمیر کا انتظام ہونے لگا جب مسجد کی بنیاد قائم کی گئی تو سمار بہت پریشان ہوئے جب دیواریں کچھ بن جائیں تو دوسرے دن وہ منہم ہو جائیں اور کسی طرح دیوار قائم نہ رہتی۔ مستری جو کئی بار بنوا چکا تھا اس کو ہمارا آگیا۔ لوگ بہت خوفزدہ ہوئے اور یہ مشہور ہو گیا کہ یہاں پر بھات رہتے ہیں لوگوں نے شاہ صاحب سے جا کر واقعات بیان کئے دوسرے دن شاہ صاحب صبح کو خود تشریف لے گئے اور معاروں کو غسل کرنے کا حکم دیا جب معارف غسل کر چکے تو شاہ صاحب نے اپنے دست مبارک سے بنیاد رکھ دی اور معاروں سے کہا کہ اب بناؤ انشاء اللہ تکمیل ہو جائیگی۔ چنانچہ معاروں نے بنا نا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مسجد تیار ہو گئی اور کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔ اہل محلہ نے باصرار و منت شاہ صاحب کو مسجد میں ٹھہرایا۔ مخصوص ایک حجرہ بنوایا گیا تھا۔ اسی حجرہ میں شاہ صاحب مستقل رہنے لگے۔ پہلی جماعت مسجد میں بہت دھوم سے ہوئی دور دور سے لوگ نماز پڑھنے آئے تھے۔ دوسرے دن میلاد شریف بہت شان و شوکت سے ہوا۔

حضرت مولانا شاہ سید احمد صاحب قبلہ نہایت بزرگ اور صوفی کامل تھے۔ شاہ جہاں پور میں آپ کا دو تخت تھا۔ جامد اور غیرہ کافی تھی مگر آپ کبھی اس کی دیکھ بھال نہ کرتے جس کا جو جی چاہتا کرتا۔ آپ کے کئی اولادیں تھیں۔ بیٹھ اور لڑکوں کے سید عبدالعلی صاحب بہت ہوشیار اور باپ کے قدم بہ قدم تھے۔ تعلیم کا بید ستوق تھا۔ لہو و لعب اور فضول کھیل کو دے سخت نفرت تھی۔ مین پچیس برس کے سن میں آپ فارغ التحصیل ہو گئے چونکہ سب بھائیوں میں نہایت نیک اور قابل تھے اس وجہ سے علاوہ غیرہ کے لوگ آتے تو آپ ہی سے ہر معاملہ کی گفت و شنید کرتے تھے اور آپ کو ان معاملات سے دلچسپی نہ تھی۔ یہاں تک کہ عاجز ہو کر اپنے وطن سے لکھنؤ ہجرت کر گئے مگر بار جامد اور غیرہ سب کو غیر یاد کردیا۔

۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ آئے وہ زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر کا تھا لکھنؤ آکر ڈالی گینج پار کی ایک مسجد میں قیام کیا۔ آپ ثنوی شریف کے تقریباً حافظ تھے اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جو سنتا وہ محو ہو جاتا۔ آپ کا دستور تھا کہ صبح کے وقت وظائف سے جب حضرت ہوتی تو ثنوی شریف پڑھا کرتے۔ سامعین کا مجمع ہو جاتا تھا۔ راستہ چلنے والے محو ہو جاتے تھے لوگ اپنے کاروبار کا ہرج کرتے لیکن ثنوی سننے ضرور کیا کرتے تھے۔

شاہ صاحب جس وقت ثنوی پڑھتے تھے ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آنکھیں بند ہوتی تھیں اور آنسو جاری ہوتے تھے اور بچاں سننے والوں کا ہو جاتا تھا۔ اپنے حجرہ سے صرف ضرورت کے وقت باجٹ کے وقت باہر آتے تھے ورنہ حجرہ کا دروازہ بند رہتا تھا۔ عصر سے نہ نیک

ہشیر سے چالیس سال کی عمر میں عقد کیا۔ یہ عقد شاہ صاحب کی ہشیر و فرہ نے طے کیا تھا۔ انھیں لوگوں کے اصرار سے ہوا۔ مسجد کے قریب ایک مکان بنوایا اسی مکان میں متعلقین رہتے تھے اور شاہ صاحب مسجد کے حجرہ میں رہتے تھے عشا کی نماز پڑھا کر و ظلیعہ و فرہ سے فراغت کر کے صرف گھنٹہ دو گھنٹہ کیلئے مکان میں جلتے اور تہجد کی نماز سے قبل مسجد میں آ جلتے۔ یہی دستور آخر وقت تک رہا۔ حجرہ میں رہتے اور دروازہ ہر وقت بند رہتا۔ صرف نماز کے لئے باہر تشریف لاتے اور عصر سے مغرب تک درس دیتے اور ماحتمدوں کو مستفید فرماتے۔

شاہ صاحب کو طبی کچھڑی بہت مرغوب تھی۔ زیادہ تر یہی کھاتے شاگرد و متفقہ حضرات بھی اکثر تغذیہ طبی کچھڑی لایا کرتے تھے۔ اپنے عمر طبی کو پہنچ کر اس دار فانی سے انتقال فرمایا۔ درگزر وہ اٹھا تھا کچھم ذکر کو شاگردوں نے بلوایا اور دوا کا اصرار کیا۔ مگر شاہ صاحب نے دوا نہیں پی انکار کر دیا اور فرمایا میں نے کبھی علاج نہیں کیا۔ اب سیرا وقت آگیا ہے۔ علاج بیود ہے۔ تم لوگ کسی قسم کی کوشش نہ کرو۔ میں تھوڑی دیر کا ہمال ہوں۔

بقرید کے روز آپ کا وصال ہوا۔ مہینوں تک اکثر مسجد سے رتنے کی آواز آتی تھیں جب لوگ جا کر دیکھتے تو کوئی نہ ہوتا لوگوں کو سخت تعجب اور خوف معلوم ہوتا۔ شاہ صاحب نے پانچ اولادیں اپنے بعد بقید حیات چھوڑیں تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔

دونوں لڑکیوں کا عقد بھائیوں نے کیا جن کی نسلیں موجود ہیں ایک صاحبزادی کی نسل بنارس میں اور دوسری صاحبزادی کی نسل مگدور ضلع بہرائچ میں ہے۔

شاہ صاحب کے تین لڑکے ۱۔ مولانا سید ناصر علی صاحب ناصر علی ۲۔ مولانا سید صادق علی صاحب علی ۳۔ مولانا سید امان علی صاحب امان ۴۔ مولانا سید ناصر علی صاحب ناصر علی تھے۔ عربی فارسی کے منہتی تھے۔ شعر و شاعری سے بہت شوق تھا۔ دیوان ناصر فارسی میں مکمل ہو چکا تھا مگر طبع نہیں ہو سکا۔ بوستان کا مانشیہ بھی آپ نے لکھا ہے جو چھپا بھی ہے۔ آپ کے شاگرد کثرت تھے۔ لکھنؤ ڈالئی گنج پار میں زیادہ تر اسی خاندان سے لوگوں کو علمی فیض حاصل ہوا ہے۔

اس سچ میں اکثر مختلف قسم کی آغازیں آیا کرتی تھیں۔ اور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کنویں سے پانی بھرنے کی آواز آتی تھی جس سے لوگ خوف کھاتے تھے۔ لوگوں نے شاہ صاحب سے بیان کیا۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ یہاں اجڑ رہے ہیں۔ ایک بار ایک صاحب کو درد کی شدت تھی وہ شاہ صاحب کے پاس نکلا۔ اور اپنی تکلیف بیان کی شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور زخم حیات کی تہی بانٹنے کو فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ یہاں کہیں قریب میں تہی نہیں ہے کل ننگو اسکوں گا۔ چند لڑکے شاہ صاحب پڑھتے تھے وہ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک لڑکے نے کہا کہ میں ابھی لائے دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ لڑکا مسجد کے باہر گیا اور فوراً بہت سے ہرے پتے لئے ہوئے چلا آیا اور لا کر دیدیئے۔ اس شخص نے پوچھا کہاں سے لئے ہو ہیں بھی لے آیا کرونگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا جب تم کو ضرورت ہو ننگو لینا۔ پوچھنے سے کیا فائدہ۔ اس وقت وہ شخص چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جن کا لڑکا ہے۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں۔ یہ تحقیق ہو گیا تھا کہ اجڑ کے لڑکے شاہ صاحب سے پڑھنے آتے ہیں۔ اکثر نایاب چیزوں کی لوگ فرمائش کرتے اور وہ لڑکے ان واحد میں لادیتے۔ دیکھنے والوں کو سخت تعجب ہوتا۔

ایک بار شاہ صاحب کے والد محترم کو خیال آیا تو لکھنؤ اپنے صاحبزادہ کو دیکھنے آئے تھے۔ وہ زمانہ نواب آصف الدولہ ہادکا تھا۔ شاہ صاحب قبلہ نے اپنے صاحبزادہ کے پاس مسجد میں قیام کیا۔ نواب آصف الدولہ ہادکا کو خبر ہوئی کہ شاہ صاحب پور کے ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں تو ملاقات کیلئے بلایا۔ شاہ صاحب قبلہ ملاقات سے انکار کر دیا۔ آخر نواب ہانسی پر سوار ہو کر خود مسجد کے پھانک پر تشریف لائے اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ فقیر اور بادشاہ کی ملاقات مناسب نہیں۔ آخر نواب واپس چلے گئے۔ شاہ صاحب قبلہ نے اپنے صاحبزادہ سے شادی کی سخت تاکید فرمائی اور کہا کہ اگر شادی نہ کرو گے تو بھوکو سخت تنگ ہوگا۔ تمہاری نسل جاری رہے گی اور اسی دن شاہ صاحب پور واپس چلے گئے لوگوں نے قیام کا بہت اصرار کیا مگر حضرت نے صاف کہہ دیا کہ اگر میں رہوں گا تو نواب پھر آئیں گے میرا رہنا اچھا نہیں۔ یہ کہہ کر روانہ ہو گئے پھر کبھی نہیں آئے۔

شاہ عبدالعلی صاحب نے والد کے حکم کے تعمیل کی اور اپنی بھوپتی رزم

مولانا کے شاگردوں میں بہت سے پرہیزی بھی فیضیاب ہوئے ہیں مولوی ہادی علی خاں میلاد خواں کو بھی تلمذ کا فخر حاصل تھا۔ بہت کچھ واقعات مولوی ہادی علی خاں صاحب تیناپوری نے خود مولانا اور ان کے والد کے بیان کئے۔ ایک بار مولانا ناصر علی صاحب نے اپنے والد کی حیات میں اپنی والدہ کو تیس روپے لے جا کر دیئے اور کہا کہ ایک شاگرد نے کہا ہے کہ میں تیس روپے یا ہوا روٹکا۔ چنانچہ پہلی تنخواہ دی ہے۔ والدہ نے خوشی میں آکر یہ رقم شاہ صاحب کو پیش کی کہ لڑکے کو کسی شاگرد سے لے ہے، شاہ صاحب نے روپے کی پوٹی کو اٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا تم خوش ہوا اور میں علم بیچنا اچھا نہیں سمجھتا اور نہ اولاد کی کمائی لینا پسند کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سے مولانا ناصر علی صاحب نے کسی شاگرد سے کبھی رقم نہیں لی مولانا موصوف نے اولاد انتقال فرمایا۔ مولانا نے اجنبی کے عقد بہت بڑھائے جن کی بیشتر اور مختلف روایتیں ہیں۔

شاہ صاحب نے چونکہ قبر عید کے دن انتقال فرمایا تھا۔ اس وجہ سے قبر عید کے دن فاتحہ وغیرہ کے سلسلے میں اچھا خاصہ میلہ ہونے لگا۔ اس میلہ کی یادگار اب بھی ہے گو اس شان سے نہیں ہوتا ہے۔

مولانا مادی علی صاحب بھی عالم تھے اور صرف ایک ہی اولاد مولوی عنایت احمد صاحب جو بقیہ حیات حیدر آباد دکن میں موجود ہیں معلوم ہوا کہ موصوف کے کوئی اولاد نہیں ہے۔

مولوی امان علی صاحب جو شاہی باورچیخانہ کے داروغہ تھے شاہی کھانا بچوانے میں بہت اہم تھے اور شاہی دسترخوان پر ایک چیز روزنی پکوانے کی بھی تھی۔ بیشتر انعامات بھی حاصل کئے تھے۔ موصوف کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کا عقد میر حسین الدین شاہ صاحب خلیفہ وجہشین شاہ قاضی سبزویش کا کوری سے ہوا تھا۔ خلافت کا حال شاہ میر کا کوری میں تحریر ہے۔ میر حسین الدین شاہ صاحب بھی بزرگ اور نیک آدمی تھے۔ شاہ صاحب مذکور نے بھی اولاد انتقال فرمایا۔

مولانا امان علی صاحب کے تینوں صاحبزادوں کی اولادیں اب بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔

مولوی محمد حسین صاحب  
منشی سید احمد صاحب

مولوی محمد حسین صاحب نے فایز تحصیل ہونے کے بعد ریلوے میں ملازمت کر لی اور گورکھپور میں سلسلہ ملازمت چالیس سال تمام کیا۔ بخیر تیرہ اولادوں کے صرف دو اولاد زریہ بقیہ حیات لکھنؤ میں موجود ہیں۔ سید خورشید حسن اور سید بخش حسن۔ خورشید حسن صاحب کی دو لڑکیاں ہیں ہیں اور بخش حسن کے صرف ایک لڑکا اطلاق حسین بقیہ حیات موجود ہے مولوی محمد حسین صاحب نے بھی عربی کو پوچھ کر گورکھپور میں انتقال فرمایا ان کے شاگرد بھی گورکھپور میں موجود ہیں۔

منشی سید واجد حسین کے تین لڑکیاں ہیں اور تینوں لڑکیوں کا عقد ہو گیا۔ سب صاحب اولاد اولاد موجود ہیں۔ موصوف خوشنویس تھے۔ منشی سید احمد صاحب بھی خوشنویس تھے۔ زمانہ شباب ہی میں انتقال ہوا منشی صاحب کے ایک لڑکا منشی سید انوار احمد صاحب جو ہیں جن کے صاحبزادہ نثار احمد بقیہ حیات موجود ہیں۔

شاہ سید عبد العلی صاحب کے وصال کے بعد معتقدین اسی طرح مولوی امان علی صاحب کو مانتے رہے اور برابر مستفید ہوتے رہے۔ مولوی امان علی صاحب کے زمانہ میں درس و تدریس کا سلسلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ ڈالی گنج پار میں اب بھی ان کے شاگرد بکثرت موجود ہیں۔ من حضرات اپنے شاگرد ہونے کا فخر بیان کرتے ہیں۔ انھی کے زمانہ میں بقرعید کی شب میں جو میلہ ہوتا ہے بہت شاندار ہوتا تھا۔ شاہ صاحب قبل بقرعید کی شب میں وعظ فرماتے تھے اور فتویٰ شریف بہت اہتمام سے پڑھتے تھے دو دور سے سامعین آکر شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس اجلے نے میلہ کی صورت اختیار کر لی اور مولوی امان علی صاحب کے زمانہ میں اس میلہ کا شباب تھا۔ جس کی غیتیں مرادیں برآتیں وہ بہت دھوم سے حاضر ہوتا۔ ایک دفعہ ایک بیگم کی مراد برآتی تھی انھوں نے بہت دھوم سے حاضر دی۔ یہاں تک کہ ماسوائے اور لوازمات کے کچھ ہی پاؤ بھر چڑھائی تھی جس میں سونے کی دال اور چاندی کے چاول بولائے تھے اور تمام مسلمانوں کے حساب سے تھا۔ اسی طرح حسب حیثیت جن کی مرادیں پوری ہوتی تھیں لوگ آیا کرتے تھے۔ رات بھر میلہ ہوتا تھا۔ تمام دکاندار کئی دن پیشتر سے اپنی دکانیں بجاتے تھے اور ہر قسم کی دکانیں ہوتی تھیں۔ مسجد میں پردہ کا سخت انتظام ہوتا تھا یہاں تک

کہ ہوشیار بچے بھی اندہ نہ جاسکتے تھے اور تمام شریف بیبیاں آتی تھیں باہر میل میں بھی شرفاء کا مجمع ہوتا تھا۔  
غرض کہ مولوی امان علی صاحب کی حیات تک یہ میل بدستور شان و شوکت سے قائم رہا اور مسجد بھی دھن بنی رہتی تھی۔ مولوی صاحب جو عورت کے انتقال کے بعد مولوی صاحب کے لڑکوں نے شہر میں سکونت اختیار کی۔ وہاں کی سکونت بھی ترک کر دی۔ صرف بقرعید کی شب کو دونوں لڑکے منشی واجد حسین اور منشی سید احمد صاحبان جا کر بیٹھتے تھے ان دونوں صاحبزادوں کے بعد اولادیں صغیر سن تھیں۔ بڑے صاحبزادہ گورکھپور میں تھے رفتہ رفتہ وہ سب شان و شوکت جاتی رہی اور مسجد بھی منہدم ہوتی رہی اب مسجد کے صرف آثار باقی ہیں اور سب شہید ہو گئی۔  
مولوی صاحب کے شاگردوں میں سے دو ایک صاحب ہیں جو میل کے

دن جا کر بیٹھتے ہیں میل بقرعید کی شب کو اب بھی برابر ہوتا ہے اب صرف مسجد کا نام باقی ہے یہ وہی مسجد ہے جس میں گھی کے چراغ جلتے تھے اب اینٹوں کے ڈھیر لگے ہیں ایسی تاریکی مسجد اس کس پرسی کے عالم میں منہدم پڑی ہے۔ اس کے متعلق جو زمین تھی وہ بھی ویران میدان ہو گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کے موروثی مکانات بھی صاف میدان ہو گئے۔

مولوی صاحب کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ سب بہت پریشان حال ہیں اپنے موروثی مکانات ہی درست نہ کر سکے تو مسجد کی تعمیر کیا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے ادبار کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ مسجدیں بھی ویران نظر آتی ہیں۔ خدا کرے کہ خاندان والوں کو اتنی مقدت ہو جائے کہ وہ از سر نو مسجد کی تعمیر کر سکیں، میل قائم رہے یا نہ رہے مگر مسجد تو قائم رہے۔

(اشعار منثور)

محبت اور زندگی!

میں اپنی تحصیل پر تھوڑی سی ٹہنی رکھتا ہوں اور چند بیج چھڑک کر اسے اپنی کھڑکی سے باہر پھیلا دیتا ہوں اور بارش کی آمد کا انتظار کرتا ہوں، میری تحصیل کی مٹی نرم ہو جاتی ہے۔ اس سے بیشتر کہ میں اس سے واقف ہوں۔

میرے چھڑکے ہوئے بیج اپنی نازک پتیاں پھیلاتے ہیں اور پھر اپنے بھول میں اپنی تحصیل میں گدگدی محسوس کرتا ہوں اور میرا ہاتھ سردی سے ٹھنک جاتا ہے۔

سولج میرے ہاتھ کے گرد گھومتا ہے اور ہوا اپنی گرم سانس اس پر بھونکتی ہے۔ بھول آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ میوے ہاتھ کی ٹہنیاں سخت ہو جاتی ہیں اور گوشت جڑوں سے بھر جاتا ہے۔

جب میں بھولوں کو اپنی تحصیل سے جدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو ان کی نازک پتیاں میری انگلیوں کے گرد لپٹ جاتی ہیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ جب مالی آئیگنا کو انھیں فوجت کر دوں گا۔ لیکن وہ صرف بھول ہی لے جائیگا اور میرے ہاتھ کو تنہا چھوڑ جائیگا۔ اسے خبر بھی نہیں کہ اگر وہ انھیں میرے ہاتھ سے جدا کر گیا۔ تو بھول مر جھا جائیں گے۔

اس لئے اگر کوئی انھیں لینا چاہے تو براہ کرم بھولوں کو میرے ہاتھ سمیت لے لے۔ میں یہ سب کچھ خوشی سے دید ونگا.....

میں گرد سے انی چوٹی سرک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوں اور آخر کار محبت کا دروازہ پالیتا ہوں۔ میں دروازے پر دستک دیتا ہوں محبت نیم دروازے سے جھانک کر کہتی ہے۔

"تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟ تمہیں سورج غروب ہونے سے قبل بیاں آنا چاہئے۔ میرے پاس کوئی خالی جگہ نہیں۔" اُرد میں تمہیں داخل بھی کروں۔ تمہیں کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی چاہئے، مجھے سخت افسوس ہے۔"

محبت ایک چمکے کے ساتھ پانچ دروازہ بند کر لیتی ہے۔ میں ہراسیمہ ہو جاتا ہوں۔ میرا دل جدا ہونا نہیں چاہتا۔

میں محبت کی نرم و نازک آواز دروازے سے کھڑا سنتا ہوں۔ (یونے لوگوچی۔ مترجمہ محمد فاروق مانگیا ناوی)



# نقش وفا!

جناب شیخ تہ حسین صاحب وفا

مطلب یہ تھا مرضِ یونہیں نیجاں رہے! آئے ہو وقت نزع ابھی تک کہاں رہے  
بالائے آسماں کہ تہہ آسماں رہے! تیری ہی جستجو میں ہے ہم کہاں رہے  
بارغِ جہاں میں ہم نہ کبھی شاداں رہے! شبنم کی طرح آنکھ سے آنسو واں رہے  
زلفِ سیہ میں ایسے دل ناتواں رہے! جیسے اندھیری رات میں تارے نہاں رہے  
خلوتِ بینِ نغمِ ناز میں دل میں نگاہ میں مجھے الگ الگ ہے وہ جہاں رہے  
بعد فنا بھی مجھ کو ستانے کے واسطے یارب ہی زمین ہی آسماں رہے  
غربت ہو یا وطن ہو چمن ہو کہ شمت ہو بیزار زندگی سے ہے ہم جہاں رہے  
کہہ ڈالئے اگر کوئی کہنے کی بات ہے یہ کیا ضرور! خلقِ خدا ہمزباں رہے  
انکوں میں کر رہی ہے بیاںِ استانِ غم خاموش کب تلک نگہِ بیزباں رہے  
مل کر چلے نہ ہم سے کبھی اہلِ قافلہ مثلِ غبار ہم عقبِ کارواں رہے  
ناکام آرزو کا جو سنتے رہیں وہ حال، محشر تک اس کے لب پہ بیجاں رہے  
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے جو در پہ آپ کے فرمائیے یہاں نہ رہے تو کہاں رہے  
چھوڑو نہ تم وفا کو ہماری اگر سُنو! رہے دو بدگماں جو کوئی بدگماں رہے

# مخدسِ پیار

## ابنِ حسن بن بھاولپور

سعیدہ کو بھی نسیم کی سردھریاں ہمیشہ بچپن اور معنوم کر دیتی تھیں، وہ محمود کو اپنے اکلوتے بچے کی طرح سمجھتی تھی، اس کی نگاہوں میں محمود کے لئے ایک شفقِ ماں کا نور و جزا تھا۔ وہ جب دیکھتی تھی کہ محمود اپنی تمام کائنات سمیت، نسیم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے اور بالواسطہ واپس آتا ہے۔ وہ کس طرح اپنے عقیدتوں کو اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور کس بیدردی سے ٹھکرایا جاتا ہے تو اس کا دل غم و اندوہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا۔

اس نے بار بار دیکھا تھا کہ محمود بارش میں پڑا بھیگ رہا ہے اور نیمہ مڑے سے اندر نیند کے خزانے لے رہی ہے۔ وہ اندر در دسے کراہ رہا ہے اور وہ باہر اپنے سینے پر رونے میں مصروف ہے۔

سعیدہ کئی بار ایک مہرباں ماں کی طرح اسے تسلی دیتی اور نصیحت دلاتی کہ واقعی نسیم اس سے محبت کرتی ہے، مگر حقیقت نسیم کے تاریک دل میں محبت کی روشنی ہی نہیں ہوئی تھی۔ حسن تھا، مگر الفت کی چاشنیوں اور رنگینوں سے بے بہرہ، دل تھا، مگر احس و مروت کی گہرائیوں سے ناواقف۔ اس کے اندر ایک جمود تھا۔ وہ ایک لاشانی مصور کا مرمریں شامہ کا رب تھا۔ جو اپنے بجا دیوں اور عقیدہ مندوں سے بے خبر تھا۔

ہونے کو تو محمود کی شادی نسیم سے ہو گئی تھی، مگر اس نے ایک لمحہ بھی چین سے نہ گزارا تھا۔ دونوں اپنا اپنا راستہ چلتے رہے۔ دونوں اپنے اپنے نظام کی تکمیل میں کوشاں رہے لیکن دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو مجبور نہیں کیا تھا کہ آپس کے اختلافات کی قربانی کر کے ایک ہو جائیں۔

تارے آسمان پر قطراتِ اشک کی مانند چمک رہے تھے... زندگی کا فرشتہ پرواز کے لئے بقیہ رہا ہے... سعیدہ!... سعیدہ! میری نسیم کو بلاؤ... تاکہ محمود... یہ بد بخت محمود اپنی ہمیشہ کے لئے جد ہونے والی زندگی کے رویہ و تشکیہ کے طور پر ایک آخری سجدہ کر لے... آہ دیکھو! موت اپنا مارک بے رحم ہاتھ اس طرف بڑھا رہی ہے... آہ صرف آخری غم... محمود بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ اس کی زندگی دنیا میں اب آخری خواب دیکھ رہی تھی، اس وقت اسے اپنی تمام گزشتہ نکالیوں کا احساس تھا اس کی روح پابندِ نفس طائر کی طرح میاد کے تجڑوں سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اس وقت اس کا دل ایک گہری کشمکش میں مصروف تھا زندگی کے مایوس لمحات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہے تھے۔ اس نے اپنی مختصر حیات میں کئی بار دیکھا تھا کہ نسیم نے اس کی پاکیزہ محبت کو کھلایا اس کی رنگین آرزوؤں کو ہمیشہ تباہی کے خوفناک آندھیوں کے سپرد کر دیا۔

”سعیدہ! کیا نسیم مجھ سے محبت کرتی ہے؟“ محمود نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک لذتی ہوئی مہین آواز میں کہا۔

”بچے چھوڑو ایسی فضول باتوں کو...“ ناحق اپنے کو پریشان نہ کرو...“ سعیدہ نے شفقتاً نہ انداز میں کہا۔

محمود سعیدہ کو اپنی والدہ کی طرح محترم سمجھتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے حقیقی والدین کون تھے۔ وہ کس طرح سعیدہ کے پاس لایا تھا کیسے وہ اس قدر سہرا یاہ کا مالک بنا تھا؟ یہ سب باتیں اس کے لئے ایک گہرا راز تھیں۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ سعیدہ کے غریب اور بوڑھے ہاتھوں نے اسے پالا ہے۔

قربانی جاری رہی، لیکن امید کبھی منقطع نہ ہوئی۔... آرزو نے دوپہ کو قریب میں دکھا۔ زندگی نے ہمیشہ امید کی رسی دماڑ کی.....

سعیدہ محمود کے بستر کے نزدیک کسی پریشانی تھی۔ وہ اسے اب آخری بار ایک ناممکن چیز کا یقین دلاری تھی۔ "نیر، تم سے محبت کرتی ہے" سعیدہ نے محمود کو خاموش دیکھ کر خیال کیا کہ وہ سو گیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آنسو بہا رہا تھا، "آہ، ہمیشہ کیلئے جدا ہونے والا محمود اپنے دل اپنے قیاب دل کے لئے ایک آخری تسکین کا تداشی تھا۔ لیکن ناکامی کے طوفانی سمندر میں اس کی کشتی امیدات چکی تھی۔... تلاش بیود تھی۔ امید موہوم تھی۔

"سعیدہ!" محمود نے مجروح ہنسی سے اس پر گماہ کی اور پاس الجیز آؤ! میں کہا۔ "بقلم کے مسافر کا سامان زندہ چھلپے۔... مجھے زندگی کی کوئی امید نہیں۔ لیکن نیر سے..... آہ! مجھے پھر بھی..... امید ہے۔ آہ! دیکھو چاند کی چاندنی تمام عالم کو اپنے نور سے منور کرتی ہے۔... مگر تمام تاریکی تو یہ بھی نہیں ختم کر سکتی۔ کوئی جگہ ایسی باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تاریکی کا تسلط ہوتا ہے۔... ہم بعض اوقات زندگی میں خطرناک غلطیاں کرتے ہیں، لاکھوں دفعہ امید، ناامیدی کا جامہ پہن لیتی ہے، بہت دفعہ ہم حالاً کا غلط جائزہ لیتے ہیں، واقعات کا غلط موازنہ کرتے ہیں اور زبردست، دھوکہ کھاتے ہیں، لیکن پھر امید باقی رہتی ہے۔ روشنی باقی ہوتی ہے ہماری روح میں کچھ جوش، کچھ احساس، کچھ جرأت باقی رہ جاتی ہے..... ہم ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح پھراٹتے ہیں اور زندگی کی ناقابل فہم پیچیدہ اور گنگناہنگ میں نئے سرے سے شریک ہو جاتے ہیں..... یہ سب امید ہی ہوتی ہے جو ہمت کو مردہ ہونے سے بچاتی ہے۔

"ہاں بیٹا!..... سعیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے وہ زندگی کی ایسی جگہ میں شکست خوردہ ہو چکی ہے۔"

"سعیدہ!" محمود نے پھر آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "جس دن سے میں نے شادی کے ہے۔ زندگی کی راحت، شادی جیسے حقیقی ملاپ کی خوشی، اور محبت کی آسانی لطافت سے ہمیشہ محروم رہا ہوں۔ آہ میں نے کئی مرتبہ زندگی کو ظاہری جامہ آوارے پر مجبور کیا..... کئی دفعہ

میں نے اپنے آپ کو گم کر دینے میں رہائی سمجھی۔ لیکن آہ! یاس اور ناکامی کے بے پناہ طوفان میں خوشی اور رہائی محال.....

"محمود، سعیدہ نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا: "کیا زندگی میں خوشی کوئی بالکل ہی ضروری چیز ہے۔؟"

"اس کا جواب میں نے کبھی مکمل نہیں پایا۔" محمود نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم زندگی میں ہزاروں انسانوں سے روزانہ ملتے ہیں۔ ہر ایک شخص باری باری سے ہمیں اپنی رنگیں دنیا دکھاتا ہے۔ ہم بھی ان میں بعض کے لئے اپنی زندگی تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے لیکن پھر ایک وقت آتا ہے ان میں بعض اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے چل دیئے بعض جو زندہ رہتے ہیں وہ ہمارے خوابوں کی دنیا میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ایک خیال سے زیادہ سے وقعت نہیں رکھتے ہیں۔ نہ انہیں ہماری پروا ہوتی ہے۔ نہ ہمیں ان کی..... آخر ہمارا دل کیوں اتنی جلدی اپنے خوابوں کی دنیا میں بدلتا رہتا ہے، اس میں وہ کونسی لگ ہے، جو اس کے بے چین، اور سیلاب کی طرح، قیاب رکھتی ہے؟..... یہ کیوں اپنی شاہراہیں بدلتا ہے، کیا خوشی کی تلاش کیلئے سکون کی امید نہیں؟..... ہم سین چہروں میں رنگین پھولوں میں، گہری سرسبز وادیوں میں، شوق کی سڑکیوں میں..... کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں؟ ان میں کیا دیکھتے ہیں..... اپنے دل کیلئے خوشی؟ لیکن یہ تو ہمارے دل کے سوئے ہوئے لندہ دہلیں نعمات بیدار کر دیتے ہیں، ہم پھر کیوں روتے ہیں؟ انہیں میں گم ہو کر اس دنیا اور اس کی زندگی سے بیزار کیوں ہو جاتے ہیں.....؟"

اس نے آنکھیں بند کر لیں، وہ خاموش ہو گیا۔ ایک آوارہ رہرو کی طرح جو ایک عظیم بوجھ اٹھانے سے تھک گیا۔ اور کسی سرسبز درخت کے تنچے سستانے کے لئے بیٹھ گیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہمیشہ کیلئے نہیں، بلکہ کچھ دیر اور مصائب کا شکار ہونے کیلئے وہ بغاظر خاموش تھا مگر حقیقتہً اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا.....

اب اس کے غم داغہ کا علاج، اس کی امیدوں یا مکان کی چار دیواری میں نہیں تھا۔ بلکہ خدا کی بندیوں میں۔ دور۔ جہاں انسان کی نظریں ناکام ہو جاتی ہیں.....

”وہ نسیمہ کی سردہریوں کی فرست دم راہ تھا۔۔۔۔۔ کہ یکا یک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

”حضور! بی بی صاحبہ، دیراج پور۔۔۔۔۔ اپنے میکے۔۔۔۔۔ بھائی کی شادی پر شہر میں لے جا رہی ہیں۔۔۔۔۔ ایک ملازم نے سودا بازوں میں عرض کی۔۔۔

محمود بقیاب ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ اسے آخری موت سے پیشتر ایک دوسری موت نے آلیا۔۔۔ اس کے جذبات میں تلاطم اور روح میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انتہائی یاس کے وقت انسان کے قابو سے ہر چیز آزاد ہو جاتی ہے۔۔۔ اس نے بتایا کہ ایک لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ کیا میرا دل محبت سے نہی دست تھا۔“

محمود اگر چاہتا تو نسیمہ پر چڑ کر سکتا تھا۔ اسے اکراہ سے اپنے قابو میں رکھ سکتا تھا۔ اس کی محبت اور وفا حاصل کرنے کے لئے اسے ”شوہرانہ اختیارات“ برتنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن یہ محمود کی فطرت سے بعید تھا، وہ ایک ناقابل حصول چیز کے لئے کوشش کرنا جو قوفی سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ وہ ایسے دروازے پر جانا گناہ سمجھتا تھا جس پر سے خیرات کی امید نہ ہو۔۔۔۔۔ وہ عورت پر ظلم کرنا۔ جس کے دل میں کہا کے لئے محبت نہ تھی۔ ایک ناقابل طافی جرم سمجھتا تھا۔

اس نے دنیا میں صرف ایک پرستش جائز سمجھی تھی اور وہ اس حسین دیوی نسیمہ کی تھی۔ نسیمہ۔۔۔ ایسے رنگین مرتع حسن پر چڑا کر اور شوہرانہ اختیارات کا استعمال؟ وہ اس خیال سے لرز اٹھتا تھا۔۔۔

”سعیدہ!“ اس نے اٹھری ہوئی آواز میں کہا۔ ”نسیمہ نے میری زندگی کو بوجھل کر کے موت کے طوفانی سمند میں۔۔۔ تنہا۔ بقا کی طرف دھکیل دیا ہے، میری امید کی رسی کاٹ ڈالی ہے۔۔۔ آہ! لیکن مجھے ایک بات پر غور ہے کہ میں نے نسیمہ پر ظلم نہیں کیا۔ اپنے، مقدس پیار کے لئے اس کو بچپن نہیں کیا۔ میں نے بہت انتظار کیا، کہ شاید وہ میری ہو۔ لیکن آہ! سعیدہ! نسیمہ۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ موت کا فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

سعیدہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ یابوس نگاہوں سے محمود کے چہرہ کو تنگ نہی تھی۔ وہ ایک یابوس حکیم کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ محمود کی مٹیابیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی تمام کوششیں محمود کے لئے قربان کر چکی تھی۔

یکدم دروازہ کھلا اور کوئی عورت تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دھاڑ مار کر محمود کی ٹانگوں سے ٹپٹ گئی۔ سعیدہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ایک سفید برف کے بت کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے آنسو اس کے چہرے کی جھریوں میں چل رہے تھے۔

اس نے نسیمہ کو پہچان لیا تھا۔ دونوں رو رہی تھیں۔ آہ! جب رونا مبیود تھا۔ آہ و زاری بیکار تھی، آہ! جب عشق بے صبر ہو چکا تھا۔ حسن اپنی نافرمانیوں پر شہر مندگی سے رو رہا تھا۔

”محمود! پیارے محمود! تمہاری نسیمہ تمہارے قدموں پر پڑی ہے سعیدہ نے محمود کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کون؟“ محمود نے نصف غنودگی کے عالم میں پوچھا۔ ”نسیمہ تمہارے قدموں پر پڑی ہے۔ حسن، عشق کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے۔“

”نا ممکن۔۔۔!“

”اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، حسن کی شہر مندگی کو۔“ محمود نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ نسیمہ واقعی اس کے قدموں پر پڑی سسک سسک کر رو رہی تھی۔

ندامت میں حسن کا احساس الفت تیز ہو جایا کرتا ہے۔ نسیمہ اپنے دل میں ایک طوفان محسوس کیا۔ جس کی شدت اس کے برداشت سے باہر تھی۔ وہ پھر ایک دفعہ اسے زندہ کرنا چاہتی تھی۔

حسن اپنے حادو سے پھر ایک دفعہ عشق کی سرستیاں بیدار کرنی چاہتا تھا، وہ ایک دفعہ پھر عشق کی جنوں آرائیاں دکھینا چاہتا تھا، گلاب وقت گزر چکا تھا۔ کوشش بے سود تھی۔ یہ وقت تھا جبکہ عشق کی یابوسیاں حسن پر طاری ہوتی ہیں۔

محمود نے آہستہ سے اپنی نگاہیں اس پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اسے اپنی ٹانگوں پر کچھ بوجھ سا احساس ہوا۔ اس کے چہرے پر

ایک مجروح مسکراہٹ نمودار ہوئی — وہ ایک دم اٹھ بیٹھا —  
جنون اور محبت نے کمزوری پر فتح پالی تھی۔  
موت کا فرشتہ انتظار کرنے لگا۔

”جاؤ!“ محمود نے جوش دیوانگی میں کہا — جس طرح میں دنیا  
سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں، میں تمہاری طرف ایک نگاہ بھی ڈالنا جرم  
سمجھتا ہوں — اس لئے نہیں کہ میری نگاہوں میں تمہارے دیکھنے  
کی ہوس نہیں رہی — بلکہ میں جانتے ہوئے تمہیں دنیا میں —  
جس کے لئے تم نے میری مقدس عقیدوں کو ٹھکرا لیا ہے —  
تنہا چھوڑنا چاہتا ہوں۔ تاکہ دنیا کے سخت ترین بچوں میں بچنس کر  
تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارا حقیقی دوست اور حبیب — محمود —  
صرف محمود ہی تھا۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جبکہ اسے ناکامیوں  
اور مایوسیوں میں ایک بچے عکسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

وہ ارد گرد نگاہ ڈالتا ہے مگر اسے دفابازرو حین ہمدی اور دوستی کا  
جامہ پہنے ہوئے نظر آتی ہیں — عشق — مکر و فریب کے لباس  
میں جلوہ گر ہوتا ہے — اس وقت اس کی آنکھیں کھلتی ہیں،  
— وہ افسوس کرتا ہے مگر بکا رہا — وہ روٹتا ہے، مگر بیسود —  
وفادار رو میں غایب ہو چکی ہوتی ہیں۔

جس طرح میں تم سے ہمیشہ کیلئے .... جدا ہو رہا ہوں —  
وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تمام جسم نے ایک فوری حرکت  
کی، اور وہ بستر پر گر کر بیہوش ہو گیا۔  
چند منٹ بعد ایک بچی اس کی مجروح مگر پاکیزہ روح کو میکرا آسمان  
کی بلندیوں کی طرف مائل پرواز تھی۔  
موت کے فرشتے نے اپنا کام کر لیا تھا —

ایں حسنین،

از۔ امین حنین بھالپور

غزل

یہ رندوں میں آکر شرابوں کا پینا  
نظر کیوں مری سوئے ساحل اٹھی ہے  
دعاؤں کی ہستی سمجھ کر چلا ہوں،  
کہاں ان کے جلوؤں میں ہم کھو گئے ہیں

تمہیں شیخ جی! کیسے آیا قریبنا؟  
کہاں ڈوبنے کو ہے میرا سفینا؟  
کہ دنیا میں مجھ کو ہے کچھ روز حبینا!  
جہاں ہائے کچھ بھی نہ چھانا ثبینا!

حزین زندگی کی وضع داریاں ہیں!

کہ جینا ہے مرنا، تو مرنا ہے جینا!

# حقائق !

حضرت طالب باغپتی،

پھر اُن کی نگاہوں میں کیفیتِ صہبائے  
ساقی ہے، صراحی ہے، ہیں ہوں لبِ دیباہ  
وہ دل میں سمایا ہے آنکھوں کو یہ دھوکا ہے  
بیمارِ محبت کی، اندرے یلو سی !  
جو تو ہے وہی میں ہوں بس فرق ہے زاہد  
وہ عقل سے بالا ہے، یہ عقل نے کیا سمجھا ؟  
گم کردہ منزل ہے اب کون محبت میں  
اک درسِ عبادت ہے ساقی کی ہر انگڑائی  
تقویٰ کا خدا حافظ، توبہ مری توبہ ہے  
یہ خواب کا عالم ہے، یا ہوش کی دنیا ہے  
آنکھوں میں رہتا ہے، دل نے تو یہ سمجھا ہے  
اب درد کا بڑھنا ہی اک شکلِ مداوا ہے  
تو نے جسے سمجھا ہے، میں نے اسے دیکھا ہے  
ہر چیز کے پردے میں وہ جانِ تمنا ہے  
میں نے تجھے ڈھونڈا ہے، تو نے مجھے پایا ہے  
ہر غرضِ متانہ سجدے کا اشارہ ہے

طالب کے تعارف پر کیا نازِ تغافل ہے

منہ پھیر کے کہتے ہیں۔ اس کو کہیں دیکھا ہے

طالب باغپتی

غیر مطبوعہ

# دوست

از: نقاش جذبات حضرت ظفر وسطی شاہ آبادی

کو کاٹتا ہے اور پھر اکثر بچ بھی جلتے ہیں مگر دوست — دوست سب کو کاٹتا ہے اور اُس کے کاٹے ہوئے تمام غم روتے ہیں، تمام غم —  
”لیکن تم انھیں دوست نہیں کہہ سکتے — دوست کا لفظ تو صرف یاد دلاؤ اور سچے ہمدرد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔“

”میں دوست نہیں کہہ سکتا — دینا انھیں دوست کہتی ہے تم خود انھیں دوست کہتے ہو۔ عابد کون ہے؟ تمہارا دوست —  
شوکت کہتی تھی تم نے غور کیا کہ یہ دوستی کے پردے میں تم سے دشمنی کر رہا ہے اور تم اسے دوست سمجھتے ہو۔“

شوکت عابد کی محبت میں اندھا ہے۔ اگر کوئی اس کے سامنے عابد کو بُرا کہہ دے تو وہ برداشت نہیں کر سکتا میں نے اسی لئے عابد کا نام لیا تھا کیونکہ وہ بحث کو طول دے رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر اس سے کچھ گفتگو نہ کروں۔ وہ عابد کا نام سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا کہنے لگا۔

”ظفر! تم کیا کہہ رہے ہو؟ عابد سادہ دوست تھیں عمر بھر نہیں مل سکتا — اور تم جیسے منطقی کو تو قطعی نہیں مل سکتا۔ بن گئے معذور نگار۔ دوست اور سانپ میں فرق نہیں معلوم، دشمن کو اگر سانپ سے نسبت دیتے تو ایک بات تھی۔“

مجھے خیال آیا کہ جب یہ بحث شروع ہی ہو گئی تو شوکت پر بھی طرح واضح کر دینا چاہئے اور اگر اب بھی میں نے عابد کو بُرا کہا تو یہ سائیکل اٹھا چلا جائیگا۔ اس لئے میں نے کہا۔

”شوکت! ناراض ہونے کی بات نہیں — اور تمہارا بھی کیا قصور؟ سچ بات سب کو بُری معلوم ہوتی ہے، خیر عابد کو چھوڑو۔ وہ تمہارا باوجود

سرمائی ایک دلچسپ گزندیت خُش شام تھی۔ میں بیچکے کے برآمدے میں بیٹھا شوکت کی دوستی کے منطقی سوچ بھاٹھا اور جذباتیادہ غور کرتا تھا شوکت آتا ہی بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ سوچتے سوچتے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب شوکت ہی نے وفار کی تو اور کون کرے گا۔

شوکت اور صرف شوکت کے لئے میں نے اپنے سب ساتھیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنی فکر میں تھا کہ شوکت سائیکل پر سوار آ پہنچا۔ اس کی معمولی مزاج پر ہی نے مجھ میں چرائی خیار میں ڈوب گیا۔ اس نے دو ایک ایسے کام کئے تھے کہ میں اس سے کنارہ کشی کرنے کا ہتھیار کر چکا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ شوکت نے غلاف ممول سکوت سے تنگ آکر پوچھا۔

”سانپوں کی طرح دوستوں کی بھی مشیارتیں ہیں۔ میں نے جواب دیا۔

”سانپوں کی طرح؟“ شوکت نے میرے الفاظ حیرت سے دہرایا۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ سانپوں کو دوستی سے کیا نسبت؟

”جس طرح سانپ طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ میں اپنا مطلب بیان کرنے لگا۔ ”جی طرح دوست جی قسم قسم کے پائے جاتے ہیں، نہ کوئی سانپوں کی قسمیں گن سکتا ہے نہ دوستوں کی۔“

”بیان؟“ سانپوں کو دوستوں سے کیا نسبت؟ شوکت نے کہا،  
”سانپ تو انسان کے دشمن ہوتے ہیں اگر صرف قسموں کا سوال ہے تو کسی اور چیز سے تشبیہ دے سکتے ہو۔“

”دوست بھی ایک طرح کے سانپ ہوتے ہیں بلکہ نقصان پہنچانے میں سانپ سے بھی بازی لے لئے ہوئے ہیں۔ سانپ تو کبھی کبھار کسی



چودھویں صدی ہے۔ اس میں انسان اقام لینے کے لئے، اکیڑ نکالنے کے

---

لئے وہ سب بن جاتے ہیں اور دوست بن کر زہر دیتے ہیں، قتل کر دیتے ہیں، بیوی کو بھگا لیتے ہیں، رو پر جڑا لیتے ہیں، اور نطفہ یہ کونئی ان پر شہتک نہیں کرتا۔ جو کام وہ دشمن رہ کر نہیں کر سکتے دوست کے کال لیتے ہیں۔ جس کسی کو دوست نہ بنا لیا ہے وہ سنی ایک اصول چیز ہے علم شاعری کی طرح بیکار دل کا متعلق۔

”بغیر دوست کے دنیا کے کام چل نہیں سکتے جس کا کوئی دوست نہیں وہ اس نبل کے مانند ہے جسے بال و پر ہو اگر سب انسان تھکے ہو چیل ہو جائیں تو دنیا کا دودن میں خاتمہ ہو جائے۔“

”آدھ تو تم نے یہ مثال ہی غلط دی ہے ادا اگر تھوڑی دیر کے لئے صبح بھی مان لیا جائے تو بھی میرے خیال میں بے بال و پر بلبل اور بلبلوں سے آدم میں ہے گا میں ہوں میرا کوئی دوست نہیں، بتاؤ مجھے کیا تکلیف ہے، بلکہ جب تک میں نے تمہیں اپنا دوست سمجھا مجھے نظرات کیسے ہے ادا اب قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہوئی اور ہم دونوں الٹ کر مسجد میں چلے گئے نماز پڑھ کر واپس ہوئے تو دونوں خاموش تھے کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہے پھر شوکت نے سائیکل اٹھائی اور سلام کر کے چلا گیا اد میں پھر کوئی کے سود و تیاں پر غور کرنے لگا۔ اس کے بعد شوکت کبھی مجھے ملنے نہیں آیا۔

## غزل

نہ تھی امید ایسی رازداں سے      نظر آنے لگے وہ بدگماں سے  
مری ناکام دُنیا اٹ رہی ہے      اٹھایا جا رہا ہوں آستیاں سے  
شبِ فرقت کا قصہ آؤ سُن لو      ستاروں سے فلک سے کمشاں سے  
عجب ہے حُسنِ ترتیبِ فسانہ !      بیاں کر دیجئے چلے جہاں سے  
اب حُسن و عشق کے رنگیں فسانے      بنینگے صرف میری داستاں سے  
وہی تم ہو وہی حسرت بھرا دل      ہوا کیا انقلابِ آسماں سے  
مری رنگینیِ وحشت تو دیکھو !      بہا میں چُن رہا ہوں میناں سے  
جہیل آؤ چلو دیوانے بن لو      تمہیں کیا فائدہ رسمِ جہاں سے

خان جمیل نعمانی - راپوری

# افریقہ کے جادوگر

مولانا شبیر ہاروی

یونٹل کبھی علم ہوتا ہے۔

ان لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اونی مویا کی اولاد سے ہیں جو پشتیں نزدیں آسمان سے، تر زینروی کے قریب کوہ لونگبر بیٹھا ہوا پایا گیا تھا۔ وہ اتنے سے چھوٹے قد کا تھا کہ اولاد اسے ایک بچہ سمجھا گیا۔ لیکن اس کی عجیب و غریب طاقتیں جلد ظاہر ہو گئیں۔ ہر حال اس علاقہ کے موجودہ جادوگر بالعموم اسی کی اولاد سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کے توہم پرستوں میں ان کا بے پناہ اثر ہے۔ اگر کوئی جادوگر کسی کو قتل کر ڈالنے تک کا حکم دے تو اس کی تعمیل لازمی ہے ورنہ اس کی بدعا کا خوف دہنگیر رہتا ہے۔ ملک میں کبھی بارش کی قلت اور قحط کا خوف ہو تو ان جادوگروں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، بارش کسے لے وہ منی کا ایک برتن کسی غلی درخت کی ٹہاڑا کچھ پانی لاتا ہے پھر چڑکے ٹکڑے برتن میں رکھ کر اوپر سے پانی اور اسے اتنا ہلاتا ہے کہ اس میں جھاگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر سمت پھینکا جاتا ہے۔ پھر وہ ایک خاص قسم کا سفوف آگ پر ڈالتا ہے جس سے گھٹا نوپ دھواں ہو جاتا ہے۔ اس عمل کے وقت تمام حاضرین گاتے ہیں۔ ”آؤ آؤ! بسلسل بارش کے ساتھ آؤ! اولیڑا! آؤ! لیڑا! ان کے یہاں رب الارباب کا نام ہے۔ جادوگر کبھی اس وقت تک یہ عمل نہیں کرتا جب تک اسے مستقبل قریب میں بارش ہونے کا یقین نہ ہو۔ اسی وجہ سے بالعموم اس کا عمل کامیاب ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جادو کی تمام طاقتیں مقدس سانپ کی رہیں منت ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر جادوگر کے پاس ایک سانپ اور ایک انسان کی کوڑھی ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جادوگر مرنے کے بعد سانپ بن جاتے ہیں ان میں سے بعض ارواح غیبتہ سے بھی باز باز رکھتے ہیں۔ جن کا قد تین فٹ

ابھی حال میں نوآبادی کین کے شفاخانے میں ایک بوڑھا ایسی کمزور تھا میں داخل ہوا کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لٹھی تھی اور دوسرے میں پانی کا ایک برتن۔ اس کی ہڈیاں جیسے باہر نکلی ہوئی تھیں اور حالت ایسی خطرناک تھی کہ دو ہی دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے متعلق ایک عجیب و غریب داستان ہوئی۔ ایک روز وہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا پانی پی رہا تھا کہ لیسن خانہ ان کا ایک شخص آیا اور اپنے پاؤں سے پانی گھسٹوٹنے لگا۔ پانی غلیظ ہو جانے پر بوڑھے نے اسے روکنا چاہا لیسن نے کہا: ”نہیں میرے کام میں دخل دینے اور میرے عمل کی تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟“ اسی کے ساتھ اس نے بد دعا دی کہ آئندہ بجز پانی کے اس کے محل کے پیچھے کوئی چیز نہ اترے گی اس وقت سے بجز پانی کا ایک آدھ گھونٹ پینے کے غذا کا ایک دریزہ بھی اس نے نہ کھایا تھا۔

افریقہ کے جادوگروں اور جیکیوں کا جملہ میں جو اثر ہے اس کی یہ ایک معمولی سی مثال تھی۔ موجودہ علوم کی روشنی میں ہم اسے سمریزم کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ ہر حال کین کے علاقہ میں روزانہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جادوگر اور حکیم کی بد دعا کبھی رانگن نہیں جاتی۔

افریقہ کے قبیلوں کے لوگ بڑے توہم پرست ہوتے اور ہمیشہ جادو سے خائف رہتے ہیں۔ ہر قبیلہ کا ایک یا ایک جادوگر اور حکیم ضرور ہوتا ہے ان کے خیال کے مطابق ان میں اتنی طاقتیں پنپاں ہوتی ہیں کہ وہ جب چاہیں مینہ برسا دیں، اولاد پیدا کر دیں، لڑائی میں فتح دلا دیں اور آئندہ کے حالات بتا دیں۔ حکیم جادو نہیں کرتا لیکن مصیبت زدہ اور بیمار کو دیکھ کر وہ تباہ و تباہ کی حالت کی بھاری اور مصیبت کا باعث کون سا جادوگر ہے وہ پوچھنے لگتا ہے کہ طبیعت کبھی بدلتا ہے اور دوا ساز بھی اتنے چند عجیب و غریب

سے زیادہ نہیں تباہ جاتا۔ پیٹ اور سر بہت بڑے اور پاؤں مڑے ہوئے  
تہائے چلتے ہیں۔ یہ خبیث رو جس ہر قسم کے کام کر سکتی ہیں اور سولے اپنے  
آٹکے کسی کو نہیں نظر آتیں۔

لیسن خاندان کے علاوہ کیونکہ خاندان کے جادوگر بھی بہت طاقتور مشہور  
ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان سے ضرور مدد لی جاتی ہے۔ کوئی شخص گر پڑتا ہے  
تو جب تک خاندانی جادوگر آکر اسے نہ اٹھائے اس کا اٹھنا محال۔ کوئی غصہ  
کی حالت میں اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دے تو جب تک جادوگر آکر ایک بجے  
کی قربانی اپنے سمنے نہ کر دے بیٹا گھر میں واپس نہیں آسکتا غرض چھوٹی  
سے چھوٹی باتوں میں بھی جادوگر کی امداد کے بغیر نہیں۔ کیلے کا پودا ان  
کے یہاں بہت مقدس مانا جاتا ہے۔ کوئی دانستہ یا نادانستہ کسی کیلے کے پودے  
کو کوئی نقصان پہونچا دے تو جادوگر کے سمنے قربانی کرنی لازمی ہے۔

عشق و محبت کے معاملات میں بھی جادوگر کی مدد لی جاتی ہے۔ لوفرنا  
ایک شخص ایک ایسی لڑکی پر عاشق ہے جسے اس کا بالکل خیال نہیں۔ تو  
وہ جادوگر کے پاس سے ایک مخصوص درخت کی جڑیں لاکر تمباکو میں ملا تاؤ  
پتی ہے۔ تمباکو پیٹے وقت وہ گاتا جاتا ہے۔ ”مجھے تم سے کیسی محبت ہے، آ  
طاقت دے کیا مجھ سے بھی ایسی ہی محبت کی جائیگی؟“ اس عمل کے بعد وہ  
لڑکی اس پر مہربان ہو جاتی ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے لئے ایسا ہی عمل  
کرتی ہیں۔ ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت ہوتی ہو ورنہ گمان غالب تو یہ

ہے کہ یہ جادوگر کے اثرات کی کارسازیاں ہوتی ہیں۔  
جب کوئی جادوگر آئے مکے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنی چاہتا  
ہے تو وہ بھی نہیں کے ایک کھوکھلے سیگ میں کچھ ٹکڑیاں ڈال کر پٹا ہے  
پھر انہیں پیچھے کر اگر گویا یہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان ٹکڑیوں پر  
کیا لکھا ہے۔ لیکن جادوگر شہد کی شہر اب خوب شکم سیر ہو کر پیتے اور  
نشہ میں مست ہو کر آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کر کے لگتے ہیں  
مسائی اور نادادی خاندان نے جادوگروں کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ وہ  
ان کھوپڑیوں نے ذریعہ سے پیشین گوئی کرتے ہیں جو ہمہ وقت ان کے  
پاس رہتی ہیں۔

۱۸۹۵ء کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک انگریز جمیل وکٹوریہ نیازیہ کے قرب  
دہوا میں تعیم تھا۔ رات کے وقت اس کے قلیوں نے شور مچانا شروع کیا۔ ان  
قلیوں میں کچھ جادوگر بھی تھے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ بہت دور  
جنوب میں بقیہ نام لوگ لڑتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ انگریز نے یہ قول سچ و  
اور تائید نہ کیا۔ نہ کر لیا اور جب وہ جذب دنیا میں واپس آیا تو اسے اسی  
تاریخ اور وقت میں تین تین کے ڈاکے کے حالات معلوم ہوئے۔

یہ بیچم اور جادوگر تعلیم کے بہت مخالف ہیں غالباً اس لئے کہ عام  
تعلیم سے خود ان کی اہمیت کم ہو جانے کا احتمال ہے۔  
شیر مار ہروی

# اگر آپ

کا وہ محرکہ آرا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء جو پچھلے مہینہ جہازی سائز پر نہایت آب و تاب سے  
شائع ہو چکا ہے بالکل مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال کیلئے عالمگیر کی خریداری  
قبول فرمائیے اس صورت میں آپ کو دسمبر میں شائع ہونے والا عظیم النظم خاص نمبر بھی مفت ملے گا۔ سالانہ خریداری  
میں ہر حال آپ کا فائدہ ہے قیمت سالانہ صرف چار روپے چار آنے للہر علاوہ محصول ڈاک،  
نوٹ۔ عالمگیر بارہ تیرہ سال پہلے خریداروں کی خدمت میں دو خاص نمبر (دسمبر جون) مفت پیش کرتا ہے اور  
یہ کہ یہ خاص نمبر دو ماہ کی مشترکہ اشاعتوں پر مشتمل نہیں ہوتے۔ بلکہ جس ماہ کا خاص نمبر ہوگا اسی ایک ماہ کا رسالہ منظور ہوگا۔  
مینڈا۔ مینجر رسالہ عالمگیر لاہور،

# کلامِ عزا

جناب ڈاکٹر اعظم صاحب کرلوی سابق ایڈیٹر اکبر

یہ میری وفا جذبِ محبت کا اثر ہے  
 ہے کشتی ہستی مری دریائے فنا میں،  
 پہلی سی نہ وہ الفت نہ وہ اگلی سی غایت  
 کیا پڑ گئی افنا دکستاں پہ الہی،  
 جلنا ہو تو جل جائیں سب زرمِ تنگے  
 بن بن کے جو گھڑے وہ ہے تقدیر ہماری  
 میں نیخبر دہر ہوں ایسا نہ سمجھنا  
 انگریزائیاں لیکر اٹھے سب زرمِ طربے  
 یہ بیخودی عشق کی تاثیر تو دیکھو!  
 بجھتی ہوئی میں شمع ہوں ڈھلتی ہوئی میں چپ  
 کس نے نگہ شوق سے دیکھا مجھے اعظم

وہ دھونڈتے پھرتے ہیں کہ دیوانہ کدہ ہے  
 امواجِ بقا کو نہیں ساحل کی خبر ہے  
 قسمت کی طرح مجھ سے پھری تیری نظر ہے  
 ہر شاخ میں پڑ مروہ جو ہر برگ شجر ہے  
 ہمان کوئی دم کی بس اب شمع سحر ہے  
 بل بل کے جوڑ جائے تمھاری وہ نظر ہے  
 عالم سے الگ رہ کے دو عالم کی خبر ہے  
 کچھ نیند ہے آنکھوں میں تو کچھ مئے کا اثر ہے  
 آماز میں مچھکو نہیں انجام کا ڈر ہے  
 انجام زمانے کا مرے پیش نظر ہے  
 مضطر جو مراد دل سے تو تیباب جگر ہے

# آخری منازل

مترجمہ ابوسعید صاحب قریشی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ہولی۔ ایک کمزور بچے کی طرح بوڑھا اپنی جگہ پر دستور بیٹھا تھا۔ اس کی کمزور آنکھیں اسے دیکھ نہ سکتی تھیں۔ مگر اس کے پاؤں کی چاپ اسے دستور سنانی دے رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ چشم بخیل سے اسے جاتے ہوئے دیکھ سکے۔

گوشت صاحبزادیوں کے مکان کے سامنے صدر بازار کے کٹر پر پہنچتے ہی بڑھیا اپنی آنکھیں کھولے چت سے زمین پر گر پڑی۔ گرتے وقت یار نے سے پہلے اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہ نکلی۔ یہ دیکھ کر ایک راگبر کھڑا ہو گیا اور ایک چھوٹی لڑکی بھاگتی ہوئی آپہنچی۔ یکے بعد دیگرے بہت سی عورتیں اکٹھی ہو گئیں جو اسے اٹھا کر ایک دکان میں لے گئیں۔ دیکھا تو وہ مر چکی تھی۔

لوگ گھروں سے نکل نکل کر دکان اور اس کے آس پاس جمع ہو گئے اسے تین کرسیوں پر لٹا دیا گیا۔ یوں زرد اور پتھرائی ہوئی لوگوں کو وہ ایک ایسی عورت کی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ جسے انھوں نے کبھی دیکھا تھا۔

”بوڑھے کو اطلاع دینی چاہئے“ کسی نے کہا۔

”نہیں! اسے نہیں..... اس کی بہو کو کہہ دیا جائے۔“ ادھر کھڑی ہے نا وہ۔۔۔۔۔ اری مارگریٹ!“

مارگریٹ بد شکل تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کا پیشہ کپڑے دھونا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ہاتھوں پر کھوتا ہوا پانی گر گیا تھا جنہیں اب وہ گھریلوں کی طرح لٹکائے ہوئے تھی۔

وہ اپنی ساس کی لاش کو دیکھ کر کانپ اٹھی۔ عرصہ ہوا کہ اس کا خاوند مر چکا تھا جسے اب وہ قریب قریب بھلا بھی تھی مگر اب اس کی یاد پھر تازہ

دونوں کی مجموعی عمر کوئی ڈیڑھ سو برس کے قریب تھی۔ لیکن انھیں اپنی الگ عمر کا حساب نہ تھا۔ انھوں نے بہت دت سے یہ حساب لگنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہاں انھیں اتنا ضرور معلوم تھا کہ ہر سال دونوں کے مجموعی عمر میں دو سال کا اضافہ ہو جایا کرتا ہے۔

انھیں اپنی دھقانی جھونپڑی میں رہتے ہوئے کئی دن ’کئی موسم‘ کئی سال گزر گئے تھے۔ یہ بات ان کے لئے سخت تعجب نہیں ہوتی اگر کسی نے ان سے یہ کہہ دیا ہوتا کہ وہ ابھی تک بیاہے نہیں گئے تھے۔ اپنے مانی کا صرف ایک دھندلا سا عکس ان کے دماغ میں محفوظ تھا۔ ان کے تعلقا بھائی بہن سے کچھ زیادہ تھے۔ جب گاؤں کے لوگ اس خیف مگر آپس میں وابستہ جوڑے کو دیکھتے تو یہ کہتے بغیر نہ رہ سکتے کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی مر گیا تو دوسرا بھی اس کے بغیر زندہ نہ رہے گا۔

سرمہ اس بوڑھے جوڑے کے لئے بہت سخت ثابت ہوا۔ اس تند موسم نے ان کی صحت پر بہت برا اثر کیا۔ ان کو کمزور زیادہ جھک گئیں۔ گالوں کے گڑھے زیادہ گہرے ہو گئے اور جڑے بال نکل کر زور ہو گئے۔ بوڑھے کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا اور بڑھیا کو چکر آنے شروع ہو گئے۔ مئی کے مہینہ میں انھیں یہ محسوس ہوا کہ نہ تو انھیں صوبہ میں پہلے ایسا طوفان آتا اور نہ سلے میں۔ بس یہ سمجھئے کہ ان کی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی۔ جمع سے شام کرنا محال ہو گیا۔

ایک روز جبکہ بوڑھا اپنے جھونپڑے کے سامنے پہلے سے کچھ زیادہ خفا ہو بیٹھا تھا تو بڑھیا خرگوشوں کے لئے گھاس لانے چلی۔ بارشیں لگے، ہوئے دروازے کے پاس پہنچتے ہی وہ دم لینے کے لئے ٹھہر گئی۔ یہ سفر کی پہلی منزل تھی۔ تھوڑی دیر نہ کہ وہ سفر کے کنارے

ہو گئی۔ اس کے ہونٹ سفید پڑ گئے، اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے  
بوزے چہرے پر پریشان نظر آرہی تھیں۔ اس نے اپنی ناک دپٹے  
سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”آہ باغریب بڑھیا!“

”وہ لوگوں کی طرف مڑی اور کہا۔۔۔۔۔ بوزے کو تم لوگ مت  
بتلاؤ، میں خود اسے اطلاع دیدوں گی۔“

مارگریٹ لاش کو اٹھا کر اپنے کمرے گئی اور کمرے کو ٹھیک ٹھاک کر کے  
وہ بوزے کو اطلاع دینے چل پڑی۔ بوزہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا انتظار  
کر رہا تھا۔

تمام لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

چوبی دروازہ کے بند ہونے کی آواز نے بوزے کو چونکا دیا۔

”میں ہوں“ مارگریٹ نے کہا۔ بوزہ پھر بت بن کر بیٹھ گیا۔ ”چلو  
دکڑا اب اندر چلنا چاہئے“

وہ اٹھا اور اپنے ہاتھ آگے کو بڑھا کر تھوڑا سا جھکا۔ اس کی آنکھوں  
میں کچھ چمک رہا تھا۔

”کیوں کیا دیکھ رہے ہو؟“ مارگریٹ نے دریافت کیا۔

”مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ بالکل کچھ نہیں“

”آہ؟“ مارگریٹ کے منہ سے صرف یہی نکل سکا۔ اس کی روحانی ماڈگی  
اسے ہر طرح کے مدد سے برداشت کرنے کیلئے تیار کر دیتی تھی۔ اس نے آرام  
سے اس بوزے کا بازو پکڑ لیا۔ جو عین اس وقت اپنی بصارت کو چمکاتا  
جب اس کی رفیقہ حیات نے دم توڑا تھا۔

مارگریٹ اسے سہارا دیتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئی بوزے نے  
اپنے ہاتھ سے کرسی کو ٹولا اور بیٹھ گیا۔ اس کا سانس تیزی سے  
چل رہا تھا۔ مارگریٹ اسے خبر سنانے ہی والی تھی کہ اس نے  
ایک آہ بھری اور کہنے لگا۔

”بس اب تو ختم ہو چکی ہیں۔ میری آنکھیں۔“

کئی گھنٹوں تک وہ افسوس کرتا رہا۔ تھوڑے وقفہ کے دوران میں  
اس نے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا۔

”بوزہ کیا کہتا ہے آخر وہ کیا کر رہی ہے؟“

مارگریٹ سمجھ گئی کہ اسے ہوش آگیا ہے اور وہ اپنی بیوی کا انتظار  
کر رہا ہے۔ یہ پوچھ کر وہ پھر اپنی بیاری کا گھ گھ کرنے لگ گیا۔

بہت سے لوگ آئے۔ بعض مکان کے اندر چلے گئے اور بعض کمرے  
سے جھانک کر لوٹ گئے مگر بڑھیا کی موت کی خبر پہنچنے کی کوئی بھی جرات  
نہ کر سکا۔ جب دن اسے یونہی بغیر اطلاع دیے گزر گیا تو کسی کو  
بھی آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

مارگریٹ تھوڑے تھوڑے عرصہ کیلئے بوزے کو بند کر کے باہر چلی جاتی  
اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وہ پھر بڑھیا کی لاش کو دیکھنے لگی۔ لاش  
تاریکی میں چھپی ہوئی تھی حالانکہ وہاں دو تین بوشن تھیں۔

یہاں سے جا کر وہ گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئی۔

”مکان سے چورادہر ادھر ادھر دڑتے ہوئے اسے سب چیزوں کا خیال  
آ رہا تھا۔ اسی اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مرگ پر کیا ہوگا۔ بد قسمتی سے  
اسے اس چیز کا تجربہ حاصل تھا۔

ایک بار وہ پھر بوزے کو کمرے کے پاس لگئی۔ ابدات کے وقت اس  
کے غم میں کچھ افادہ ہو گیا تھا۔ مارگریٹ نے سپرٹ لیمپ جلا کر آئینہ  
پر رکھ دیا۔ اور آپ تہ ہوا میں کاپتی ہوئی تہی کی طرح لڑناں۔۔۔۔۔ زرد  
اور بیجان سی بوزے کے سانسے کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے بڑھیا کی موت کی خبر  
سنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا سر جھک گیا۔ اپنی تمام طاقت جمع کرتے  
ہوئے (جیسے بکارنا چاہتی ہو) اس نے تلاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”وہ  
اب نہیں آئیگی!۔۔۔۔۔ وہ نہیں آسکتی۔۔۔۔۔ وہ ہمیشہ کیلئے جا چکی ہے  
بوزے سے اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ سو رہا تھا۔ اور

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ خاموشی سے کمرے کی چیزیں قرینے سے رکھنے میں مشغول ہو گئی۔  
یہ ایک بوزہ ہلا اور ساتھ ہی اس نے مارگریٹ کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ  
۔۔۔۔۔ سنو بڑھیا آگئی ہے۔ میں نے اسے ابھی وہاں دیکھا تھا جہاں تم  
کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا کہ دفعہ مجھے معلوم ہو کہ وہ آگئی ہے۔ اس نے کمرے  
کی تمام چیزوں کو قرینے سے رکھا اور چلی گئی۔ سنو! اسے یہ معلوم  
نہیں ہونا چاہئے کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ اسے یہ سن کر بہت تکلیف ہو گی  
دیکھو جب تک مجھے آرام نہ آجائے اسے کہیں مجھ کو ادو۔۔۔۔۔ ہاں ضرور“



کوئی ڈکونی طریقہ نکالو۔۔۔ سنا میری بھی؟۔۔۔

وہ اپنی جگہ پر ہلا۔ کرسی چنچ چنچ کر گئی تھی۔ مہنی معلوم ہوتی تھی۔  
”اے لے جاؤ۔۔۔ لے جاؤ۔۔۔ اے کدو کہ وہ کھنڈی دیر کیلے پائی

جلے۔۔۔ اے لے جاؤ۔۔۔“

”بت اچھا دکھڑے میں اس کا خیال رکھو گی۔ میں اسے معلوم نہیں کچھ  
دو گی؟ مارگریٹ نے قسم کھاتے ہوئے کہا۔

قسم نے بوڑھے پر بہت اثر کیا اور وہ یہ کہتے ہوئے چپ ہو گیا۔ تم  
بہت اچھی لڑکی ہو؟“

دوسرے دن مارگریٹ نے بوڑھے کا ایک عجیب غریب من گھڑت کہنا  
سنادی کہ بڑھیا کو اس کے رشتہ دار لگے ہیں۔ ”بوڑھا بچوں ایسی کپڑی

سے سن ہاتھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ ہیں۔ گزشتہ رات جب  
میں سو رہا تھا تو پھر آئی تھی۔ میں نے اسے آتے سنا تھا۔“

”ہاں وہ آئی تھی۔ مارگریٹ نے اہستہ سے کہا۔ اسی طرح دور

گزر گئے۔ تیسرے دن جب بڑھیا کی تجسیر ٹھنسن ہو چکی تو ڈاکٹر بونہ سے کو  
دیکھنے آیا اس نے یہ غیر متوقع رائے دی۔ ”بخار تو اب اتار چکا ہے۔ مہنی

بھی نہیں رہی۔ کل تک یہ دیکھنے لگ جا لیگا۔“ وہ گھبرائی ہوئی کہے کے  
کوٹے میں جا چکی۔ ”کل، کل، ہاں۔۔۔ کل۔۔۔“

اپنی رنج کی تاریکیوں میں ایک بار پھر اس نے دہرایا۔ ”کل۔۔۔ کل۔۔۔“  
کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا لیکن اس وقت واقعی اندھا ہو گا۔ اس لئے کہ

وہ بڑھیا کو نہ دیکھ سکیگا۔ کل مارگریٹ کی ہنسی سے سرزنش کر گئی کہ وہ خاموش  
کیوں رہی اسی طرح جس طرح اس کی ہنسی نے اسے بوڑھے کو غم کی خبر سنانے پر

طاقت کی جوتی۔۔۔ جب انجام خراب ہو تو ہمیشہ فردا ہوا کرتا ہے  
اور پرسکون یا امید افزا دن جس کے ہم کسی مالک ہوتے ہیں ہمیشہ دوسرے  
دن کے اختتامی حصے پر واقع ہوتا ہے۔

## نظر محبت

دوست! مجھے دنیا کی ہر ایک شے سے تو زیادہ حین اور پیارا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت جبکہ تو محبت بھری نظروں  
سے میری طرف دیکھتا ہے۔۔۔

میرے محبوب! مجھے کائناتِ عالم کی تمام دلچسپیوں سے بڑھ کر تو دلکش اور دلغریب نظر آتا ہے۔ جس وقت تیرے  
حین تھکے میری سوئی ہوئی آرزوؤں کو جگا دیتے ہیں۔۔۔

میرے عزیز دوست! تیری محبت بھری نگاہیں مجھے اس عالم سے بیخبر بنا دیتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے میں ایسی جگہ جاتی  
ہوں جہاں کے گلزاروں میں خزاں کے تہ جھونکے نہیں چلتے۔ جہاں خورشید محبت کبھی غروب نہیں ہوتا۔ جہاں محبت کا دریا جاری  
دساری ہے۔ جہاں کی ہوائیں بوئے گل سے معطر ہوتی ہیں۔ ہاں ایسی جگہ جہاں محبت کی فتح ہے۔۔۔

پیارے! جب کبھی تو میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو میری مسرتوں کا کھکانا نہیں رہتا۔۔۔

میرے دوست! تیری محبت بھری نظریں میری روح کی گہرائیوں کو بھی پر نور اور روشن بنا دیتی ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم  
ہوتا ہے کہ تو آکاش کے دکنے ہوئے ستاروں سے بھی زیادہ نور ہے۔ تیری بھولی صورت جنت کے مقدس فرشتوں سے

بڑھ کر تقدس آمیز ہے۔۔۔۔۔ اور تیری محبت بھری نگاہیں مجھے جنت کے کوثر و سلسیل سے زیادہ اچھا بادہ محبت پلاتی  
ہیں۔۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ شیریں اور زیادہ سے زیادہ لطیف۔۔۔

شکیلہ اختر،

# جذباتِ تبسم

جذبِ کامل نے رہنمائی کی،      ذرتے نے ہر تک رسائی کی،  
 کس قدر جذب ہے محبت میں      کھینچ کے آئی جفا خدائی کی۔  
 دے گئی ہے خبر سحرِ رو کر      نالہ شب کی نار سائی کی۔  
 سر و ہنگامہ حیا ل ہوا،      بچھ گئی شمع آشنائی کی۔  
 ان کی مشقِ رستم ہے جامِ بقا      طرح ڈالوں میں کیوں لڑائی کی۔  
 باتوں باتوں میں یوں بگڑ جانا      ہے سزا خوب لب کشائی کی۔  
 حشر میں بے حجاب دکھیں گے      جان قیمت ہے رونبائی کی۔  
 دردِ کتنا رہا میں سستا رہا،      داستاں ان کی کج ادائی کی۔  
 شامِ فرقت ہوئی کہ صبحِ امید      جس نے کی مجھ سے بیوفائی کی۔  
 رازِ حسنِ طلب سمجھ نہ سکا،      عشق نے عمر بھر گدائی کی۔

خندہ زن اس پہ ہے چمن کا چمن

تبسم قرشی گجرات

کیا تبسم نے کچھ بُرائی کی

# خوابِ افسانہ

جناب لطیف انور صاحب گوہر دہلوی

تمنا زاد عزیز ملاقاتی کمرہ میں صرف گفتگو تھے جب تنا زاد داخل ہوا  
تو دونوں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

تمنا زاد — صرف تمہاری کمی تھی۔

عزیز — اب پوری ہو گئی۔

تمنا زاد — شکستہ!

تمنا زاد — لیکن دوست! آج تمہارے چہرہ پر غیر معمولی ہنسی کے آثار نمایاں ہیں۔

عزیز — ہاں! بالکل آج بیکر صاحبہ ہر بانی سے ہنسی آئی ہوئی۔

تمنا زاد — تمہارے خیال میں.....

تمنا زاد — گویا تم کو یہ نعمت کبھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

عزیز — اور اس غیر معمولی ہنسی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

تمنا زاد — اہا! جب میں نے اپنی ہنسی کا اہل سبب بتایا تو تم لوگ اسے  
سن کر یقیناً محفوظ ہو گے۔

تمنا زاد — ممکن ہے ہمارا قیاس درست ہو۔

عزیز — کہئے ہم اسے نہایت اطمینان سے سنیں گے۔

تمنا زاد — ملاحظہ — واقعی اس کا چہرہ چاند کے مانند تھا۔

تمنا زاد — میرا ہنسی کا بازو تمام تیار ہے اور پوچھتا ہے: وہ کون تھی؟

عزیز — اہ! کسی حد تک تم کو نہ معلوم ہو۔ اہ! یہ؟ کتنا پیارا نام ہے؟

تمنا زاد — اگر قطع کلام کا یہی علم ہوتا تو میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گا۔

تمنا زاد — عزیز! ہم زبان ہو کر پکارا کرتے ہیں۔ نہیں دوست! اب ہم

خاموش رہیں گے تم کہے جاؤ۔

تمنا زاد — یہ میں نہیں تباہ کتا کہ میں اہ! یہ کس طرح ہو چکا لیکن اس

علاوہ مجھے ذرا دقت یاد ہے۔

جب سامرخ نے مجھے دیکھا تو وہ بڑے اشتیاق سے میرے استقبال کیلئے بڑھی  
مجھے اپنی نشست گاہ میں لگائی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دقت رفتہ  
میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ لیکن جب اس نے مجھے افسردہ آنکھوں  
پیش کیا تو میں بالکل مطمئن ہو گیا۔ اجنبیت دور ہونے لگی۔ یہ راز میں اب  
تک نہیں سمجھ سکا کہ اس افسردہ آنکھوں نے میرے تمام غدشات کو کیونکر مٹا دیا  
اس کے بعد اس نے مجھ سے مندرجہ ذیل سوالات کئے۔

ماہ رخ — اب تو جی نہیں گھبراتا ہوگا؟

میں — نہیں جناب! اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

ماہ رخ — آپ کو دورانِ سفر میں بہت سے مصائب دوچار ہونا پڑا ہوگا۔

میں — لیکن میں نہیں جانتا کہ میں یہاں کس طرح پہونچا ہوں؟

ماہ رخ — ہمارے یہاں کوئی حکومت نہیں ہے۔ ہر شخص آزاد ہے

جس طرح کسی کا جی چاہے زندگی بسر کرے ہر کوئی خود اپنا ذمہ دار ہوتا

ہے اس لئے آمد و رفت کا کوئی مستقل ذریعہ موجود نہیں ہے۔

میں — پھر تو یہاں بہت سی غیر ضروری پریشانیاں ہوتی کیونکہ حکومت

کے بغیر زندگی محفوظ نہیں ہو سکتی۔

ماہ رخ — (مسکراتی ہے) تمہارا خیال غلط ہے۔ ہم بڑے اطمینان سے زندگی

گزارتے ہیں ہم مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں

یہاں مصیبت باہمی عداوت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان کی پیداوار

کے اسباب ایسے ہیں جن کا ہم کی اسناد نہیں کر سکتے۔

میں — مثلاً؟

ماہ رخ — موسم کا تغیر، جنگلی دندے، زہریلے کیڑے وغیرہ

میں — آپ کے ملک کا نام کیا ہے؟



# نامیدی میں امید

جناب محمد اختر صاحب صفی پور

۳۱ مئی ۳۵ء کی شب کو جبکہ بادی کے خوفناک اثر ہوں کی پھکارا ہوا ایک شخص کے جسم کو لپکپکا رہی تھیں جس شب کو برباد کن زلزلے نے شمالی مغربی ہندوستان کے کئی شہروں کو اینٹ اور پتھر کا ڈھیر بنا دیا تھا محمود اپنے نرم نرم بہتر پر پڑا خواب فوشیں کے مزے لوٹ رہا تھا چونکہ محمود بہت ہوشیار سونے کا مادی تھا اس لئے پہلے ہی جھٹکنے سے بیدار کر دیا اس کی نظر سب سے پہلے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر پڑی جو اس وقت تین بج رہی تھی محمود اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اس کو ہلکے ہلکے محسوس ہو رہے تھے گویا زمین کی بجائے وہ سمندر پر ہے اور چھوٹی چھوٹی لہریں اسے ادھر سے ادھر لہا رہی ہیں۔ محمود ابھی اپنے حواس ہی مجتمع نہ کرنے پایا تھا کہ اس نے یکایک باہر کی جانب کسی بڑی عمارت کے گرنے کی آواز سنی۔ اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ واقعہ معلوم کرنے کے لئے اپنے بستر سے کود کر گھڑی کی جانب بھاگا۔ محمود ابھی وہاں تک پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ بجلی کی روشنی جس سے شہر کو نہ بقیہ نور بنا ہوا تھا یکایک غائب ہو گئی اور تمام شہر کو اندھیرے نے اپنے دامن میں ملفوف کر لیا۔ اب محمود کو محسوس ہوا کہ یہ آفت ناگہانی ایک سخت زلزلہ کی رہیں منت ہے۔ اس وقت زلزلے کے جھٹکے جلد جلد اور شدت کے ساتھ آ رہے تھے جنہوں نے ایک خوفناک قسم کی گڑگڑاہٹ میں مل کر ہر شخص کے اوسان خطا کر دیے محمود نے بجلت اپنے لباس خرابی کے اور ایک گون پہنا سہانے سے پستول اور قریب کی میز پر سے ٹاپچ اٹھا کر اپنے بیٹگلے سے نکل کر میدان کی طرف بھاگا۔ باہر نکل کر اس کو اس آفت ناگہانی کا کچھ اندازہ ہوا جو کوئٹہ پر نازل ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جو کچھ عرصہ قبل اپنے بستروں پر پڑے غفلت کی نیند سوئے ہوئے تھے اب بدحواسی کے عالم میں نکلے

سر دنگے پر میدانوں میں جمع ہو رہے تھے۔ ہر طرف شورشیں اور نالہ و بکا کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ محمود جس طرف ٹاپچ کی روشنی ڈالتا۔ سوا گری ہوئی عمارتوں کے اینٹ و پتھر کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ غلبہ عمارتیں جو کچھ ساعت قبل آسمان سے گھڑی باتیں کر رہی تھیں اس وقت زلزلے کے جھٹکوں کے ساتھ پاش پاش ہو کر گر رہی تھیں۔ اس وقت محمود کا دل خوف و وحشت کی آماجگاہ تھا۔ اور موت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتی دکھائی دیتی تھی۔

محمود ہنوز بحر استغراق سے ماحول ہوش و حواس پر پونچنے بھی نہ پایا تھا کہ جگر کے خیال نے اس کو بڑا یا۔ بجز محمود نے ایک ہی ماحول میں اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ گزارا۔ انٹرنس تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ انٹرنس کے بعد محمود نے کلج میں نام لکھایا تو مجھے جو اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد باپ کے پاس رہتی تھی اپنے خاگی امور کی دیکھ بھال شروع کی۔ قدرت کا ملنے حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی کے بھی وہ وہ جو ہر عطا کئے تھے جو ظلم کی صیقل پر چرمنے کے بعد چمک اٹھے اور ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ محمود جو بچپن سے بجز کا گرویدہ تھا اب اس کا پرستار بن گیا۔ بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد محمود نے حصول ملازمت کے لئے کوئی ذیقہ اتحاد رکھا لیکن ناکامیابی اور نامرادی ہر جگہ استقبال کے لئے موجود تھی جن بڑے لوگوں کی ذات سے اب تک اس کی امیدیں وابستہ تھیں انہوں نے بھی صاف جواب دیدیا۔ اب محمود کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ قانون کی ڈگری لینے کے بعد وکالت شروع کرے۔ محمود کا کلج کھلنے کے انتظار میں اپنے مکان پر تھا جبکہ ۳۱ مئی ۳۵ء والے زلزلے نے ہزاروں خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

مجھے بپ کی کوٹھی شہر کے دوسرے کنانہ پر قریب تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ اگر اس وقت وہاں پہنچنا انسانی طاقت میں ہے تو مجھے ضرور پہنچنا چاہیے۔" محمود نے خود ہی کہا۔ لیکن ہذا انخواہستہ اگر مجھے .... یہ کہتے کہتے اس کی زبان رگ گئی۔ دل امید یاس کا غزن بن گیا لیکن مجھ کی محبت نے ایک بار پھر اس کی ہمت مردانہ کو اکسایا۔ محمود جانتا تھا کہ مجھ کا بپ کراچی آگیا ہوا ہے اور اس وقت صرف مجھ ہی تنہا کوٹھی میں ہے، محمود کو دواہمہ عجیب عجیب خیالات اس کے دل میں پیدا کر رہا تھا کہ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ انتہائی پریشانی میں محمود کو مدد کیلئے بجا رہی ہے اب خود فکر اس کے حیطہ امکان سے باہر تھا۔ محمود مجھ کی کوٹھی کی طرف بھاگا۔ اس وقت چاند اپنے زرد اور معصوم چہرے کے ساتھ بام فلک پر بکھرا اس شہر کی بربادی پر اشد حسرت برسا رہا تھا جو کچھ دیر قبل خوبصورت باغات، عالی شان کوٹھیوں اور حسین تفریح گاہوں کا غزن تھا۔ محمود چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھ کی کوٹھی کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں جا بجا اینٹ اور پتھر کے ڈھیروں نے آمدورفت کو مسدود کر دیا تھا لوگ شب خوابی کے کپڑوں میں بلوس۔ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں ہائے پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ معصوم بچوں کو خون آلود مٹیائیوں کے ساتھ اپنے ماؤں کے سینوں سے لپٹا ہوا دیکھ کر محمود کو یارائے ضبط نہ رہا اور اس کے آنسو نکل پڑے۔ کوئی شدت تشنگی سے جاں بلب، کسی کے جسم کا خون دہان زخم سے بہہ سکا اس کو نیم مردہ کر چکا تھا۔ وہ عورتیں جو سوتے وقت لاکھوں کی مالک تھیں۔ جن کے اشارہ چشم پر خادما میں ڈرتی تھیں جس وقت ان کو فناء اور غارت کے چکروں نے ہوشیار کیا تو فقیر بن کر میدان ہوئیں۔ نہ اس وقت وہ خادما میں تھیں اور نہ روپیہ۔ جسم کے کپڑے ان کا مل سرمایہ تھے۔ جن کے دسترخوانوں کے پس خوردہ سے کتوں کے روزانہ پیٹ بھرتے تھے آج وہ ایک ایک دانہ کے لئے دوسروں کے دست نگر تھے۔ ان کے دارتوں اور سرتاجوں کو ان سے چین کر گردش زمانہ نے اس دنیا کے ناپید اکنار سمندر میں بے یار و مددگار چھوٹے کھلنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا تھا۔ محمود یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن مجبور تھا۔ وہ فور محبت اور جذبات انسانیت سے اس کا کلیہ بچھا جاتا تھا لیکن لاچار تھا۔ اس وقت قیامت صغریٰ قائم تھی، ہر طرف نفسی نفسی کا شور تھا۔ محمود نے بہت کوشش کی کہ ان مصیبت

کے ماروں کو کسی جائے امن تک پہنچا دے لیکن اس بگھاڑے رستخیز میں ان کی ستا ہی کون تھا۔ وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ مجھ کے خیال نے اس کو پھر چڑھایا۔ محمود جلدی جلدی مجھ کی کوٹھی کی طرف کھنڈرات سے گذرتا طبع کے ڈھیروں کو پھانڈتا چلا جا رہا تھا کہ ایک بڑے مجمع سے اس کا گذر ہوا جو بازار کی تنگ گلیوں میں ہو گیا تھا۔ اس وقت قومیت اور شخصیت کا امتیاز بالکل مفعود ہو گیا تھا۔ برہمن اپنے سرمایہ کی حفاظت کی خاطر بنگلی اور بھاروں سے اور چار ڈھنگی برہمنوں سے دست و گریبان تھے۔

"کیا یہ لوگ لوٹ مار کر رہے ہیں؟" محمود نے کہا۔ "ایسا ہونا بھی کیا غیر ممکن ہے؟" پھر خود ہی جواب دیا۔ محمود جانتا تھا کہ اس طبع کے بچے سونے اور چاندی کے ڈھیر ہیں کیونکہ کل ملک بہت ملد بازار بگھا جاتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ابلانے ملک بنکوں سے کس قدر خائف رہتے ہیں۔ اس وقت محمود کو اپنی وہ دس ہزار کی رقم یاد آئی جو اس نے مجھ کے باپ کے پاس بطور امانت کے رکھی تھی۔ محمود کو یقین ہو گیا کہ اس پر آلام اور آفات کا ایک پہاڑ پھٹ پڑا روپیہ ملنے کی اب کوئی امید نہیں اور مجھ کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔" مجھے روپیہ جانے کی کوئی پرواہ نہیں ہے مگر اے میرے مالک مجھ مجھے مل جائے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محمود اسی ادھیر بن میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک گیسے ہوئے مکان میں کچھ لوگ جمع ہیں اور ایک بڑے لوہے کے سیف کو کھونٹے میں منہک ہیں۔ محمود کے پوچھتے پوچھتے سیف کھل گیا اور نوٹوں کے بڈل کے بڈل اور طلائی زیورات اس میں سے نکل کر پھیل گئے۔ مثل جھکے کتوں کے وہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے محمود نے اپنا پستول نکال لیا اور سب کو اپنے ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دیدیا۔

مجموع نے محمود کی طرف دیکھا اور جب اس کو سر پر پستول لئے ہوئے پایا تو سبکے حواس غائب ہو گئے۔ صرف ایک شخص نے پیچھے ہٹنے سے انکار کیا اور پاس پڑے ہوئے نوٹوں کے بڈل پر جھپٹا لیکن قبل اس کے کہ وہ ان کو اپنے قبضہ میں کر سکے پستول کی ایک گولی نے ہمیشہ کے لئے اس کو خاموش کر دیا۔ محمود نے جلدی جلدی نوٹوں اور زیورات سے اپنی گون کی جیبیں بھر لیں۔ زیورات اگرچہ مرصع ہیں مگر سب سے اکر

محمد نے ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا: "بہر حال میرا کوئی ردِ پیہ کا نقصان نہیں ہوا۔" محمد نے کہا: "ادھر گیا ادھر آیا؟"

محمد پھر غم کی طرف بھاگا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا غم کے طے سے اس کو ادھر زیادہ ناامیدی ہوتی جاتی تھی۔ محمد ابھی تھوڑی سی دور گیا ہو گا کہ ایک زخمی ہنس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر محمد سے امداد کی درخواست کی۔ محمد وہ تو نیم کھ سکا کہ وہ کتسا کیا ہے لیکن اس کا مطلب ضرور سمجھ گیا، بڑھنے ایک لمحہ کی طرف اشارہ کیا اور دونوں نے جلدی جلدی اس کو ہٹا کر شروع کیا۔ آخر بدلت دونوں نے ایک عورت کو جو اپنے سینہ سے ایک چار پانچ مہینہ کے بچے کو لٹائے ہوئے تھی آہستہ آہستہ خاک و خون میں شرب اور طبع کے پیچھے سے نکالا عورت غریب تو ہلکی ہلکی سانس لے رہی تھی لیکن بچہ کا حائر روح قفسِ غصہ سے پرداز کر چکا تھا۔ یہ دیکھ کر غریب بڑھے کی بقراری۔ اف محمد کا دھور غم سے کیجی بچہ جاتا تھا۔

محمد یہاں سے آنسو پونچھتا پھر دیارِ محبوب کی طرف بھاگا۔ غم الم نے اسے مینوں کا بیار بنا دیا تھا۔ چہرے سے دشت برس رہی تھی۔ یاس و حرمان، رنج و غم اور دشت و پریشانی نے اس کے حواسِ محسوس کر دیئے تھے قدم ڈالتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ مجرد ہوں کی آہ و زاری کانوں میں بس گئی تھی۔ آفت رسیدوں کی لاشیں قدم قدم پر اس کا راستہ روکتی تھیں موت اور بربادی کا ہر طرف بول بالا تھا۔ آہ و زاری نالہ و غیون سے پریشاں ہو کر ہر طرف موت و بربادی سے گھبرا کر محمد ایک ایسے میدان کی طرف بھاگا جہاں نسبتاً جمع کم معلوم ہوتا تھا۔ محمد چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس ماحول سے دور ہو کر اگر ممکن ہو تو اپنے پوش و حواسِ مجتمع کرے۔ وہ اسی کوشش میں تیز تیز قدم ڈالتا میدان کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اس کا پیر کسی ظالم چیز پر پڑا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک جسم ہے نصف جھاڑی میں پوشیدہ اور نصف باہر محمد نے پانچ کی روشنی اس پر ڈالی تو کلیہ دھک سے ہو گیا۔ آنکھوں کے پیچھے اندھیرا چھا گیا اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ یہ غم تھی، جو خاک و خون میں غلٹا اپنی زندگی سے ناامید بے یار و مددگار یہاں پڑی تھی۔

محمد نے جلدی سے اپنے حواسِ مجتمع کئے اور غم کو اپنے ہمارے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

"غم! میری غم تم یہاں کیسے ہو گئیں؟" محمد نے کہا لیکن ناامیدی میں امید پیدا ہو کر غم کی آواز کو ایک لمحہ کیلئے فرطِ انسا سے گھوٹ کر دیا غم محمد سے لپٹ گئی اور اس کی آغوش میں ایک خوف زدہ بچے کی طرح کانپنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد جب دونوں کے ہوش و حواسِ مجتمع ہوئے تو انھوں نے ایک دوسرے کی سلامتی پر پہلے تو درگاہِ قاضی الحاجات میں سر بسجود ہو کر نذرانہ شکر پیش کیا اور پھر دونوں نے اپنی اپنی روداد الم سنا لی۔ اسی سنا میں غم کی نظر ایک ملائی ہار پر پڑی جو نصف کی قریب محمد کے جیب سے باہر لٹک رہا تھا۔ غم نے اسے جیب سے میخ لیا اور غور سے دیکھ کر تھپائی "ارے یہ تو میری اسی مرحومہ کا ہے محمد یہ تمہیں کہاں ملا؟"

محمد اب بالکل خاموش تھا۔ اس کا خیال فزا اس لمحہ کے سیف کی طرف گیا جس کو لوگ کچھ دیر قبل توڑ کر اس کا سامان نکال رہے تھے اور محمد نے عین اسی وقت پہنچ کر اور ان لوگوں کو پستول سے ڈمکا کر کل ڈال دیا۔ غم اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اب محمد کو خیال آیا کہ وہ سیف ضرور غم کے باپ کا تھا اور جو وہ یہ ملا وہ خود اسی کا تھا جو غم کے باپ کے پاس بطور امانت رکھا ہوا تھا۔ محمد نے غم کے ہاتھوں سے ہارے لیا اور مسکراتے ہوئے اس کو غم کے گلے میں ڈال دیا۔ یہ اس شب میں محمد کا پہلا تبسم تھا۔

"غم! پیاری مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں اور نہ پردہ۔" محمد نے غم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "تم مل گئیں مجھے سب کچھ مل گیا۔ یہ ہار سحر دیگر دیورات کے مجھے راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا جواب تمہاری مذہب ہے۔"

اگر آپ اردو ادب زبان کی بہبودی و ترقی کے خواہاں ہیں

رسالہ عالمگیر کی خریداری قبول فرمائیے کیونکہ ہم انشاء اللہ العزیز جلد ہی خاص نمبر سے ایسا جدید نظریہ اور پروگرام پیش کریں گے جو اردو کیلئے بہت زیادہ مفید و کامیاب ہوگا۔ چند سالانہ لکچر نیازمند منجر عالمگیر لاہور



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے !!

نمبر ۱۳

فہرست مضامین اگست ۱۹۳۶ء

جلد ۲۵

| نمبر شمار | مضامین               | اثر خاتمہ                 | نمبر شمار | مضامین | اثر خاتمہ            |
|-----------|----------------------|---------------------------|-----------|--------|----------------------|
| ۱         | فہرست مضامین         | مینجر                     | ۱         | ۱۱     | غزل                  |
| ۲         | ملاحظات              | ادارہ                     | ۲         | ۱۲     | گناہ معاشرت (ڈراما)  |
| ۳         | ایک جھلک             | جناب شمس الدین صاحب       | ۳         | ۱۳     | خاک کھدیں جا رہے ہو؟ |
| ۴         | ہولین پرقائمانہ حملے | جناب افتخار احمد صاحب     | ۴         | ۱۴     | تخنیں بر غزل غالب    |
| ۵         | تلاش                 | حضرت علامہ تحوی کھنوی     | ۵         | ۱۵     | چک والی (افانہ)      |
| ۶         | ارشاد کی روح (افانہ) | جناب راؤ شفیق الرحمن صاحب | ۶         | ۱۶     | ...                  |
| ۷         | اتمس تننا            | مولانا ذکری بھوپالی       | ۷         | ۱۷     | انگوٹھی (افانہ)      |
| ۸         | بلوری ملک            | مسٹر ظفر قریشی بی۔ اے     | ۸         | ۱۸     | آمد خورشید           |
| ۹         | غزل                  | جناب نعمان جالندھری       | ۹         | ۱۹     | اشتہارات             |
| ۱۰        | دستان حیات (مطالعہ)  | حضرت خرم صدیقی روضوی      | ۱۰        | ۲۰     | ...                  |

عالمگیر کا مطالعہ آپ کے ذوق ادب کی دلیل ہے کیونکہ عالمگیر اردو کا مایہ ناز رسالہ ہے

مکتبہ معہ دہلی

اگر آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم عزیز ہو تو مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا باتصویر رسالہ پیادہ تعلیم طلب فرمائیے قیمت سالانہ ۸ روپے سالانہ ۱۳ روپے ۸ روپے پر چھپتا ہے۔  
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ اسلامیہ - قروں باغ - دہلی

مکتبہ جامعہ

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے عالمگیر ایکٹر ملک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر ناز سید شاہ لاہور سے شائع کیا ہے

# ملاحظت!

عالمگیر نے اپنے گزشتہ ادوار زندگی میں ادبیاتِ اردو کی جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ انظرِ اشمس ہیں، یہ ایک حقیقت و منح و غیر مستور ہے کہ عالمگیر کا ہر نمبر، پچھلے نمبر سے بجا خاص طور پر صوری و صنفی بڑھ چکا ہے۔ یہ عالمگیر کے ہر نمبر کو علمی و ادبی حلقوں میں نظرِ احسان دیکھا گیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں اردو میں امتیازی حیثیت دی گئی۔ ہم بلاشبہ مبالغہ نہ کہہ سکتے ہیں کہ عالمگیر کے سالانوں اور خاص نمبروں نے اردو دنیا میں ایک مستقل و متم با نشان اضافہ کیا ہے۔

## اگر آپ

اردو علم و ادب کے بی خواہ ہیں اگر آپ اردو کے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دانش برداروں دیکھنا چاہتے ہیں تو عالمگیر کی توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے۔ عالمگیر کی خریداری، فی تحقیق اردو ادب کی سرپرستی کے مترادف ہے۔ عالمگیر کو پیش از پیش بلند یوں پر لے جائے آپ کے تعاون کی ہمیں شدید ضرورت ہے۔

ادب تو مول کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے تو اہم یورپ کے ادب کو دیکھئے، آپ اپنے ادب اور ان کے ادب میں بہت بڑا فرق پائیں گے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اپنے ادب کو ترقی و وسعت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور نہ کر سہے ہیں، مگر ہمارے ملک کا

کوشش کی ہے، اس کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے؟ یہ دنیا پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

عالمگیر کے سالانہ ۱۹۳۶ء کو چار ہی تو قحط سے بڑھ کر نوازا گیا۔ جلیل القدر ادباء اس کی تعریف میں طوب اللہاں ہوئے اور عالمگیر کا یہ حال تھا کہ اشاعت سے کچھ عرصے بعد سالانہ کی تمام کاپیاں دفتر سے نکل گئیں ادب و ادب دفتر میں صرف چند کاپیاں رہ گئی ہیں اور وہ بھی ہم نے فائل کے دستے رکھی ہوئی ہیں!

ایک مژدہ جاننوار جن حضرات نے عالمگیر کے گزشتہ متم با نشان سالانہ اور خاص نمبر دیکھے ہیں وہ یہ سن کر اذہا خوش ہونگے کہ عالمگیر کا خاص نمبر ۳۳۳ جہاں عالمگیر کی کتاب حیات میں ایک انبیت ہی اہم باب کا اضافہ کرنے والا ہے وہاں ادبیاتِ اردو کو بھی چار چاند لگا دیے۔ ہمارے پیش نظر ایک زبردست لائحہ عمل ہے۔ یہ اہم لائحہ عمل عالمگیر کو کیا بنا دے گا، اس کے واسطے قارئین عظام کو کچھ عرصے کے لئے انتظار کرنا ہوگا، ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ عالمگیر کا یہ خاص نمبر میں پر عملی تمام امکانی کوششیں صرف کر رہے ہیں اور میں پر بھروسہ ہے کہ ہر شخص کو یہ خاص نمبر ۳۳۳ کا بلکہ اردو کا بہترین خاص نمبر ہوگا۔ ملک کے چوٹی کے ادباء اپنے نگارشات جلیل دفتر میں روانہ کر رہے ہیں۔ قنات شریع ہو گئی ہے۔ باور کیجئے یہ خاص نمبر عالمگیر ظاہری ماز بیت، مقناطیسیت، حسن اہم اور مضامین کی جامعیت و تنوع کے لحاظ سے عیدم انظر ہوگا۔

بابا آدم ہی نہا لہے، ادب کی طرف افسوسناک بے توجہی و تغافل برتنے کا ر آج۔ سالانہ ادب تو مول اور ملکوں کے قہر عظمت کے تعمیری عناصر ہیں، ایک ایسا ناز و ہم عصر ہے جس کے بغیر وہ کھڑا ہی نہیں رہ سکتا، ادب کو فروغ دینے کے واسطے ضروری ہے کہ ہم اپنے رسائل و جرائد کو ذہنی ارتقاء کی بلند سطح پر لائیں، عالمگیر اس فرض کو جس خوبی سے انجام دے رہا ہے۔ وہ پوشیدہ نہیں، عالمگیر نے قارئین عظام کے ذہنوں کو ایک طرف زندگی کی حرارت سے بھرے ہوئے انکار و اغیہ سے روشن کیلئے تو دوسری طرف فن صوری کی بھی گراں قدر پیشکش کیا، جینا جینا جن جنوں کو بھی سطح وجود پر لانے کی

خط و کتابت کر رہے ہیں۔ محبان عالمگیر یہ سن کر خوش ہو گئے کہ ہمارے ارادوں کو بہت حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے! باب تنقید تبصرہ کی جانب بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے!

اب ہم شمارہ حاضر کے بعض مضامین پر نظر ڈالتے ہیں۔  
**بلوری ملک (کوکین)**

جناب نفع قریشی صاحب بی۔ اے دیوبند کا یہ مقالہ 'پراز معلومات' مفید اور سبق آموز ہے، کوکین کے ممالک، بجز اثرات کو اپنے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بلوری ملک نے خاندان کے خاندان تباہ کر ڈالے ہیں اور کر رہی ہے کاش ہندوستانی، شدید لٹی ہوئی اس ہر لاپرواہی، اقبال کریں، زمین میں ہے کہ جناب نفع صاحب آئندہ بھی عالمگیر کو ایسے مفید مقالات عنایت فرمائیں گے، اردو میں اس قسم کے مضامین کم تعداد میں ہیں۔

**ارشاد کی روح!**

ایک انگریزی افسانہ ہے جسے جناب شفیق الرحمن صاحب نے ہندی معاشرت میں پیش کیا ہے اور نہایت کامیاب طریقے پر،

**داستان حیات!**

دلچسپ خطوط کا مجموعہ جس میں مرد اور عورت کی فطرت کو بطور حسن پیش کیا ہے، ہم جناب نفع صاحب مدنی کے نمونہ امان ہیں،

**گناہ معاشرت!**

اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ ہمارے معاشرتی قوانین کیونکر تباہ کر رہے ہیں!

ہم تمام معنون نگار حضرات کا یہ حکم ہی لکھ رہے ہیں ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ بدستور قلمی معاونت ادا کر سکا ہوتا ہے بلاتے رہیں گے، (اداکار)

جو حضرات اس مہتمم باتان خاص نمبر کو مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ آج ہی عالمگیر کا سالانہ چندہ بھیج کر اپنے اسمائے گرامی عالمگیر کے متعلق خریداروں میں صبح کرالیں!

اردو جس دور ابتلا سے گزر رہی ہے وہ اہل قلم حضرات اچھی طرح جانتے ہیں۔ برادمان وطن کی عداوت کو دشمنی سطح تعصب سے اہل قلم کر اردو پر صدمہ حیات تنگ کر رہی ہیں اس صورت میں لاوم ہے کہ اہل قلم حضرات جو اردو کے واسطے اپنے سینوں میں درد رکھتے ہیں، برادمان وطن کی اس تنہا نہ روش کی طرف خاص توجہ مہندل فرمائیں، مافہانہ کو کشیش تو ہر حال میں جائز ہیں بلکہ لازمی و ناگزیر، کیا ہم امید رکھیں کہ کامیان اردو اردو کی حمایت میں خاص توجہ سے کام لیں گے، ہمارے وطنی بھائی ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہیں، یعنی اردو، مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے، حالانکہ اگر اس نظریے کا تجزیہ کیا جائے تو ہم ہندو بھائیوں کو 'نمک' انگریز غلطی میں پائینگے۔ اردو، ہندو، مسلمانوں کی کوششوں، متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے، پھر اس حالت میں یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، وہ اگر چاہیں تو اسے ترقی دے سکتے ہیں، ہندوؤں کو اس سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے! کاش برادمان وطن اس غلطی کو سمجھیں اور اتحاد کے ایک ایسے ذریعہ کو جو ہندوستان کی اقوام مختلفہ کو زنجیر محبت میں جکڑ سکتا ہے ملنے کا افسوسناک اقدام نہ کریں!

عالمگیر کو استحکام دینے کے واسطے جدید انتظامات، بروئے کار آ رہے ہیں۔ قارئین کرام دیکھیں گے کہ عالمگیر کا معیار بلند سے بلند ہوتا جائیگا۔ آئندہ نمبروں میں مادی اور معناتی مقالات زیادہ تعداد میں شائع ہوا کریں گے، ہم تحقیقی مضامین حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے ہندو پارہ معنون نگاروں سے

**نمبر خریداری** اگست ماہ (جولائی ۱۹۳۶ء) سے عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں آپ آئندہ خط و کتابت کے وقت جدید نمبر خریداری (جواب آپ کے نام کے ساتھ چٹ پر چسپا ہوگا) تحریر کیا کریں، جولائی سے قبل جو نمبر آپ کا تھا اسے لکھنا فضول ہے۔ کیونکہ رجسٹر خریداران از سر نو مرتب کر کے پڑانے تمام قریب قریب تلف کر دیئے گئے ہیں، ہر قسم کی خط و کتابت میں نمبر خریداری لکھنا اشد ضروری ہے!

نماز مند، میجر عالمگیر لاہور

# ایک جھلک

غازی صلاح الدین بیت المقدس میں

جناب شمس الدین صاحب شیدائی، انصاری ٹھہری

ہوئے دل آدر آسوں سے بھگی ہوئی نگاہوں سے، وگرد کے درو دیوار،  
کو تک رہا ہے۔ اور اپنے قلب کی ہر حرکت میں رافت و الفت کا ایک سحر  
بے پایاں موجیں مانتا عکس کرتا ہے۔... پیچیدگی پر حلال آواز اپنے اپنے  
میناروں سے بلند ہو کر مسجد کے گنبد سے نکراتی ہوئی، ہر طرف فضا میں منتشر ہوتی  
ہے اور ذقہ ایک سکوت، ایک مقدس سکوت درو دیوار پر جاری ہو جاتا  
ہے۔ آلاؤ کا جادو بیان خطیب قاضی، جبہ و دستار سے مرصع جریب میتکا  
ہوا مہر پر چڑھتا ہے اس نورانی چہرے کے گرد سفید ڈھکی کا جھارا ایسا حضور  
ہوتا ہے کہ آفتاب سے کرن پھوٹ رہی ہے۔ ہزاروں انسانوں کی عقیدت  
کیش نگاہیں مقدس چہرے پر جم جاتی ہیں۔

سحر بیان خطیب معمولی تلاوت قرآنی کے بعد حاضرین کو مخاطب کیا،  
غازیان اسلام و فدا یان رب کعبہ!!

آج ہم جس قدیم بھی خوشیاں منائیں کم ہے۔ خداوند قدوس کے اس  
الطاف بے پایاں اور عنایت بیکران کا کس سُننے سے شکر کیجئے کہ آج کے دن  
پھر اس نے اپنے جان نثار غلاموں کو اس مقدس شہر میں داخل ہونے  
کی توفیق عطا فرمائی، آج پھر ایک بار یہ مقدس درو دیوار تقاری پر حلال  
گلاباگت بکھرے گویا رہے ہیں کمال ایک سو سال تک دشمنان اسلام  
کے نفس قدموں سے پامال ہونے کے بعد آج پھر رب کعبہ کے نام پر بھگتے اپنی  
عینیں دیکھیں یہ عظیم شہادت کے دریا کھلے ہوئے اس چوکھٹ پر حاضر ہوئے  
ہیں اور ان کے دل میں کچھ بچتے بچتے کو تو شہادت سے سنا ہے جس  
یک رنگ و یک رنگی کی گلی کی تمام سے پلازہ شہر دل اسطاعت کے  
اور قیمتی خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ یہ فضائے بسیط جس کا قدر

۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کا زمانہ ہے، جمعہ کا مبارک دن ہے۔ بیت المقدس  
کی فضائے بسیط میں اسلام کا جلالی پرچم ہوا سے اٹھکیا ہوا ہے۔ ذرے  
ذرے سے کیف و شادمانی کی لہریں پھوٹ رہی ہیں۔ ہر طرف چل پھل کے  
اتہلج آگیاں اثرات نمایاں ہیں۔ عساکر اسلام کا ہر سپاہی مہمانے کلمتی  
سے چور اور نشہ فتح و ظفر سے غمور ہو کر پھر رہا ہے۔ وسط شہر کے وسیع سبزہ زار  
میں دور دور تک رنگ برنگ کے فوجی غمے نصب ہیں جن کے اوپر احمری جھنڈیاں  
غیب انداز سے لہرا رہی ہیں، آج پہلا جمعہ ہے جو فتح بیت المقدس کے بعد  
مسجد اقصیٰ میں ادا کیا جانے والا ہے۔ تلواروں کے دھنکے اور نیزوں کے  
روح و دال غازیان اسلام فریضہ دو گانہ کی ادا گلی کے لئے جلدی جلدی ہوس  
فاخرہ سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ ہر طرف سکون و طمانیت کی روح پر دکھفتیں  
ستوئی ہیں کہ ذقہ شورا مختار ہے کہ سلطان المہاجرین غازی صلاح الدین،  
نماز جمعہ ادا کرنے اور اپنی زریں کامیابی پر سجدہ شکر بجالانے کے لئے مسجد اقصیٰ  
میں تشریف لا رہے ہیں ایک بجی کی لہر ہے جو تمام عساکر اسلامی میں جوڑ  
جاتی ہے اور ہر شخص جلد از جلد مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے!

بیت اللہ کا وسیع صحن پر جوش غازیوں سے کچا کچ بھرا ہوا ہے  
لوگ جوق در جوق پتے پرتے ہیں۔ مجاہدین قطار اند قطار ٹیو رہے ہیں سرخ  
دستہ عرب، ہتک فام بدو، کشیدہ قامت شوکی۔ ہانکے توچے مصری و  
شامی، جان اپنے اپنے سرداروں کے ساتھ قطاریں بنائے ہوئے ہیں اور  
کھانسی کی لہریں اور جاکس جانی کے ہنسنے کا مذاق اڑاتے ہوئے ہیں  
کے ہر شخص ہتھیں جھان کا فہمہ امانت اسلام کے لئے  
ہر شخص رنگ برنگ ہے۔ ہر شخص رنگ برنگ ہے۔

(دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر) اے رب العزت! تو اپنے عاجز بندوں کی دعا قبول کر۔ جب تک آسمان ہے اور آسمان پر چاند تھا مے جب تک دنیا ہے اور دنیا میں انسان ہے، رض مقدس، یہ بیت اللہ، یہ کعبہ دین و ایمان، جس کو تیسرے ناچیز بندوں نے اپنا مقدس خون بہا کر حاصل کیا ہے جس کی خاک میں ہمارے اسلاف کی پاک روض خوابیدہ ہیں کسی غیے کے بغیر جس کو سے طوٹ نہ ہو، اے خداوند قدوس! اپنے عاجز غلام کو جس کے جھنڈوں کے نیچے غازیان اسلام کا اجتماع ہے جس کی تلوار نے خرمن کھر کھلا کر خاکسٹر کر دیا ہے۔ جو تیسرے دین بین کی حفاظت میں اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہے یعنی ابوالمظفر خلیفۃ المسیحین، سلطان المجاہدین، غازی صلاح الدین سیف بن ابوب کاسا یہ ابداً لا باؤدک ہمارے سروں پر قائم رہے!

امین شہرامین!

قاضی الفضل سلطان غازی صلاح الدین کے معتمد مشیر کایان ہے کہ یہ پوجش اور ولولہ انگیز خطبہ کچھ اس جوش و خروش کے عالم میں ادا کیا گیا تھا، دوہاں کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا۔

غازیان اسلام بیت المقدس کی زریں فتح سے اپنے جانے میں بھولے ہیں ساتے نئے۔ غازی صلاح الدین کی عقیدت کیشا نہ سامعی اس شہر کو پھر ایک بار اس کی پہلی آب و تاب میں لے آئی عنایات مقدسہ کی طرح پاکے مشا کئے گئے اور پھر وہی رعنائیاں اس کے درو دیوار پر چھائیں جو کعبے سے ایک ہمدی قبل تھیں۔ کلری کا وہ خوبصورت تراشا ہوا مہر جسے نور الدین نے مسجد اقصیٰ میں نصب کرنے کیلئے بنوایا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے ہاتھوں سے نصب کیا جو آج تک اسی حالت میں موجود ہے اور مسلمانوں کی خلعت دیرینہ کی یلوتازہ شمس شیدائی شہسرامی!

کر رہا ہے!

دین حنیف کا علمبردار ہے۔ یہ درو دیوار، یہ مساجد و مقامات جن کی بنیادیں محمد رسالتناہ صلعم کی صحبت یا قہر ہستیوں کے ہاتھوں سے رکھی گئی ہیں پستانان توحید کے نزدیک اسی طرح مقدس و قابل تعظیم ہیں جس طرح بیت اللہ! یہ وہ مقدس ارض پاک ہے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قدموں کے نیچے رسول رہ چکی ہے۔ یہی وہ مقدس خطہ زمین ہے جہاں ہمارے آقائے نامدار سرور کو زمین حضور رسالتناہ معراج کی رات کو عرش علی سے اترے یہ وہ جگہ ہے جو برسوں تک گویان توحید کا قہر رہ چکی ہے۔ یہ وہ مقدس خاک ہے جس کے ذرہ ذرہ میں رسولوں اور نبیوں کی امانتیں مخفی ہیں اور یہی وہ نہر ہے جہاں نیامت کے دن تمام انسان اپنے دنیوی اعمال کے حساب و کتاب کے لئے اپنے پروردگار کے دربار کھڑے کئے جائیں گے۔ آج تم جس قدر بھی خوشیاں مناؤ کہ تمہیں کیونکہ آج پھر اس ارض مقدس کی مضامیں اللہ اکبر کی غفلت انداز آواز گونج رہی ہے!

”سایم کے نام کو زندہ رکھنے والے جالفروش غازیو! توحید کے نام پر سرکٹائے والے بہادر مجاہدو! تم پر خدا کی رحمت ہو! تمہارے اپنی تلواروں کے طوفان بیشش سیلاب سے کھر کے خس و خاشاک کو ہمارے بیت المقدس کو پاک کر دیا۔ تم غازیان بدر کے سرفروشا نہ معروکوں کے حامل ہو، مجھارے دلوں میں ابوجبر کا استقلال ہے۔ تمہارے بازوؤں میں فاروق اعظم کی طاقت ہے۔ تمہارے جھبوں کے اندر خالد کی روح ہے۔ تمہاری شمشیروں میں نور انصاف کی بقی سوز تڑپ ہے! تمہاری سرفروشی نے ابتدائے اسلام کی ان حوزہ جوی کی یاد تازہ کر دی ہے جو قادیہ، یرموک، اور خیبر کے نام سے موسوم ہیں خداوند قدوس کی بارگاہ میں شہیدان اسلام کے خونی عطیے قبول ہوئے اور اس کے عوض جنت کی ساری شادمانیاں اور ابدی نشاط انجیزیاں انھیں سپرد کر دی گئیں خوشیاں مناؤ کیونکہ تمہارا خدا تم سے خوش ہے۔

تمام اردو رسائل میں عالمگیر ایک ماہ الامتیاز پرچہ اس لئے اس کے سلسلہ خریداری کو سعت دینا ہر ہی خوا علم و ادب کا فرض اولیٰ ہے۔ عالمگیر کی خریداری فی الحقیقت اردو زبان و ادب کی سرپرستی کے مترادف ہے۔ سال میں دو ضخیم خاص نمبر مفت، سالانہ چندہ صرف للہم علاوہ محصولہ اک منبر عالمگیر

# ہنولین پر قاتلانہ حملے

جناب افتخار احمد صاحب میاں پوری (میرٹھ)

سے سخت نفرت کرتا تھا۔ نفرت کی وجہ بائبل معقول تھی۔ اس کا باپ اور بھائی فرانسیسیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ اور ماں کو جاسوسی کے الزام میں اس قدر تکلیف دی گئی تھی کہ وہ جان بڑھ کر ہوسکی، اس سے بھی زیادہ اس کی ناراضی کا سبب یہ تھا کہ جس جنگ میں مدد کے لئے ہنولین کو بلایا گیا تھا اس کی وجہ سے اس شخص کی شادی ملوئی ہو گئی تھی اسے اپنی سنگیت سے فایت درجہ محبت تھی، وہ کسی طرح بھی شادی میں تاخیر گزارنا نہ کر سکتا تھا۔

غرض کہ ان اسباب کی بنا پر شخص مذکور غصہ سے دوبارہ پورا ہوا تھا اس نے اپنے ساتھی کو فرانس کی طرف اسی کی وجہ سے زدہ کو بکھا اور قسم کھائی کہ کل ہنولین کو ضرور قتل کر ڈالوں گا۔

اس نے کہا: اگر مادر وطن کے اس ظالم دشمن کے قتل کی کسی کوشش نہیں تو میں یہ ہم انجام دوں گا اور ملک کو اس شہریر دشمن سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دوں گا۔

چنانچہ یہ ارادہ بیکر فوراً روانہ ہو گیا۔ اسے ہنولین کی آمد کی تاریخ معلوم نہ تھی۔ بازاریں ایک بویرین سپاہی کے گرد بیٹھ گئی تھی۔ یہ ابھی ابھی میدان جنگ سے آیا تھا لوگ لڑائی کی خبریں پوچھ رہے تھے وہ بتا رہا تھا کہ فرانس فوج نے کس طرح آسٹریں فوج کو پسپا کر دیا ہے۔

لوئی دولٹ نے آگے بڑھ کر سوال کیا: ہنولین ہمارے شہر میں کب داخل ہوگا؟ سپاہی نے تعجب سے سر اٹھا کر کہا: یہ سالہا کی زبانی ہم نے سنا ہے کہ ہنولین کل صبح کو شہر میں داخل ہوگا۔ وہ ابھی میدان جنگ کا نقشہ مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے سلام کے لئے بہت بے چین ہو؟

ہاں، میں اسے ایک بالکل انوکھے طریقے سے سلام کروں گا: ”دولٹ نے کہا۔ پھر وہ شخص اپنے مکان پر گیا، بندوق لی باور شایع عام پر ایک غالی

ہنولین بونا پارٹ کے اخلاق پر مورخین نے جس تفصیل سے نظر ڈالی ہے شاید جدید دنیا کے کسی انسان کی شخصیت اس قدر زیر بحث نہ رہی ہو۔ ہنولین نے یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں الٹ دی تھیں، اخلاق کے قانون میں اس کی کھاتہ خانہ انوار العزمی سب سے بڑا جرم تھی، اور اسی وجہ سے غصہ ملکوں میں اس کی جان کے ہزاروں دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی تمام زندگی میں اس پر صرف دو ہی قاتلانہ حملے ہوئے۔ حملہ آوروں کے جذبات میں سمجھنے چاہئیں۔ ان پر ظلم ہوا تھا، ان کی آزادی چھینی گئی تھی۔ وہ جوش و تہاں قوم پرستی میں سب کچھ کر سکتے تھے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہنولین نے ان کے ساتھ کیا سوک کیا، کیا ایک مجرم کی وجہ سے سیکڑوں بے گناہ قتل کئے گئے؟ کیا خود مجرموں کو اس ہولناک طریقہ پر سزا دی گئی جو عام طور پر آج بھی تمدن دنیا میں رائج ہے؟ تاریخ اس کا اعتراف کرتی ہے کہ اس فراخ دل و بلند ہمت انسان نے پوری شرافت سے دونوں قاتلوں کو معاف کر دینا چاہا اگرچہ ان میں سے ایک نے عافی قبول نہیں کی اور موت کو ترجیح دی، یہ دونوں واقعے بے حد دلچسپ اور جرت انگیز ہیں۔

## بویریا میں حملہ

شاہ بویریا (جرمنی) نے آسٹریا کے متعلق ہنولین سے مدد طلب کی تھی، ہنولین ۲۲ جولائی کو درمل داخل ہوا۔ شاہ بویریا اس کے پہلو پہ پہلو چل رہا تھا۔

اس وقت بویریا کے باشندوں میں اپنے ملک کی سیاسی حالت کے متعلق سخت اختلاف ملے تھا۔ ایک گروہ فرانسیسی اثر پسند کرتا تھا دوسرا آسٹریا کو ترجیح دیتا تھا ہنولین کے آنے سے ایک دن پہلے اس شہر کے دو آدمیوں میں ٹکرا ہو گئی، ان میں ایک فرانس کا طرفدار تھا دوسرا آسٹریا کا آخر لڈر کا نام لوئی دولٹ تھا، اس کی عمر اٹھائیس برس کی تھی اور فرانس ہنولین

نپولین کھڑا تھا۔ مجرم اس کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ اس کے داہنی طرف بویریا کا ولیعہد تھا۔ مابین جاب جنرل بریٹھ! نپولین نے اپنی آنکھیں مجرم کے چہرے پر جمادیں ان آنکھوں میں نہیں معلوم کیا طلسمی قوت تھی کہ مجرم تاب نہ لا سکا اور سنے کے بل کر گر چڑیا۔ ”عفو، عفو!“

نپولین نے زری سے پوچھا۔ ”وہ اسباب کیا تھے جنہوں نے تجھ کو اس مجرم پر آمادہ کیا؟“

مجرم نے تمام واقعات صحیح بتا دیے۔ اس پر نپولین نے کہا۔ لیکن اس میں میرا قصور کیسا ہے؟ اگر دول یورپ مجھے ٹھانا چاہتی ہے اور میں اپنی نفع کرتا ہوں تو میرا گناہ کیا ہے؟ تمہاری شادی رد کئے گئے کایں نے مجھ نہیں دیا نہ میں اس کے التوا کا املی سبب ہوں لیکن اگر تم مجھ ہی کو باعث سمجھتے ہو تو میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ کچ ہی تمہاری سنگیتر سے تمہاری شادی ہو جائے میں اپنی جیب خاص سے سواشر فیاں اس تقریب میں پیش کرتا ہوں؟

پھر وہ جنرل سے مخاطب ہوا۔ ”بریٹھ! کل فوج کے ایک دستے کے ساتھ اس شادی میں شریک ہونا اور میری طرف سے دو ہا دھن کے ساتھ جلوس جینا“ پھر نپولین مترجم سے کہنے لگا۔ ”اس شخص سے کہ دو کہ میں نے سعادت بردیا، میں تمہارے لئے خوشی و خرمی کا متمنی ہوں۔“

دو لخت غلات توقع پر بناؤ دیکھ کر ہوت ہو گیا، مگر ولیعہد بویریا نے نپولین سے کہا۔

”آپ کا اخلاق واقعی نہایت قابل عزت ہے!“

نپولین نے ساوکی سے جواب دیا۔ ”عزیز شازادے! میں نے تو بادشاہی کا ایک نہایت معمولی فرض ادا کیا ہے۔ کبھی کبھی ”عفو و کرم“ بادشاہ کا مقدس فرض ہو جاتا ہے!“ (ماخوذ)

مکان میں چھپ کر بیٹھ گیا، صبح کو بڑی چینی سے کھڑکی میں بیٹھا نپولین کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ سورج کی کرنوں کی روشنی میں اسے دور سواروں کی صفیں نظر آئیں۔ سب سے آگے ایک مدیانی قد کا سوار سر پر متاز توپی پہنے آ رہا تھا۔ دو لخت نے سمجھ لیا کہ نپولین یہی ہے۔ بدوق درست کی، لیکن اس کے ہاتھ کاٹنے لگے۔ قریب تھا کہ بدوق گر جائے لیکن اس نے اپنے تئیں سنبھالا جب نپولین چند گز کے فاصلہ پر آ گیا، تو فر کرنا چاہا لیکن عین اسی وقت کچھ سے ایک ہاتھ بڑھا اور اس زور سے اسے کھینچا کہ وہ بیوقوف ہو کر گر پڑا۔

نپولین کو اس واقعہ کی خبر تک نہ ہوئی، وہ اپنی قیام گاہ میں پوچھا، اور کھکھاسوئی کے افسر اعلیٰ کو بلا کر گفتگو کرنے لگا۔

”فرانسیسی فوج کے خلاف کسی سازش کا تو پتہ نہیں چلا؟“

”ہاں حضور والا! تیس سازشوں سے زیادہ کا حال اب تک معلوم ہو چکا ہے۔“

”سازش کے بانیوں کا بھی کچھ پتہ چلا؟“

”مجھ پر سب سے بڑا فرض شہنشاہ کی حفاظت کا ہے۔ میرے ایک افسر نے ابھی ابھی ایک عاقبت نا اندیش کو گرفتار کیا ہے جو حضور پر۔۔۔ گولی چلا لے والا تھا۔“

نپولین نے تعجب سے پوچھا۔ ”وہ پروشیا کا باشندہ ہے یا آسٹریا کا؟“

”بویرین ہے!“ افسر نے جواب دیا۔

نپولین یہ سن کر سخت متحیر ہوا۔ ”خوب! میں تو اس بدعصب مذکور آسٹریا کی غلامی سے بچانے کے لئے فرانسیسی فوج کا خون بہا رہا ہوں اور اس کا بدلہ مجھے یہ دیا جا رہا ہے۔“ دھوکے سے قتل!“

اس نے مجرم کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ میں منت کے بعد وہ موجود تھا

کردام و دود و مل و انسائم آرزوست

شیر خداور تم دستا نم آرزوست

گفت آنکہ یافت می نشود آتم آرزوست

محلایار

دی شیخ با چراغ ہی گشت گرد شہر

از ہر بان بست غنا و تنگ دل

گفتم کہ یافت می نشود جستائیم



# مش

حضرت علامہ مخوی لکھنوی (مداس)

جب چاند ہونوشتاں جہاں پر  
ہو چاندنی بام ہر مکاں — پر  
تارے چمکے ہوں آسماں — پر  
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

گلشن کی نسیم مشکبو میں،  
صحرا کی ہوائے تند خو میں،  
کہسار کی شوخ آبجو میں،  
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

شادابی کوہسار میں بھی!!  
زنجبئی لالہ زار میں بھی!!  
رعنائی ہر ہبہار میں بھی!!  
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

سبز تمام وادیوں میں، آزاد حسہ رام ندیوں میں  
خود روشاد آب بونیوں میں، آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

سنانا ہو جب محیط عالم تاریکی شب محیط عالم  
خاموش ہو جب محیط عالم آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

تاروں بھری رات کی فضا میں،  
باغوں کی شمیم دل کشا میں،  
اور صبح کی جانے لگا ہوا میں،  
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں!!

تاریک ردالمیں بادلوں کی،  
خاموش فضا میں جنگلوں کی،  
دلورنوا میں کوٹیلوں کی،  
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں!!

پھولوں کی لطیف ترہنسی میں،  
کلیوں کے تبسم خفی میں،  
شماخوں کی لچک میناز کی میں،  
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں!

شادابِ حمن کی تپوں میں، برسات کی نخی بوندیوں میں  
بادل کی گرج میں بجلیوں میں، آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

ہر غنچہ میں اور برگ تریں، ہر پھول میں اور ہر ثمر میں  
ہر شاخ میں اور ہر شجر میں، آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

## ایک تحیر زا افسانہ

# ارشاد کی رُوح

(از راضی شفیق الرحمن خاں کلانوری)

”جی میں وہاں.....! یعنی دہلی..... میں وہاں..... ایک ضروری کام کے لئے جا رہا ہوں!“ ارشد بولا۔

”گنتاغی معاف! میں وہ ضروری کام ہی تو دریافت کرتا جا رہا ہوں۔“ سلیم نے پوچھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنی شادی کرنے جا رہا ہوں“ ارشد بولا۔

”آپ اپنی شادی کرنے جا رہے ہیں! واہ واہ! اور لطف یہ کہ بالکل اکیلے۔ یہ تو انوکھا الطیف ہے صاحب!“

”مذاق نہ سمجھئے!“ ارشد نے تنبیہ کی۔ ”جواب دیا۔“ قبلہ والد صاحب کو تو اپنی سوداگری کے جھگڑے سے مطلق فرصت نہیں ہے اور میری شادی کے بارے میں سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ فقط نکاح باقی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جہا کو ذرا ڈھیل کیا۔ جس سے اس کا غیر متناسب جسم سلیم کو دکھائی دیا۔ سلیم ازراہ تسخر بولا۔ ”حضرت! صرف دوکان ہی پر سارا دن بیٹھے رہتے ہو۔ یا کچھ کمیل کو دے بیٹھے...“

”مجھے کھیل کو دے سخت نفرت ہے۔“ ارشد نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں لغویات سمجھتا ہوں۔ اور آپ؟“

”کمیل کو دیریں جان ہیں۔“ سلیم بولا۔ ”میں ورزش کا عاشق ہوں۔“

”انوکھا عشق ہے قبلہ۔“ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ اگرے میں کہاں سے تشریف لارہے ہیں اور دہلی میں کہاں جائیں گے؟“ سلیم نے پوچھا۔

دو سو سال کا ذکر ہے۔ ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ موسم بہار کی ایک چمکیلی صبح کو جبکہ نسیم سحری فضا میں اور بھی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ آگرے سے ایک گھمبے دہلی جانے والی سڑک پر جا رہی تھی۔ اس میں تقریباً دس گیارہ مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلی نشست پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔ دونوں کے خدو خال ایک دوسرے سے ایک جگہ ملتے جلتے تھے۔ مگر ایک کا جسم نامناسب اور بے ڈھنگا سا تھا۔ اور چہرہ آداس اور زرد سا۔ دوسرے کا بدن گھٹیلّا اور چہرہ بارونتی اور شکیل تھا اور کمر سے ایک تلوار بندھی ہوئی تھی۔ گاڑی کو چلتے ہوئے مشکل سے آدھ گھنٹہ ہوا ہو گا۔ کہ پہلے نے دوسرے سے شرماتے ہوئے دریافت کیا۔

”کیوں حضرت! آپ کبھی پہلے بھی دہلی تشریف لینگے ہیں؟“

”دہلی!“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں وہاں تقریباً چھ سال تک طالب علم رہ چکا ہوں۔ اور وہاں کے چتے چنے سے واقف ہوں۔“

”آپ کا اسم تشریف؟“ پہلے سے دریافت کیا۔

”فاکسار کو سلیم کہتے ہیں۔ اور جناب کی تشریف؟“

”بندے کو ارشد کے نام سے پکارتے ہیں!“

”میرے خیال میں آپ دہلی پہلی مرتبہ تشریف لے جا رہے ہیں۔“ سلیم نے دریافت کیا۔

”جی ہاں! دہلی کیا میں نے اپنی عمر میں آج تک کوئی سفر ہی نہیں کیا۔“ ارشد نے جواب دیا۔

”خوب! تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ وہاں کس کام کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں؟“ سلیم نے دریافت کیا۔

”اگرے میں میرے والد میرے عہد الجبار صاحب سوداگر ہیں۔ اور وہی میں میں میرے قائم علی کے ہاں جا رہا ہوں۔ وہ بھی سوداگر ہیں۔ اور لال قلعہ کے پاس ہی خانم بازار میں رہتے ہیں۔ آؤ دیکھو جواب دیا۔“

”کیوں دوست! تمہیں کچھ وہاں کا پتہ بھی ہے۔ یا ویسے ہی اندھا دھند جا رہے ہو؟“ سلیم نے دریافت کیا۔

”ہاں! پتا ہے کہ بڑے دولت مند ہیں۔ اور جہیز بھی کافی ملے گا۔ ارشد نے شریاتے ہوئے جواب دیا۔“

”جہیز کو ڈالو جہنم میں اور یہ بتاؤ کہ تمہیں اس کے بارے میں بھی کچھ پتہ ہے؟“

”اس کے۔ کس کے بارے میں؟“

”ارے میاں! مجب انسان ہو تم بھی! اس کا اپنی غصہ کے بارے میں اور کس کے بارے میں؟“

”اوہو! ٹھیک ہے!! اب سمجھا۔ ارشد نے ہنستے ہوئے کہا ”سنائے کہ بڑے زیورات پہنے رہتی ہے۔ اور بڑی خوبصورت اور تندرست ہے!“

”واہ! استاد! سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ تندرستی اور دیوانگی بھی ایک ہی کمی۔“

”اور آپ کہاں جا رہے ہیں!“ ارشد نے سلیم سے دریافت کیا ”ارے یار! رہنے بھی دو“ سلیم نے ٹھنڈا سا سن بھرتے ہوئے کہا۔ ”میرا قصہ بہت لمبا ہے سن کر کیا لو گے؟“

”نہیں نہیں! ہم تو سنیں گے! اور ضرور سنیں گے!! ارشد بولا اچھا اگر مجبور کرتے ہو تو سنو“ سلیم بولا۔ بات یہ ہے کہ میرے والد نے میری شادی ایک دو تہند بیوہ سے کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے اور میں اس عورت سے ایسا ڈرتا ہوں جیسے لوگ بھوت سے ڈرتے ہیں۔“

افوہ! عورت کیا ہے چڑیل ہے۔ جب کہی دیکھتا ہوں تن سے جان نکل جاتی ہے۔ میں نے بہت انکار کیا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ اب میں نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور وہی اپنا

غفلت کرنے جا رہا ہوں۔ اس چڑیل سے بناؤ فی انہما رحمت کر کے ایک بڑی رقم ایٹھ کر لایا ہوں۔ وہی کچھ روز ٹھہر کر یا تو لاہور چلا جاؤں گا۔ یا شاہی فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا۔ گھر واپس نہ جاؤں گا۔“

”بڑے ناشکرے ہو تم!“ ارشد بولا۔ اتنی دولت کو ٹھکرا رہے ہیں“

”دولت! لال اول ولا قوہ!“ سلیم نے کہا۔ ”دولت کیا اگر مجھے کوئی بہشت بھی اس چڑیل کے ساتھ رہنے کے معاوضے میں دے تو بھی میں دور ہی سے سلام کروں۔ مجھے سکون قلب کی تلاش ہے جب زندگی میں وہ بھی حاصل نہ ہو سکا تو دولت بھی فضول ہے۔“

”اور والدین کی فرمانبرداری؟“ ارشد نے دریافت کیا۔ ”والدین کی فرمانبرداری میں نے بہت کی اور اب بھی کرتا ہوں“ سلیم نے جواب دیا۔ ”مگر یہ تو معاملہ ہی بے ڈھب ہے

شادی ہوتے ہی وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور پھر وہی مثال ہوتی ہے۔ کہ ”اپنی ہلاکت بوم بسے یا ہمارے“

اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ ساری زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ایک دور روز کا سودا نہیں عمر بھر کا سودا ہے۔

انسان پیسے کی ٹھیلیاں مول لیتا ہے تو ٹھوک بجا کر لیتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسے ضروری اور اہم کام کو سارے پہلوؤں سے دیکھ بھال کر انجام نہ دیں۔ سمجھے دوست!“

”ٹھیک ہے“ ارشد نے جواب دیا۔ ”مگر دیکھو تو اس طرح تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی“

زندگی! زندگی چیز ہی کیا ہے! سلیم نے لاپرواہی سے کہا۔ ”زندگی کو میں نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی۔ میں زندگی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ میری نظروں میں زندگی ایک کھیل ہے۔

ایک تماشہ ہے۔ اور صرف چند خوابوں کا مجموعہ ہے زندگی کی قدر اس کی اہمیت وہی جانتا ہے جو تیز دل ہو۔ ڈرپوک ہو۔ مگر آزاد طبیعت والے زندگی کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتے۔“

خیر اس جھگڑے کو دفع کرو۔ ارشد نے تنگ آکر کہا۔ اب

ہوتا کہ گہمی دہلی کیسے وقت پہنچی؟ شام کو پہنچی شاید! سلیم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم دونوں وہاں رات کو کٹھنے کسی سرے میں ٹھہریں۔ اور اس کے بعد علی الصبح ایک دوسرے سے نصرت ہو جائیں۔"

بہت بہتر! ارشد نے جواب دیا۔

اسی طرح سے سلیم اور ارشد شام تک آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔ شام کے وقت جبکہ سورج کی زرد نور کوئیں دریائے جمن کی نیلگوں سلج پر رقصاں تھیں۔ کمی دہلی میں داخل ہوئی۔ لال قلعہ اور جامع مسجد شفق کی گلابی روشنی سے جگمگا رہے تھے یہ دونوں دوست شیخ ابراہیم کی سرے میں اترے۔ سلیم نے اتارے ہی مالک سرے کو بلا کر کہا۔ "دیکھئے صاحب! آج رات ہم آپ کی سرے میں ٹھہریں گے۔ آپ ہمارے لئے بہترین کھانے تیار کریں اور ہمارے ٹھہرنے کے لئے بہترین کمرے درست کرا دیں۔"

بہت بہتر غائب! مالک سرے کا جواب تھا۔ چنانچہ حکم کے بموجب اسی طرح کیا گیا۔ ارشد غریب نے یہ نوابی ٹھاٹ کہاں دیکھے تھے۔ وہ دنگ رہ گیا۔

خیرات کو میر کے بعد وہ دسترخوان پر بیٹھے۔ ارشد نیاہ کھا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ سلیم کو آدمی رات ایک ڈراؤنی شکل کے حکیم نے جگایا۔ اور دریافت کیا۔ "کیوں صاحب! ساتھ کے کمرے والے صاحب آپ کے دوست ہیں کیا؟"

"جی نہیں دوست تو نہیں! ہاں واقع ضرور ہیں!!" سلیم نے جواب دیا۔

تو آپ براہ نہر بانی ان کے کمرے میں چلیں۔ حکیم بلا "کیوں؟" سلیم نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"وہ شام کو بہت زیادہ کھا گئے ہیں۔ اور انہیں ایک خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ جو کہ ہر ایک لمحے کے بعد زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ وہ صبح تک زندہ نہ سکیں گے" حکیم کا چہرہ زیادہ ڈراؤنا اور سنجیدہ ہوتا گیا۔

سلیم فوراً ارشد کے کمرے میں پہنچا۔ جہاں وہ زور زور سے چہنیں مار رہا تھا۔ اور سلیم کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگا۔ "دوست میرا وقت آن پہنچا۔ اگر کل کچھ بڑا بھلا کہہ گیا ہوں تو معاف کرنا۔"

"نہیں نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے! آپ بہت جلد صحتیاب ہو جائیں گے۔" سلیم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "صحتیاب ہو صحتیاب ہو جگا۔" ارشد نے روتے ہوئے کہا۔

"کیوں دوست میرا ایک کلام بھی کرو گے؟" "بیسرو چشم!"

"وہاں میرا صاحب کے گھر میرا انتظار ہوگا۔ تم علی الصبح ضرور بالضرور ہمارے ان کو اطلاع دے دینا۔ اور شریا۔۔۔۔۔۔ آف۔۔۔۔۔۔ بھیتا سلیم۔۔۔۔۔۔ سخت درد ہو رہا ہے!"

حکیم نے تھوڑی سی دواٹی پلائی جسے پی کر ارشد نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوست! افسوس ہے! ہماری دوستی بہت جلد ختم ہو رہی ہے۔ اور تم ایسے دوست پر مجھے فخر ہے۔ افسوس کہ میں تمہاری۔۔۔۔۔۔ کچھ۔۔۔۔۔۔ خدمت۔۔۔۔۔۔ نہ کر سکا"

تھوڑی دیر میں ارشد نے سلیم کی گود میں جان دی۔ ی۔

سلیم نے باہر نکل کر دیکھا تو پوچھٹ چکی تھی۔ وہ واپس اپنے کمرے میں گیا۔ اس نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور اپنی تلوار ساتھ لے کر ایک گاڑی میں بیٹائے ہوئے پتے پر چل کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ایک عالی شان محل کے سامنے جا کر رکی۔ سلیم اتر اور آتر کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ بکا ایک ایک کنیز اندر سے آئی اور سلیم کو دیکھ کر پھر واپس اندر ہی بھاگ گئی

تھوڑی سی دیر کے بعد ایک عجیب و غریب اور ادھیڑ عمر کا آدمی دروازے سے باہر نکلا اور سلیم سے نہایت گرجوشی سے بغلیں ہوا۔ یہ میر قائم علی تھے

"مجھ پر یقین تھا کہ میرے دوست کا بیٹا اپنے باپ کی طرح وقت کا پابند ہوگا۔" میر قائم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولے "کیوں بیٹا راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں قہدا" سلیم نے حیران ہو کر کہا۔ بڑے آرام کے ساتھ آیا۔

”اچھا تو گھر چلو نا“

”مگر قبلہ مجھے تو ایک ضروری کام.....“

”ضروری کام! ہاں ٹھیک ہے۔ گھر چلو نا بر خور دار!“

وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔“

”مگر میرا مقصد یہ ہے۔ کہ مجھے.....!“

”تمہارا مقصد کہلے سے ہے۔ نا مہید! گاڑی وا۔ لے کو کرایہ

دیدو۔ اور ہاں اسے کچھ انعام بھی دیدو۔ بھلا شادیاں روز روز

تھوڑا ہی ہوتی ہیں۔“

”مگر قبلہ آپ میری بات تو سنتے ہی نہیں۔ میرا مطلب کچھ

اور ہے۔ آپ ناحق.....“

”افوہ! اس میں تکلیف کی بات ہی کیا ہے!؟ سے بھی

اپنا ہی گھر سمجھو۔ کرایہ ایک معمولی سی چیز ہے بر خور دار!“

”مگر حضرت! دیکھئے گا۔ آپ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں

دیتے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....“

”یعنی ناشتہ! ناشتہ گھر کر لینا۔ بھئی چلو نہ۔ کیا کر رہے ہو

یہاں!!“

اسی طرح سلیم کی ہر ایک بات کا ٹی گئی۔ وہ بے چارہ

چپ چاپ آن کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں کئی دفع اس نے

بولنے کی کوشش کی مگر ہر دفعہ اسے اسی طرح سے چپ کر دیا گیا۔

اندر جا کر اس نے دیکھا کہ پورا کنبہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اندر

داخل ہوتے ہی اس نے سب کو سلام کیا۔ جس پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون

نے سلیم کو گلے سے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ یہ ثریا کی والدہ

اور میر صاحب کی بیوی تھیں۔ سلیم سے ہر ایک نے یہی سوال

کیا کہ راستے میں اسے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ مگر اس نے سب کو

ایک جواب سے مطمئن کر دیا کہ وہ بڑے مزے سے آیا۔ اس لیے کہ

تواضع شروع ہوئی۔ اور دستور کے مطابق سلیم کے سامنے

شریت پان اور چینی ڈلی وغیرہ پیش کی گئی۔ سلیم کا دل مختلف خیالات

آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ امانت میں خیانت کر رہا

ہے۔ وہ اپنے فرض کو بھول رہا ہے۔ مگر ایک آئینہ لے دھوان کا

خیال ان سب باتوں پر غالب آجاتا تھا۔ اور دراصل اس کا

کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ اسے خیالات کو اظہار کا موقع ہی نہیں

دیا گیا تھا۔ کنبے کی غلط فہمی کو پہلے ہی دور کرنا چاہیے تھا۔ اب کوئی

موقع نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک حد تک مضحکہ انگیز معلوم ہوتا تھا۔ اس نے

ایک فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے مستقبل کو قسمت کے ہاتھ میں سونپ دیا

اور ارشد کا پارٹ ادا کرنے کی دل میں پٹھان لی۔

جہاں سب کے لبوں پر تبسم تھا۔ وہاں ایک ایسا

نوجوان بھی تھا جو دانت بین رہا تھا۔ یہ میر قائم علی کا بھتیجا تھا۔

جسے انہوں نے بڑے لاڈ سے اپنے بیٹوں کی طرح سے پالا تھا۔ یہ

شاہی فوج کا ایک افسر تھا۔ شکل صورت خاصی تھی مگر سلیم کے

مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس کا نام محمد ذکی تھا۔ اور صاف صاف

کیوں نہ کہدیا جائے کہ یہ ارشد سلیم کا رقیب تھا۔ اور اسے

مشتبہ نگاہوں سے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ اٹھا

اور اندر سے ارشد کی وہ تصویر اٹھا لایا جو کہ سنگنی کے وقت آگے سے

آئی تھی۔ سب کی توجہ تصویر کی طرف مبذول ہو گئی۔

میر صاحب بولے۔ ”بر خور دار! تم قبلے بہت معلوم

ہوتے ہو!“

”جی ہاں!“ سلیم نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔ میں پچھلے

دو مہینوں سے بیمار تھا۔“

”بیمار تھے!“ سب نے حیرت سے دریافت کیا۔

”جی ہاں! مگر اب بفضل خدا بالکل تندرست ہوں“ سلیم

جواب دیا۔

”خیر! اب تم بیٹھو۔“ میر صاحب بولے۔ مجھے آج قلعے

میں بادشاہ سلامت نے بلایا ہے؛ ذکی تم ان کے پاس بیٹھو۔ یہ

کہتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔ اور اب کمرے میں ذکی اور سلیم اکیلے

رہ گئے۔ ذکی نے نفرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سلیم سے کہا۔

”جناب! آپ کے اخلاق و عادات تو بالکل آگے کے گذریوں

ایسے ہیں۔“

نیلیم کمال کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اس کی نشیلی اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تھے۔ الفاظ کیاتھے تہر تھے جو تیرے دل میں

پیوست ہو گئے۔ وہ متاثر ہو کر بولی۔

”میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ مگر افسوس کہ محبت نہیں کر سکتی  
میرے دل میں آپ کے متعلق جو خیالات تھے۔ ان سے آپ ہزار  
درج بالا تر ہیں۔ مگر افسوس یہ دل کسی اور کا ہو چکا ہے۔ آپ ذرا  
دیر میں منصرف لائے۔“

”ذکی! سلیم نے زور سے کہا۔

”جی ہاں ذکی! ہم آپس میں محبت کرتے ہیں! اس نے ہری  
روح کو دنیا کی پستی سے نکال کر عرش کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ میں  
اس کی شکر گزار ہوں اور وہ.....!۔“

”بہت اچھا! خدا حافظ خانم! سلیم یہ کہہ کر کمرے سے باہر  
نکل گیا۔ اب اس کے سامنے ساری کتنی سلجھی ہوئی رکھی تھی۔ اب  
اسے خیال آیا کہ اس کی جگہ اگر آرد شد ہوتا تو اس غریب کا کیا حشر ہوتا  
اس کے سلسلہ خیالات کو ایک کنیز کی آواز نے توڑ دیا۔ ”چلئے آپ کو  
دستر خوان پر بلاتے ہیں۔“ سلیم اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔

سلیم چہرہ پر ہنس رہا تھا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی۔ زمانے میں کوئی ایسی  
چیز نہ تھی جس کا اسے تجربہ نہ ہو چکا ہو۔ ویسے ہی وہ بڑی بڑی عورتوں  
میں شریک ہو چکا تھا۔ بیٹھتے ہی اسنے اپنی دلچسپ باتوں اور لطیفوں کا  
سماں باندھ دیا۔ سلیم میں کمی ہی کیا تھی۔ خوبصورت تھا۔ نوجوان تھا  
میش قیمت پوشاک پہنتے ہوئے تھا۔ تہذیب یافتہ تھا۔ سب کے سب  
اس کے گرویدہ ہو گئے۔ نرتا بھی بہت متاثر ہوئی۔ اور وہ اپنی  
سخت کلامی پریشیاں بھی کبھی کبھی سلیم کو کنکھیوں سے دیکھتی تھی  
مگر ناخوش تھا تو وہ ایک ذکی تھا۔ اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک  
رہی تھی۔ آخر کھانا ختم ہوا۔ اور وہ سلیم پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالتا  
ہوا باہر نکل گیا۔

سلیم نے بھی باہر جانا چاہا۔ مگر میر صاحب نے اسے شلوغ کیلئے  
بٹھالیا۔ اور بازی شروع ہوئی۔ جو پورے دو گھنٹوں میں ختم ہوئی  
سلیم نے کہا۔ قبلہ! میں ذرا باغ تک ہواؤں۔“

”بخوشی! میر صاحب نے جواب دیا۔ اگر کہو تو میں بھی تمہارے  
ساتھ چلوں۔“

”جی نہیں! مجھے اکیلے سیر کرنے کی عادت ہے۔“ سلیم نے کہا۔  
”بہت اچھا جاؤ۔“ میر صاحب بولے۔ ”مگر ذرا جلدی آنا۔ کیونکہ  
نکاح کے لئے سب تیار کیا ہو چکی ہیں۔“ سلیم پائیں باغ میں پہنچا  
وہاں ذکی کو منتظر پایا۔ وہ دیکھتے ہی بولا۔ ”دوست! بہت دیر  
لگا دی۔ اپنی منسوبہ کے پاس بیٹھتے تھے کیا؟“

”خاموش! بد بخت! پرانی چیز پر نگاہ ڈالتے مجھے شرم  
نہ آئی۔ ایک معصوم لڑکی کو اپنی پیچھا رباتوں سے بہکا ہی دیا نا؟“  
سلیم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”آفہ! اتنا غصہ!! اتنا گھمبڑ! آخر کس پر؟“ ذکی نے طنزاً  
جواب دیا۔ ”کیسی پرانی چیز محبت اور لڑائی میں سب کچھ  
جانٹ ہے۔ اچھا خود خیال کرو کہ کھلا ہو اور ستر خوان دیکھ کر بھوکے کا  
ایمان کس طرح سلامت رہ سکتا ہے۔ خیر! جلدی کرو تلوار نکالو۔  
آؤ ہم فیصلہ کر لیں کہ ثریا کس کی ہے؟“

”ثریا! ثریا کی طرف میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ چاہتا تو  
درکنار رہا۔“ سلیم نے جواب دیا۔

”چھوٹے ہوئے شکار پر ہاتھ ڈالنا میں انتہائی درجے کی  
حماقت سمجھتا ہوں۔“

”خیر! سمجھتے ہو گے! اذکی نے کہا۔ ”مگر اس وقت تو تم لڑائی کو  
بچنے کے لئے بہانے تلاش کر رہے ہو۔“

”بھانے! کیا کہا بہانے تلاش کر رہا ہوں؟“ سلیم نے باٹ  
خوش ادائیگی سے ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک نا تجربہ کار سوداگر  
زادے پر تلوار اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کاش خیر پالا کسی  
سپاہی زادے سے بڑا ہوتا۔“

”مگر تمہیں لڑنے کے لئے مجبور رہی کون کرنا ہے؟“ ذکی نے کہا

”اگر چاہو تو لڑائی سے بچ سکتے ہو۔ چپ چاپ عورت سے  
واپس آ کر سچلے جاؤ۔ بس! میں تمہاری جان بخشی کر دوں گا!!“

اب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ سلیم سپاہی زادہ تھا  
ہر چند کہ وہ نقلی گفتگو کرتا رہا مگر ایسے طعنے سن کر اس سے رہا نہ گیا  
وہ کرک کر بولا۔



”جان بخشی اور تو کرے گا کہ میں تجھ سے اب تک کھیل رہا تھا اچھالے اب تجھے اصلیت بتا ہی دوں۔ تلوار نکال لے۔۔۔۔۔ خیر دار۔۔۔۔۔ لے منبھال۔۔۔۔۔!“

لڑائی شروع ہو گئی۔ ذکی سلیم کو نا تجربہ کار سمجھتا تھا۔ مگر اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ برا بھنسا ہے۔ اور اس کی زندگی کا انحصار صرف سلیم کے رحم پر موقوف ہے۔ سلیم استاد دی سے کام لے رہا تھا۔ پہلے تو وہ ذکی کے وار روکتا رہا اور جب اسے اچھی طرح سے تھکا چکا تو پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہوا۔ اور تلوار کے چرکوں کے ساتھ ساتھ الفاظ کے چرکے بھی لگاتا جاتا تھا۔

”اجی قبلہ اسے منبھالے۔۔۔۔۔ افوہ آپ ہانپ کیوں رہے ہیں۔۔۔۔۔ اوہو آپ خون پونچھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ خریا کار و مال لا دوں کیا۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ خدا کے لئے میری جان بخشی کر دینا۔۔۔۔۔ اجی سپاہی صاحب قبلہ۔۔۔۔۔ اور لویہ فیصلہ ہے۔۔۔۔۔!“

جھن سے ذکی کی تلوار سلیم کے قدموں میں آ پڑی۔ ذکی کا رنگ زرد پڑ گیا۔ سلیم نے تلوار اٹھاتے ہوئے ذکی کو فرشی سلام کیا۔ یکایک اس کی نظر سامنے کی کھڑکی پر پڑی۔۔۔۔۔ اس میں سے کوئی جھانک رہا تھا۔۔۔۔۔ یہ شرمناک تھا۔ ”لیجئے قبلہ!“ سلیم نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذکی سے کہا۔ ”وہ رہیں آپ کی معشوقہ! جنہیں آپ ایسے بہادر اور دلیر چاہتے والوں پر ناز ہے“

”م۔۔۔۔۔ م۔۔۔۔۔ میر۔۔۔۔۔ سی۔۔۔۔۔ ت۔۔۔۔۔ تلوار۔۔۔۔۔“

ذکی نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

”تلوار واپس دیدوں!“ سلیم نے کہا۔ ”مجھے تمہاری جوانی پر اور خاص کر خریا پر ترس آتا ہے۔ کیونکہ اگر میں نے تمہیں تلوار واپس دیدی تو اس کا نتیجہ تمہارا خون ہو گا سمجھو!“ پھر چلتے ہوئے بولا۔ ”اچھا دیکھنا یا رہیں اپنی شادی پر بھولنا مت۔ خدا حافظ!“ یہ کہا اور فوراً

مکان کی جانب چل دیا۔ راستے میں اسے قوارے کے پاس خریا ملی جس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ سلیم کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ ”خدا کے لئے بتائیے کہ آپ نے ذکی کا کیا کیا؟“ میں نے اسے تمہاری خاطر چھوڑ دیا ہے۔ اور لویہ اس کی تلوار ہے جس سے تمہاری شادی کے موقع پر بطور تحفے کے پیش کرنا سلیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ آپ بیٹے نہ بان ہیں۔۔۔۔۔ میں آپ سے اپنی گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔۔۔۔۔ میں شادی پر رضامند ہوں۔“ خریا نے سلیم کے ہاتھوں کو بوسہ دے ہوئے کہا۔

”مگر خاتون معاف کیجئے! افسوس کہ آپ نے محبت کے لئے دیر میں درخواست کی۔ اور وہ طبیعت کی جولاٹی اور شگفتگی تو آپ کے پہلے ہی سنگدلانہ جواب سے مردہ ہو چکی ہے۔ اور وہ دل ہی بدل گیا ہے۔ جو آپ کی محبت کا جواب دے سکے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ کے راستے میں کبھی حائل نہ ہوتا۔ سلیم نے نہایت سنجیدگی جواب دیا۔ ”مگر سنئے تو سہی! آپ میرے دل کو توڑ رہے ہیں“ خریا نے دوتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھ سے صبح بڑی سخت غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری قدر و قیمت اب سمجھی ہوں“

”نہیں نہیں! مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ میں تمہیں پسند بھی کرتا ہوں۔ مگر افسوس کہ محبت نہیں کر سکتا۔“ سلیم نے اپنے خوبصورت چہرے کو زیادہ سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اچھا محترم خاتون خدا حافظ!“ یہ کہہ کر سلیم تیر کی طرح سے مکان کی طرف چلا۔ وہاں اسے میر صاحب منتظر ملے۔ وہ دیکھتے ہی بولے۔ ”برخوردار اتنی دیر کہاں لگا آئے۔ جلدی کرو۔ سب لوگ تمہارے منتظر ہیں۔“

”مگر، مگر میں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے ایک جگہ ضروری کام ہے اور اسی وقت وہاں پہنچنا ہے!“ سلیم نے کہا۔

”ضروری کام ہے! اس سے ضروری کام کہا ہو سکتا ہے؟“ میر صاحب نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیسی بھکی بھکی باتیں

وہ کل آگرہ سے آیا تھا۔ اور نقوڑی دیر ہوئی کہ وہ دفن کیا گیا ہے۔“

میر صاحب حیرت زدہ ہو کر گھر پہنچے۔ اور یہ ڈراؤنی خبر سب کو سنائی۔ جس کو سنتے ہی سارا گھر خوفزدہ ہو گیا کہ ایک روح ان کے ساتھ سارا دن رہی۔ ان کے ساتھ ہی کھانا کھا یا اور میر صاحب نے اس کے ساتھ شطرنج بھی کھیلنا۔ چونکہ نکاح پر بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس لئے اس حیرت انگیز واقعہ کا اطلاع دہلی کے کوچے کوچے میں پھیل گئی۔ اور اس کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی چیمگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے من گھڑت قصے بنا لئے مگر اصلیت کسی کو معلوم نہ ہوئی۔ اور نہ ہی ثریا اور ذکی کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔ شاید ذکی ثریا کو بہانے تراش کر اپنے ڈھب پر لے آیا ہو۔ کہ اس کا مقابلہ کسی انسان سے نہیں بلکہ ایک روح سے ہوا تھا جس میں اس کی شکست یعنی ہمتی۔ یا شاید میر صاحب نے ارشد کی موت پر خود ہی ثریا کی شادی ذکی سے کر دی ہو۔

مگر سلیم؟ — اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں!!

(پلاٹ ماخوذ)

شفیق الرحمن خاں  
کلا نوڑی

کر رہے ہو بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“  
قبلا مجھے اپنے جنازے میں شریک ہونا ہے۔ جو کہ تمہاری دیر میں شیخ ابراہیم کی سرائے سے قبرستان لے جایا جائے گا۔“  
سلیم نے کہا۔

”اپنے جنازے میں.....؟ کیا کر رہے ہو پر خوروار؟“  
میر صاحب نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں اپنے جنازے میں! یعنی ارشد کے جنازے میں!!“  
خاص اپنے جنازے میں!!! اچھا خدا حافظ“ یہ کہتے ہوئے سلیم فوراً مکان سے نکل کر۔ دہلی کی گلیوں میں غائب ہو گیا۔

اس خبر نے سارے گھر میں کھلم کھیا دیا۔ ثریا اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ میر صاحب محن میں کھڑے تھے اور سارا کنبہ انہیں گھیرے ہوئے کھڑا تھا۔ سب کے سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ یکایک ثریا کی والدہ بولیں۔ ”میرے خیال میں تو.....!“  
”کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے۔“ میر صاحب کو اک کر بولے۔ ”کیا تمہارے خیال میں.....؟“

”میرے خیال میں آپ اسی وقت شیخ ابراہیم کی سرائے میں جائیں اور وہاں سے مفصل پتہ لیں“

میر صاحب فوراً سرائے میں پہنچے جہاں جا کر انہیں مالک سرائے کے بیان سے تصدیق ہو گئی۔ مالک سرائے بولا۔

”جی ہاں میر صاحب! ارشد نامی ایک بد قسمت نوجوان تھا کہ یہاں ٹھہرا مگر ایک خطرناک بیماری سے اس کا انتقال ہو گیا“

**اگر آپ** اردو زبان ادب کو معراج کمال پر دیکھنا چاہتے ہیں تو آج ہی رسالہ عالمگیر کی مستقل خریداری کیلئے آرڈر بھیجئے۔ ہم عالمگیر کو اردو کا ایسا بلند پایہ رسالہ

بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی نظیر آپ ہو، چندہ سالانہ صرف للہم علاوہ محصول ڈاک، مینجر عالمگیر لاہور

# التاسِ تمنا

(از مولانا ذکری بھوپالی)

|                            |                              |
|----------------------------|------------------------------|
| دل کی رگ رگ کو دل بناٹے جا | حُسن کی شوخیساں بڑھائے جا    |
| برہمی حُسن کی بڑھائے جا    | داستانِ وفا سنائے جا         |
| نغمہ سازِ دل سنائے جا      | وجد میں آ رہی ہیں اُمیدیں    |
| صبحِ اُمید مسکرائے جا      | غنجے گلشن میں ناشگفتہ ہیں    |
| اسی ساغر سے مے پلائے جا    | میکدہ کھینچ دے جو آنکھوں میں |
| اور کچھ دیر مسکرائے جا     | دیکھ پھر کائناتِ عالم کو     |
| شمعِ ہستی کی لو بڑھائے جا  | کچھ توقع ہے اس کے آنے کی     |
| ہر تمنا کو دل بناٹے جا     | دیکھ لے وہ بھی عشق کا ماہل   |
| غم کی دنیا الگ بنائے جا    | آرزوئے کرم آ رہے تو یہ       |
| مسکرا اور مسکرائے جا       | دل کی ہستی مری نظریں ہے      |

حُسن کا راز راز رہنے دے

اس سے ذکری نظر بچائے جا

# بلوری ملکہ (کوکین)!

یورپ اور امریکہ کے تمدن کی تباہ کاریاں  
از جناب طغر قریشی۔ بی۔ اے (دہلوی)

یورپ اور امریکہ کے تمدن کی تباہ کاریوں کا جو سیلاب ہندوستان میں آیا ہے اس میں سب سے زیادہ خوفناک اور مہیب کوکین نوشی ہے۔ کوکین ایک ایسی عام چیز ہے جسے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ شخص کو معلوم ہے کہ کوکین ایک سفید وادنی ہوتی ہے جو عمل جراحی کے وقت اعضا کو شش کرنے کے لئے ڈاکٹر استعمال کیا کرتے ہیں۔ کوکین کا دوسرا مصروف یہ ہے۔ اچھا ہے کہ اسے شراب۔ افیون۔ چرس گانجا وغیرہ کی طرح بہ طور منشی چیز کے استعمال کیا جائے۔ گو کوکین میں نشہ تو نہیں ہوتا۔ لیکن ایک "اعضا شکن سرور" ضرور ہوتا ہے۔

**کوکین اور ہندوستان** ہندوستان میں کوکین ہر جگہ ناجائز طور پر فروخت ہوتی ہے۔ پان میں رکھ کر اسے کھایا جاتا ہے پان میں چھایا بہت موٹی کھاتی جاتی ہے۔ تاکہ پان منہ میں بہت زیادہ دیر تک قائم رہے۔ اور گھلتا رہے۔ تاکہ کوکین نوش کی زبان شش رہے۔ اور لذت محسوس ہوتی رہے۔ پان کے ساتھ کوکین کھانیا والوں کو چھ نا بہت زیادہ کھانا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کوکین پنا فضل پوری قوت کے ساتھ نہیں کرتی۔ کوکین کے اجزا ہلکے ہوتے ہیں اور چنے کا کھانا اس کے ساتھ مل کر زیادہ تحریک اور حس پیدا کر دیتا ہے جو ناز زیادہ کھانے کی وجہ سے کوکین نوشوں کی زبان کے پھٹ پھٹ کر ٹکڑے اڑ جاتے ہیں۔ تالو۔ کٹے اور جڑے بالکل پھٹ جاتے ہیں۔ نمک اور مرچ بہت تیزی کے ساتھ لگتی ہے۔ اس لئے سالن پائیز چیزیں نہیں کھا سکتے۔ دودھ یا پھلوں پر گزارا کرنا پڑتا ہے لیکن بھوک چونکہ کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کوکین نوش کو غذا کی طرف سے

ایک نوع کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں لاکھوں روپے کی کوکین فروخت ہوتی ہے ہسپتالوں اور مطبوں میں کوکین معین مقدار سے زیادہ استعمال نہیں ہوتی۔ لاکھوں روپے کی خفیہ کوکین ناجائز طریقہ پر ہندوستان میں لائی جاتی ہے۔ اور قطعی ناجائز طریقوں سے اسے فروخت اور حاصل کیا جاتا ہے۔ کوکین ہندوستان میں دوا کے طور پر استعمال ہونے کے لئے ایک ہسپتال میں استعمال کی گئی۔ لیکن بعد میں اسے کھانے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ وہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں پھیل چکی ہے۔

کلکتہ میں کوکین کی ناجائز درآمد چینی کرتے ہیں۔ لاکھوں روپے کی کوکین ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ ان کی کارستانیوں اور چالاکیاں مشہور ہیں۔ اس لئے باوجود سخت احتیاطی تدابیر کے اس ناجائز و سادہ کو قابل قدر طور پر روکا نہیں جاسکتا۔ کلکتہ کے علاوہ ممبئی۔ کراچی میں بھی یہ درآمد ہوتی ہے۔ دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ پشاور۔ آگرہ۔ کانپور۔ بنارس وغیرہ شہروں میں کوکین فروشی اور کوکین نوشی کا بہت زور ہے۔ دہلی میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے بیسیوں خوشحال گھرانے اس "بلوری ملکہ" پر تصدق ہو گئے۔ کوکین نے دہلی کے گھرانے کے گھرانے تباہ کر دیے ہیں ان کی بڑی جگہ خراش تفصیلات ہیں جن کا تصور کر کے روح لرز جاتی ہے۔ یہی حال تقریباً تمام ہندوستان کے ان شہروں کا ہے۔ جہاں یورپ کی اس شہزادی یا ملکہ نے اپنے سحر سے بربادی اور تباہی پھیلادی ہے۔

**بلوری ملکہ** کوکین جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ایک ہوتا ہے۔ اسے ڈاکٹر لینز ایک فرانسیسی معالج امراض کوکین نے اس منحوس شے کا نام "بلوری ملکہ" رکھا تھا اور یہ نام یورپ اور امریکہ بھر میں مشہور ہے۔ چنانچہ اس کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی اسے شہزادی "کالقب دیلتے۔ دہلی کے چاؤ ڈری بازار۔ موٹی دالاں وغیرہ بازاروں میں "شہزادی کا پان" کوکین کے پان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات کھلے بندوں ملجاتا ہے۔ ایکروپیہ پی پان کے حساب سے بیچتے ہیں۔ اس سے زیادہ قیمتی بھی ہوتے ہیں۔ دہلی کے ایک بزرگ جتنی جائیداد بھی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ سو۔ سو سو روپے روزانہ کے شہزادی پان ملتا ہے!

**کوکین کی نقل** کوکین کی نقل تیار ہو چکی ہے۔ یورپ میں، چنانچہ ۱۸-۱۹ء کے پر آشوب زمانہ میں اس نے مصنوعی کوکین بہت تیار کی۔ اب یہ کوکین ہر جگہ بننے لگی۔ اصل میں اور نقل میں بہت ہی کم فرق ہوتا ہے۔ ابتدائی کھانے والے تمیز نہیں کر سکتے۔ ہندوستان میں بھی مصنوعی کوکین چل پڑی ہے چنانچہ اصل کے دام لے کر نقلی کوکین بیچنے والے ہر بازار اور کوچہ میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

**یورپ اور کوکین** یورپ اور امریکہ میں کوکین کھانے کا رواج خوفناک طریقہ پر جاری ہے ہندوستانی یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ کوکین نوشی کی لت ہندوستان میں ابھی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن یہ خیال قطعی غلط ہے سب سے زیادہ کوکین کھانے والے یورپ اور امریکہ کے لوگ ہیں۔ بالخصوص عورتیں۔ یورپ کا کوئی ملک نہیں ہے جہاں خفیہ طور پر کوکین درآمد نہ کی جاتی ہو۔ اور خفیہ طریقہ پر کھائی جاتی ہو۔ یورپ میں اس کی تباہ کاریاں بہت بڑھ رہی ہیں۔ ہر قوم اور ملک پریشان ہے کہ کس طرح اس لعنت کو دور کیا جائے۔

یہ رسم غلامی سے بھی زیادہ برباد کن ہے۔ یورپ میں صرف انگلستان ہی ایسا ملک ہے جہاں کوکین نوشی کی وبا نہیں پھیلی ہے ورنہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں بلوری ملکہ کی شعاع سحرانہ از پھیل چکی ہے۔ امریکہ جہاں سے یہ چیز آتی ہے وہاں بھی یہی حال ہے **جنگ عظیم اور کوکین** جنگ عظیم نے کوکین نوشی میں سب سے زیادہ کام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوکین ہسپتالوں اور جنگی زخمیوں کے کمپوں میں استعمال ہوتی تھی۔ مرلینوں نے تندرست ہو کر بھی اس کا استعمال جاری کر دیا جب اس قائم ہو گیا تو تمام یورپ اور امریکہ میں کوکین نوش افزا کے ساتھ نظر آنے لگے۔

ایک فوجی ڈاکٹر لکھتا ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں جب چاروں طرف توپوں کی گرج۔ مرنے والوں کی آہ و بکا۔ زخمیوں کی چیخ و پکار ہنگامہ اور دہشت و خوف کے ماحول میں ہسپتالوں کے ڈاکٹر پریشان ہو جاتے تھے تو سکون حاصل کرنے کے لئے کوکین کھا لیا کرتے۔

کوکین جب ڈاکٹروں نے کھانی شروع کر دی تو مرلینوں کو بھی اس کی رغبت ہو گئی۔ جب کوکین کی طلب بہت زیادہ ہو گئی تو مصنوعی کوکین بننے لگی اور اس کی یورش عام ہو گئی۔ یہ ڈاکٹر لکھتا ہے کہ امریکن قوم سفید اقوام میں سب سے زیادہ کوکین فروش ہے۔ اس کے بعد جرمنی۔ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ۔ سپین۔ ہندوستان۔ چین وغیرہ کا درجہ آتا ہے۔

**کوکین کی قیمت** کوکین غالب سب سے زیادہ قیمتی دوا ہے کوکین فروشی سے جو دولت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ کوکین کی قیمت کا اندازہ اس سے لگا یا جاسکتا ہے کہ ایک دیاسلانی کے کس میں ۵۰۰ ہزار روپے کی کوکین لیجائی جاسکتی ہے!! ایک پونڈ کوکین کی قیمت عموماً دو سو روپے ہے۔ لیکن جب یہ فروخت کی جاتی ہے تو انفرادی طور پر ایک پونڈ کی قیمت ۴۰ ہزار سے ۵۰ ہزار روپے تک جا پہنچتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس چیز سے دولت اس قدر خلیل تعداد

سراغرمانی اور پولیس کی قوت کے اسکا انداد نہیں کر سکی۔ پھر ہندوستان بھارا توکس گنتی میں ہے :

**یورپ میں کوکین نوشی کے طریقے** (یورپ میں کوکین زیادہ تر مرد بھی کھاتے ہیں بعض لوگ خاموشی اور تنہائی میں بیٹھ کر اس سے

لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں بعض لمباٹھ کیے ہوئے اور کھانیکے کمروں میں بیٹھ کر کھانا۔ ہنگامہ اور گرمی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں کھانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ زبان پر مل لیا جاتا ہے۔ اس کا لوشن سوڈے بشراب وغیرہ میں حل کر کے پینا بھی عام ہے۔ ایک طریقہ انجکشن کا ہے۔ جو یورپ میں عام نہیں ہے۔ امریکہ میں عام ہے۔ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں ہے :

**کوکین کا جنون اور علاج** کوکین کھانے کی عادت مالی حیثیت سے بالکل تباہ کر دیتی ہے۔ بلکہ صحت بھی قطعی تباہ ہو جاتی ہے۔ انسان آخر کار پاگل سا ہو جاتا ہے۔ یورپ میں کوکین زیادہ لوگوں کے علاج کے لئے صحت گاہیں اور ہسپتال قائم کر دیئے گئے ہیں جہاں کوکین زدہ لوگوں کا علاج مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ بگڑے ہوئے نظام جسمانی اور تباہ شدہ اعصاب کو درست کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انسانی عقل جو کچھ کر سکتی ہے کرتی ہے۔ ان صحت گاہوں کے ڈاکٹر با معالج عام طبیوں کی طرح نہیں ہوتے۔ کوکینیات کے ماہر ہوتے ہیں اور بعض اوقات خود کوکین زدہ ہوتے ہیں جو بعد میں اس کے تباہ کن اثرات سے متنبہ ہو کر جلد راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ اور پھر طبی تحقیقات کر کے اس کے معالج بن جاتے ہیں۔ کوکین زدہ لوگوں کے علاج میں بھی بڑا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

ایک ڈاکٹر نے کوکین کے اثرات اور اس کی تباہ کن کیفیت ایک شخص سے بیان کی ہے جس کا مطالعہ خانی از دلچسپی و افادہ نہ ہو گا :

**نظام جسمانی پر کوکین کے تباہ کن اثرات** (ایک طبی کوکین خور کو

میں حاصل ہو سکتی ہے ایسی چیز کی تجارت کیوں نہ ترقی کرے کوکین کی قیمت اس قدر زیادہ کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے درآمد کرنے میں لوگ جس قدر خطرہ اور فحشہ برداشت کرتے اور حیرت انگیز طریقے کھانے کی ناجائز ترسیل کے اختیار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قیمت کا بڑھ جانا عجیب انگیز ہیں۔ چونکہ نباتات طور پر خرید و فروخت اس کی ممنوع ہے۔ اس لئے اسے بیچنے کے لئے معمولی تجارت یا مصنوعات کے مقابلہ پر بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیکڑوں لوگوں کے ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی یہ چیز اصل خریدار تک پہنچتی ہے۔ اس لئے ہر ایک کارکن اپنے اپنے خطرہ کے مطابق اس کی قیمت کو بڑھا رہا ہوتا ہے۔

**قانون اور کوکین** کوکین کو بیچنے۔ بنانے۔ کھانے اور کیلئے یورپ اور امریکہ میں نہایت ہی سخت قانون ہیں بہر بند رگا سرحد سمندری علاقوں اور چتے چتے پر کوکین کی ناجائز درآمد کا مقابلہ کرنے اور اسے روکنے کے لئے محکمے۔ سراغرمیں اور بڑے بڑے منظم مقرر متعین ہیں۔ لیکن اس لعنت کو دور نہیں کیا جاسکتا وجہ یہ ہے کہ کوکین بیچنے اور اس کی ترسیل کے ایسے نادر طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ کہ سراغرمانی کا فن ہار مان جاتا ہے۔ علاوہ انہیں جس شہر میں کوکین جاتی ہے وہاں کے بڑے بڑے لوگ۔ ارکان بلدیہ مشہور مصنف۔ تجارت پیشہ لوگ۔ افسر۔ وکیل۔ ڈاکٹر وغیرہ وغیرہ اس تجارت یا اس کے کاروبار میں کسی نہ کسی طرح متعلق ہوتے ہیں۔ پولس ان سب کو کس طرح گرفتار کر سکتی ہے۔ جہاز راں کمپنیوں کے کارندے۔ کپتان اور خزانہ بند رگا ہوں کے قلی۔ افسر اور کارکن نہایت خطیر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر اس تجارت کو روکے تو کون روکے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ کوکین فروشی یا کوکین کی ناجائز درآمد کو روکنے کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں وہ خود اس کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی خاطر سے وہ کوکین درآمد کرتے ہیں۔ باقی ماندہ کوکین اپنے ملک کے دیگر اہل ذائقہ کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی کوئی سلطنت اپنی پوری

جگرہ کار آدمی فوراً پہچان لے گا کہ نہایت نمایاں علامتیں ہوتی ہیں  
زندہ چہرہ - ہوا نیلیاں اڑتی ہوئیں - ہونٹ خشک اور پتلے زبان  
ایشی اور سوکھی ہوتی - جسم لاغر و ضعیف - آنکھیں بے رونق اور  
ڈراؤنی - اندرونی اضطراب کی پوری کیفیات اور نظام جسمانی  
اضطلال کی جملہ علامتیں جسم پر نظر آتی ہیں - مزاج چڑچڑاہٹنا  
پسند خوفزدہ اور خراب ہو جاتا ہے -

کوکین خور کا دماغ خراب ہونے لگتا ہے - پہلے غیر محسوس ہوتا  
ہے پھر آخر ظاہر ہونے لگتا ہے - معمولی سی آواز کو کین خور کو ایک  
گرج سنائی دیتی ہے - ایک معمولی آواز جس پر کوئی آدمی توجہ  
نہیں کرتا - کوکین خور اس پر چونک پڑتا ہے - وہ معمولی حرکت و  
دھڑلہ دھڑلہ چلنے لگتا ہے - دماغ کی رگیں پیکے لگتی ہیں - زبان خشک  
ہو جاتی ہے - اگر کوئی مسکن چیز آپ پی بھی لیں تو کوئی اثر نہیں ہوگا  
آپ دعا کرتے ہیں کہ خدا کے لئے طبیعت پر سکون اور مسکن ہو جائے  
مگر ایسا نہیں ہوگا - طبیعت ہڑاں و پراگندہ ہی رہے گی - آپ کو  
اپنی آواز بھی حسرت ناگوار معلوم ہوتی ہے - کجا دوسرے کی آواز کا  
سننا - اگر آپ بولیں گے بھی تو نہایت آہستہ آہستہ سرگوشی کر کے  
انداز میں گویا آپ کسی چیز سے خائف ہیں - اس کے بعد ہم اور  
خوفناک تصورات کا دور آتا ہے - آپ کی زندگی یہاں پہنچ کر  
ہو جاتی ہے - آپ کو خیالی اور وہی تصورات اور ہیمائیک تصویریں  
پریشان کرتی ہیں - دماغ دھوکے دیتا ہے - دنیا کی ہر چیز مراب  
نظر آتی ہے - آپ کو ہر جگہ پولیس اور سراسر اس نظر آتا ہے جو  
جواس لعنت کی سب سے زیادہ شکار ہوتی ہیں یہی طرح  
پریشان ہوتی ہیں - سڑک کے کھمبے - درخت اور دراندہ آدمی  
انہیں عفریت معلوم ہوتے ہیں -

کوکین خور کے لئے اس حالت میں پہنچ کر نیند بھی نامکن ہو جاتی ہے  
وجہ یہ ہے کہ جسم میں خشکی ہو جانے اور طاقت نہ قائم رہنے کی وجہ سے  
نیند اڑ جاتی ہے - دماغ خراب ہونے لگتا ہے - بھوک بھی غائب  
ہو جاتی ہے - جو رفتہ رفتہ ان کو پاگل بناتی رہتی ہے - اگر ایک  
منٹ کھلے آپ کی آنکھ ملگ بھی گئی تو فوراً اکمل جاتی ہے دفعتاً آپ ایک

خیالی عفریت سے ڈر کر چونک پڑتے ہیں - آپ کو چاروں طرف رنگ  
برنگ کی بجلی کی بیتیاں دن کو جلتی ہوئی نظر آتی ہیں - دوسرے  
لوگوں کی آنکھیں کو سرخ و سبز زرد رنگ میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھتے  
ہیں - آپ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں - اور گزشتہ واقعات پر اظہارِ تا سفت  
کرتے ہوئے سوچتے ہیں - کہ ان کی جسم کیا ہو گیا ہے؟ خدا کا ہیکل کس  
طرح منہدم ہو گیا ہے؟

آپ کا حافظہ بھوکھا ہے - قوت ارادی برباد ہو جاتی ہے  
بغیر کین کی انسوار لئے آپ کا ذہن متوازن نہیں رہتا اگر وقت پر  
کوکین نہ لے لے تو پھر آپ ایک جرائم پیشہ انسان بن جاتے ہیں - اور  
کوکین حاصل کرنے کے لئے جرائم کی مشق اسی زمانہ سے شروع کرتے ہیں  
بعض مریض اس سے زیادہ انوسناک دماغی جہنم میں تر پتے ہوتے نظر  
آتے ہیں - مثلاً بعض لوگ سڑک عبور کرتے ہوئے یہ سمجھیں گے کہ لاکھوں  
میل کا سفر طے کر لیا ہے - ایک مکان انہیں ہاتھی کے برابر معلوم ہوگا -

دیوار پر لگی ہوئی تصویر پر ایک آپ کو شلت معلوم ہونے لگے گا - نیلگوں آنکھیں  
سرخ یا زرد معلوم ہونگیں - عورتوں کو ہر جگہ چہ پھرتے ہوئے بھی نظر آتے  
ہیں - ایک فیشن ایبل لیڈی کو ہر وقت اپنی گردن - ذراک - اور ٹوپی پر  
ایک بے وجود چوہا پھرتا ہوا نظر آئے گا - وہ اسے گھڑی گھڑی جھاڑتی رہے گی  
مگر تصور کا چوہا برابر آنکھوں کے سامنے رہے گا - عورت کی حالت ناگہم  
ہوگی - ناک پر آپ کو کتنی بیٹی ہوئی نظر آئے گی - آپ اسے ہیشاڑ لے کر کوش  
کریں گے مگر وہ جانے کا نام نہ لے گی - دروازہ پر دستک اور اجنبی  
لوگوں کی آوازیں گھڑی گھڑی سنائی دینگیں - حالانکہ حقیقت  
میں وہ آپ کے دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہیں - آپ کمرہ میں محض نانا  
جوش کے ساتھ مٹھیاں بیچتے ہوئے پھرتے نظر آئیں گے اور آپ  
گھبرا کر کھل کھڑے ہوں گے چل پڑیں گے شہر سے دور - میلوں کی مسافت  
ایک پراسرار دھن میں طے کر جائیں گے اور پلٹنے کا نام نہ لیں گے - غرض  
حالت بری ہوگی - آخر!!

ہندوستانیوں کے خطا آپ نے مغربی بلا کی تباہ کاریوں کے معاملہ کا  
پورا مطالعہ کر لیا ہے - آپ کی صحت اور  
دولت و عزت سب اس سے خطرہ میں ہے - کیا آپ اسے اب بھی چھوڑیں گے؟



# غزل

(از جناب فضا جالندھری)

|                                        |                                        |
|----------------------------------------|----------------------------------------|
| پروانے جل رہے ہیں تو ہے اشکبار شمع     | تاثیر سوزِ دل سے ہوئی بیکرا شمع        |
| اس دہریس ہے ہستی ناپائیدار شمع         | ہمان ایک شب کا ہوں میں بھی تری طرح     |
| سوزِ دروں کو کیوں نہ کرے آشکار شمع     | کیا جانے کس کی یاد میں اس کا یہ حال ہے |
| اب کون بزم میں ہو تر اغمگسا شمع        | پروانوں کو تو شام ہی سے توجہ دہلی      |
| گردِ اس کے گھومتی ہے جو پروانہ وار شمع | کون آج بزمِ ناز میں جلوہ نما ہو        |
| تر کر رہی ہے دامنِ دل اشکبار شمع       | کس شعلہ رو کی یاد میں از شام تا سحر    |
| پھر کس الم فیصیب کی ہو راز دار شمع     | جب خود نہ پنے سوزِ دروں کو چھپاسکی     |
| لائی تھی صرف زندگی مستعار شمع          | رواقِ فزائے بزم نہ ہی شب سے تاحر       |

تاثیرِ عشق کا یہ نتیجہ ہے اے فضا!

پروانوں کے فراق میں ہو سو گوار شمع

(فضا جالندھری)

# داستانِ حیات

(از جناب شرمصدیقی رڈولوی)

داستانِ حیات جلد خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ایک اسیرِ محبت، ہستی کی طرف سے ایک دوست کو لکھے گئے۔ مرحلہ بذاتِ خود مکمل ہے تاہم یہ بتادینا بھی ناگزیر ہے کہ ان خطوں کے ضمن میں ایسی داستانِ محبت تحریر کی گئی ہے جس سے لکھنے والے کی مالی، دماغی اور بلندیابی کے ساتھ ہی اس کی احساسِ دلی کی بھی جھلک نمایاں ہے۔ وہ ایک عورت کی محبت میں بری طرح اسیر ہے۔ عجم روزگار کی جفاؤں نے اسے خود فوجی کی نچوڑ میں ابا گرفتار کر دیا ہے کہ وہ مسرت کے لمحوں کو بھی سکون میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ منصفِ نازک کے طبقہ سے بیزار نظر آتا ہے مگر اس میں اتنی ہمت و جرأت نہیں کہ ایک لفظ بھی اس کے خلاف اپنے منہ سے نکال سکے؟

(دُغم صدیقی رڈولوی)

”اس“ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ — ”وہ“ مجھ سے دو باتیں کر لے  
بھر بھی میں اپنی زندگی میں، ایک ناقابلِ بیان خلا محسوس کرتا ہوں  
جہاں! اتم سمجھ گئے ہو گے کہ یہ خلا اسی وقت پُر ہو سکتا ہے۔ جب  
شہزادی کی — آغوشِ محبت ”میرے“ ہمیشہ کے واسطے وقف  
ہو جائے؟

ساتھ تھے وہ اب ایک ایسا زہر ہلاہل تیار کر رہی ہے جو  
عقربِ میرے اور خود اس کے لئے موت کا پیغام ثابت ہو گیا ہے  
میں خود حیران ہوں کہ یا الٰہی امیر اکہا انجام ہو گا۔ مجھے اپنے  
دل پر اب اتنا بھی اختیار باقی نہیں رہا کہ اس کی مرضی کے خلاف  
اپنے لفظ ہی منہ سے نکال سکوں؟ — اسی کا نام بے بسی ہے۔

۹۹۹

جہاں! مجھے ایسے لوگوں کی حالت پر بہت افسوس ہوتا ہے۔  
جو اپنی منفعت کے لئے سارے جہان کا خون کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔  
خود غرضی انسان کے احساسات کو بھی مردہ کر دیتی ہے۔ ذرا غور کرو وہ درود لو،  
جو کبھی میرے لئے عشرت و سکون کا باعث تھے۔ اور جہاں کی نشاط  
آفرینیاں میرے پڑ مردہ دل کے لئے راحت و مسرت کا پیغام لاتی  
تھیں۔ آہ جہاں! اجاں پہلی بار میں شاہزادی سے ملا تھا۔ اُسے مار  
کر دیئے گئے ہیں۔ ایک دھندلی سی تصویر اُن — ”درد و آرزو“  
اب بھی تصویر کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ — بھائی ظلمت یا نینا!  
زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انتہائی قدر و قیمت  
رکھتی ہیں۔ لیکن دنیا کے نامبارک ہاتھ اُن کو تہہ و بالا کرنے میں کوئی  
دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ جہاں! آج کل میں سکون و طمانیت کی زندگی  
گزار رہا ہوں۔ شہزادی ایک طویل مدت کے لئے یہاں آگئی ہے  
اگرچہ اس کی قربت میرے خوابیدہ جذبات کو برا لگنے لگتی ہے  
لیکن اس میں بھی سکون کا کافی شائبہ موجود ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے  
اچھا برتاؤ کرتی ہے جیسا کہ ایک خوش خلق میزبان اپنے مہمان سے  
کرتا ہے۔ — سنا، تعجب کیوں کرنے لگے؟ بھلا جس کے لئے  
میں نے دنیا تاج دی۔ جو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے کیا۔

آج شاہزادی ریشمی سرخ ساری میں ملبوس میری قیام گاہ کے  
قریب سے گزری۔ میں نے دیکھا اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف  
تبسم نمایاں ہے۔ — میں نے ایک سچے عقیدتمند زائر کی طرح  
اس کی خوبصورت رتھ کے چاروں طرف طواف کیا۔ بالکل ہی  
طرح جیسے ایک جاں نثار پروانہ شمع کے گرد طواف کیا کرتا ہے۔ مجھ  
خبر نہیں کہ میں کب تک اپنے عقیدتمند دل کو پہلو میں لئے اس کے نقش

قدم کو دوسرا دیتا رہا۔ اُس کی رتھ میرے قریب سے گزر گئی جالی پائے سنکر تمہیں تعجب ضرور ہوگا۔ کہ شاہزادی کے ہاتھوں میں ہی رومال تھا جو کسی زمانہ میں مجھ سے یہ اصرار لیا گیا تھا۔

وہ چادر بھی اب تک میرے حوزہ جان ہے جو ایک جلوس کے موقع پر شاہزادی نے اوڑھ رکھی تھی۔ دنیا میں جموٹے سکوں کی جو قدر و منزلت ہے وہ خلوص و محبت کے انگینوں کی انہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ میرے عزیز دوست! مجھے شاہزادی کی اس مذموم روخت بہت اذیت ہوتی ہے۔ وہ ظاہری آن بان کو باطنی خلوص پر ترجیح دیتی ہے۔ اور بہت جلد زرد پتوں سے متاثر ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں میرے پاس کچھ نہیں اور اگر سچ پوچھو تو میرے پاس کیا نہیں؟ سب سے بڑا خزانہ اس کی محبت ہے۔ اور اس کی محبت کے سوا مجھے دنیا میں کچھ چاہئے بھی نہیں۔ پیارے دوست! میں غریب یہاں سے رخصت ہو نیو والا ہوں۔ شاہزادی کی روش میں اُسے دن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ہر وقت الٹی گنگا بہتی ہے۔ بہت سی باتیں میرے مزاج کے خلاف شروع ہو گئی ہیں۔ جن سے متاثر ہونے کے بعد میں اپنی عورت نفس کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ابھی کل کا واقعہ ہے۔ شاہزادی سے ایک نوجوان ملنے آیا۔ گھنٹوں وہ اٹھکسی مسئلہ اقتصادیات پر بیٹھیں گفتگو کرتی رہی۔ میں خاموش بیٹھا اُس کی صورت دیکھتا رہا۔ جالی! کیا شاہزادی کا فرض نہیں تھا کہ وہ مجھے بھی اس شخص سے متعارف کراتی؟۔ اس کے معنی تو یہی ہیں کہ اُس نے مجھے ذلیل سمجھا؟۔

————— ﴿ ۳۴ ﴾ —————

میری تودی خواہش تھی کہ شاہزادی کو ایک پل کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے نہ اوجھل ہونے دیتا۔ لیکن قدرت کے خلاف کوئی کام کرنے کی اپنے میں جرأت نہیں پاتا۔ آج شاہزادی کچھ دیر کے لئے گھر سے باہر چلی گئی تھی مختصر لمحے جس کرب و بھینی کے عالم میں گزرے ہیں۔ جالی اس کی کیفیت نہ پوچھو۔

میں اپنی چار پائی لیٹا ہوا تھا۔ شاہزادی نے کھڑکی سے جھانکا۔ سلام کے لئے ہاتھ اٹھائے لیکن۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ

نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید رعبِ حسن مانع رہا ہو۔ مجھے اپنی اس حماقت نما جرأت پر اس وقت تک قلق ہے۔ عزیز دوست! میرا ارادہ ہے کہ میں کچھ دنوں کے لئے تمہارے پاس چلا آؤں۔ شاید اس وقت میری یہ بیچینیاں مہر و سکون میں تبدیل ہو جائیں۔ مگر نہیں جالی! میں تم کو بھی اپنے فکیر کی طرح دھوکا دے رہا ہوں۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی شاہزادی سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔

————— ﴿ ۳۵ ﴾ —————

آج شاہزادی جب میرے سامنے آئی۔ ندامت اور شرمساری کی وجہ سے میری زبان سے ایک لفظ بھی معذرت کا نہ نکل سکا۔ اس کے تیور کچھ بدلے ہوئے تھے۔ غور و فکر کی علامتیں اُس کے خوبصورت چہرے سے مترشح تھیں۔ کل میں نے شاہزادی کے سلام کا جواب نہیں دیا، یہ غم آفرین فروگزاشت میرا سینہ ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ آہ۔ جالی! بعض اوقات میں یہ سوچ کر چھران ہو جاتا ہوں کہ میں اور شاہزادی سے محبت؟۔ اُس کے حصول کی آرزو؟۔ میری ساری امیدیں مجروح ہو جاتی ہیں۔ اور۔۔۔ لالچ و آرزوئیں ایک خدفاک خواب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اللہ میرا کیا حشر ہوگا۔ جالی! جس کے لئے میں نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ کیا وہ میری کہیں نہیں ہو سکتی؟۔

————— ﴿ ۳۶ ﴾ —————

سناتم نے ہنر جمائے ہوئے پتوں گلے کا ہار نہیں ہوتے! جالی! وہ زمانہ یاد کرو جب میں دنیا میں شاہزادی کے لئے ہر کام کر سکتا تھا۔ دنیا میرے نقش قدم پر چلتی تھی۔ نوازش کی جب بارشیں ہوتی تھیں۔ اس وقت میرا وجود بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب میرا وجود۔۔۔ وجودِ باطل کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانہ تعیش پسند واقع ہوا ہے۔ غم کا سامتی دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ جالی! میرے چاہنے والے مجھ سے اب کتنا رہ کر رہے ہیں۔ وہ موقع کے

وہ اس لئے کہ — میرا دل محکوم ہے میرے دماغ کا اجماع دماغ  
دل پر حکومت کرتے ہیں وہ انسان انتہا سے زیادہ ضبط کے خوگر  
ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے جو دل — دماغ پر حکومت کر کے  
مادی ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک بھرے ہوئے پیما کی طرح چمک  
اٹھتے ہیں — سمجھے جانی! یہ مالی طرفی کی دلیل ہے۔ میں  
انتہائی مصائب اور روحی تکالیف برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن  
یہ کبھی نہیں گوارہ کر سکتا کہ اپنی قلبی کیفیات کو منظر عام پر لا کر کسی کی  
رسوائی کا باعث بنوں؟ مجھے دنیا میں کچھ نہ چاہئے۔ تلم لڑتیں ہیں  
اپنی ختم شدہ طویل زندگی میں حاصل کر چکا ہوں۔ اب ہر وقت  
شاہزادی کی خوشنودی مجھے مد نظر ہے! —

(۸)

جمالی! — خط ملا۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ تم عنقریب  
میرے پاس آنے والے ہو۔ یہ خط میں تم کو سفر کی حالت میں نگہ رہا  
ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ سال گذشتہ شاہزادی نے مجھے ایک تصویر  
دی تھی۔ جس میں چند سیلیوں کے درمیان وہ ایک ادائے مکنسٹ  
ساتھ کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ گویا — ستاروں نے چاند کو  
اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ اب تعاضل ہے۔ میں وہ تصویر شاہزادی  
واپس کر دوں۔ پیار سے جمالی! جب اس کی تصویر میرے صفحہ دل پر  
نقش ہے۔ تو مجھے ان کا فدی نقوش کی کیا ضرورت؟ کیوں نہ  
واپس کر دوں — مجھے دیکھنا ہے کہ وہ تصویر واپس لینے کے بعد  
میرے — دل سے بھی — اپنی تصویر پیچیدہ کر سکتی ہے؟  
جمالی! میں نے ایک انتہائی خوفناک خواب دیکھا ہے۔ جس سے  
طبیعت سخت پریشان ہے — دعا کر و تعبیر میرے حق میں  
خوشگوار ثابت ہو!

(۹)

آج کل جی رہی ہے۔ کچھ نہ بوجھو۔ راقی غم میں  
ڈوبی ہوئی ہیں۔ دل سے نشاط آگیں تصور رخصت ہو چکا ہے  
ولولہ انگیز خواہشوں کی جگہ اس چھائی ہوئی ہے۔ آف جمالی!  
میری روح کانپ رہی ہے۔ شاہزادی کے مرمریں جسم کی حرارت کا

بانی رہتے ہیں کہ میری ذرا سی غفلت ہو اور وہ اپنی جو فروشی کا  
نہایت آن و اہد میں پیش کر دیں۔ میری خفیف ترین فروگزاشت  
ان کے نزدیک گناہ عظیم کے مترادف ہوتی ہے۔  
مجھے اپنی زندگی کا ہر پہلو اب تاریک نظر آ رہا ہے۔ وقت سے  
پہلے غم کا اظہار آئین محبت میں ممنوع ہے لیکن جمالی! — پانی  
اب سستہ اچھا ہو چکا ہے۔ میری زندگی ایک طوفانی زندگی بن چکی  
ہے۔ میں کا روبرو درمختص یاد و بار اس کی فرادانی پتھر ہے۔ اس  
بعد میری زندگی — سکون کی زندگی ہوگی؟

(۱۰)

جمالی! جب میں اپنی زندگی کے اس انقلاب آمد میں پہلو پر  
نہ رکتا ہوں۔ جس نے مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔ یقین مانو  
مجھے خود تعجب ہوتا ہے! — یا خدا! کس گناہ کی پاداش  
میں مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ اس ابتدا کی انتہا کب ہوگی؟  
— مستقبل کی امیدوں پر حال کی زندگی تلخ کر لینا دشمنی کے  
غلاف ہے۔ یہ جانتا ہوں — میرے عزیز دوست! لیکن  
احساسات کے سیلاب کو کیا کروں جو مجھے مال کی وادیوں سے علیحدہ  
کر کے — مستقبل کے دلفریب اور بے پایاں سمندر کی طرف  
بہائے لئے جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک تنکا —  
پانی کی رو پر انجام سے بے خبر موجوں کے رحم و کرم پر بہتا چلا جا رہا  
ہو — شاید اس زندگی کا انجام موت کے پردے میں  
پوشیدہ ہو؟

(۱۱)

میں کہا ہوں۔ ہوائے تیز کا ایک بے ثبات جھونکا؟ پھر  
جمالی! — کیوں نہ طمانیت کی زندگی گزاراؤں جبکہ شاہزادی  
مجھ پر انتہا سے زیادہ حیران ہے۔ وہ مجھ سے اچھا سلوک کرتی ہے۔  
اس کے لبوں کا خفیف سا تبسم میرے خوابیدہ جذبات کو آن و اہد  
میں بیدار کر دیتا ہے۔ میں نے لاکھ بار چاہا کہ جھوپڑی کے گوارے  
میں رہ کر محلوں کے خواب نہ دیکھوں۔ لیکن دل سے انسان مجبور  
ہو جاتا ہے — اور اگر سچ بوجھو تو مجھے اپنے دل پر ناز بھی ہے

احساس مجھے چھوٹے جا رہا ہے۔ میں اس کے بغیر اس دنیا کی ضامیں سانس نہیں لے سکتا۔ اندھنوں کی خیالات دماغ سے کسی وقت دور نہیں ہوتے۔ اسے کاش میں اپنی پوری وقت صرف کرنے کے بعد شاہزادی کو حاصل کر سکتا!

تم نے بھی انکساری کی حد کر دی۔ بس بس مجھ سے اتنی خیریت نہ برتا کرو۔ خدا نخواستہ تم کس بات میں کسی سے کم ہو۔ یہی نا کہ دولت کے نشے میں نہیں ڈوبے ہو جو — انسانی درد کو بھی کھو بیٹھو! — کیا جھوٹے موتیوں کی چمک بچے موتی کی توقیر کھ سکتی ہے۔ نہیں؟ ہرگز نہیں؟ پھر بلاوجہ انکسار کیا؟

میرے اس خواب کی تعبیر ظاہر ہو گئی۔ اسی مہینے شاہزادی شادی ہو نیوالی ہے۔ دماغ ابھی سے ریکارہ ہو رہا ہے۔ جو اس جواب دے رہے ہیں۔ عجب مایوس کن کشمکش میں مبتلا ہوں — یا اللہ اس کے بعد میرا کیا حال ہوگا۔ اس مبارک تقریب پر شادی لے بیٹھیں گے ہر شخص مسرت کی دلیوی سے ہم آغوش ہوگا اور — میں ایک کونہ میں پڑ اپنی جذباتی پر خون کے آنسو بہاؤں گا! —

ختم بار باد میرے زخموں کو کر دیتے ہو۔ مجھے شاہزادی سے کیوں محبت ہے آہ — جمالی بایرن پوچھو! میری آنکھوں سے اُس کی خوبیاں دیکھو! میرے دل سے سوال کرو کہ وہ کیوں اس کی پرستش کرتا ہے۔ لیکن میری زبان صرف اک آہ — دلفگار آہ کے سوا ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی — بہت کچھ سوچتا ہوں! سمجھتا ہوں لیکن لاالہ الا اللہ! روشن پہلو کو تاریک نہیں بنا سکتا۔ اس کی طویل جدائی اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے!

میرے عزیز دوست ہاں شعلہ بے پناہ کو کیونکر چھپاؤں — وہ انتہا سے زیادہ ظاہر پرست بن گئی ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے — جمالی! مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ کسی زمانہ میں میری ہوگی — یا میری آخری سانس بھی اسی آرزو میں فنا ہو جائے گی؟ —

جمالی! میرا نفس اب مجھ سے گریزاں ہے۔ رقابت بھی محبت ہی کا ایک جذبہ ہے جو میری رگ رگ میں پیش زنی کر رہا ہے۔ خدا کیلئے مجھے تم ترک محبت پر مجبور نہ کرو۔ یہ تمہارے الفاظ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ نہ میں نے اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنا کوشش کی اور نہ میں اس کو فراموش کرنے کی سعی کر سکتا ہوں۔ میں دنیا کی ساری چیزیں اپنے سے علیحدہ کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں گوارا کر سکتا کہ شاہزادی کی محبت میرے دل سے علیحدہ ہو میرے حریص دل پر شاہزادی کے سوا کسی دوسرے کا قبضہ نہیں ہو سکتا — میرے سینے کی آگ ہر لمحہ — ہر ساعت — شعلہ ریز ہوتی جا رہی ہے۔ — مجھے اندیشہ ہے کہ میں جیسے خرمین حیات کو ہمیشہ کے لئے نہ خاکستر کر دے!

میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اپنی حالت کا صحیح الجھنا تم پر نہیں کر سکتا۔ اے کاش مجھے چند ساعتیں شاہزادی کی قربت میں بسر کرنے کی لمبائیاں اور میں انہیں اپنی زندگی کے عوض خرید سکتا آف جمالی! زمانے کی بندشیں میری فطرت کو پیسے ڈالتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو مجھے خطرات کا پھندا اپنا گلا گھونٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر دست بہیرے سکون کی مثلاًشی روح — اضطراب کی لہروں میں بھی سکون سامحوس کرتی ہے۔ شاید مستقبل کا کوئی سنہرا لمحہ مجھے سرشاری کے گوارے میں بھیج دینا کر دینا سے بے خبر کر دے؟

خود فرتی کی آخر کوئی انتہا بھی ہے۔ ہم روز بروز آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مگر منزل کا پتہ نہیں۔ بتاؤ آخر محبت کی سرحد کہاں ہے۔ یہ تم نہیں تو اور کیا ہے کہ شاہزادی کی موجودگی میں بھی زمانہ مجھے اطمینان کی صورت نہ دیکھنے دے؟ — تم بالکل سچ کہتے ہو۔ واقعی میری فطرت کا خمیر — عشق و محبت کی جنون انگیز دنیا ترتیب پایا ہے۔ ہاں مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں محبت اور صرف محبت کا بھوکا ہوں اور وہ — بھی شاہزادی کی! میں اپنی

عنقریب یہاں سے باہر ملنے والا ہوں۔ اور کچھ دنوں تک ادھر کا رخ بھی نہ کروں گا۔ اس لئے کہ ہوا کئی دن سے میرے خلاف چل رہی ہے۔ میرا یہاں سے چلا جانا ہی میرے حق میں اچھا ہے۔

(۱۵)

جالی! — تمہارا خط ملا۔ مجھ کی نشاۃِ آفرینیاں اور تمہاری زبانِ قلم سے کچھ نہ پوچھو۔ قلبی بے چینوں کا اظہار ناممکن ہے! — جذبات کی فراوانی رگ رگ میں چھپا چھپے دیتی ہے۔ دل چلا جا رہا ہے۔ آرزوؤں کی وسعت۔ — تمناؤں کا طوفان مجھے دریائے فکر میں ڈبوئے دیتا ہے۔ کاش زمانہ مجھے اتنی ہمت دیتا اور یہ فردوسی مناظر مجھے شاہزادی کی آغوش تک پہنچا دیتے۔ ماسوا کا غم ہر نفس پر چھایا ہوا ہے۔ آف یہ احساسِ زندگی کے قیمتی اور زریں لمحات کو تلخ بنانے دیتا ہے۔ یہ جاں سوز غلش میری صحت کو برباد کر رہی ہے! قدرت نے دنیا بھر کی ناکامیاں میرے حصے میں دیدی ہیں۔ افسوس یہ طویل جدائی کے دن کس طرح ختم ہوں گے؟ — نگاہِ باس سے ہر سو نگراں ہے۔ لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو مجھے قفسِ آلام سے آزاد کر سکے! میری قیام گاہ کے قریب ایک خوبصورت آبشار ہے۔ — جہاں شام کو میں روزِ تفریح کرنے جاتا ہوں۔ روکپن کا وہ معصوم یادگار جھیل جس میں کبھی — ہم اور تم غوطے لگا کر سکون حاصل کیا کرتے تھے! بے اختیار یاد آ جاتی ہے! — جالی یہ ٹھنڈی ہوا کی موجیں رات بھر میرے دل کو ڈسا کرتی ہیں۔ اے کاش یہ ہوا کی روانی ہی مجھے شاہزادی کے قدموں تک پہنچا دیتی! ۱۶

(۱۶)

آج صبح کو میں شاہزادی کے دربار میں پہنچ گیا۔ شانِ رحمت کے قریب! ہم ایسے گنگنا روں کی التجائیں بھی ٹھوکریں نہیں کھاتیں۔ شاہزادی مجھے دیکھتے ہی حیرت میں آگئی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک قسم آمیز چمک نمایاں ہے

الٹا زندگی کی تصویر تھاری نظروں کے سامنے کیونکر پیش کروں؟ — میری قید بڑی سنگین ہے۔ اور میرا جرم اس سے بھی زیادہ سخت؟ — جرمِ محبت کے قیدلوں کی سزا جہان فی نہیں ہوتی! ان کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ پھر بتاؤ جالی! — میں اپنی روح کا ادیتوں کو تم پر کیسے ظاہر کروں؟ ۱۷

(۱۷)

پیارے جالی! اگر سچ پوچھو تو میں اب مرنا بھی نہیں چاہتا۔ خدا کی قسم یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ میں اپنا وجود اب ضروری سمجھنے لگا ہوں۔ نہ جانے شہزادی نے کون سا سحر کر دیا ہے۔ اب اگر جینا چاہتا ہوں تو اس کے لئے — جالی تم نے میری فطرت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم بھی مجھے عوام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ تمہارے نزدیک ظاہری آسائش قلبی کوفت کو دور کر سکتی ہے۔ کیسی باتیں کہتے ہو جالی! دنیا میں وہ کر قلبی سکون حاصل کرنا ہو انکو مٹھی میں بند کرنا ہے۔ میرے تفکرات میرے دم کے ساتھ ہیں۔ اب یہ تلخیاں جزوِ حیات بن گئی ہیں۔ جن کا ٹھکانا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس نے آلام کی فضا میں آنکھ کھولی ہو وہ کیونکر — مسرت کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ — میرے پیارے تم میری محبت کے معترف ضرور ہو مگر پھر بھی یہ نہیں جانتے کہ میں شاہزادی سے کتنی محبت کرتا ہوں؟

(۱۸)

آہ! میرا احساسِ دل اکثر میرے لئے سخت گراں ثابت ہوتا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ دونوں کے دونوں — محبت کے لطیف جذبے سے محض نا آشنا ہیں۔ ایک شوق کی فراوانی میں مبتلا! دوسرا تمول کی زنجیروں میں گرفتار! — حسن کی دلفریبی کو میری نظروں سے دیکھو! دلشگی مجھے سو شاہزادی کی قربت کے کسی شے سے نہیں ہو سکتی! — دل کی دنیا ناریک ہے — ہلالِ محبت پر چھوڑی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں! غم و یاس کی دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ جالی! میں

اب نہ موسم برنگال کی آمد کا احساس ہے۔ نہ ان کیف سامانیوں کی خبر جو کبھی دہائے محبت کے ہر ذرے میں بخودی کے بلے پناہ جذبے پیدا کر دیتی تھی۔ آہ اب تو ایسی ہولناک بستی میں گم ہوں، یہاں۔ یاس و ناامیدی۔ غم و اندوہ کی ہیمیاں گھورتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جمالی! ان حزاں رسیدہ لمحوں میں بھی شہزادی تصور ہر اثر یک مال ہے۔ میری متالم ہستی پر وہ چھائی ہوئی ہے۔ آفت میں انتہائی گنگنا رہوں۔ ضمیر کی غلط افواہ از اکثر میری حالت دگرگوں کر دیتی ہے۔ اے کاش میں اپنے گناہوں کی سزا۔ خود بن سکتا۔

۱۸

دل کی تاریک دادیوں میں اب تک قندیل آرزو روئے ہے۔ سناتم نے جمالی! باب الفردوس پر کھڑا ہوں۔ مگر اندر جانے کی اجازت نہیں؟۔ مجبوری کی دشوار گزار راہیں، راہ شوق میں پہاڑ کی طرح مائل ہیں۔ وہ فاضلہ چنگ رگوں میں خون ٹکرا کر پانی کی شکل اختیار کر چکے۔ قید و بند کی ہولناک گور میں تڑپ رہا ہوں۔ اطمینان و آزادی کا احساس لینے کی اجازت نہیں؟ مجھے یہاں ہر چیز میسر ہے تاہم جسے دوست و سکون کہتے ہیں۔ اس کا میرے لئے فقدان ہے!

یہاں کا موسم انتہائی خراب ہے۔ دن بھر خوفناک ہوائیں چلتی ہیں۔ ساری دوپہر جنہی شعلوں کے حصار میں گزرتی ہے۔ یہ تیش آفریں لمحے اور بھی زندگی کو خاکستر بنا رہے ہیں۔ جمالی ایسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے عورت و توقیر نہ چاہئے۔ غفلت و دولت کی خواہش نہیں۔ میں تو صرف محبت کا بھوکا ہوں۔ تم دل کی باتیں خوب سمجھ لیتے ہو، واقعی میں نے اسی انتظار کے لئے شہزادی کا خط بھیج دیا تھا کہ اس نے بھی کبھی مجھ سے محبت کی ہے؟

تم نہ جانے کس دھن میں بار بار مجھے خبریں بھیجنے کی باتیں کرتے ہو۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ اگر میں خوش بھی رہوں تو کیا شہزادی کی طویل مفارقت ہی میرے لئے کیا کم ہلاکت آفریں ہے؟ جمالی! اس کے بغیر صبح و شام کی گردش میرے لئے بیکار ہے۔

وہ گھنٹوں مجھ سے میٹھی گفتگو کرتی رہی۔ میں نے اپنی مباحث کے پھپھ و اوقات سنائے۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ میٹھی سنتی رہی!۔ جمالی! اس کو مسرور دیکھ کر میں کنول کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ محبت کے خوابیدہ جذبے چونک اٹھے!۔ بخدا میری تسلی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ شہزادی مجھ سے دلی خلوص سے ملتی ہے۔ اپنی مجبوریوں کا مجھے خود احساس ہے۔ مگر اضطراب انگیز ہے کیا کروں۔ جو مجھے اب تک دھوکہ دے رہی ہے۔ جمالی۔ مجھ میں اب اتنا ضبط و تحمل کہاں جو انجام پر نظر کر سکوں؟ گوزمانے نے ہم سبق دیئے۔ لیکن عبدالمصطفیٰ کے اوقات اب تک بھلے نہیں؟ شہزادی کی محبت میری عقل کی روشنی میں چمکی ہے۔ دل کی تمنائیں مجھے نابینا بنا کر۔ دہائے محبت میں بھٹکنے کا حکم صادر کر چکی ہیں اب مجھے اتنا بے ہوش کہاں جانشین و فرازدیکہ کر چلوں؟۔ شہزادی مجھ پر انتہا سے زیادہ مہربان ہے۔ آج اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے ایک شاداب آڑ کا تحفہ پیش کیا۔ لیکن خود فربہ کا برا ہو۔ قسمت کی تاریکیاں اسی طرح دماغ میں غلش آفریں خیال پیدا کر رہی ہیں۔ کاش اس ظاہری غلوں کے تحفہ میں باطنی غلوں بھی پوشیدہ ہوا!۔

۱۹

جمالی! جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ہر چیز پر یاس و اندیشہ کی خوفناک تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر وہی گھر ہے اور میری جنوں انگلیاں!۔ زندگی ہے یا عالم برزخ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک دھندلا سا تصور عہد رفتہ کا ہر وقت پیش نظر رہتا ہے۔ ذرا غور کرو وہ شخص اپنے سینے میں خار و غم کی غلش کیسے محسوس کر سکتا ہے۔ جس کے تاؤوں میں کبھی ایک کانٹا بھی نہ چھبھا ہو۔ عیش و عشرت کے گہوارے میں میٹھی نیند سوئے والے دوسروں کی شب بیداری کا حال نہیں جان سکتے۔ پھر جمالی! میری تلون مزاجی حبش اور شکوہ فصول۔ ایسے ہی وقت روح یاس و ناگامی بندشوں کو محسوس کر کے پھر پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ تم نے موسم برنگال کی کیف سامانیوں کا ذکر کیا ہے۔ میرے دوست؟





جان کر انجان بخت تم پر زب نہیں دیتا۔ بھلا اب سوچئے اور سمجھئے کی  
 قوت کس میں باقی رہ گئی ہے؟ دل کی اگر لہ جیتے ہو تو یہ ہے۔  
 ایک بار میں پھر۔۔۔۔۔ "شہزادی" کی ہر شخص محبت میں مدہوش  
 ہو کر دنیا و مافیہ سے اسی طرح بے خبر ہو جاتا چاہتا ہوں۔  
 جس طرح ۸ رجون کی سکون آفریں رات میں اُس نے مجھے بام  
 سرشاری ہلا کر ایسے باہر کر دیا تھا!۔۔۔۔۔

خطا۔ لیکن وہی غیریت میں ڈوبی ہوئی تحریر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر تمہارے دل سے یہ فحش آفریں کھٹک مٹاؤں؟ اگر میری فروگداشت کا کفارہ میری جان ہو سکتی ہے تو تم مشوق سے بار بار میرے دل پر احسان احسان کی ٹھیس لگا کر مجھے ہلاک کر سکتے ہو۔ میری طرف سے ہمیشہ تمہارے دل میں ————— "عذوبہ غیریت" رہا۔

بس وہی پھر عود کر آیا ہے۔ جس سے تم خود قلبی انتشار میں مبتلا ہو اور  
مجھے بھی خیر زندگی اور ندامت کے بحر عمیق میں غوطہ زن کر دید ہے۔ بلا  
وجہ قلبی ہنگامہ آرائیاں نہ ہونی چاہئیں۔ میں اور تمہیں شرمندہ  
کروں۔ خدا اس دن کے لئے مجھے زندہ نہ رکھے۔ تم مجھ سے زیادہ  
زود سرخ معلوم ہوتے ہو۔ میں اور تمہارے ضمیر کو دھوکا  
دوں۔۔۔ بس حد ہو گئی! زیادہ سنا نہیں جاتا۔ جب تم کو

میرے الفاظ میں طنز اور اشتباہ نظر آتا ہے تو پھر میری بہتری بیکار اور — میرا دعائے دوستی فضول ہے۔ اگر تم مجھے اپنا سمجھتی ہو تو کبھی یہ نوبت ہی نہ آتی — ہاں ہاں اس کے اظہار کی ضرورت نہیں! خوب معلوم ہے کہ — تم کسی کے نہیں! لیکن یہ خیال کہ تمہارا بھی کوئی نہیں — تمہارا القباسِ فطرت ہے! جسے غیر سمجھ وہ غیب ہے۔ ورنہ محبت کی نگاہیں بیگانہ روی کی تاریکیاں مٹا دیتی ہیں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو لیکن یہ بار بار اظہارِ تشکر کیسا؟ — خدا کے لئے بس ہو چکا — جانے دو

تم جیسا عالی دماغ انسان محض شبہ کنی رہنا پر محبت کے آگینہ کریوں  
 شکست کر دے۔ حیرت ہے۔ تعجب ہے۔ سو سائشی کے اثرات  
 تم نے بھی قبول کر لئے۔ بُرائے ماننا و ہاں سب کے سب ایک ہی رنگ

ہیں۔ قسمت دیکھیں سر راہ پر مجھے فخر تھا وہ خود مجھ سے اپنا دامن  
کھینچتا نظر آ رہا ہے۔ دیکھنا ہے ابھی قسمت کیا کچھ دکھائی ہے۔ سن کس  
تو مہم اس قابل نہ تھا کہ قلبی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ ماہر نے میری  
ساری کیف سامانیاں چھین لیں۔ خیر اگر تمہاری ہی خوشی  
ہے تو۔۔۔ میں زندگی بھر دن رات کو تیار ہوں۔ ۶۹۔

جہاں! کیوں زخم خوردہ دل کو چھینڑتے ہو۔ مجھے دل کی آگ میں جل بجھنے دو۔ سچ ضرور کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن جو خود کھڑا ہو۔ اُس پر دوسری تلخی کا اثر کم ہوتا ہے۔ جسے اس بات کا احساس ہے کہ شاہزادی کو میری وجہ سے بدنامی کی تلخی چکھنا پڑی — جس کی سزا اگر دیکھو تو قدرت مجھے دے چکی! خود اپنے ہاتھوں محبت کے کنویں میں ڈوبا ہوں۔ ثواب تک بھی تنہا جاؤ لگا۔ مجھے کسی دوسری ضرورت نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ واقعی میں ہمیں اس قدر بلند فطرت انسان نہیں سمجھنا تھا — خدا کے لئے مجھ معاویہ، کروامیری کمزوریوں کو نہ دیکھو، تمہارے سارے الفاظ سنہرے اور قیمتی ہیں۔ کاش اس سے پہلے میں نے تمہارے جذبات کا اندازہ کر لیا ہوتا — جہاں! بدگمانی انسان کو بالکل اندھا کر دیتی ہے — مجھے اپنی کمزوریوں کا بخوبی احساس ہے۔ یہ ہم ناکامیوں سے عقل و ہوش چھین لئے ہیں تاہم میں شاہزادی کی شدید محبت میں گرفتار ہوں!!

(۲۴)

میں تمہاری رائے سے کبھی متفق نہیں ہو سکتا۔ کیا دوسروں کی  
پرمسرت زندہ گی میرے لئے وجہ سکون بن سکتی ہے؟ ہرگز نہیں!  
میرے لئے مسرت عناق ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو مسرت وہ شے ہے  
جس کو نہ دولت خرید سکتی ہے نہ بادشاہت۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر مسرت کی تلاش ہے تو جھوڑی  
 خاک چھانو! ————— جمالی! اگر عمیق نظروں سے دیکھو تو حقیقت  
 بھی یہی ہے۔ ایک تھکے ہوئے مزدور کا چمکتا ہوا اچھرہ دیکھو اور —  
 ایک امیر بیروز کی صورت پر نظر ڈالو۔ انصاف سے کہو۔ کون بسوئے

سرت کار اصل میں محبت کی لڑائیوں میں پوشیدہ ہے۔  
یہ میرا قول ہی نہیں بلکہ تجربہ ہے۔ جس قدر محبت کی لڑائیوں میں کھوئے  
جاؤ گے۔ سرت تم سے قریب ہوئی جائے گی! — میں خود  
اپنے کو دھوکا دیتا ہوں جاتی اپنی محبت تو مجھے اسی وقت حاصل  
ہو گئی۔ جس وقت — شاہزادی نے میرے قلموں میں محبت  
اپنے دل سے اعتراف کیا!! —

!!! — !!! — !!! — !!! — !!! —

جالی! مجھے کل شاہزادی کے ہمراہ ایک طویل سفر کرنا ہے  
ابھی سے خوش ہوں۔ اس کی دلنواز قربت کا احساس میرے جذبات  
میں ایک غیر فانی ہتھوڑا پیدا کر رہا ہے۔ ایسے وقت جو سرت میرے  
قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ تم بخوبی کر سکتے  
ہو۔ خدا جلنے اس کی ہستی میرے لئے کیوں سرمایہ نشا طبعی جاری  
ہے۔ — تم یقین نہ کرو گے جالی! میرے سیاہ فام غم میں  
امید کی کرنیں پھر بناؤں پھیلا رہی ہیں۔ عجب ہجان آفریں ابتلاں  
گرفتار ہوں۔ اس کی طبیعت کا جوش و خروش ہوائے تندہ کے غیر  
مستقل جھونکوں کی طرح ہے۔ — کرایا اور نکل گیا! —  
تبدیلی نفس کی حالت بالکل بدلتے ہوئے دریا کے مانند ہے جس کو کسی  
مالت قرار نہیں۔ پھر بتاؤ جالی اس کی فریب آگیاں باتوں کو لیتے  
کیسے تعبیر کروں؟ کبھی اس کی نوازشات مجھے جنت کے کیف پر  
تخیلات میں گم کر دیتی ہیں۔ اور — کبھی اس کی فطرت کا  
تغیر آفریں رویہ مجھے دوزخ کی آگ میں پلنے کے لئے مجبور کرتا ہے  
— تمہارے نزدیک محبت میں رقابت کا عنصر ہونا بھی  
ناگزیر ہے۔ میرے عزیز دوست یہ خیال کاش تم میرے فلسفہ محبت  
میں نظر رکھتے ہوئے ظاہر کرتے تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا —  
میں جس سے محبت کرتا ہوں اپنے دل کی تمام مجبوریوں سے مجبور ہو کر  
پھر اگر اس ہستی کو بھی کسی دوسرے کے ساتھ محبت ہے تو اس میں  
رقابت کی کیا ضرورت؟ انصاف سے اگر دیکھو تو وہ بھی مجبور ہے  
— اور اگر سچ پوچھو تو — میں جس ہستی کو اپنی جان سے

زیادہ عزیز رکھتا ہوں جس کی میرے دل میں سب سے زیادہ عزت  
تو قیہ ہے۔ بھلا وہ ہستی میرے سوا کسی دوسرے سے محبت کر سکتی ہے  
نہیں! ہرگز نہیں! پھر بلا وہ شک و اشتباہ میں پڑ کر اپنی موجودہ  
حوشگوار زندگی کو تلخ بنانا دانشمندی کے خلاف ہے — تم کہو گے  
محبت کی رمز شناسیوں میں گم ہو کر انسان دانشمند کہاں رہ جاتا  
ہے؟ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو  
اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں سے بھی خبردار کر دیتا ہے جو قوت  
وہ کسی مخرب اخلاق عمل کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ اس کا ضمیر ایک  
بدترین اعمال پر ملامت کرتا ہے؟ —

جالی! میں کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ — دعا  
کرو! اٹلئے راہ میں مجھے شاہزادی کی تلون مزاجی سے دوچار نہ ہونا  
پڑے؟

نام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہوا میرے اس مبارک  
سفر پر اوداجی نغمے الاپ رہی تھی۔ جس وقت شاہزادی نے گاڑی کے  
اندہ قدم رکھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ بالکل کیا میں کبھی شاہزادی کی  
قربت اس آزادی کے ساتھ حاصل نہ کر سکوں گا۔ جو اس وقت مجھے  
میرے۔ دنیا میں رہ کر روحی مسرت حاصل کرنا جالی! ہر انسان کے  
قسمت میں نہیں ہوتا۔ روحی مسرت کے معنی کہیں تم دنیاوی دولت کے  
نہ سمجھ لینا۔ یہ مسرت جھوٹے سکون سے نہیں خریدی جاتی۔ اس کے  
حاصل کرنے میں جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔

ہاں سنو! میں تمہیں ایک انتہائی افسوسناک واقعہ سناتا ہوں  
غالباً تمہیں سنکر ذرا بھی استعجاب نہ ہو اس لئے کہ تم شروع سے میرا  
مجدوبیت کے قائل ہو۔ مگر میرے لئے یہ واقعہ ایک اہمیت ضرور  
رکھتا ہے۔ — گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ متحرک تھی۔ چونکہ  
غیر دلچسپ جھونکے میری نظارہ بازی میں غلٹ تھے۔ شاہزادی سے ملا  
ہوا میرا کپڑا ٹٹٹ تھا۔ بہت دیر تک میں اس کے حسن و جمال کی کیفیات  
میں کھویا رہا۔ مجھے خبر نہیں کہ درمیان میں کتنے اسٹیشن آئے اور نکل گئے  
— دفعتاً شاہزادی نے اپنا خوبصورت و نازک ہاتھ میری

اور نکل گئے! کیا میں نہیں چاہتا کہ اس بار سے نجات حاصل کر سکوں جس کا میں اہل نہیں۔ مگر پیارے! دل کچھ اس طرح اس کی محبت محبت میں اسیر ہو چکا ہے کہ میری ساری کوششیں بے سود اور میری ہر سعی بیکار نظر آتی ہے اور — میں کسی طرح اپنے کو دام محبت سے آزاد نہیں کر سکتا۔ محبت کی تباہ کاریاں — آف جمالی! کچھ نہ پوچھو! کتنی شدید ہوتی ہیں۔ اے کاش تم نے بھی — کبھی کسی نے محبت کی ہوتی — تو اس جاں سوز جذبے سے واقف ہوتے!!

~~~~~۲۸~~~~~

جمالی! تمہیں خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کون سی ایسی روحانی اذیت تھی جو میں نے یہاں نہیں اٹھائی؟ بہت کچھ جمیل چکا ہوں۔ اب تنہائی ہے اور خاموشی — ایسی خاموشی جہاں اپنی مدد ابھی کالوں میں نہیں آتی نکل سے میں نے بنی داستان حیات کی ورق گردانی شروع کر دی ہے۔ صنف نازک کی فطرت کا عمیق نظروں سے مطالعہ کر چکا ہوں۔ ان کے سنہرے جال میں مچس کر ان تباہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی تم ان کے قریب نہ جانا۔ میں جتنا عورت کی ذات سے ڈرتا ہوں — دنیا میں کسی دوسری شے سے نہیں ڈرتا میری زندگی کا ذرہ ذرہ ان کی فریب کاریوں کا شکوہ سنج ہو — میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنے کو ان کی قربت سے دور ہی رکھنے کی کوشش کرو لگا کر جمالی! — آگ جب جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو اس میں دوسری آگ کی گرمی شعلے نہیں پیدا کرتی۔ — پھر میری یہ احتیاط میرے لئے کیے — سکون و منفعت کا باعث بن سکتی ہے؟

(ثمر صدیقی راولپی)

طرف برصغیر ہوئے ایک لٹری رومال مجھے پیش کیا! جس کی مست کن خوشبو نے گردہ پیش کی مذموم فضا کو معطر کر دیا۔ جمالی! میری مسرت کا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ شاہزادی کے اس خلوص و محبت سے مجھے کتنی خوشی حاصل ہوئی ہوگی؟ میں نے رومال اپنی جیب میں رکھ لیا۔ آج مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کی ساری دولت اس کے مقابل میں ایک حقیر شے ہے۔ وہ چیز جو خلوص و محبت سے حاصل کی جائے اس دولت کہیں زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ جس کے حصول کے لئے دنیا والے اپنا منہمیز و خست کر ڈالتے ہیں — مجھے تعجب تھا کہ شاہزادی آج یہ تحفہ مجھے کیوں دیا — لیکن جمالی یہ میری خود فریبی کا نازکیا پہلو تھا؟ وہ راستہ بھر مجھ سے نہایت سنجیدہ گفتگو کرتی رہی۔ جو وقت میں ٹیشن پر انرا میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ رومال میری جیب سے غائب تھا۔ آف جمالی میری روح نے جو اذیت محسوس کی۔ بخدا اگر مجھے کسی جرم کی پاداش میں پھانسی کا حکم دیا جاتا تو مجھے یہ تکلیف نہوتی جو شاہزادی کے بیش قیمت عطیہ کے ضائع ہو جانے سے ہوئی؟ — جمالی! اے کاش تمہیں میری شدید محبت کا احساس ہوتا کہ میں — شاہزادی سے کتنی محبت کرتا ہوں؟

~~~~~۲۹~~~~~

اس وقت ساری دنیا — مجھے اپنے خلاف نظر آ رہی ہے۔ فہمت کی طرح شاہزادی بھی مجھ سے برگشتہ ہو گئی ہے۔ بعض اوقات تو میں اپنا سر دھن لیتا ہوں۔ مجھے اپنی فہمت پر ایسے ہی وقت افسوس ہوتا ہے۔ دنیا اگر ظاہری خلوص کو پسند کرتی ہے۔ تو اے میرے مالک! مجھے کیوں نہ دیا دل دیا۔ جس سے میں بھی دنیا والوں کو اپنے دل و خیال میں مجسوس کر سکتا — جمالی میں جس قدر شاہزادی سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے اتنا ہی دور ہوتی جا رہی ہے۔ مسرت کی لہریں دماغ میں بالکل آن موہیم پریشکال کے بالوں کی طرح اٹھتی ہیں۔ جو تھوڑی دیر کے لئے — اٹھے، رہے

عالمگیر کے سالانہ خریداروں کو دو خاص نمبر مفت ملتے ہیں جبکہ صرف چار روپے چار آنے علاوہ محصول

# غزل

(مصور قلم ماسٹر باسط بیوانی)

بہر نظر داستان ہے گویا      آنکھ اپنی زبان ہے گویا  
بے نشان کا نشان ہے گویا      لامکاں بھی مکان ہے گویا  
گفتاں یوں ہیں حضرتِ ناصح      آپ ہی کے زبان ہے گویا  
جو کرتا ہے اس ادا سے حسن      عشق کا امتحان ہے گویا  
پردہ قوس میں سیرِ افلاک      کوئی ابرو کمان ہے گویا  
سامنے میرے دل کیا پامال      صبر کا امتحان ہے گویا  
خونِ ناحق نہیں سروا من      ظلم کی داستان ہے گویا  
کوئے قاتل کی سرزمین کیا ہو      ظلم کا آسمان ہے گویا  
جانستائی تیشہ فرہاد      اس کے قصہ کی جان ہے گویا  
دل دکھاتا ہے اور نہنتا ہے      آج وہ مہربان ہے گویا

کیا ہے باسط غزل ہرانی میں

درجہ دل کا بیان ہے گویا

ڈراما :-

# گناہ معاشرت

## (ایک معاشرتی المیہ)

(از جناب میرزا ادیب - بی - اے)

افراد ڈراما

شیخ احمد اسماعیل :- ایک بہت بڑے تاجر - تہذیب قدیم کے عاشق  
سلطانہ ..... شیخ احمد اسماعیل کی بیوی - غلام کے نقش قدم پر چلتے والی  
غیاث ..... شیخ احمد اسماعیل کا لہو جوان بیٹا !  
نازہ ..... ایک مجلس و قلاش خاندان کی لڑکی !

مفتد ر { غیاث کے ماموں شیخ احمد اسماعیل کے ہمنا !  
جعفر

رضا ..... شیخ احمد اسماعیل کا دوست -

ان کے علاوہ غلامہ - غیاث کی بیوی - دو بد معاش - دو

سپاہی - بوڑھا آدمی - مسافر وغیرہ

ہلے وقوع ..... وسط ہندوستان کا ایک شہر -

پہلا ایکٹ

منظر :- وسط ہندوستان کے ایک شہر کا بارونق - وسیع و کشادہ

بازار - سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا - اور

اس کی ضعیف و مضمحل کرنیں اونچے اونچے مکانات کی

پیشانیوں پر الوداعی بوسہ ثبت کر کے جلدی جلدی رخصت

ہو رہی ہیں - بازار کی تجارتی سرگرمیاں اپنے پورے

شباب پر ہیں - مکانات اور دکانیں رنگ رنگ کے برقی

تعمیروں کی مختلف المان روشنی میں جھٹکنا بنی ہوئی ہیں

ہانگوں اور موٹروں کے شور - خواجہ والوں کی مسلسل صداؤں

اور فقیروں کی لگاتار التجاؤں سے فضا میں ایک ہنگامہ  
برپا ہے - بازار کے آخری سرے پر یہاں کے ملک التجار  
شیخ احمد اسماعیل کی بلند - مالیشان اور فراخ بلد رنگ  
اسماعیل منزل - کھڑی ہے - اسماعیل منزل کی دوسری  
منزل میں ڈرائنگ روم ہے - اور ڈرائنگ روم کا طرز  
آرائش صاحب خانہ کی تہذیب قدیم کی محبت پر دال  
کمرے کے فرش پر ایک اعلیٰ درجہ کی چھتری ہے - دروازے کے  
دائیں جانب ایک پرانی الماری رکھی ہے جو فرسودہ و  
بوسیدہ رجسٹروں سے بھری ہے - پاس ہی ایک چھوٹی  
میز ہے - جس کے اوپر چند کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئی ہیں  
دیواروں پر قطعات اور مقامات مقدسہ کے فوٹو لٹکے ہیں  
ہیں - سامنے کی دیوار کے ساتھ دو ٹکے لگے ہیں اور ان کے  
اگے کشمیری قالین بچھا ہے - شیخ احمد اسماعیل ایک ٹکے سے  
سہارا لگائے بیٹھے ہیں - حقہ کی تلی منہ میں ہے اور لمبے  
لمبے کش لگا رہے ہیں - ان کے دائیں طرف مفتد ر اور  
جعفر بیٹھے ہیں اور بائیں جانب رضا - شیخ احمد اسماعیل  
ایک تجارت پیشہ اپنے فن میں ماہر - مذہب کی سختی سے پابند  
تہذیب جدید سے متفرقان ہیں - صحت نہایت اچھی -  
سر موچہ اور دارمی کے بالوں کی سیاہی پوڈر کی رہیں  
منت - جعفر اور مفتد ر اپنے اخلاق و عادات میں شیخ  
احمد اسماعیل سے مماثلت قریبہ رکھتے ہیں - آزاد خیالی ان کے

رضا۔ اچھا شیخ صاحب! اب میں جانے کی اجازت چاہتا ہوں  
کل صبح کے وقت آؤں گا۔ اور غیاث کو خود سمجھاؤں گا۔  
مسلّمین رہتے ہیں۔

احمد اسماعیل۔ آپ جا رہے ہیں؟ بہتر۔ صبح ضرور تشریف لائیے  
صفدر۔ (رضا سے مخاطب ہو کر) رضا صاحب! دیکھئے یہ خاندان کا  
عزت کا معاملہ ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے!  
رضا۔ ناحول ولا۔ آپ مجھے اتنا بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ بات  
دوسروں سے کہہ دوں گا؟

صفدر۔ احتیاط لازمی ہے۔

احمد اسماعیل۔ ناہنجار نے مجھے کہیں کا نہ رکھا!

(رضا آہ بھرتا ہے اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل جاتا ہے  
ایک منٹ خاموشی طاری رہتی ہے۔ سلطان آتی ہے اور  
اور اپنے خاوند کی دائیں طرف بیٹھ جاتی ہے)  
سلطانہ۔ آپ تو اس طرح بیٹھے ہیں گویا گھر میں کسی کی موت  
ہو گئی ہے!

احمد اسماعیل۔ تو کیا تم سمجھتی ہو یہ واقعہ موت سے کہے؟ خدا کی قسم میرا  
بیٹا مر جانا پھر بھی مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ جتنا اب ہو رہا ہے  
جانتی ہو تمہارا لال کس کو گھر پر لایا ہے؟

سلطانہ۔ یہ تو میں نہیں جانتی مگر لو کی نیک معلوم ہوتی ہے۔  
بے حد خوبصورت اور شرمیلی ہے۔ جب تک میں اس کے  
پاس کھڑی رہی۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکاٹے رکھیں۔  
بہت ادب آداب والی نظر آتی ہے۔ غیاث نے سخت  
فلطی کی جو اسے لے آیا۔ ہمیں کیوں نہ کہا۔ اب بھی کیا  
بگڑا ہے؟

احمد اسماعیل۔ (صفدر سے مخاطب ہو کر) من لیا تم نے! یہ ہے  
تمہاری بہن کا حال؟ خاندان بھر کی عزت خاک میں  
مل رہی ہے اور اسے کچھ خبر ہی نہیں!

سلطانہ۔ یہ میں نے کب کہا کہ غیاث نے اچھا کیا ہے۔ اس نے  
سخت فلطی کی ہے۔ آپ بلا کر اسے ڈانٹیں۔

پاس تک نہیں پہنچی۔ شیخ احمد اسماعیل کے چہرے سے اثراتِ فکر  
ظاہر ہیں۔ خادمہ آتی ہے۔ اور حقہ کی پیلم اٹھا کر لے جانا  
چاہتی ہے۔ شیخ احمد اسماعیل اس کی طرف دیکھتے ہیں وہ  
مودبانہ کھڑی ہو جاتی ہے)

احمد اسماعیل۔ اتنی دیر میں کیوں آئی؟ اور یہ شور کیا ہے؟

خادمہ۔ چھوٹے شیخ صاحب آئے ہیں حضور!

احمد اسماعیل۔ غیاث آگیا۔ اکیلا؟ اس کا لہجہ اسفہام اس کے  
قلبی اندیشے کو ظاہر کر رہا ہے)

خادمہ۔ وہ اکیلے تو نہیں ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش عورت  
بھی ہے۔

احمد اسماعیل۔ برقعہ پوش عورت؟

(شیخ احمد اسماعیل غم و غصہ سے بھری ہوئی نگاہوں سے  
خادمہ کو دیکھتے ہیں۔ وہ دو تین لمحے ٹوٹ کر چلی جاتی ہے۔  
صفدر۔ جعفر اور رضا کن انکیموں سے ایک دوسرے کو  
دیکھتے ہیں۔ گویا ان کا اندیشہ پورا ہو گیا ہے)

صفدر۔ بلند اقبال صاحبزادے کی یہ کاروائی میں نے پہلے ہی  
کنا بیٹہ شیخ صاحب پر ظاہر کر دی تھی!

جعفر۔ اسے اس بات کا خیال نہ آیا کہ اس فعل سے خاندان کی عزت  
خاک میں مل جائے گی!

صفدر۔ خیال آتا تو کرتا ہی کیوں؟

جعفر۔ افسوس اتنی عزت والا باپ کس طرح لوگوں کو منہ  
دکھائے گا؟

رضا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس بے خیال کی کو جبر وک بلکہ  
مار پیٹ کر گھر سے نکال دیجئے اور لڑکے سے کہہ دیجئے کہ  
آئندہ خبردار اس کج فتنے کا نام تک نہ لے!

(خادمہ چلم بھر کر لاتی ہے)

احمد اسماعیل۔ (خادمہ سے) کہاں ہے وہ خبیث؟

خادمہ۔ باورچی خانے میں۔ بی بی جی کے پاس! (آگے بڑھ کر  
شیخ احمد اسماعیل کے کان میں آہستہ سے کچھ کہتی ہے)



احمد سہیل - میں تو اس کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ کاش وہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔

سلطانہ - خیانت کے آبا! آپ اتنے سخت الفاظ کیوں زبان سے نکالتے ہیں؟ خیانت نے بے حد نادانی کی۔ میں بھی لمبے لعنت ملامت کر کے آئی ہوں۔ بیچارہ اور رہا ہے۔

صفدر - آپا! آپ جانتی ہیں وہ لڑکی کون ہے؟

سلطانہ - میں کیا جانوں بھائی!

صفدر - آپ کا فرزند ارجمند جس لڑکی کو لایا ہے۔ وہ ایک غریب اور غفلت فاندان سے ہے۔ آپ اس کا مرچکا ہے۔ ہاں بے شکل سوکھی روٹیوں سے اپنا اور بیٹی کا پیٹ بھرتی ہے کیا ایسی لڑکی ہمارے فاندان میں آسکتی ہے؟

سلطانہ - تم کیا کہہ رہے ہو؟

احمد سہیل - اسے جو کہا سو کہا۔ اب اسے بلاؤ اور میں اسے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

سلطانہ - خیانت کے آبا! صبر سے کام لیں۔ خیانت بیمار بیٹا ہے۔ احمد سہیل - تمہارا بپا نہیں۔ خیانت میرا بیٹا نہیں مارا آستیں ہے!

سلطانہ - آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

صفدر - آپا! آپ اسے لائیے۔

(سلطانہ - سر جھکائے جاتی ہے اور ایک دو منٹ کے بعد

خیانت کو لاتی ہے۔ خیانت کا سر فرطِ ندامت سے

جھکا ہوا ہے)

جعفر - خیانت! ہمیں اور تمہارے باپ کو تم سے ایسی امید نہیں تھی۔

(خیانت چپ رہتا ہے)

احمد سہیل - بد بخت! بولتا کیوں نہیں۔ زبان کٹ گئی ہے؟

خیانت - کیا بولوں اباجان؟

صفدر - آخر تم نے کیا کیا؟ بیٹی والہ کی عزت کا خیال نہ آیا؟

احمد سہیل - مجھ سے تو تم نے گلے جانے کی اجازت لی تھی۔ اور۔۔

خیانت - اباجان! مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔ میں شرمندہ ہوں خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔

احمد سہیل - مجھے تباہ و برباد کر کے اب معافی مانگ رہے ہو۔ شرم تو نہیں آتی!

خیانت - میں شرم سے پانی پانی ہوں اباجان!

احمد سہیل - مجھے کیا معلوم تھا کہ تو مارا آستیں ثابت ہوگا۔ ورنہ پیدا ہوتے ہی تیری گردن مروڑ ڈالتا۔

خیانت - اب بھی آپ کو مجھے ہر سزا دینے کا اختیار ہے۔

احمد سہیل - میں تجھے کوئی سزا دینا نہیں چاہتا۔ بس میرے گھر سے نکل جاؤ۔ اور آئندہ مرنے دم تک مجھے شکل نہ دکھانا!

سلطانہ - بیٹا! تو نے کتنی بری غلطی کی۔ ایک غریب و قلاش فاندان کی لڑکی یہاں کیوں لکڑا سکتی ہے؟ ہم تو جیتے جی ہی مر جائیں گے۔

احمد سہیل - تو نے اس کا رروائی سے میرے دل میں ناسور ڈال دیا ہے۔ اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو اس لڑکی سے کہہ دو۔

یہاں سے چلی جا۔ اور آئندہ اس کا نام تک اپنی زبان پر نہ لا۔ میرا پہلا اور آخری فیصلہ یہی ہے۔

صفدر - باپ! آخر باپ ہے۔ خیانت تمہیں تو ایسے رحمدل شفیع باپ کا پاؤں جو منے چاہئیں۔

سلطانہ - میں اپنے بیٹے کے لئے شہر کے کسی محلے اور دو ہند فاندان سے دو لہن لاؤنگی بیٹا! باپ نے جو حکم دیا ہے اس کی فوراً تعمیل کرو۔

خیانت - اباجان! مجھے معاف کیجئے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

ایسا نہیں کر سکوں گا۔ میں اسے۔ اس کے گھر سے بیوی بنا کر لایا ہوں۔ میں اس سے یہ سلوک کیسے کروں؟

اس کا اور اس کی بوڑھی ماں کا کیا حال ہوگا؟

احمد سہیل - تو مادور ہو جا۔ خدا تجھے غارت کرے۔

(آہستہ آہستہ اٹھ کر کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ صفدر اور جعفر بھی ان کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ سلطانہ خیانت کا

بازو پکڑ کر اسے پاس بٹھاتی ہے)

### منظر دوم

منظر - (ڈرائنگ روم کا داخلی کمرہ - دروازے کی دائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی سنگ مرمر کی پرکھتے اوپر پشت میں چائے کے برتن رکھے ہوئے ہیں - جن میں کچی مچی چائے ہے - میز کے عین سامنے کھڑکی سے جیسے شبنم پر درہ پڑا ہے - چھت سے تین بڑے بشت بٹورے ہیں - فانوس - جن کے گرد موتیوں کی جھالیں پڑی ہیں - ٹھوڑے سے ٹھوڑے فاصلے پر ایک رہے ہیں - کمرے کی پائیں دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا ہے - پلنگ کی پائینی کے پاس سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے - دروازہ اس وقت بند ہے - نازو ایک ہزارہ سالہ خوبصورت لڑکی خاموش ہنموں سے انداز میں دروازے کے پاس دیوار سے ہارالگائے کھڑی ہے - اس کے چہرے کے سوگوارانہ اثرات اس کے حسن و جاذبیت میں اضافہ کر رہے ہیں - یکایک فرط غم سے مجبور ہو کر وہ خود کو پلنگ پر گرادی ہے اور چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسکیاں بھر کر رونے لگتی ہے - دوسرے دروازے سے غیاث چھوٹا، متفکرا انداز میں آتا ہے - جونہی اس کی نظر نازو پر پڑتی ہے - وہ متحیرانہ کھڑا ہو جاتا ہے - نازو - چہرے ہاتھ اٹھاتی ہے - اس کے سیاہ ریشمیں بال - آنسوؤں سے بھیکے ہوئے گالوں پر لہرا رہے ہیں اور ہاتھ بھی قطرات اشک سے پر غم ہیں - دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں غیاث کی نظریں شرمندہ - محبوب اور مضطرب ہیں - اور نازو کی مایوس - افسردہ اور رحم طلب - غیاث نازو کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے - اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتا ہے - وہ کھڑی ہو جاتی ہے)

غیاث - نازو! تم اس کمرے میں کب سے ہو رہے ہو اور کیوں

رہی ہو؟

(نازو: مایوسانہ اس کی طرف دیکھتی ہے)

نازو! بولتی کیوں نہیں؟

نازو - کیا بولوں؟

غیاث - تم رو کیوں رہی ہو؟

نازو - اور کیا کروں - ایک میس عورت رونے کے سوا اور کچھ کیا سکتی ہے؟

غیاث - صاف صاف کہو نازو!

نازو - مجھے خادمہ ہاں لائی تھی - اور میں نے تمہارے والد بزرگوار اور دوسرے لوگوں کی تمام گفتگو سن لی ہے -

غیاث - تم نے سب کچھ سن لیا ہے؟

نازو - ہاں - سب کچھ - میری وجہ سے تم پر کتنی بڑی مصیبت ٹوٹ رہی ہے!

غیاث - ان باتوں کو چھوڑ دو - سوچنا یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟

نازو - کیا کیا جائے - کچھ بھی نہیں - کچھ بھی نہیں ہو سکتا - (دو تین لمحوں کے بعد) ہاں سب کچھ ہو سکتا ہے - مجھے چھوڑ دو - مجھے بھلا دو -

غیاث - یہ کبھی نہیں ہو سکتا نازو! تمہیں چھوڑ کر - تمہیں بھلا کر میں زندہ نہیں رہ سکتا!

نازو - غیاث! سوچو!! ایک جھوٹپڑی میں رہنے والی غریب مفلس لڑکی تمہارے محل میں کیونکر آ سکتی ہے؟ میرے ساتھ رہنے سے تم پر تمہارے محل کے دروازے بند کر دیے جائیں گے!

غیاث - محل کے دروازے بند کر دیے جائیں گے؟ بیشک - مگر خدا اپنی دنیا کے دروازے تو مجھ پر بند نہیں کرے گا - تمہارے ساتھ ایک جھوٹپڑی بھی میرے لئے محل ثابت ہوگی!

نازو - غیاث! تم یہ دل سے کہہ رہے ہو - میں نے سنا ہے مرد - محبت کے معاملے میں دھوکا دیتے ہیں!

غیاث - دیتے ہوں گے - مگر میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں -

(شیخ احمد اسماعیل - صفدر اور سلطانہ کے ساتھ آتے ہیں  
ناز و خورفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی ہے)

سلطانہ - غیاث! میں تمہارے باپ کو چہر لاتی ہوں۔ آہ تم ہمیں  
کتنی تکلیف دے رہے ہو۔ (ناز و خورفزدہ ہو کر لڑکی کو توبہ لگا  
تھوڑی دیر کے لئے جلی پا (خادمہ ناز و خورفزدہ کر کے سے  
نکل جاتی ہے) اولاد والدین کو اتنا ہی مستایا کرتی ہے؟  
غیاث - میں نے کو کسی کو بھی نہیں سنا یا اماں جان!  
احمد اسماعیل - کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔ تو وہ بھی پوری کر دو۔

سلطانہ - بیٹا! ہم تمہارے والدین ہیں۔ ہمیں ہر حالت میں  
تمہاری بہتری مقصود ہے۔ دیکھو! اگر ایک مفلک و  
تلاش فائدہ ان کی لڑکی ہمارے خاندان میں آگئی تو ہمیں  
لوگ طعنہ دے دے کر مار ڈالیں گے۔ تمہارے والد  
خدا کے فضل سے شہر میں بڑی عزت کے مالک ہیں۔ تمہاری  
اس حرکت سے لوگوں میں ان کی کیا عزت رہ جائے گی؟

غیاث - غریب لڑکی کو گھر میں لانے سے عزت میں کیا فرق آسکتا ہو؟  
کیا اس کا غریب ہونا دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے؟  
صفدر - لڑکے! تم بھی ان چیزوں کو نہیں جانتے۔ ہمیں دنیا میں روک  
دنیا کے اصولوں پر عمل کرنا ہے۔ دنیا داری یہی ہے۔  
غیاث - ماموں! مجھے معاف کرو۔ میں دنیا داری کے لئے خود کو  
اور ایک غریب لڑکی کو تباہ نہیں کر سکتا۔

احمد اسماعیل - تم ناز و خورفزدہ نہیں چھوڑ سکتے۔ تو تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے  
اپنے والدین اور یہ گھر چھوڑنا ہو گا۔

سلطانہ - (احمد اسماعیل سے) آپ نرمی کے ساتھ گفتگو کریں۔ میں ہی  
اپنے بیٹے کو سمجھاتی ہوں (غیاث کے سر پر ہاتھ پھیر کر)  
میرے بیٹے! تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔ باپ کی آنکھوں کا  
نور ہوا اور میرے دل کا سرور ہو۔ دیکھو نا! ہمیں ذرا سی  
بھی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم بیتاب ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں  
جب تمہاری طبیعت نصیب دشمنان خراب تھی۔ تو جانتو  
ہی جو نا تمہارے باپ کی کیا حالت تھی؟ رات دن تمہارے

لئے بچپن رہتے تھے۔

غیاث - مگر اماں جان! آج مجھے تباہ کرنے کے لئے بچپن کیوں  
ہیں؟ ناز و خورفزدہ! میری بیوی ہے۔ میں اس سے نکاح کر چکا  
ہوں۔ اس کی بوڑھی ماں۔ اپنی اکلوتی لڑکی مجھے سوئپ  
چکی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ دوں تو وہ کدھر جائے گی  
اور میں بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اماں! ابھی  
رحم کرو!

صفدر - سونو غیاث! جوان آدمی بعض اوقات ایسی غلطی کا شکار  
ہو اس کی تمام زندگی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس وقت  
والدین کا کتنا ناگوار تمہیں ایسی ہی غلطی کے مرتکب ہو رہے  
ہو۔ سوچو۔ سمجھو۔ پھر ایسا موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا۔

سلطانہ - تم اپنے والدین کو تباہ کرنا چاہتے ہو؟  
غیاث - میں کیا کروں۔ کاش میں ایک لکڑہارے کے گھر  
پیدا ہوتا۔ (رونے لگتا ہے)

احمد اسماعیل - (نرم لہجے میں) بیٹا! میں تمہارا باپ ہوں۔ اگر تم اپنے  
باپ اور اپنے خاندان کی عزت کو بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہو  
اگر تم دنیا کو ہم پر ہنسنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتے تو اس  
لڑکی کو فوراً چھوڑ دو۔ میں آج ہی اپنی تمام جائیداد  
تمہارے نام لکھ دیتا ہوں۔ سمجھ گئے؟

صفدر - غیاث! تم اتنے سنگدل ہو گئے ہو کہ والدین کی پیہم التجا و نگو  
ٹھکرا رہے ہو۔ ایک طرف عزت ہے۔ دولت ہے۔  
والدین کی محبت ہے۔ اور دوسری طرف غریبی ہے  
طعنہ ہیں۔ اور ذلت ہے۔ بتاؤ ان میں سے کون سی  
راہ پسند کرو گے؟

سلطانہ - کیا سوچ رہے ہو بیٹا! باپ سے معافی مانگو  
(غیاث خاموش رہتا ہے)

صفدر - (احمد اسماعیل سے) شیخ صاحب! آپ اسے معاف کر دیں  
آخر یہ آپ کا بیٹا ہے۔

احمد اسماعیل - (غیاث کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر) میں یہی خوش

ہوں۔ کہ آخر تم سمجھ گئے۔ میں آج ہی تمام باپ اور تمہارے نام لکھ دوں گا۔ بننے سے مکانات اور کوٹیاں تمہاری ہیں۔ میں ابھی اس لیل لڑکی کو نکال دوں گا۔ اس کبخت نے میرے بچے کو برباد کرنا چاہا تھا۔

(دھمکے میں دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ غیاث ان کے پیچھے جانا چاہتا ہے مگر سلطان اس کا بازو تھام لیتی ہے)

سلطانہ غیاث! کیا کر رہے ہو؟ تم نے تو ہمیں کسی بھی نہیں سنا یا!

آج کیوں بدل گئے ہو میرے بیٹا!

صفر۔ تم ایک خوفناک و مہیب غار میں جا رہے تھے۔ خدا کا شکر کرو۔ تمہارے باپ نے ہمیں بچا لیا۔

غیاث۔ میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سلطانہ۔ بیٹا! آج تمہاری پھوپھی آئی ہیں۔ تمہیں اسٹیشن پر جا کر انہیں لانا ہے۔ اب کپڑے پہنو۔ آؤ میرے ساتھ میرے

لال! —

(سلطانہ غیاث کا بازو پکڑ کر دروازے سے نکل جاتی ہے صفر بھی مسکراتا ہوا ان کے ساتھ ہے)

منظر سوم

منظر!۔ (دائیں منزل میں مسرت کے قہقہے گونج رہے ہیں۔

نہان شادال و فرماں نیچے سے اوپر۔ اوپر سے نیچے چڑھ اتر رہے ہیں۔ شیخ احمد اسماعیل اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی ابتدائی رسوم میں انتہائی دلچسپی کا ثبوت دے رہے ہیں مکان کے پائیں باغ میں غیاث۔ بلور کا ایک مدور ٹکڑا دائیں ہاتھ میں پکڑے۔ ایک روش پر ٹھل رہا ہے۔

دسمبر کا آفتاب آسمان پر جلوہ گر ہے۔ غیاث نے غصہ میں بلغ کا دروازہ ہے۔ ناز و ایک شیر خوار بچے کو گود میں اٹھائے۔ لرزتی۔ کانپتی۔ ادھر ادھر دیکھتی۔ آہستہ آہستہ آتی ہے۔ غیاث پاؤں کی آہٹ سنکر۔ ملوکر اسے دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہیں ناز کے چہرے پر پڑ کر

بچے کے چہرے پر خود بخود جمع جاتی ہیں)

غیاث۔ نازو! تم کیسے آئیں؟

نازو۔ میں خود بھی نہیں جانتی!

غیاث۔ پھر بھی!

نازو۔ تمہارے چروں میں رہنے کے لئے تمہاری پوجا کرانے کے واسطے۔ محبت کی ماری ہوئی عورت اس کے سوا اور

کیا چاہتی ہے؟

غیاث۔ نازو! (وقف) اکاش میں تمہاری آرزو پوری کر سکتا

تمہاری کیا۔ میری اپنی بھی آرزو ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں۔ لیکن۔

نازو۔ (متعجبانہ) لیکن۔؟ میں نہیں سمجھی؟

غیاث۔ میں جانتا ہوں اس بات سے تمہارے دل کو چرٹ لگے گی۔ مگر کیا کیا جائے؟

نازو۔ آج تم معمول میں کیوں باتیں کر رہے ہو۔ تم نہیں جانتے میں اس وقت کس مصیبت میں ہوں۔

ماصل کرنے کے لئے میں تمام دنیا کو کھوپٹی ہوں۔ ہمارے تمام رشتہ دار ہم سے سخت ناراض ہیں۔ وہ مجھ پر طرح طرح کے خوفناک الزام لگاتے ہیں۔ اماں بیمار ہیں۔ اسے

تمہارے والدین کی روش سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ غیاث! تم بھلا اس دن بدل گئے تھے۔ تمہارے والد نے

مجھے بالوں سے پکڑ کر اور ہنٹار مار کر کمرے سے نکال دیا اس وقت تم کہاں تھے؟ مگر مجھے کوئی رنج نہ ہوا کیونکہ

میں سمجھتی تھی کہ میرا غیاث تو میرا ہی رہے گا!

غیاث۔ اف میرے اللہ!

نازو۔ ان باتوں سے تمہیں صدمہ پہنچتا ہے تو میں خاموش رہتی ہوں۔

غیاث۔ میں مجبور ہوں نازو! مجھے کیا بے بہور کر دیا ہے!

نازو۔ کس بات پر؟

غیاث۔ اس بات پر کہ میں تمہارے ساتھ زندگی بھر کر سکتا

نازو۔ ظالم نہ ہو خیاث۔ دیکھو میرے کان مجھے دھوکا دینے لگے ہیں۔

خیاث۔ تمہارے کان تمہیں دھوکا نہیں دے رہے۔ جو کچھ تم نے سنا ہے۔ میں نے ہی کہا ہے! نازو! میں نے تم سے محبت کی۔ غدت کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔ ہماری سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ اکٹھے رہیں۔ مگر سوسائٹی کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ تم بے حد مفلس اور میں دولت مند! کیا بیٹھا ہوں۔ یہ فرق کسی صورت سے بھی دور نہیں ہو سکتا اس لئے ہم کسی صورت میں بھی نہیں مل سکتے۔

نازو۔ تو کیا اب تک تم مجھے دھوکا ہی دیتے رہے؟ سوسائٹی کا قانون تم کو اس بات پر مجبور کر سکتا ہے۔ کہ تم ایک غریب لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتے۔ مگر یہ قانون تمہیں ایک غریب لڑکی کو نہایت شرمناک دھوکا دے کر تباہ کرنے پر بھی مجبور کر رہا ہے۔ یہ محبت کا فریب دے کر تم نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔ غریبی اور امیری کا فرق اس وقت کہاں تھا۔ جب تم نے ہمیشہ محبت اور نباہ کرنے کا وعدہ کر کے مجھ سے نکاح کیا تھا؟ کیا میری ماں نے اس وقت یہ نہیں کہا تھا کہ تم بہت امیر آدمی کے بیٹے ہو اور میری بچی بیحد مفلس ہے مگر تم نے ایک نہ سنی۔ بار بار مجھے محبت کا دھوکا دیا۔ خیاث۔ جی بھر کر بددعا میں دو۔ شاید اس سے تمہارے دل کو تسلی ہو۔

نازو۔ تسلی میرے دل کو؟ تمہیں یہ الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی؟

خیاث۔ نازو! تم مجبور ہو۔ میں نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ نازو! دلچسپانہ لہجے میں خیاث! تم وہی محبت کرنے والے پہلے خیاث کیوں نہیں رہے! سوچو میری حالت کیا ہو؟ میں دنیا کی لگا ہوں میں مجرم ہوں۔ اور جرم کی سب سے بڑی نشانی انہی کی طرف اشارہ کر کے رہے۔ کون جانتا

کہ تم نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ میری ماں یہاں ہے۔ وہ مر رہی ہے۔ میری زندگی کا یہ سہارا بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ اگر تم بھی مجھ سے چھین لگے تو میں کدھر جاؤں گی۔ سوچو تمہاری دوسری کس تربیت میں ہوں۔ تمہاری دلچسپی دنیا مجھے اور میری ماں کو لٹھنے دے دے کر ہلاک کر رہی ہے۔ اور تم بھی مجھے چھوڑ رہے ہو۔ میں تمہارے گھر میں ایک خادمہ بن کر رہو گی۔ بولو خیاث! بولو۔ دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔

(سر جھکانے لگتی ہے۔ خیاث اس کے شانوں کو کپکپلاتا ہے۔ اور وہ پھر سیدھی ہو جاتی ہے)

خیاث۔ نازو! میں تم سے برا بھلا کرتا ہوں۔ میں تم سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ مگر ہماری معاشرت کے قانون نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ میں اب کیا کر سکتا ہوں؟

نازو۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو!

خیاث۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری مہتی سوسائٹی کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی سی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ گھر میں اتنی چل پھل ہے۔ معلوم ہے یہ کیوں؟

نازو۔ نہیں میں نہیں جانتی۔ اور نہ میں جانتا چاہتی ہوں۔ خیاث۔ تم جانتا نہیں چاہتیں۔ مگر تمہیں جانتا ہو گا۔ آج شام کو میں شہر کے ایک بہت بڑے تاجر کی لڑکی کا شوہر بن جاؤں گا۔

نازو۔ شوہر بن جاؤ گے۔ تم۔ تم۔ تم؟

خیاث۔ ہاں نازو! میرے والدین اور سوسائٹی یہی چاہتی ہے نازو۔ سمجھ گئی۔ میں جاتی ہوں۔ تم کارمرور! لو اپنے بچے کو لے لو

میرے ساتھ یہ کیوں ٹھکر کریں؟ کہا تا پھر ہے؟

خیاث۔ میں اسے لے کر کیا کروں؟ تمہیں رکھو۔

نازو۔ اتنے ظالم۔ سنگدل۔ سفاک!!!

(چلی جاتی ہے۔ غباث بھی آہستہ آہستہ باغ سے نکلتی ہے)

دوسرا آدمی۔ ہم بھی تمہارے پیچھے ہیں۔ کہاں جاؤ گی آخر؟  
نازو۔ تم لوگ مجھے بے کس عورت کو کیوں تنگ کرتے ہو۔  
تم سے خدا کے نام پر التجا کرتی ہوں کہ میرا پیچھا  
چھوڑ دو۔ میں بہت دکھی ہوں!  
پہلا آدمی۔ بہت دکھی (دقتہ لگا کر) واقعی بہت دکھی لیکن  
ہم تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتے۔

نازو۔ (مرد کر جاتے ہوئے) تم سب مرد ظالم ہو۔  
دوسرا آدمی۔ (پہلے آدمی سے) کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ قہقری تو  
اس طرح اڑ جائے گی!

(دونوں آدمی اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ نازو بیگناہی  
ہے۔ بچہ کمزور آواز میں چیتا ہے۔ نازو ایک بڑے  
پتھر سے ٹھوکر کھاتی ہے۔ بچہ اس کے ہاتھوں سے بھل کر  
ایک پتھر پر جاگرتا ہے۔ ایک ہلکی سی چیخ کی آواز آتی  
ہے اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ بد معاش بھاگ جاتے  
ہیں۔ دوسرا ہی اس کی طرف آتے ہیں۔ نازو خون  
میں شرابو زچے کی نقش کو اٹھاتی ہے اور اسے چھاتی  
سے لگالیتی ہے)

نازو۔ میرے بچے۔ اف۔ خون۔ لہو۔ بے جان!!!  
(آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی ہے۔ سپاہی اس کا  
بازو پکڑ لیتے ہیں)

ایک سپاہی۔ چلو ہمارے ساتھ!  
(نازو متحیرانہ کبھی انہیں اور کبھی بچے کو دیکھتی ہے)  
دوسرا سپاہی۔ سنتی نہیں تم نے اس بچے کو مار ڈالا ہے!  
(دونوں سپاہی اسے لے چلتے ہیں۔ اس کے لیے لیے  
بال بچے کے خون آلود جسم پر بکھرے ہیں۔ لہو پر  
میر خاموشی ہے)

منظر اول

دوسرا ایکٹ

منظر۔ (متذکرہ بالا واقعات کو گزیرے پانچ سال کا عرصہ  
گزر چکا ہے۔ نازو۔ پانچ سال کے اختتام پر پاگل سمجھ کر

منظر چارم

منظر۔ (شہر سے باہر ایک وسیع میدان۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے  
ٹیلوں کی ایک مسلسل قطار جا رہی ہے۔ شام کی ظلمت  
آہستہ آہستہ فضا میں پھیل رہی ہے۔ نازو۔ اپنے بیمار  
بچے کو گود میں اٹھائے ہانپتی کانپتی۔ لرزتی۔ ڈگمگاتی آتی  
ہے۔ اور ایک ٹیلے کے پاس ٹھہر جاتی ہے۔ اس کے  
چہرے سے خوف و دہشت کے آثار مٹ رہے ہیں۔ پیشانی  
پیسے میں شرابو زچہ۔ لباس پٹا ہوا ہے۔ آنکھوں سے  
مطلوبیت ٹپک رہی ہے۔ وہ بچے کے لمبے پر ہاتھ رکھتی ہے  
اور پھر یہ محسوس کر کے کہ بخار پوری شدت کے ساتھ ہے  
مالوسانہ اٹھا لیتی ہے)

نازو۔ (خود بخود) دنیا کتنی ظالم بن گئی ہے۔ شہر میں لوگ طعنوں سے  
ہلاک کئے دیتے ہیں اور یہاں ظالم بد معاش پیچھا نہیں  
چھوڑتے۔ خدا یا رحم کر (بچے سے) دودھ پیو گے میرے  
لال!

بچہ۔ (کمزور آوازیں) مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔  
نازو۔ مم (متحیرانہ ادھر ادھر دیکھتی ہے) یہاں پانی کہاں  
(ایک طرف چلنے لگتی ہے۔ اور خود بخود کستی جاتی ہے)  
غیاث بھی بدل گیا۔ ماں بھی دنیا سے چل بسی۔ اب  
زندگی کا کون سا سہارا باقی رہ گیا ہے۔ غیاث کیوں  
بدل گیا؟ مجھے اس کی کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی! ہاں  
وہ مرد ہے۔ مرد کا دل بہت جلد بدل جاتا ہے۔  
اس نے مجھے محبت کا کس طرح یقین دلایا تھا۔ اور  
یقین دلا کر کس طرح تباہ کر دیا۔ آخر کیا کروں؟ موت؟  
مگر یہ ننھی جان! (دور سے تمبھوں کی آواز آتی ہے۔  
وہ ڈر کر ٹھہر جاتی ہے۔ دو شخص جن کی آنکھوں سے  
بد معاشی ٹپک رہی ہے۔ سامنے آتے ہیں)

ایک آدمی۔ کہاں کہاں بھاگی پھر رہی تھیں۔ ڈھونڈتے  
ڈھونڈتے عاجز آ گئے!

جیل خانے سے آزاد کر دی گئی ہے۔ اور اب وہ مالِ جنون میں شہر کے کوچہ و بازار میں پھر رہی ہے۔ غیاث چھ ماہ سے بیمار ہے۔ اس وقت وہ اپنے مکان کے نچلے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ سر ہانے کی طرف ایک بلند میز پر دو ایسوں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پلنگ کے دائیں طرف سلطانہ کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر غیاث کی بیوی بیٹی بھی ہوئی ہے۔ غیاث کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا ہے۔ آنکھیں دھنس گئی ہیں اور ان کے گرد جلتے پڑے ہوئے ہیں۔ گھڑی دن کے بارہ بجاتی ہے۔ سلطانہ غیاث کے چہرے کو دیکھ کر دو آؤں کی طرف دیکھتی ہے)

سلطانہ۔ دو آئی پیٹے کا وقت ہو گیا بیٹا! اس تکٹے کے سہارے بیٹھ جاؤ نا!

(اٹھ کر میز کے پاس جاتی ہے)

غیاث۔ دو آؤں سے کیا ہو گا؟ میری دلی فلتس برابر بڑھ رہی ہے کوئی سینے میں نشتر چھو رہا ہے!

سلطانہ۔ گھبراؤ مت۔ غیاث! آخرو ان ہی کو تکلیف پہنچتی ہے دو تین دن تک تندرست ہو جاؤ گے۔

غیاث۔ نہیں اماں! میں کبھی بھی تندرست نہیں ہو سکتا۔ میرے دل کو وہ زہر آلود نشتر سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہے۔

سلطانہ۔ وہ کون؟ تم کیوں وہی ہوئے جاتے ہو؟

غیاث۔ ناز و کو تم نہیں جانتیں اماں!

سلطانہ۔ ناز و؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے میرے لال! وہ کبھی کی مر کھپ گئی ہے۔

غیاث۔ وہ مر کھپ گئی! مگر یہ کس کے خون سے بھرے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ کس کے بالوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں یہ کس کی آتشیں لگا ہیں میرے دل کو جلا کر کباب کر رہی ہیں۔ میرے کانوں میں یہ کس کی جگر خراش صدائیں گونج

رہی ہیں؟ یہ ناز و نہیں تو کون ہے اماں؟ ظلم میں نے اس پر وہ ظلم کیا ہے کہ کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ ایک محبت کریمہ والی بیکیس عورت کو سوسائٹی کی نگاہوں میں عزت و وقار حاصل کرنے کے واسطے تباہ کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟ سوسائٹی۔ سنگدل۔ ظالم۔ سنگمر سوسائٹی۔ لیکن میں نے ظالم سوسائٹی کے ملعون قانون کی کیوں پابندی کی؟ ناز و میری تھی۔ سوسائٹی کو کیا حق تھا کہ وہ مجھ سے میری ناز و کو چھین لے۔ دولت اور فائدہ؟ فخر کو زندہ رکھنے کے لئے میں نے اس بے کس عورت کو چھوڑ دیا۔ آف (سینے پر ہاتھ رکھتا ہے)

سلطانہ! بیٹا، غیاث! خدا کے لئے چپ رہو۔ تم بیمار ہو۔ اس طرح تمہاری تکلیف بڑھ جائے گی۔

غیاث۔ بڑھ جائے۔ یہاں تک کہ میری زندگی ختم ہو جائے میری

یہ سرزنش میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے ارد گرد

جنم کی آگ دھک رہی ہے۔ ناز و مر گئی۔ کسی گاڑی سے

ٹکرا کر۔ کسی موٹر کے نیچے آ کر اس کا ننھا بچہ بھی اس کے سینے

سے چٹا ہو گا۔ ان دونوں جانوں کے خون کا ذمہ دار

میں ہوں۔ والد نے اسے ہنڑ مار مار کر اسی گھر سے

بگال دیا۔ اور میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ننھے سے

بچے کو لے کر وہ ایک بار پھر رحم کی بھیک مانگنے آئی۔

میرے خاندان و دولت کے ملعون غرور نے اس کی ہر

ایک التجا کو ٹھکرا دیا۔ اس کی درد انگیز صدائیں میرے

دل میں اثر پیدا نہ کر سکیں۔ اور پھر۔۔۔ وہ

کہاں گئی؟ مایوس ہو کر اسنے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی

ہو گئی۔ اور میں جس نے اسے برباد کیا۔ زندہ ہوں۔

سلطانہ۔ غیاث کی گردن کے گرد مادرانہ شفقت سے ہاتھ

ڈال کر، بس اب خاموش رہو بیٹا! (گلاس میں

دو آئی ڈال کر غیاث کے منہ کے قریب لاتی ہے پانی بوند

غیاث! تمہیں میری قسم ہے جاناں کار کرو۔



غیاث - چند دن — شاید چند دن یہ غلش برداشت کرونگا  
پھر — موت!

(سراٹھا کر دوائی پی لیتا ہے)

سلطانہ - پھر خوفناک باتیں!

غیاث - اماں! تم نہیں جانتیں میرے دل میں کیا ہو رہا ہے؟

(سلطانہ قالی گلاس غیاث کی بیوی کی جانب بڑھاتی

ہے۔ وہ اٹھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری

ہیں۔ گلاس کو الماری پر رکھ دیتی ہے۔)

سلطانہ - لو اب سو رہو۔

غیاث - مجھے اب ایک ہی بار میند آئے گی اماں! اف سینے میں

سخت درد ہو رہا ہے۔

سلطانہ - میں تمہارے سینے پر روئی گرم کر کے رکھتی ہوں۔ آرام

آجائے گا۔

غیاث - نہیں اماں! جانے دو۔ مجھے جتنی تکلیف پہنچے کم ہے۔

(اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں)

سلطانہ - خدا جلنے تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے غیاث! (اس کے آنسو

پونچتی ہے۔ غیاث کی آنکھوں سے برابر آنسو نکل رہے

ہیں۔ سینے میں سخت ہرجان برپا ہے)

### منظر دوم

منظر - اسماعیل منزل کے سامنے۔ بازار کے آخری سرے پر ایک

وسیع چوک۔ شام کا وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے

ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے۔ سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے

خوفناک آواز پیدا کر کے چل رہے ہیں۔ چوک میں کوئی

کوئی آدمی تیزی سے چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پاگل

نازو۔ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس ایک طرف چل رہی

بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر وہ خود بخود کچھ کہنے لگتی ہے

اس کے پاس، اب ادھیڑ عمر کا آدمی جس نے ہاتھ میں

لالٹین پکڑی ہے۔ گزرنے لگتا ہے۔ وہ اس کی طرف

دیکھتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر اسے روکتی ہے۔ بوڑھا آدمی

(ٹھہرتا ہے)

نازو۔ اے جانے والے ٹھہرا! ذرا ٹھہر۔

بوڑھا۔ کیا ہے نازو!

نازو۔ نازو؟ کون ہے نازو؟؟ یہ لفظ میں نے کئی بار

سننا ہے۔

بوڑھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟

نازو۔ تمہیں بتاؤ۔ میں تو بھول چکی ہوں۔

بوڑھا۔ آہ دیوانی عورت!

نازو۔ ہاں ہاں یاد آگیا۔ میرا نام دیوانی عورت! (دقت

لگاتی ہے) کتنا اچھا نام ہے۔ تم بھی یہ نام رکھ لو۔ بولو

رکھتے ہو؟

بوڑھا۔ میں جاتا ہوں آسمان پر بادل آئے ہوئے ہیں بجلی

بھی جھب رہی ہے۔ بارش ہوگی۔

نازو۔ خون کی بارش ہوگی۔ آسمان پھٹ جائے گا۔ اور

اس میں آگ اور خون برسے گا۔ لوگوں کی خون آلود

نخیں آگ کے شعلوں پر چلیں گی۔ ہر طرف خون ہوگا

ہر طرف آگ ہوگی۔ (آسمان پر نظر ڈال کر) وہ

بادل کا ٹکڑا کیوں اس لمحے سے ستارے کی طرف

جار رہا ہے۔ شاید محبت سے بیتاب ہو کر جا رہا ہے۔ مگر

(گہرا کر) ستارے سے کہو۔ بادل پر بھروسہ نہ کرے۔

محبت کرنے والا دھوکا دیا کرتا ہے۔

بوڑھا۔ اُف، (لالٹین کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں لے

لیتا ہے)

نازو۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ لالٹین (اپنے بازو اور

ہاتھوں پر نظر ڈال کر) میری گود میں بھی ایک چراغ

تھا۔ وہ کہاں گیا؟ شاید لوگوں نے چھین لیا!

(ایک مسافر ان کے پاس آکر ٹھہرتا ہے)

مسافر۔ (بوڑھے سے) میں راستہ بھول گیا ہوں۔ کیا آپ

بتا سکتے ہیں۔ یہ راستہ کدھر کو جائے گا؟



وہ آگئی۔ نازو!

(نازو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی ہے۔ گویا کوئی بھولی ہوئی چیز اسے یاد آ رہی ہے)

نازو۔ ایک دم چونک کر غیاث۔ غیاث! (نہایت تیزی سے اس کی طرف بھگتی ہے۔ غیاث سر اٹھاتا ہے۔ مگر سر گر پڑتا ہے۔ اور جہم)

مردہ ہو جاتا ہے۔ نازو آگے بڑھ کر گر پڑتی ہے۔ نازو کا سر اس کے پلنگ کے پائے کے ساتھ زور سے ٹکراتا ہے۔ چند لمحوں میں اس کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ رات کی تاریکی میں نالہ و شیون کی صدا میں اٹھنے لگتی ہیں۔ بارش زور سے برس رہی ہے۔ بادل گرج رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے)

## کہاں جا رہے ہو؟

میرے دل کی برباد دنیا بسا کر  
خیالوں میں بس کر نظر میں سا کر  
مجھے تم سراپا تمنا بن کر

انگوں بھرے جی کو ترس رہے ہو  
کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو

سکوتِ مجسم بنا کر رہو گے؟  
تجتر کا عالم دکھا کر رہو گے؟  
جلا کر رہو گے؟ مٹا کر رہو گے؟

محبت کی دنیا کو ٹھکرا رہے ہو  
کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو

سر و سر سے معمور راہیں!  
جوانی کے نشہ میں مخمور راہیں!  
یہ بھگت و کشمکش یہ پر نور راہیں!

مجھے ایسی راتوں میں تڑپا رہے ہو  
کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو

یہ لازم تھا تم کو محبت بڑھاتے  
تغافل نہ کرتے وفا آزماتے  
نگاہوں سے تسکین کے گل کھلاتے

مگر تم تو بیطرح کترا رہے ہو  
کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو

عبد السلام حق ہوشیار پوری

# میں بر غزل غالب

عشق میں گریہ نہیں نہ رہا میرے بعد طالب جو رو جفا کون ہو میرے بعد  
 درد والے ہیں طلبگار و دامیرے بعد سخن غمزے کی کٹاکش سے چٹا میرے بعد  
 بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد ہوجو لبت کش آلام وہ کامل نہ رہا  
 مایہ ناز محبت جو ہو وہ دل نہ رہا دھوم عشاق میں جس کی ہو وہ لہل نہ رہا  
 ہوتی معز وئی انداز وادامیرے بعد منصب شیفتگی کے کوئی فتاہل نہ رہا  
 بار اُلفت کا اٹھائے سے کہاں اٹھتا ہے شوہر کماں شور فقاں اٹھتا ہے  
 انک ہوتے ہیں رواں کورد جہاں اٹھتا ہے شمع بجتی ہے تو اس میں دھواں اٹھتا ہے  
 شعلہ عشق سیہ پوش ہو امیرے بعد شکر ہے بعد مرے قدر ہوتی ہے میری  
 اب حیں آنکھوں میں سرمہ ہے نہ لب پرستی چہ اُترا ہوا ہے زلف سیہ ہے بکھری  
 غوں ہے دل خاک میں احوال بدلتاں پریشی آن کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد  
 امتاں گاہ محبت میں کوئی کب ٹھہرا نہ ملا مجھ سا کوئی ناز اٹھانے والا  
 یہ عین بھول گئے جو رو جفا کو ایسا درخورد عرض نہیں جو ہر بے داد کو جا  
 نکہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد ہے کرم مال زبوں کے لئے آغوش وداع  
 عقل ہے سحر و فنوں کے لئے آغوش وداع "ہے جنوں۔ اہل جنوں کے لئے آغوش وداع  
 چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد تم نے دیکھا ہے حریف مے مرد افکن عشق  
 صرف بندہ ہے حریف مے مرد افکن عشق ابو غنقا ہے۔ حریف مے مرد افکن عشق  
 کون ہوتا ہے حریف مے مرد افکن عشق ہے مکر لب ساتی پہ صلا میرے بعد  
 رنج کرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی آپس بھرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی  
 کہتے ڈرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی "غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی  
 کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد کہ کسی بے درد پہ عاشق نہیں ہونا غالب  
 تم سے کتنا تھا رسا جان نہ کھونا غالب آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب  
 اب یہ کیوں کہتے ہو۔ ممکن نہیں سونا غالب کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد  
 (سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی)

# چک والی

(از جناب ریاض الدین احمد)

آؤں گا۔ پھر ساتھ چلیں گے۔ دس قدم چاکر میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور کام میں مشغول ہو گئی۔

میں آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈوں میں سے گزرتا ہوا جا رہا تھا۔ اور چک والی کے متعلق غور کر رہا تھا۔ وہ پہاڑی ہرگز نہیں۔ لب و لہجہ سے یو۔ پی یا پنجاب کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا لباس بھی اس علاقے کا نہیں۔۔۔ شلوار اور قمیص۔ لیکن وہ اکیلی یہاں کیا کرتی ہے؟ عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ کچھ میں کام کیوں نہیں کرتی؟ اس کے ماں باپ بھائی بہن کہاں ہیں؟ ہستی ہے اکیلی ہوتی ہوں۔ بچوں کے آنے سے جی بھل جاتا ہوں لیکن یہ اکیلی کیوں ہے؟

میں کچھ دیر ادھر ادھر پھرتا رہا اور یہی سوچتا رہا۔ پھر بچوں کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

دوسرے روز پھر میں اس عجیب و غریب لڑکی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بچوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کے ساتھ دو چار باتیں کیں اور واپس آ گیا۔ اس کے بعد تو میرا معمول ہو گیا کہ ہر شام کو بچوں کے ساتھ چک والی کے پاس جاتا سا اور باتیں کرتا رہتا۔ بچے اپنے کھیل میں مشغول رہتے چند دنوں میں مجھے اس کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ سہارنپور کی رہنے والی تھی۔ اور خوشحال گھر میں پیدا ہوئی تھی لیکن دو سال ہوئے اس کے ماں باپ دونوں ہی فتنہ کا شکار ہو گئے۔ اور زمانے کی گردش نے اسے بے رحم عجبیہ کے دروازے پر لا پھینکا۔ اس کے چچا چکوں کی تجارت کرتے تھے۔ اور ایک چک روزانہ اس سے بھی بنواتے تھے۔ صبح کو وہ گھر پر کام کرتی اور

مٹی کا مینہ تھا۔ میں امتحان سے فارغ ہو کر ماموں جان کے پاس ایسیٹ آباد چلا گیا۔ ماموں جان کپڑے کے سوداگر تھے۔ اور شہر سے باہر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ ایسیٹ آباد چھوٹا سا شہر ہے۔ ایک ہی دن میں تمام شہر کی جی بھر کے سیر کر لی۔ اور پھر دن بھر گھر پر رہنے لگا۔ ماموں جان سویرے ہی سے کام پر چلے جاتے اور میں دن بھر کبھی کوئی کتاب دیکھ لیتا۔ کبھی عمارتی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا۔ اور کبھی ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ نیچے شام کو سیر کرنے جاتے تھے اور ہر روز واپس آ کر مکملی بائیں سنایا کرتے۔ کوئی کتنا آج اس نے ہمیں گانا سنایا۔ او۔ میں بھی ان کی باتوں کو دلچسپی سے سنا کرتا ہوں۔

ایک دن بچوں نے مجھ سے کہا۔ ”بھائی جان! چلے ہم آپ کو چک والی دکھائیں۔“ اس دن میں گھر بیٹھے بیٹھے ذرا اکتا گیا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ ہوا۔

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی چک بنا رہی تھی اور سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھی۔ بچوں نے پہنچتے ہی شور مچا دیا۔ ”چک والی! آج بھائی جان بھی ہمارے ساتھ آئے ہیں۔“ میں قریب پہنچا۔ نو عمر لڑکی کچھ شرا کر کھڑی ہو گئی۔ میں بچوں سے کہا۔ ”اچھا یہ ہیں چک والی؟“ اور پھر بے پروائی سے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”تم ہی انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہو؟“ اس نے کہا۔ ”جی ہاں بچے اگر کھیلتے رہتے ہیں۔ میں انہیں کہانیاں سناتی ہوں اور ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی جاتی ہوں۔ اکیلی ہوتی ہوں۔ ان کے آنے سے تھوڑی دیر کے لئے دل بھل جاتا ہے۔“

”ہوں! اچھا بھو! تم یہیں کھیلو۔ میں آدھ گھنٹے تک واپس

شام کو ایک چمک لیکر بیاں درخت کے نیچے بیٹھتی تھی۔ وہ خوش مزاج تھی۔ خوش شکل تھی۔ رنگ گورانہ تھا۔ لیکن ایسا جسے لمبج کہیں۔ ناک نقشہ تیکھانہ تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے گول چہرے میں ایک عجیب جاذبیت تھی۔ اس کی صورت میں ایک خاص نمکینی تھی۔ جو بلا کی کشش رکھتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا اس نے چھو سات کتابیں اردو کی بھی پڑھی ہیں۔ اس نے اپنی داستانِ غم کچھ ایسے انداز میں بیان کی اور اس طرح چبچہ چپکے روئی کہ ایک دو آنسو میری آنکھوں سے بھی ٹپک پڑے۔

دو ہفتے گزر گئے۔ اور ہم ایک دو سرے سے بے تکلف ہو گئے۔ میں چمک والی کے پاس بیٹھ کر دم میں اس کا ہاتھ بٹاتا وہ مجھے چمک بنانا سکھاتی۔ اور جب مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو قہقہے مار کر ہنستی۔ میں شام ہونے سے پہلے ہی اس درخت کے نیچے بیٹھ جاتا۔ وہ کھڑی ہو کر آداب رکھتی اور میری دونوں ہاتھوں کو چمک بنانے میں مشغول ہو جاتے۔

دن گزرتے گئے اور ہمارے بے تکلفی بڑھ کر کشش سے بدل گئی۔ تمام دن بڑی مشکل سے گزرتا۔ بار بار میں اپنی گھڑی دیکھتا کہ کب پانچ بجیں اور میں گھر سے نکلوں۔ چمک والی بھی کہتی کہ آپ اتنی دیر میں کیوں آتے ہیں بے جلدی آیا کیجئے۔ لیکن مجھ کو سانی جان کا خیال تھا کہ اگر اتنی جلدی گھر سے نکلوں گا تو وہ ضرور پوچھیں گی کہ دھوپ میں کہاں جا رہے ہو۔

ایک روز جی میں آئی کہ آج جلدی چلیں۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب سو گئے تو میں چمک سے نکل کھڑا ہوا۔ درخت کے نیچے پہنچا۔ ابھی چمک والی نہیں آئی تھی۔

ویسے تو ہندوستان کی دوپہر اوائل بہار میں خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن ایسٹ آباد کی دوپہر ہمہ جہت درخت کے نیچے بیٹھ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ نہایت حین تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ کی گرمی میں ہلکی ہلکی ہو کی خشکی مل کر فضا کو نہایت خوشگوار بنا رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں کی دلکش سریلی آوازیں ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ مل کر ایک پُر کیف و پرور دلفراں لاپ

رہی تھیں۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک پوشیدہ احساس ایک ہلکا سا جذبہ ایک ناقابل بیان خواہش ایک نامعلوم امنگ میرے دل میں موجزن تھی۔ میں اس درخت کے تنے کو پیٹ لگائے کھڑا تھا۔ اس کے پتے ہل رہے تھے۔ اس پاس کی حسین طلسمی دنیا کو بہوت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک جادو تھا جو مجھے سلا رہا تھا۔ وہ آتی ہوگی۔ میں آہستہ سے درخت کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے کھڑی دیکھی۔ پونے تین بجے تھے وہ تین بجے آتی ہے۔ میں نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی۔ وہ نظر نہ آئی۔ فریب سے ایک بھو ترا شور مچاتا ہوا گزر گیا۔ ایک اور گزرا۔ ایک اور۔ سامنے بڑے درخت پر پرندے شور کر رہے تھے۔ دور گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ ساری دنیا خوش تھی مگر اس خوشی میں متانت تھی۔ سنجیدگی تھی۔ میرے سینے میں ایک خوار تھا۔ اور میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی سرے سے لگا کر بڑی کو آنکھوں پر رکھ لیا۔ اور اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا۔

کان پر سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے غنودگی کی حالت میں ہاتھ سے کبھی کوڑا دیا۔ وہ پھر آ بیٹھی۔ میں نے پھر آڑا دیا۔ وہ پھر میرے کان پر چلنے لگی۔ میں نے زور سے اپنے کان کے قریب سے ہاتھ گھمایا۔ میرا ہاتھ کسی چیز کو لگا۔ جھن سے آواز آئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا۔ چمک والی اسیجہ اپنی کلائی پکڑے ہوئے منہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس کی ایک چوڑی ٹوٹ گئی تھی۔ بظاہر وہ ناراض معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ اور چھوٹی سی پیاری ناک پر شرارت کھیل رہی تھی۔

اوہو۔ میں نے کہا۔ میں سمجھا تھا کبھی ہے۔ میں اپنی مسکراہٹ نہ دبا سکا۔ بلکہ نہیں دیا۔

”آپ کو شرم نہیں آتی؟ ایک تو مارتے ہیں اور پھر اوپر سے ہنستے ہیں۔“ اس نے جھوٹا غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

میں چونک پڑا۔ آپ کو شرم نہیں آتی؟ کتنا مبہک فقرہ تھا

لیکن مجھے برا نہیں لگا۔

”اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم نے کبھی بن کر مجھے کیوں ستایا؟ میں سو رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”لیکن آپ سے یہاں سونے کو کس نے کہا تھا؟ انتظار کرنا تھا تو جاگ کر کرتے۔“ اس نے طنز یہ انداز میں کہا۔

میں پھر چنک پڑا۔ ”انتظار!“ ہاں اس نے سچ کہا تھا۔  
- درحقیقت میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا۔ لیکن کیسا چبھتا ہوا فرقہ تھا۔ مجھے مزا آیا۔  
لیکن پھر فوراً اپنی خود داری کا خیال آیا۔ میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا  
”انتظار کس کا کرنا تھا؟ یونہی ذرا سیر کو جی چاہا۔ بہاں آگیا مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی جلدی آجاتی ہو“

وہ ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ”اچھا اب مجھے کام بھی کرنے دو گے۔ یا یہیں میری جگہ پر بیٹھے رہو گے۔“

دوسرے روز مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور پھر اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ لیکن آج میں نے دور سے دیکھا۔ کھک والی قمیض سے پہلے چلی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ وہ بھی میرا انتظار کرتی ہے۔ اس نے کہا۔ آداب! آج آپ بہت دیر میں آئے ہیں۔  
”نہیں تو اہل ہی کا وقت ہے“ میں نے کہا۔

”میں تو آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں۔“  
”کس کا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ شرما گئی۔ سر جھکا کر کہنے لگی۔ ”اچھا تو بیٹھے کام کریں“  
ہم بہت دیر بیٹھے ایک چمک بناتے رہے۔ کام کے دوران میں اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھو جاتا۔ اور کبھی اس کی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنس کر رہ جاتیں۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتی۔ غرض اسی طرح کبھی اتفاقاً اور کبھی جان بوجھ کر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے اور کام دلچسپ ہو جاتا۔

وہ ہمیشہ سفید اور اچلے پڑے پتلی تھی۔ اور چند دن سے تو میں نے کبھی میلے کپڑے اس کے جسم پر نہ دیکھے تھے۔ میں نے دیکھا

اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ اس کے بال بہت اچھی طرح گندھے ہوتے تھے۔ چہرہ کا رنگ بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ سرخ و سفید ہو گیا تھا۔ دوسرے وہ ایک سفید روح معلوم ہوتی تھی۔  
ایک روز میں نے اس سے کہا۔ ”نیمہ! میں ایک ہفتہ تک چلا جاؤں گا۔“

”کہاں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔  
”جہاں سے آیا تھا“ میں نے آہستہ سے کہا۔  
”نہیں! سچ کیئے“ اس نے گڑا گڑا کر کہا۔  
”سچ کہتا ہوں“

”کیا سچ آپ چلے جائیں گے؟“ آف! اس کی آواز میں سوز تھا۔ میں بچپن ہو گیا۔

”کیا کروں نیمہ! جی تو نہیں چاہتا۔ لیکن کالج کھلنے والا ہے اور مجھے وہاں پہنچنا ہے۔“

اس نے گویا چڑا کر آہستہ سے کہا۔ ”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ آپ چلے جائیں گے۔“ اس کی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی۔

میں چپ ہو رہا۔ ہم کام کرتے رہے۔ وہ چپ تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا۔ وہ سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔ مغرب کے وقت رخصت ہوتے وقت میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں میں اپنی سیاہ نگین آنکھیں ڈال دیں۔ پھر فوراً مڑی اور نہ جھپکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ میں گم سم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں غم کا بوجھ دل پر اٹھائے گھر واپس آیا۔

اب میں روز دوپہر کو جانے لگا۔ کبھی وہ پہلا جاتی کبھی میں ایک روز باتوں باتوں میں چمک والی نے مجھ سے کہا۔ ”میں غریب ہوں اور آپ بڑے آدمی۔ کاش آپ بھی میری طرح غریب بن جائیں“  
”کیوں؟“ میں نے کہا۔ ”اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوتا؟ اور ویسے بھی اول تو میں بڑا آدمی ہوں نہیں۔ اور اگر ہوں بھی تو تمہارے ساتھ تو بالکل برابر کی حیثیت سے ملتا ہوں۔ تم مجھے چھیڑتی ہو۔ برا بھلا



کتنی ہو۔ کمی بن کر کان پر چلتی ہو۔ لیکن مجھے تمہاری یہ سب باتیں اچھی لگتی ہیں۔ تم ناراض ہو جاتی ہو تو میں مناتا ہوں۔ اور ہر بات میں برابر کا سا برتاؤ کرتا ہوں۔ اس پر بھی تمہیں بڑے چھوٹے کا خیال آتا ہے؟

اس نے کہا۔ ”پھر بھی اگر آپ میں اور مجھ میں یہ فرق نہ ہوتا تو... وہ رک گئی۔ اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔ جن سے وہ اپنے سوہوم مطلب کا اظہار کر سکتی۔

میں نے پوچھا۔ ”تو کیا ہوتا ہے؟“  
”آپ بڑے بیوقوف ہیں۔“ اس نے کہا۔

یہ جیسا ہوا فقرہ مجھے اچھا لگا۔ میں نے مذاق کے طور پر کہا۔ ”اور تم عقلمند ہو؟“

”آپ کو تو فقط مذاق کرنا آتا ہے اور بس“ اس کی پیاری پیاری نظروں سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”نہیں“ میں نے کہا۔ ”تمہیں بس ساری عمر تین بھول سکتا۔“  
میرے سینے میں سوز کا غبار اٹھا اور میں نے ایک می ٹی ٹیڈی سن لی۔ ”نہیں نسیم! میں تمہیں کبھی نہ بھولوں گا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی کالی غلیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اور سر جھکا کر انہیں چھپالے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آخر میں نے بھی لہجھا۔

”نسیم! کیا تم بھی مجھے یاد کرو گی؟“ میرے اس سوال کے جواب میں اس نے سر اٹھایا اور اپنی غلیں پر نرم سیاہ آنکھوں ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ اٹ! وہ نظریں کبھی نہ بھولوں گا۔ اب

جب مجھے اس نظر کا خیال آتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں۔ وہ کچھ کتنا چاہتی تھی۔ لیکن میں اس وقت اس کی جاذب دل آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے۔ اس کے تہمتے ہوئے رخساروں پر

ڈھلک آئے۔ الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ ”تم رو رہی ہو“ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک خاموش سیلاب جاری ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور بچوں کی طرح

ہاتھ پھیر پھیر کر چپ کرانے لگا۔ ”نسیم! روؤ نہیں۔ آئی۔ آئی۔ روتی ہو! تم بڑی ہولیا نی ہو۔ تمہیں رونا نہیں چاہئے۔ دیکھو دنیا میں کسی چیز کو قیام نہیں۔ سب کچھ بدلتا رہتا ہے۔ مجھے بھی جانا ہے۔ خدا کی قسم۔ نسیم! میں تمہارے پاس سے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن میرے بس کی بات نہیں۔ میں کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟“

اس کی چھکی بندھ گئی تھی۔ وہ اپنا منہ میری آنکھوں میں چھپے رو رہی تھی۔ میں جھکا۔ میرا سر اس کے سر کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میری گود میں پڑے پڑے مہری طرف دیکھا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں

سراٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اسی لمحہ وہ گویا منہ سے چونک اٹھی۔ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ چپ کو لپیٹا۔ سامان اٹھایا۔ اور میری طرف ایک آخری چھچھلتی ہوئی نظر ڈال کر ہل دی۔ میں

ایک سیکٹ کے عالم میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ فوراً میں بیدار ہوا میں نے آواز دی۔ ”نسیم! کہاں جاتی ہو؟“ وہ جلتے جلتے مشکلی۔

مڑ کر دیکھا اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلنے لگی۔ میں نے پھر آواز دی۔ ”نسیم! نسیم! خدا کے لئے ذرا اٹھ جاؤ۔“ لیکن وہ

پہلے سے بھی زیادہ تیز قدم اٹھا کر چلنے لگی۔ میں ہماگ کر اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن خدا جانے کیوں میری ہاتھیں لڑا کھڑا نہیں اور میں درخت کے تنے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا ہ۔

دوسرے روز میں پھر اسی وقت گیا۔ لیکن وہ نہ آئی تھی۔ میں درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ آج مجھ کو معلوم ہوا کہ انتظار کے لمحے کتنے طویل ہوتے ہیں اور ملاقات کی گھڑیاں کتنی مختصر۔ ادھر ایسٹ آباد کی دوپہر کا پرسکون طلسم ادھر

میرے دل میں ہیجان و اضطراب۔ مجھے آس پاس کی سنہری دنیا کی مسرت پر رشک آ رہا تھا۔ کائنات مطمئن معلوم ہوتی تھی لیکن میں بچپن تھا۔ سڑک پر دو دو رنگ نظر و ڈرائی۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہوئے اور ہر دفعہ یہ کہہ کر دل کو

تسلی دی کہ بس اب آتی ہو گی۔ لیکن وہ نہ آئی۔ اگلے روز پھر میں گیا۔ اور وہ کہیں اس سفید روح کو درخت کے نیچے کھڑا دیکھا۔ میں نے قدم تیز کیا۔ لیکن اس نے مجھ کو

اور مدد کر بھاگی۔ درختوں کے جھنڈوں میں سے ہوتی ہوئی خدا جانے کہاں چلی گئی۔ میں بھاگا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے تک وہ غائب ہو چکی تھی۔ دل میں ایک شے ابھی۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ نظر نہ آئی۔ وہ میری نظر درخت کے تنے پر پڑی جس پر ایک کاغذ کیل سے لگا ہوا تھا۔ وہ ایک خط تھا میں نے دوبارہ دار اسے فوری لیا اور پڑھنے لگا۔

میرے دل کے مالک!

آپ نے مجھے دھوکا دیا۔ اب میں کبھی آپ سے نہیں مل سکتی میں نے جب پہلے دن آپ کو دیکھا تو مجھے آپ سے اس سا ہو گیا۔ خدا معذرت فرمائیے کہ میں نے آپ سے کتنے لمحے لگنے لگے۔ جب آپ میرے چلے گئے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد آپ نے روزانہ شروع کر دیا اور چند دنوں کے بعد آپ جی نہ رہے ساتھ بڑی محبت ملنے لگے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے غریب کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا۔ میں آپ کا یہ سلوک کبھی نہ بھولوں گی میرا خیال تھا کہ آپ اب بڑا آباد سے کہیں نہ جائیں گے۔ اور ہماری ملاقاتیں اور باتیں ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ کاش آپ مجھے اس وقت بتا دیتے کہ آپ چلے جائیں گے۔ تو میں عقل سے کام لیتی لیکن آپ نے مجھے غلامی میں رکھا اور ہمیشہ کہتے رہے کہ میں یہیں ہوں۔ دن گزرتے گئے اور میرے دل میں آپ کی محبت بڑھتی گئی۔ آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں آپ کی پیار کی باتوں کو سچ سمجھتی تھی۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ لیکن میں کم عقل تھی آپ کی نظروں سے محبت ٹپکتی تھی۔ آپ کی باتوں سے محبت کی بو آتی تھی۔ لیکن میں کم عقل تھی۔ آپ کی نظروں کے دھوکے میں آ گئی۔ آپ کو یاد ہو گا۔ ایک روز میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں آ گیا تو آپ نے اس طرح دیا یا کہ میری رگ رگ میں آپ کی محبت سرایت کر گئی وہ شے مجھے جب بھی معلوم ہو جاتا کہ آپ فقط دل لگی کر رہے ہیں۔ اور میرے دل کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں آپ سے زیادہ نہ ملتی اور اگر ملتی تو ایک غیر کی طرح۔ اور شروع ہی سے اپنے

اوپر جہر کر کے آپ کی محبت کو دل سے نکال دیتی۔ آپ کو یاد ہو گا۔ کہ ایک روز آپ میرا انتقال کر کے کرتے درخت کے نیچے سو گئے۔ میں نے آکر آپ کو جھینڑا تو آپ نے میری چوڑی توڑ دی۔ میں جھوٹ موٹ ناراض ہو گئی۔ تو آپ نے مجھے منایا۔ اس دن میں بہت خوش تھی۔ اور آپ کو دوسرا رو۔ لیکن بڑوں کو سن کر بھولے میں سہمی آئی۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میں بائیں ہاتھ میں فقط ایک خوش وقتی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیروا پیہ ہوا ہو گیا۔ میں آپ سے شکوہ نہیں کرتی۔ کیونکہ آپ بھی مجبور ہیں۔ کالج میں پڑھتے ہیں۔ اور ابھی آپ کو اور پڑھنا ہے۔ خدا کے آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور آپ اپنی تمنا اور مراد حاصل کر لیں۔ میں ہمیشہ آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی کہ خدا ہمیشہ آپ کی نگہبانی کرے اور اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ مجھے یقین ہے میرا خدا امری دعا ضرور سنے گا۔ میں آپ کو تمام عمر کبھی نہیں بھلا سکتی۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ آپ مجھے بھول نہیں گئے۔ آپ کے ہاں شہروں میں دن رات لگو کا سب سامان موجود ہوتا ہو آپ کو اور بہت سی لڑکیاں بھلائے کے لئے مل جائیں گی۔ خدا میں غریب کیسے یاد رہ سکتی ہوں۔

اب میں آپ سے کبھی نہیں مل سکتی۔ آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔ میں نے بے شرم ہو کر سب کچھ آپ کو لکھا ہے۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ آپ سے چھپا کر کیا کر دیں گی۔ مجھے آپ سے پاک محبت ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گا آپ کا یاد یاد کرتی رہوں گی۔ لیکن آپ سے مل کر میں آپ کی پڑھائی اور ترقی میں مائل ہونا نہیں چاہتی۔ آپ مجھ سے ملنے کا خیال نہ کیجئے۔ آپ کی بدنامی ہوگی۔ ممکن ہے دنیا کو معلوم ہو جائے اور آپ کے نام پر بٹہ لگ جائے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ میرا خیال دل سے نکال دیجئے اور اطمینان سے پڑھائی میں مشغول ہو جائے۔ آپ کو دنیا میں اور بہت سے کام کرنے ہیں۔ ان کی تیاری کیجئے۔ اور مجھے مدد فی سب کو میرے حال پر رہنے دیجئے آپ کی غم فی سب نسبتہ

میں نے یہ خط پڑھا تو سر مکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ اور میں بے بس ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا اور کیا کرتا رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ مغرب کے وقت میں اپنے چھوٹے چھوٹے ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ گھر واپس آیا +

اس کے بعد میں تین چار روز ایبٹ آباد میں رہا۔ روز دوپہر کو اس درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا۔ لیکن وہ نہ آتی۔ کاش وہ آجاتی۔ لیکن اگر وہ آجاتی تو میں اس سے کیا کہتا یہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں۔ کبھی دور سے کوئی سفید کپڑا والا کسان گزرتا۔ تو میری آپس بندھ جاتی۔ دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ لیکن پھر وہی یاس وہی غم۔ کئی بار خیال کرتا کہ نسیمہ کا خیال چھوڑ دوں۔ پڑھائی میں حرج ہو گا۔ مگر دل نہ مانتا اور ہر دوپہر کشاں کشاں نسیمہ سے ملنے کی آرزو میں اس درخت کے نیچے لایٹھاتا ہ

اس کے بعد میں جلد ہی لاہور واپس آگیا۔ لیکن مجھے نسیمہ کے خیال نے اکثر یہیں رکھا اور وہ ایک والی مجھے ہمیشہ یاد آتی رہی آج اس بات کو تین برس گزر گئے ہیں اور اب بھی بہار کے موسم میں مجھے وہ اکثر یاد آتی ہے۔ اور میں غمگین ہو جاتا ہوں دل میں کچھ ایسی ہوک اٹھتی ہے کہ کسی کام کرنے کو جی

نہیں چاہتا۔ جب موسم خزاں میں کسی اداس شام کو ایک بے برگ و بار درخت کے نیچے کھڑے ہوئے دل میں ایک میٹھا سا درد اور اداسی محسوس ہوتی ہے۔ تو مجھے ایبٹ آباد کی رنگین دوپہر ایک سہانے خواب کی طرح یاد آجاتی ہے اس دفعہ پھر ایبٹ آباد جانے کا ارادہ ہے۔ خدا معلوم نسیمہ کہاں ہے؟ اور کیا کرتی ہے؟ ممکن ہے اس کی شادی ہو گئی ہو اور وہ کہیں باہر چلی گئی ہو۔ لیکن میں اس بڑے درخت کے نیچے جایا کروں گا۔ جہاں میں چک والی سے ملا تھا ہر روز وہاں جاؤں گا اور درخت کے نیچے اسی مگہ بیٹھ کر اس طلسمی دوپہر کا لطف اٹھاؤں گا۔ وہاں ہوا ملکی ملکی سرسبز ہے کیسا تھ پتوں میں سے گزرتی ہوئی چلے گی۔ سامنے بڑے درخت پر پرندے شور مچائیں گے۔ دو رنگائیں گھاس چرتی ہوں گی۔ بھونرے بھنبھناتے ہوئے میرے پاس سے گزر جائیں گے کسی کسی کسان کے گائے کی آواز دور سے آئے گی۔ فضا میں غم کی جھلک ہوگی۔ اور میرے دل میں یاد رفتہ ایک سرور پیدا کرے گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس بڑے درخت کے نیچے ایک سفید روح سر جھکائے بیٹھی اپنے نازک ہاتھوں سے چمکیں بنا رہی ہو +

ریاض الدین احمد

## ملازموزی کی دو بہترین کتابیں

**شادی**، ہماری یا آپ کی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور ظرافت نگار حضرت ملازموزی کی شادی کے دلچسپ حالات، خود ملا صاحب کے قلم ظرافت رقم سے لکھے ہوئے۔ خیال فرمائیے کتنی دلچسپ کتاب ہوگی، ہمارا خیال ہے کہ اہلی شادی میں وہ رومانیت نہیں ہے جو اس کتاب میں پائی جاتی ہے۔ بس پڑھئے اور ہنسنے اور پھر پڑھئے۔ حیرت انگیز چیز ہے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت ۲۰/-

**صبح لطافت**، ملازموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا اگر انقدر مجموعہ، کتاب کا ہر صفحہ زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے سجایا گیا ہے، حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۰/-

نوٹ:- عالمگیر کے ناظرین کرام کو دو نو کتابیں یکجا خریدنے پر تین روپیہ چار آنے (۳/-) علاوہ مصروفہ ایک میں ملے گی۔  
 ملے کا پتہ: عالمگیر بک ڈپو - لاہور

# انگوٹھی

مترجمہ حضرت صہبائی بی۔ اے (آنر)

[ہمیں ناروے کا مشہور زمانہ ادیب ایک گڈرے کاڑکا تھا جس نے باقاعدہ تعلیم پانا تو درکنار بچپن میں کبھی یہ خیال بھی نہ کیا تھا کہ ایک دن وہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی کی دنیا میں۔۔۔ آفتاب بن کر چمکے گا۔ وہ مویشی چراتا اور فطرت کی سحر کاری سے سحر ہو کر زمین مناظر میں سین خواب بکھا کرتا۔ یہی خواب اس کی کتابوں میں جواہر ریزے بن کر چمکے۔ ہمیں پچھلے عرصہ میں پیدا ہوا اور گھر پر اپنے پیشے کے ساتھ ساتھ بخوبی بہت تعلیم پا کر اپنے نصب العین کی بلندی اور رفعت کے خیال میں محو رہنے لگا۔ اتفاق سے اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جانے کا موقع مل گیا۔ لیکن وہاں کی معرکوں زندگی میں ناکام رہ کر وہ پھر ناروے واپس آ گیا۔ آسکو (دار الحکومت میں چند ماہ بھوک اور فقر و فاقہ کی زندگی نے اس کے نظریہ حیات کو بے انتہا بلند کر دیا اور یہی علمی مصائب اس کے عظیم انظر شاہکار بھوک کوٹ کو منظر عام پر لانے کا باعث ہوئے۔ بھوک جیسے بلند پایہ ناول نے ہمیں کوا دیات میں نہ صرف روشناس کرایا بلکہ کلچر اس کی شہرت و عظمت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اس کے افسانوں ناولوں اور ڈراموں میں مرکزی کردار ایک ایسا نوجوان ہوتا ہے جو منظم سوسائٹی کا مخالف بلکہ اس کا ایک زبردہی نہیں ہوتا۔ یہی ہر دہر اس کے دو مشہور ناول "خاندان بدست" اور "آخری مسافر" میں نمودار ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بجائے خود ایک ایگزٹو ہونے کے زندگی میں صرف دنیا اور سوسائٹی کے ناخلفانہ اعمال کا ایک تماشا بین ہے!

"زمین کی پیداوار" ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی اور اس میں دنیائے قدیم کا ایک فرد جو تمام انسانوں سے مساوات اور امن دوستی کا متوقع ہے اور خود بھی انہیں صفات کا حامل ہے پھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس کتاب نے چونکہ زمانہ جنگ شائع ہوئی تھی اور امن فاشی کی ایک روح اور سچا پیغام تھی اس لئے عامۃ الناس اور خواص میں وہ ایک عجیب جوش اور احساس امن پیدا کرنے میں ڈائنامیٹ ثابت ہوئی۔ اکثر ممالک نے جو جنگ میں شریک تھے زمین کی پیداوار کا داخلہ اپنے حدود میں ممنوع قرار دیدیا لیکن ۱۹۱۷ء میں جب ہر قوم صلح اور امن کی حامل اور عامی نظر آ رہی تھی ہمیں کی کتاب اپنی اعلیٰ قدر و قیمت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور مصنف "نوبل پرائز" کا مستحق قرار دیا گیا!

ہمیں کی شہرت کا زیادہ تر مدار ناول نویسی اور افسانہ نگاری پر ہے لیکن اس نے بعض مرتبہ کامیاب تیشیل بھی لکھی ہے اور محدود شاعری میں بھی داخل ہونا چاہا ہے جس میں اس کی کامیابی چنداں قابل ذکر نہیں۔ مترجم [

چمکار روشنی پیدا ہوتی تھی۔ یہ خاتون اپنے جذبات کو چھپانے میں بالکل ناکام تھی۔ وہ کس سے محبت کر رہی تھی؟ اس نوجوان سے جو سنے کھر کی

ایک مرتبہ کسی دعوت کے موقع پر میں ایک خاتون سے ملا جو دیوانہ وار محبت میں گرفتار تھی اور اس کی انگٹھوں میں باری باری سے ایک ہلکی نیلی اور



## عالمگیر کڈ پو - لاہو

قارئین عالمگیر کی سہولت کیلئے اور ہر قسم کی علمی و ادبی کتابیں برقت میں کرنے کیلئے عالمگیر کڈ پو کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، اب ہم نے اس کو بہت زیادہ وسعت دیدی ہے اس پرچہ کے ساتھ چند لا جواب اور بہترین کتابوں کی فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ ناظرین عالمگیر کو جب کسی کتاب کی ضرورت ہو تو عالمگیر کڈ پو سے طلب فرمائیں۔ عالمگیر کے خریداروں کو مطبوعات عالمگیر کڈ پو پر بہت کافی رعایتیں دی جاتی ہیں اس لئے خریدار حضرات بالخصوص عالمگیر کڈ پو ہی سے کتابیں طلب فرمایا کریں۔

اس ماہ میں ہم نے پہلی کے خطوط کے نام سے ایک مجموعی کتاب شائع کی ہے عالمگیر کے خریداروں کو صرف ۷۰ علاوہ معمولہ اک میں ملے گی!

مینجر عالمگیر کڈ پو لاہو

پورا ایک سال گزرا گیا۔ میں پھر ایک مرتبہ اپنے دوستوں میں اور پرانی جگہ پر واپس گیا اور جب ایک دن شام کو ایک بہت ہی مایوس راستہ پر چل رہا تھا تو میں نے خاتون کو اپنی طرف آتے دیکھا اس کی آنکھوں میں باری باری سے ایک ہلکی سی اور چمکدار روشنی پیدا ہو رہی تھی لیکن اس کا چہرہ زرد اور اترا ہوا تھا۔ ابھی وہ دور ہی تھی کہ میں نے مجھ سے بکار نہ لیا۔

”یہ ہے تمھاری انگلی تھی۔۔۔ تمھاری تنگی کی انگلی تھی۔۔۔“ میں نے اسے دھونڈ لیا اور سب سے زیادہ میں نے اس کا حلقہ بھی بڑھادیا اب یہ بھی تمھاری انگلی میں تنگ نہ ہوگی۔“

محبت میں ناکام خاتون اور اس کے مصیبت زدہ چہرے پر میں نے نگاہ ڈالی۔۔۔ اور پھر میں نے انگلی کو دیکھا!

”افسوس!“ میں نے معمول سے بہت زیادہ جھجک کر کہا۔ یہ انگلی واقعی بے سنگونی کی علامت ہے۔۔۔ اور اب یہ میری انگلی سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے!

صہبائی۔ بی۔ اے۔ (آرژ)

## کان کی تمام بیماریوں اور نہپٹ براہین کا شرطیہ علاج

روئے زمین پر۔

کان کے تمام امراض کی ایک کیسٹ اور بلب اینڈ سنزیمیٹک پیلی بھیت کا ایک ذکر کردہ نسخہ جو بچوں اور بزرگوں کے کان کے لئے کم سنے بزرگوں کے لئے۔ طرح طرح کی آوازیں سننے۔ بہرین بلکہ بالکل سننے۔ درد۔ زخم۔ دم۔ خشکی۔ کھجلی۔ کان میں کیڑے پڑ جانے۔ ناسور اور کان کے تمام امراض پر ایک ایسی جادو اور جگہ کی دوا جو کسی کوئی دیگر نفیر آج آپ کے سطح زمین پر نہیں پاسکتے۔ زمانہ یائس سال کی طویل زندگی کا خانہ بد کی سپانی کا ایک خاص ثبوت ہے۔ صہبائی کی ہوا جو شوق سے یہاں ہی شریف لاکر علاج کر سکتے ہیں قیمت فی روپیہ ۴۰ روپیہ اور پیسہ ایک ساتھ تین شیشی طلب فرمائے پر معمولہ اک معاف کون بند اور کان کے زخم کو اور ہر قسم کے گندگی کو بلا جھاگ لائے ملا پانی و پچکاری مٹا کر دینی ہے قیمت فی شیشی ۸ روپیہ جادو شامی مینجن۔ ہلے دانت جادو شامی۔ دانت کی ہر ایک تھلیف اور گندہ دہنی کو دور کرتا ہے۔ قیمت فی پیکٹ ۴۰ روپیہ

جناب مسٹر مرزا حسین بیگ صاحب شیخ و دانا (عالم پور) اترام فرماتے ہیں کان کی دوا جو والدہ بزرگوں کو آسان کیلئے آپ کے طلب کی تھی وہ عید ثابت ہوئی۔ جناب مسٹر عظیم بیگ صاحب پونڈے اترام فرماتے ہیں آپ کی دوا پہلے جو سنگوئی تھی کان بالکل اچھا ہو گیا اور بھیت کے جناب مسٹر عبداللطیف حسین صاحب دہلی کلکتہ اترام فرماتے ہیں بلب اینڈ سنزیمیٹک پیلی بھیت کی دوسری شیشی بہت کامیابی سے کام کر رہی ہے ضرور کیلئے بہت مفید ہے جو اپنی دوا کے دام نہیں دیکھتے یہ ایک قابل علاج ہیں اور کان کے امراض میں خاص اہمیت رکھتے ہیں دوا سنگوئی دوا پونڈے مسٹر عبداللطیف

یہ جادو اچھا ہے براہین کی دوا بلب اینڈ سنزیمیٹک (پیلی بھیت۔ یو۔ پی)

# آندِ خورشید

حضرت آزاد انصاری،

غضب کی روشنیِ خطر نے دی ہر درختاں کو  
 بھٹے ہیں جلوہ خورشید سے ہر بام و در و روشن  
 کیا مزدور کو بیدار فرشِ خاک سے اس نے،  
 پڑے ہیں خوشنما شبنم کے موتی سبز و گل پر  
 و نورِ عیش سے ہر غنچہ و گل مست زنگینی  
 ہوائے تازہ نے کیسی بہارِ تازہ بخشی ہے  
 ادھر ہر منور پردہ تاریک سے نکلا  
 ادھر روشن ہوا خورشید کی تنویر سے عالم  
 ادھر گلشن میں لی شاخ شجر نے لکھے انگڑائی  
 دھلایا قطرہ شبنم نے منہ ہر ایک غنچے کا  
 مناد سے صدائیں آئیں ناقوسِ بہن کی  
 خدائے پاک کے آگے کسی کا سر خمیدہ ہے  
 خدا کے روبرو آزاد تو بھی سرنگوں ہو جا  
 میں اک ناکامِ الفت ہوں مری تائید کر یارب !  
 کیا اک آن میں جس نے منور بزمِ امکان کو  
 نہ چھوڑا اس نے تشنہ وادی و کوہ و بیاباں کو  
 جگایا اہل چلنے کیلئے در ماندہ دھقاں کو  
 نسیم صبح نے خبت بنا ڈالا گلستاں کو  
 طرب اندوز جس نے کر دیا مرغِ خوش الحال کو  
 پیامِ زندگی دیکر ہر اک قلب پریشاں کو  
 ادھر ہر پونجی ضیا، ہر ذرۂ خاک، بیاباں کو  
 ادھر جنبش ہوئی بیکسخت تارِ بربطِ جاں کو  
 ادھر اک تازگی حاصل ہوئی قلب پریشاں کو  
 حیاتِ تازہ بخشی نو جوانانِ گلستاں کو  
 مودن کر چکا بیدار ہر مردِ مسلمان کو  
 بچشمِ ترکوئی دھوتا ہے اپنے داغِ عصیاں کو  
 چھپائیگا کہاں تک یونہی اپنے دردِ نہاں کو  
 مجھے بھی ہمنارِ جلوہ خورشید کر یارب !



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

نمبر ۱۲

فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء

جلد ۲۵

| نمبر شمار | مضامین                | اثر خاتمہ                       | نمبر صفحہ | نمبر شمار | مضامین            | اثر خاتمہ                    | نمبر صفحہ |
|-----------|-----------------------|---------------------------------|-----------|-----------|-------------------|------------------------------|-----------|
| ۱         | فہرست مضامین          | مینجر                           | ۱         | ۱۱        | عظمت نسوانی       | مختصرہ فاطمہ لیاقت منشی فاضل | ۲۸        |
| ۲         | ملاحظات               | ادارہ                           | ۲         | ۱۲        | سائیں بابا        | علامہ امجد حیدر آبادی        | ۲۹        |
| ۳         | دیوار چین             | جیکم محمد ابراہیم صاحب مچوال    | ۵         | ۱۳        | زیاں تھانہ سودھیا | جناب بابر صاحب بٹالوی        | ۳۰        |
| ۴         | تخیلات عالیہ          | نواب اعانت جنگ سین الدولہ بہادر | ۸         | ۱۴        | کیفیات            | حضرت علامہ کیفی چڑیا کوٹی    | ۳۷        |
| ۵         | مختصر شعر جیکم قاتانی | حضرت صہبائی بی۔ اے آنرز         | ۹         | ۱۵        | عراقی ستارہ پرست  | مولوی عبدالعالی صاحب         | ۳۸        |
| ۶         | موت اور انسان         | مختصرہ صدیقہ بیگم سیوہاروی      | ۱۳        | ۱۶        | ابراکاز اور ستارہ | جناب یحییٰ محمد فاروق صاحب   | ۴۴        |
| ۷         | درس بصیرت             | مولانا محمود اسرار علی          | ۱۴        | ۱۷        | پردیسی پریا       | ماسٹر ممتاز حسین صاحب بٹل    | ۴۵        |
| ۸         | آپ بیتی               | جناب شرم صاحب صدیقی ردولوی      | ۱۵        | ۱۸        | کیفستان           | پروفیسر رگھوپتی سنگھ قرآن    | ۵۵        |
| ۹         | جذبات عالیہ           | اعقبہ الملک حضرت دل             | ۲۴        | ۱۹        | غزل               | ماسٹر تبارک علی عبرت صدیقی   | ۵۶        |
| ۱۰        | رجوع باطل             | مختصرہ فاطمہ لیاقت منشی فاضل    | ۲۵        | ۲۰        | اشتہارات          | مشتہرین اصحاب                | ۶۷-۷۷     |

عالمگیر خاں نمبر ۱۹۳۷ء اپنی فقید المثال خصوصیات کی بنا پر عظیم لفظیہ گاہ

مکتبہ جامعہ دہلی

اگر آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم عزیز ہے تو مکتبہ جامعہ اسلامیہ کی باتصویر رسالہ تعلیم طلبہ لکھیے  
چند سالانہ صرف ۸ روپے پر چھپا کر سالانہ نمبر ۸ روپے کا پتہ، مکتبہ جامعہ قدول باغ دہلی

مکتبہ

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید پٹھان لاہور سے شائع کیا

# ملاحظیات!

## ملاحظات ضرور ملاحظہ فرمائیے

اشاعت گزشتہ میں ہم نے اردو کے موقت الشیوع رسائل و جرائد کے خاص نمبروں کے ادبی و فنی معیار کو بالتفصیل زیر بحث لاتے ہوئے عالمگیر کے پچھلے خاص نمبروں اور سالناموں کے متعلق ایک حقیقت غیر مستورہ و واضح کا اظہار کر کے دسمبر میں شائع ہونے والے مہتمم بالشان خاص نمبر کے باب میں چند اشارات کئے تھے۔ دعویٰ کی وقعت و صداقت صرف اسی وقت دینا ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ مدعی کا ہر لفظ، ہر ایک فقرہ، ہر ایک اعلان علی جاہ پس لے۔ وہ دعویٰ جو عمل سے یکسر محروم ہو، دیکھنے صداقت میں ذرہ بھر وقعت حاصل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا، اور کہے بھی کیونکر؟ دنیا عمل چاہتی ہے، زبانی گفتگو نہیں، آپ اس معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہمارے پچھلے دعاوی و غرائم پر چھپتی ہوئی نظر ڈالیں اور پھر ہمارے خاص نمبروں کو اپنی نظروں کے سامنے لائیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ اپنے خاص نمبروں کے باب میں ہمارا ہر ایک اعلان عمل کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دعاوی صداقت سے محروم نہیں سمجھے جاتے، اور ہر ایک شخص جس نے کبھی ہمارے کسی دعویٰ کو پڑھا ہے۔ قوت احساس کی پوری شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارا دعویٰ الفاظ کی رنگین و فریب کار دنیا سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور صرف عمل کی دنیا کو محبط ہے! ہم دونوں اشاعتوں سے بات لگ دہل اس چیز کا اعلان کر رہے ہیں کہ دسمبر میں شائع ہونے والا عالمگیر کا خاص نمبر دیکھنے اردو کو چار چاند لگا دیگا۔ اور اپنے ہم عصروں کے سامنے خاص نمبر کا ایک خاص معیار پیش کرے گا۔ آپ نے جب ہمارے پچھلے دعویٰ کو صداقت سے محسوس کیا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس زیر ترتیب خاص نمبر ۱۹۳۷ء کے بارے میں ہمارے ہر ایک اعلان کو اعلان صداقت نہ سمجھا جائے۔ دنیا کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے کن کن دشوار تجربات، ہمت فرما کر اصل، بہت تسکین منازل کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے،

یہ چیز وہی شخص جان سکتا ہے جس نے دوسروں کے اعتماد کے حصول کیلئے امکانی کوششوں سے کام لے کر اس مرحلے کی تمام تلخیوں کو بخندہ پیشانی برداشت کیا ہو۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ عالمگیر کے قارئین کرام ہم پر کئی اعتماد رکھتے ہیں اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آج تک زندگی کی منزل میں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کر لی ہیں۔ ہم نے مہمان عالمگیر کے ساتھ جو وعدہ کیا اسے پورا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کار پر د ازان عالمگیر، قارئین عالمگیر کے ساتھ اسی وقت وعدہ کرتے ہیں اور وہی وعدہ کرتے ہیں جسے وہ اپنے وقت مقررہ پر بطور احسن پورا کر سکیں۔ ہم نے یہ بھی کبھی نہیں کیا کہ اعلان کر دیا کہ ریل جہازی سائز پر شائع ہوگا اور شائع ہو وہ معمولی سائز پر۔ یا یہ وعدہ کیا ہو کہ اس خاص نمبر میں اتنی باصرہ نواز سرنگی تقویر شریک اشاعت ہوگی اور تصویریں مقررہ تعداد سے کم دیں۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ رسالہ کے صورتی بخودی محاسن ہمارے وعدوں اور دعویٰ سے بڑھ کر ظاہر ہوتے ہیں۔

ہم پھر اعلان کرتے ہیں کہ عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۷ء جس بچہ ہماری تمام کوششیں مرکوز ہیں اردو کو تمام خاص نمبروں اور سالناموں سے یقیناً بڑھ چڑھ کر شائع ہوگا۔

ہمارے سامنے رسالے کو معیار کی انتہائی سطح پر پہنچانے کے واسطے ایک ایسی زبردست کیم ایک ایسا مہتمم بالشان لائحہ عمل ہے جس پر عمل کر کے ہم اپنی توقعات سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہونگے۔ یہ حکیم جہاں تک آپ کے علم کا تعلق ہے بالکل پردہ انخلا میں ہے اور اسے پردہ انخلا میں رہنا چاہئے کیونکہ ہم اس کاروشن ترین پہلو، جسے دنیا کی تمام زبانیں علی پہلو کہتی ہیں، خاص نمبر کی صورت میں پیش کرینگے۔ آپ حسب معمول ہم پر اعتماد رکھیں اور ہمارے دعویٰ کو صداقت پر مبنی سمجھیں۔

ہمارا کام اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہے۔ آئیے ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ بغیر تعاون کے دنیا کا کوئی کام پوری کامیابی کے ساتھ پورا نہیں ہوا ہے۔ آپ اپنا کام کریں، ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ ہمارے اعلانات پر اعتماد کرنے کے ساتھ ہی عالمگیر کے محترم قارئین پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے حلقہ احباب و اشراف میں تاجدارانہ اپنے عالمگیر کی ترویج، اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں۔ عالمگیر کی یہ ہائز مد آپ کی اس پیاری اردو زبان کی مدد کے مترادف ہے جس کی تخریب کے لئے معاذین ابڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ لیکن ہم یقین ہے کہ عدل کے قتل کے فضل و کرم سے اردو کی اس آہنی دیوار کو چٹا لینا کسی مباحوث و اجوج کے بس کی بات ہے۔

## مضمون نگار حضرات کے گزارش

یہ ایک مسئلہ امر ہے کہ جب سالانہ مضامین کی مضمونوں کو برداشت کر کے کتابت کے منازل طے کر چکے ہیں تو ہمارے محترم مضمون نگار ہاتھ میں قلم اٹھاتے ہیں، یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اردو کے عام رسالے و کتابتوں پر تو کچھ نہیں اس لئے ایک دو ماہ پیشتر روانہ کرنے سے کیا فائدہ؟ مگر چونکہ عالمگیر بہت کم ایسے مواقع آئے ہوں کہ وہ بدیر نکلا ہو اس لئے مضمون نگار حضرات اس کی تاریخ اشاعت سے بدگمان نہیں ہیں۔ خاص نمبر کی کتابت کو شروع ہوئے ابھی چند دن گزرے ہیں مگر ہندوستان کی معمول سے برابر مضامین دفتر میں موصول ہو رہے ہیں۔ اس جگہ ہیں اپنے دیگر محترم مضمون نگاروں کی خدمت میں یہ گزارش کرنا ہے کہ وہ بھی نظر انصاف سے کام لیں۔ اگر وہ مضامین جلد از جلد بھیج دیں تو کارپردازان رسالہ کو خاص نمبر کی ترتیب و تدوین کے باب میں ان مشکلات و کالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ جو مضامین بدیر پہنچنے سے ایک ہجوم کی صورت میں نازل ہو جاتی ہیں، ہمیں امید و اتق ہے کہ معزز و محترم مضمون نگار حضرات ہماری گزارش پر توجہ فرمائیں گے اور جلد اپنے گرانقدر مضامین بغرض اشاعت روانہ فرمائیں گے!

## عالمگیر کی پالیسی

عالمگیر کو پڑھنے والے حضرات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہم نے کبھی اپنے

کسی ہم عصر کے خلاف نہیں لکھا، اور نہ کبھی کوئی ایسا مضمون شائع کیا ہے جس میں کسی رسالے یا کسی رسالے کے کسی مضمون نگار کے خلاف ایسی تنقید ہو، جو بھری پہلوئے ہوئے ہو شائع کی ہو۔ اول تو ہم اپنے ہم عصروں کے خلاف کسی حالت میں بھی قلم اٹھانا پسند نہیں کیا اور جب کبھی کچھ لکھنے کی نوبت بھی آئی ہے تو صرف یہ چیز مد نظر رکھ کر کہ یہ مدافعہ پہلو ہے اور مدافعہ پہلو اختیار کرنا دینے کے اخلاقیات میں جائز ہے۔ مختصر یہ کہ ہم اپنے ہم عصروں کے خلاف لکھنا، معاصرانہ فرض سے بعید سمجھتے ہیں۔ ہماری پالیسی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کے باوجود اگر ہمارے مضمون نگار دفتر میں بغرض اشاعت ایسے مضامین روانہ فرماتے ہیں جن میں بھری پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ہم ایسے مضامین کو ہرگز شائع کرنے کے واسطے تیار نہیں ہیں۔ ہم پھر اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہیں کہ عالمگیر میں تجزیاتی اور محض ذاتی عناد پر مبنی تنقیدیں کسی حالت میں بھی شائع نہیں ہو سکیں۔ اس لئے مضمون نگار ایسی تنقیدیں دفتر میں نہ بھیجا کریں کیونکہ ہم انھیں شائع نہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ ہمارا بعض مضمون نگاروں کی روش تبدیل ہو جائیگی۔

کوئی صاحب اس سے یہ سمجھیں کہ ہم ادب کے ایک نہایت ضروری شعبہ یعنی تنقید نگاری کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تنقید کو نہایت ہی ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے خیر ادب کا ایک نہایت ضروری اور اہم شعبہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ مگر وہ تنقید جو محض ذاتی عناد پر مبنی ہو، کسی حالت میں بھی تنقید کہلانے کی قدرت نہیں ہے۔ ایسی تنقید سے ادب کو فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان پہنچتا ہے!

## شمارہ حاضرہ

میں تمام مضامین افادی حیثیت سے بہت کامیاب ہیں۔ ہمیں اس حقیقت صحیحی کے اعلان میں تامل نہیں کھانا چاہیے کہ مضامین حقیقی مضمون میں حیات آموز ہوتے ہیں۔

اس شمارہ میں حکیم قاضی پر جو بلند پایہ مقالہ ہے وہ قارئین سے ضرور داد تحسین حاصل کرے گا۔ اردو میں ایسے بہت کم مضامین لکھے گئے ہیں جن میں دوسری زبانوں کے علما و مشاہیرین ادب کی ذہنی کاوشوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہو حالانکہ اس چیز کی اشد ضرورت ہے۔ ہم صاحب مضمون

عالمگیر کو یہ غور حاصل ہے کہ اس کا حصہ نظم ہمیشہ بہت بلند رہا، ملک کے جلیل القدر شعرا و عالمگیر کو نوازتے ہیں شمارہ حاضرہ ہی کو دیکھئے کن کن قابلِ غرور شعرا کا کلام درج ہے۔ ہم تمام شعر کے نمونہ احسان ہیں۔  
شمارہ آئندہ (نومبر) میں ہم خاص نمبر میں شایع ہونے والے  
چند مضامین کے عنوانات اور تصاویر کے نام درج کریں گے  
(ادارہ)

کے نمونہ احسان ہیں اور یہ کہتے ہیں آپ آئندہ بھی اس قسم کے نمونہ مضامین عالمگیر کو  
مرحتہ فرمائیجئے۔ آپ ملتی چند خطوط کا مجموعہ ہے جو وحدت کی زندگی کے ایک عالم پر  
کی بہت کامیاب نئی تھیں ہے جناب خرمرد دوی کا پہلا مضمون جو گسٹ کے عالمگیر  
میں شایع ہو چکا ہے بہت مقبول ہوا ہے (Dedication) نئی تھیں  
ایک نہایت دستور اور شکل منزل ہے اور ہر ایک مضمون نگار سے ملے کرنے کی اپنے اند  
مسلک نہیں لکھا جناب خرمرد صاحب کو ہم ایسے بلند پایہ مضمون پر قابل مبارکباد سمجھتے ہیں

## علمی ادبی جواہر کا گران بہا خزانہ!

عالمگیر کا  
خاص نمبر ۱۹۳۷ء

گراں قدر مضامین، دلگداز افسانوں، باصرہ نواز تصویروں اور کیف بالظلموں کا بلند پایہ مجموعہ  
پسہر علم و ادب کا یہ درخشاں مآثر باہاں فوق صحافت پر دسمبر کے پہلے ہفتہ میں  
طلوع ہو کر شیدا بیان اُردو علم و ادب کے لئیں سروردِ دل و خوشی چشم کا باعث ہوگا

سالانہ خریداروں کو حسبِ اہل مفت  
صفحہ چھاپہ

عالمگیر بارہ تیرہ سال سے اُردو علم و ادب کی مستقل و مسلسل خدمات انجام دے رہا ہے اور اپنے ناظرین کی خدمت میں  
دو بلند پایہ و ضخیم خاص نمبر (دسمبر، جون) مفت پیش کرتا ہے۔ اس کی خریداری قبول کرنا یقیناً  
آپ کا علمی و ادبی فرض ہے اور یہی یقین ہے کہ آپ اس نعمتِ شگوار فرض کو جلد از جلد محسوس فرمائیں گے

سالانہ چندہ صرف چار روپے چار آنے علاوہ محمولہ ڈاک، نیاز مند میجر عالمگیر لاہور

جناب کیم محمد ابراہیم صاحب بھوپال سٹیٹ

[illegible]



جہاز پر دس ہزار قرائیں وقفہ بجائے جائیں تو اس جہاز کے تہوار پر بجز طوفان کے شور و غل کے قرائوں اور نقاروں کی آواز کو کوئی نہیں سن سکتا!

دیوار مذکور کی عظمت کا کسی قدر اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ایک انگریز سیاح نے جو علم ریاضی کا اہل دہرا مندس تھا حساب لگا کر یہ تخمینہ بیان کیا کہ دیوار ختا کے نقطہ

برجوں میں اس قدر اسباب تعمیر صرف ہوا ہے کہ تمام اٹھستان کی ہر طرح کی عمارتوں پر جو کچھ خرچ ہوا ہے شاید اس کے مقابلے میں بہت کم نکلتے گا۔ پس غور و تامل فرمائیے کہ جس قدر دولت کثیر اس دیوار پر صرف ہوئی ہوگی اس کا کیا ٹھکانہ ہے! ۱۵

۱۵ صفحہ ۲۰۰ باب ۱۲: فقرہ ۲ جلد اول مطبوعہ ۱۸۴۵ء مطبع متذکرہ  
حاشیہ میرا: حکیم محمد ابراہیم بھوپال

## تین خواب جوانی

### بڑھاپا

رات کی تاریکیوں میں میرے نظام کی تکمیل ہو چکی ہے  
میری آنکھوں سے انگلیں نفاذ ختم ہو چکے ہیں  
رہ رہا ہوں۔۔۔ زندگی تباہ کن پریشانی ہے  
میری روح میں جوش نہیں.... میرے افانوں  
میں آتش نہیں  
موت کے پردار فرشتے کی رتھ کی آواز

میرے کانوں میں آ رہی ہے!

وہ میری طرف آ رہا ہے!

میرے ہاتھوں پر کتہ ہے!

میرے نغے ختم ہو چکے ہیں۔ سیر ضعیف

ہاتھوں میں ٹوٹی ہوئی تلوار ہے۔ جس میں ٹوٹے ہوئے

نغے تڑپ رہے ہیں۔

آ۔۔۔ موت کے پردار فرشتے میں

تھارا منتظر ہوں!

میری پیاری اماں! مجھے آخری پیار کر لو!  
دوپہر کی کرکڑاتی دھوپ میں سیر نظام  
کی تکمیل ہو رہی ہے  
میں زندگی کی لامتناہی جنگ میں جا  
رہا ہوں

میرے نغوں میں ابدی سستی ہے!  
میرے افانوں میں آتش موجزن ہے!

میری پیاری اماں! مجھے آخری پیار کر لو!

میری آنکھوں سے نیند غایب ہو رہی ہے

میرے لئے زندگی حسن عشق کا ایک طویل

افانہ ہے

ظالم کیو پڈ کا تیر میرے سینے میں لگ چکا ہے

میری اماں! مجھے آخری پیار کر لو!

میں اپنے ہمانوں کیلئے مستل محبت

جمع کرنے جا رہا ہوں!

### بچپن

میری پیاری اماں! مجھے اولیں پیار کر لو!  
صبح کی رنگین شفق میں میرے نظام کی  
تکمیل ہو رہی ہے  
میں اپنے نغے سینہ میں دنیا کا راز لیکر آیا ہوں  
جس کی آتش سے میرا دل سنگ رہا ہے!۔۔

جس کی شدت سے میں چلا رہا ہوں!۔۔

جس کی رنگینی میں میری امیدیں نہاں ہیں!

میری پیاری اماں! مجھے اولیں پیار کر لو!

میں دنیا کو لطیف اور پاکیزہ سمجھ کر آیا ہوں!

میں زندگی کو وسیع اور رنگین سمجھ چکا ہوں!۔

میں ہر انسان کو دوست سمجھ رہا ہوں!۔

میری اماں! مجھے اولیں پیار کر لو۔

میں اپنے ہمانوں کے لئے

خوشی کا

بجرانغ ہوں!

ابن حسنین

..... عالمگیر ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء ..... عالمگیر ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء



# مخملاتِ سالیہ

معلیٰ القاب العجائب امیر اکبر نواب اعجاز جنگی معین الدولہ بہادر دام قبالہ شیر شاہ

بتوں نے چاہنے والوں کو خوار ہی رکھا  
تمام عمر رہے ہم اسیرِ دامِ بلا  
خوابِ خستہ و زار و نزار ہی رکھا  
خیالِ کاملِ پیچِ پاں نے مار ہی رکھا  
ہمیشہ محوِ غمِ انتظار ہی رکھا  
مگر ہماری طرف سے غبار ہی رکھا  
تصورِ نگہِ مستِ یار کے صدقے  
گراں تھی دل پہ جو تکلیفِ دستِ وحشت کی  
خوشی کے دن نہ دکھائے کبھی مقدر نے  
نہ تو نے چین سے رہنے دیا کبھی اے دل  
بٹی ہزار نہ گلہائے دل غ کی دھم بھہر  
خیالِ نرگسِ مسرور میں ترے قرباں

معیس بڑھا کے گھٹانے کی خونیں اپنی  
دیباچہ عروج جسے، بادِ تار ہی رکھا

# مجتہد الشعرایہ قآنی اور اس کے ممدوحین

۱۸۰۷ء تا ۱۸۵۳ء

از مولانا صاحب سائی بی۔ اے (آنر)

قآنی نے شعر و سخن کی مشق کے ساتھ ساتھ علوم السنہ کا مطالعہ بھی نہ چھوڑا چنانچہ وہ نہ صرف شاعری کی تمام اصناف پر کمال قدرت رکھتا تھا بلکہ ایک متبحر زبان داں بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان اور جس زبان میں پورا پورا ملکہ رکھتا تھا۔ اور اس کے طرز ادا اور خیالات سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کہیں کہیں فکر مغرب سے استفادہ کیا ہے۔ فارسی شاعری میں اس کا انداز نہ صرف الفاظ اور حسن تخیل پر ہی دلالت کرتا ہے بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ زبان پر اسے پوری پوری قدرت حاصل تھی جو اس کے معاصرین میں کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔

افسوس ہے کہ عمر نے مشرق کے اس بلند پایہ مفکر اور شاعر کے ساتھ دفاع کی اور صرف ۴۷ سال کی عمر میں یہ سنہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں وہ اس مادی قید و بند سے آزاد ہو گیا۔

**قآنی کی تصانیف** قآنی نے ایک دیوان کے علاوہ نثر میں بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ”بار“ اور ”پریشان حکیم قآنی“ ہیں۔ آخر الذکر کتاب نثر میں گلستان سعدی کے طرز میں لکھی گئی ہے جس میں تقریباً ۱۱ حکایات پسند و نضار اور اقوال موجود ہیں۔ اس کتاب میں خود نوشتہ سوانح کی جھلک بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ کلیات قآنی میں تقریباً سات ہزار ہیں۔ ان میں تصانیف قطعات، غزلیات، ترکیبات اور چند تنزیہات بھی شامل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قآنی کی ہمارے فن خصوصیت کے ساتھ تصانیف دیکھی گئی ہے اور یہی اس کی ادبی اس کی ادبی شہرت کا سبب ہوئے ہیں۔

**طرز کلام** نقیبہ دلی میں قآنی نے گونا گوں علمیت اور ہر قسم کی تعلیم کا اظہار کیا ہے۔ بعض بعض قصیدوں میں تو دودھ و سوا شاعر

ایران کے شہور زمانہ ادیب اور شاعر حکیم قآنی کا اصل نام مرزا حبیب اللہ تھا۔ قآنی کے متعلق بالاتفاق یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ عہد جدید کے فارسی شعرا میں اس کا درجہ افضلیت رکھتا ہے۔ قآنی مرزا عبدالحسین متخلص گلشن کاڑ کا تھا۔ ۱۸۰۷ء یا ۱۸۰۸ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ سات سال کی عمر تک تو وہ شیراز ہی میں ابتدائی تعلیم پاتا رہا لیکن آٹھویں سال شہد چلا گیا اور السنہ قدیم و مختلف علوم کی تحصیل میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس کی شہرت بحیثیت ایک نوخیز شاعر کے دروزدیک تک پہنچ گئی۔ فن شاعری میں اس کی حیرت انگیز مہارت اور اس کے کلام کی نفاست نے مرزا حسن علی شہنشاہ الدولہ یا شہنشاہ السلطنت کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ قآنی کچھ دن اپنے سرپرست کے دربار میں رہا جو اس کے فیض صحبت سے مستفیض ہوتا رہا، اور کچھ عرصے کے بعد اسے اپنے باپ فتح علی شاہ قاجار کے دربار میں بھیج دیا۔ اس بادشاہ نے جو علم و فضل اور شاعری کا دلدادہ تھا قآنی کی بڑی عزت و عظمت کی اور نہ صرف بیش بہا انعامات اور خلعتیں فائز ہوئے بلکہ اس کو نواز ایک مجتہد الشعرایہ کے لقب سے بھی سرفراز کیا۔

اسی کے بعد ناصر الدین شاہ قاجار کے عہد حکومت میں اس کو ملک الشعرا کا خطاب مرزا علی قلی کی کوششوں سے حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ اس وقت دربار ایران کے شہر کا ممتاز ترین خطاب تھا۔ مرزا علی قلی اس زمانہ میں سلطنت کا وزیر اعظم اور کل سیاہ و سفید کا مختار تھا۔ خود بھی ایک فاضل تھا اور شعر و شاعری سے کمال شغف رکھتا تھا۔ اس کی سرپرستی نے قآنی کا جہل و بہت بلند کر دیا اور آج دنیا کے سلسلے قآنی کی شاعری فارسی شاعری کی روح رواں سمجھی جاتی ہے۔

سے بھی زیادہ ہیں، عرفی نے بعد قافی کے سوا کسی فارسی شاعر کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہوا کہ نئی نئی ترکیبات اور شعراء اصطلاحات کی اختراع کرے۔ چنانچہ قافی کی شاعری کے بعض بعض شارحین نے ان اصطلاحات کی ایک فہرست تیار کی ہے جس کو دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بغیر اس سے استعصاب کئے قافی کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔

ایک قصیدہ گو کی حیثیت سے قافی کا مرتبہ کسی طرح اتوری، قافی، قافی، ظہیر فارابی، غفری اور فرخی سے کم نہیں ہو سکتا۔ تخیل کی رفعت اور بجز قافی کے استعمال میں حدت اس کا امتیازی حصہ ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ان اوصاف میں وہ اپنے معقدین سے بھی انکے بڑھ گیا ہے۔ قافی نے انتہائی گوشش اور سعی یلین سے فارسی کی صحیح شاعری اور زبان کی سلاست و نفاست کو زندہ کر دیا ہے اور اس اعتبار سے اسے فردوسی اور نظامی گنجوی کا قائم مقام کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ طرز ادا میں بھی قافی خود اپنی نظیر ہے۔ زبان جو وہ استعمال کرتا ہے روانی میں آب رواں سے کم نہیں کہی جاسکتی اور بیان اس کا خاص حصہ ہے، غرض یہ کہ سلاست، صفائی، نفاست الفاظ اور شیرینی زبان، طرز ادا کی خوبی، قوت بیان اور محرکات ترنم یہ سب ایسی خصوصیات ہیں کہ سننے والوں اور پڑھنے والوں پر فوری اثر ہوتا ہے۔ اور ایک بیخودی و کیف سا طاری ہو جاتا ہے۔

قافی نے جہاں شعر کی ان خصوصیات کو فن کے اعتبار سے برقرار رکھا، وہیں زبان کی خصوصیات کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مناظر قدرت، موسم بہار کی رنگینیاں، خزاں کی تباہ کاریاں، دن اور رات کا سماں، موسموں کی تبدیلیاں اونٹ، گھوڑے، عمارات، رسوم اور تہوار، نوروز اور عید کے جزیات اور تفریبات کے اظہار میں وہ فارسی شعراء کی طرح ایک ندرت پیدا کر رہے ہیں یہ طبعی رکھتا ہے اور کسی طرح فرخی، منوچہری اور حکیم سنائی سے کمتر شمار نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً فرخی کا رنگ قدیم شعرا میں اس کے اشعار و قصائد میں کافی نمایاں ہے۔

**السنہ مشرق پر عبور** قافی اپنی شاعری کو دو زبان میں فارسی عربی اور ترکی کا، کافی مظاہرہ کرتا ہے جس سے اس کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اسے فرانسیسی اور جرمن کے علاوہ ان مشرقی زبانوں پر بھی انتہائی عبور تھا۔ ایک فارسی شاعر کے لئے ندرت تخیل اس زمانہ میں جتنی ضروری چیز ہو سکتی تھی، قافی نے اپنی شاعری میں اس کا خاتمہ کر دیا اور اس کی

شاعری اور تخیل اور جدت کی نگینوں سے مالا مال تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ قافی جو کا بھی مالک تھا۔ اس کے کلام میں اکثر تلخی زبان، دھمکیاں اور سخت الفاظ کی جھلک موجود ہے۔ خصوصاً جس جگہ وہ اپنے معقد میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکا ہے، اس نے جو کابلے محابا استعمال کیا ہے اور متعدد فارسی شعراء کی طرح جس میں اتوری کا درجہ اول ہے اس نے جو کو ذریعہ کامیابی بنایا ہے۔ قافی نے قصائد کو چند در چند بجز اور زمینوں میں استعمال کیا ہے، اور اس اعتبار سے اس کو قافی کا ایک قریبی ہیرو سمجھنا چاہئے، جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا، قافی جدت خیال کا حد سے زیادہ شائق تھا۔ رفعت تخیل کی غیر لولائی اس میں مطالعہ فطرت اور خصوصاً فرانسیسی شاعری کے استفادہ سے پیدا ہوئی تھی یہی امتیاز انگریز شاعروں میں لارڈ، ٹینیسن کو بھی حاصل تھا اور قافی کی شاعری کا اس سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

قافی نے شاہی دربار داری کے نقشے حسین اور بہت ہی رنگین الفاظ میں کھینچے ہیں، اسی کے ساتھ معاشرتی حالت، اپنے زمانے کے رسم و رواج اور اپنے ملک کی حالت بھی بتائی ہے۔ دوسرے قصیدہ گو شعراء کے مانند اپنے مرثی اور مدوح کی صفت و ثنائیں قافی نے اپنے پیشرو اور متقدین سے ذرا ہٹ کر ایک جدید طریقہ اختیار کیا ہے یعنی قصیدہ کے آغاز میں عموماً وہ تشبیب کو نظر انداز کرتا ہے، لیکن چند قصیدے جن میں اس نے حسب دستور پہلے تشبیب لکھی ہیں ان میں حصہ تشبیب کو تغزل کی ایک عمدہ مثال اور نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ قافی اکثر خود ستائی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ

چوئی من پس از وصال نیامی کس

مدبار اگر بکاوی تو ایراں را

**پروفیسر براؤن کی رائے** مشہور مشرق پر عبور راؤں کی رائے ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

”قافی فارسی شعرا میں سب سے زیادہ خوشگوار اور زبان پر کامل عبور رکھتا ہے، لیکن اس کی شاعری میں بلند نصب العین اور اعلیٰ اہل موجود نہیں ہیں۔ نہ صرف وہ بڑے اور صاحب اقتدار لوگوں اور ہستیوں کی خوشامدیں حد سے زیادہ گزر گیا ہے بلکہ ضرورت اور رفع مطلب کیلئے وہ نہایت قابل اعراض ہجو

اور رکیک الفاظ کے استعمال سے بھی نہیں چوکتا، چنانچہ اپنے متعدد قصائد میں اس نے حاجی مرزا علی، وزیر اعظم ایران کی صفات جلیلہ کا اظہار بڑی ہی شہدہ سے کیا ہے۔ لیکن ایک قصیدہ میں جو اس کے جانشین کی شان میں لکھا گیا ہے وہ لکھتا ہے۔

بجائے ظالم شقی نشستہ عادل تقی  
کہ مومنان شقی کنند افتخار ہا  
” جو گوئی کی مثال ذیل کے اشعار میں عمدہ نظر آتی ہے۔

خداں خنداں دود و پیش من تہ دوست دو لب بر لبم کہ بوسہ زن  
الحق بشرم آدم بدیں لب مسکن بوسہ زدن بر لبم چو لالہ حمر  
گفتش بے ترک ترک این سخاں کجا بس کن ازین غمزہ و عشوہ وایما  
یہ ممکن ہے کہ اس نوعیت کا تخیل قافی نے نے فرانسیسی شاعری سے استعارہ کیا ہو۔

عہد قاجاریہ کے پیشاں شعرا کی طرح قافی بھی قصیدہ گوئی کا حاکم تھا لیکن اس نے سسطا اور ترکیب بندی میں بھی کمال فن کا اظہار کیا ہے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ محروں کے استعمال میں قافی ایک موجد کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل محرقا قافی سے پہلے غالباً ایک دو مقدمین کے سوا کسی نے استعمال نہیں کی۔

مار کے راست رند و مرزہ گو شوخ و دلبر او خوب خوشتریں  
مرزا تقی خاں اور ام الملک ملکہ کی شان میں قافی کے بعض قصائد عجمی فارسی زبان اور ادبیات سے خارج دیکھے جاسکتے، قافی کی یہ خصوصیت بھی قابل اظہار ہے کہ وہ پیشرو شعرا کی طرح تخیل کی گہرائیوں میں الجھکر امام کی حد تک کسی نہیں پہنچتا، وہ اس کو مزج دیتا ہے کہ اپنی تعلیمات کا متبع، مانوس رسوم اور عام شاہدات کو نبائے۔ نوروز فارسی شعرا کے لئے اظہار قابلیت میں سب سے بڑا موضوع رہا ہے۔ قافی جب نوروز کا نقشہ کسی قصیدہ کی تشبیہ میں کھینچتا ہے تو اس کی تشبیہات ہمیشہ عام زندگی اور رسوم سے ماخوذ ہوتی ہیں مثلاً عید شد ساقی بیاد گردش آدر جام را پشت پازن در چرخ و گردش ایام سین باغربس بود بے ترک مارا روز عید گو باشد نہفت سین ندان داکشمار ایران میں یہ پرانا رواج ہے کہ نوروز کے دن سات ایسی چیزیں جمع

کوکے بطور تحفہ دی جاتی ہیں جو حوت سے شروع ہوں اور غمونا میں یہ سات چیزیں ہوتی ہیں۔ ۱۔ سنبل ۲۔ سیب ۳۔ سوسن ۴۔ سیم ۵۔ سرکہ ۶۔ سیر ۷۔ سپند، نہفت سین کا حوالہ انھیں مندرجہ چیزوں سے مراد ہے۔

۱۔ حضرت علی موسی الرضا علیہ السلام  
قافی کی مضمون۔ فرقہ شیعہ کے آٹھویں امام تھے۔ ان کا

مزار شہد میں ہے۔ اور ہر سال ہندوستان، افغانستان اور ایران کے ہزاروں زائرین وہاں جاتے ہیں، جس کے بعد انھیں شہدائی کا لقب مل جاتا ہے۔ اور یہ لقب شیعوں میں ایک خصوصی امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ حاجی اسد اللہ خاں  
یہ ایک ترکمان سردار تھا اور قبیلہ قاجار سے تعلق رکھتا تھا۔ ناصر الدین شاہ کے عہد حکومت میں اس کو کافی رخصت حاصل تھا۔

۳۔ فتح علی شاہ قاجار  
فتح علی شاہ قاجار تخت ایران پر ۱۷۹۷ء میں آغا محمد خاں کے بعد سرکارا حکومت ہوا اس کو ادبیات سے کافی ذوق تھا۔ خود بھی شعر کہتا تھا اور اچھا کہہ لیتا تھا۔ شہزادہ بایک صحبت سے بہت محفوظ ہوتا تھا۔ اور ہر نوع ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس بادشاہ نے تخت ایران پر تقریباً چالیس سال حکومت کی اور ۱۸۳۳ء میں انتقال کیا۔ یہ اسی بادشاہ کا عہد حکومت تھا جس میں سر جان مالک اپنی عظیم الشان سفارت لیکر ستائیس عیسویں حسب الحکم لارڈ ولزلی ایران پہنچا تھا۔

۴۔ عباس مرزا  
یہ فتح علی شاہ قاجار کا لڑکا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۳ء میں باپ کے ایک سال پہلے چل بسا۔ فتح علی شاہ کے ولیعهد کی حیثیت سے اس کو آذربائیجان کی حکومت سپرد کی گئی تھی۔ روس و ایران اور ایران و ترکی کی سرحد پر بھی حفاظت کیلئے اسی شہزادہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں زار کی دست درازوں سے ایران کو محفوظ رکھ سکا۔ لیکن ایران میں اس کی موت ایک عظیم قومی صدمہ کے مترادف سمجھی گئی تھی۔

۵۔ حسن علی مرزا  
یہ بھی فتح علی شاہ کا بیٹا تھا، جس کو شیراز کی گورنری دی گئی تھی۔

#### ۱۶۔ ناصر الدین شاہ

ناصر الدین شاہ، فتح علی شاہ کا سب سے بڑا پوتا اور محمد خاں فتح علی شاہ کے بڑے بیٹے کا لڑکا تھا۔ ناصر الدین شاہ تخت ایران پر ۱۸۴۸ء میں اپنے باپ کی وفات پر بیٹھا، اس وقت اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی، جب یہ ولیعہد تھا، تو حسب دستور آذربائیجان کا گورنر تھا۔ اپنے طویل عہد حکومت میں اس نے دوبارہ روس کا سفر کیا اور خزانہ ایران پر اتنا بار پڑا کہ ملک بالکل مفلس ہو گیا۔ یہ ایک مطلق العنان اور مغربی معاشرت کا دلدادہ اور عیش و عشرت کا بندہ، بادشاہ تھا۔ خصوصاً فرہنگی ادبیات اور فنون اس کی نظر میں بے انتہا مقبول تھے۔ اور اسی کے عہد حکومت میں سیکڑوں کتابیں فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں، وہ ایک عمدہ شاعر بھی تھا اور بادشاہت فرماتے اس کا مشغلہ مشعر و شراب اور عورت کے سوا کچھ نہ تھا۔ بابی تحریک ایران کے اندر اسی کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔ چھوٹے کی بددق سے اس پر ایک مرتبہ فائر بھی ہوا، اور یہی چیز بابیوں پر مظالم اور تشدد کے آغاز کا باعث ہوئی جس سے تحریک بابیان ہو گئی اور تقویت ملی گئی، یہاں تک کہ ناصر الدین شاہ عبد العزیز کے مزار کی زیارت سے واپس ہوتے ہوئے ایک ایرانی بابی کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ قاتل نے بھی ماسی بادشاہ کے عہد حکومت میں فحاشی پائی،

#### ۱۷۔ مرزا اتقی خاں

امیر نظام مرزا اتقی خاں ناصر الدین شاہ کی تخت نشینی کے کچھ دن بعد ہی وزیر مقرر ہوا۔ امیر نظام کی پیدائش ایک معمولی گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ ایک بادبچی تھا جو تھوڑے دن کے بعد قائم مقام محمد شاہ کے وزیر اول کا خانگی منتظم مقرر ہو گیا۔ اس کا لڑکا اتقی خاں سپہ سالار ایران کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد خسر درنا کا اپنی بن کر خود سپہ سالار کے لباس میں سینٹ پیٹریک (لینن گراڈ) زار کے دربار میں پہنچا۔ وہاں خدمت خاطر خواہ انجام دینے کے صلے میں اس کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ آذربائیجان میں وہ فوجی وزیر مقرر کر دیا گیا۔

مرزا اتقی کا سب سے بلند اور آخری عہدہ ولیعہد سلطنت کا وزیر اعظم مقرر ہونا تھا، اس نے اپنے معاصرین کے زعم کے حد سے بچنے کیلئے صمد اعظم کے خطاب کو نوجو آذربائیجان کی حکومت کا سب سے بڑا خطاب، قبول کرنے سے انکار کر دیا اور امیر ناظم کا لقب اختیار کیا۔ اپنے بلند اخلاق اور روشن ضمیری کی بدولت، ایران میں اس امیر کو ایک لازوال شہرت اور ہر مغربی محل پر

اس نے نظم حکومت کی اکثر خرابیاں اپنی فطری صلاحیت اور لیاقت سے دور کیں۔ صوبہ داروں اور دیگر ملازمتوں کی فروخت کا طریقہ بالکل مسدود کر دیا اس طرح پنشن کی بڑی بڑی رقوم جو نااہل اشخاص کو دی جاتی تھیں ایک نکتہ موقوف کر دیں، فوج کی تنکیفات اور افسروں کی چھوڑ دیتوں کا جیسا سبب اس بد برتنے کیلئے وہ عہد قاجار کا سب سے بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا رہا۔ ان تمام اصلاحات اور تبدیلیوں کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ملک کے وزیر نظم حکومت میں نااہل افراد کا ایک بڑا گروہ اس کا جانی دشمن ہو گیا۔ انہیں میں ام المملک ملکایران بھی تھی۔ جس کا اخلاقی اثر ملک پر اب تک کافی موجود تھا۔ ناصر الدین شاہ پہلے تو اس کا کافی معتقد اور مددگار رہا، یہاں تک کہ اپنی بہن سے اس کا عقد کر دیا لیکن ۱۸۵۸ء میں اس کے مرتبہ و عزت کو زوال آ گیا۔ اس کو مقید کر لیا گیا اور دوسرے ہی سال قتل کر دیا گیا۔

#### ۱۸۔ منوچر خاں محمد الدولہ

یہ شاہ محمد شاہ قاجار کا بڑا چھٹا پوتا اور بایر خاں تھا۔ جس کے عہد حکومت میں اسے شیرازی صوبہ داری پر مامور کیا گیا تھا۔ شہزادہ فریدون مرزا کی سازش سے اس کا شاہ عروج بھی زوال پذیر ہو گیا۔ اور فریدون مرزا اس کی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

#### ۱۹۔ حاجی مرزا عکسی

حاجی مرزا عکسی بھی محمد شاہ کا وزیر اعظم تھا۔ قائم مقام کے بعد اسے یہ درجہ حاصل ہوا تھا جسے بادشاہ نے اپنے مہاجرین میں پھانسی دلو کر ختم کرا دیا تھا۔ وہ جرجان کا باشندہ تھا۔ اپنے حجاز کے سفروں میں اس درجہ استعداد و ہوشیاری تھی، کہ تبریز و اہلی پر اسے عباس مرزا کے لڑکوں کی معلی کیلئے منتخب کر لیا گیا۔ مرزا عکسی کو بخوم، رمل اور علم ہندسہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ فتح علی شاہ، قاجار کے عہد حکومت ہی میں اس نے پیشین گوئی کی تھی، کہ محمد شاہ ایک دن سلطنت ایران کا صدر ہوگا۔ لیکن اپنے اس تجربے کیلئے اس نے باوجود وہ ایک لائق مدبر اور ذلیل سلطنت بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ وہ ہمیشہ ہمایہ حکومت کے مقاصد اور تحریکات کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا اور کبھی کسی صلح نامے اور معاہدے کی تکلیف پر آمادہ نہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علم سیاست اور پولیٹیکس کا کوئی سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ چنانچہ اکثر ایسے معاہدے جو خود دولت ایران کے حق میں بد درجہ غایت مفید ثابت ہوتے۔ اس کو تہ اندیش اور تنگ نظر بد برکی

کی وجہ سے معزز وجود میں نہ آ سکے۔

مرزا عکسی کا ایک ناعاقبت اندیشانہ قدم یہ تھا کہ افغانستان کو فتح کرنے کیلئے ایک فوج اس کے حکم سے روانہ کی گئی اور پوری فوج کو صرف ایک سرحدی قلعہ کا محاصرہ کرنے کے بعد واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد حکومت میں کچھ توجہ ریشم کے کیڑوں اور شہتوت کی پیداوار کے لئے کی گئی، اور یقیناً ریشم کی صنعت کا ایران میں اس کے زمانہ سے ہی ایک قومی صنعت کی شکل میں آغاز ہوا۔ اس نے دریائے گنج کا راستہ بھی موڑ کر طران سے گزرا تاکہ

شہر میں آب رسانی کی آسانی ہو سکے۔

ناصرالدین شاہ کے تخت نشین ہونے پر مرزا عکسی کے دشمنوں کو موقع ملا اور دیہاتیوں کے ایک بڑے اور با اثر گروپ نے حکم کھلا اس کی برخواسی کا مطالبہ کیا۔ ۱۲۹۹ھ میں بالآخر بادشاہ نے مرزا عکسی سے فطردان و درارتہ لیکر مرزا قاسم خان کے لئے اور مرزا عکسی کو قید کرنا چاہا، لیکن مرزا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، بقیہ عمر مرزا عبدالعزیز پر پناہ گزین رہا۔ اور اسی جگہ اس نے وفات پائی۔

## موت اور انسان

رابرٹ براؤننگ کی مشہور آفاق نظم پر اسپس کا ترجمہ

از صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی،

آہ! ..... کیا میں موت سے ڈروں؟ کیا میں ایک بہادر انسان کی طرح اس کا مقابلہ نہ کروں؟ جبکہ موت ..... اپنی بھینٹک صورت ..... دکھلا کر مجھے ڈرا رہی ہے؟ آہ! ..... اب میری بوج آخری پگھل کے لئے بچھن ہے ..... میری پیشانی پر پے درپے موت کا پسینہ آ رہا ہے ..... میرا بدن برف کی مانند ٹھنڈا ہو رہا ہے، موت ..... آہ ظالم موت ..... میرے سر پر نڈلا رہی ہے، کیا اس وقت میں ایک بہادر انسان ہوتے ہوئے اپنی زندگی اور کم ہمتی کا ثبوت دوں ..... نہیں نہیں ہرگز نہیں اب میں اپنی زندگی کی مسافت طے کر چکا ہوں، اور اپنی زندگی کے مقاصد کو حاصل کر چکا ہوں تاہم مجھ کو آخری دم تک بہادری سے لڑنا چاہئے تاکہ میں اس بڑے انجام کو بھی حاصل کروں، جو خداوند عالم اس دنیا کے بعد ہر بہادر کو عطا کرے گا۔

او خدا! ..... او خدا! ..... میری تمام زندگی ایک نامور اور بہادر سپاہی کی طرح گزری ہے میں جانتا ہوں کہ میں اس آخری اور سب سے زیادہ مشکل جنگ (یعنی موت) میں بھی بہادری سے فتح حاصل کروں، میں ایک بزدل، کم ہمت انسان کی جیسی موت مرنے سے نفرت کرتا ہوں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے بزرگوں کی طرح بہادری سے موت کی تمام تکالیف کو برداشت کر کے اس دنیا سے سرخرو جاؤں۔

ایک بہادر جب موت کی تمام تکالیف کا بہادری سے مقابلہ کرتا ہے تو آخر میں وہ مصائب اور تکالیف ایک خوشناباغ بن جاتی ہیں جہاں اس کو ہر طرف خوشی اپنے زریں لباس میں شعلتی نظر آتی ہے ..... میرے چاروں طرف ایک جگہ کا عالم ہے، میرے کانوں میں شیطان کی آوازیں آرہی ہیں ..... لیکن رفتہ رفتہ یہ تمام آوازیں غائب ہو کر کسی خوشناباغ چیز میں تبدیل ہو جائیں گی اور میں ایک غیر فانی چین اور آرام کی زندگی بسر کروں گا، اس وقت بہادری ..... میری پیاری ..... میرے دل کی مٹاتی ہوئی شمع میں جنت میں تجھ کو اپنے آغوش میں لوں گا۔ اے خدا! ..... اے خدا! ..... آئندہ کا تو نگہبان ہے!

# درنِ صبر

مولانا محمود اہر سلی،

دستِ فرہاد بنا تیشہ بُراں کے لئے      ہستی قیس ہوئی وقفِ بیاباں کے لئے  
 ہے دلِ بلبلِ بقیابِ قضاں سے مخصوص      لذتِ سوز ہے پروانہ رقصاں کے لئے  
 چشمہ کوہ کی ہر موج گہر بار میں ہے      اک ترنم کی صدا مرغِ خوشی اچاں کے لئے  
 منزلِ دہریں جو نقشِ قدم ملتا ہے      مشعلِ راہ ہے وہ بے ہر ساماں کے لئے  
 کوئی مشکل نہیں دنیا میں جو آسان ہو      عزمِ باہجزم مگر شرط ہے انساں کے لئے  
 جذبہ شوقِ شہادت میں کبھی آہ تو کھینچ      کامِ شمشیر کا دیگی یہ رگِ جاں کے لئے  
 خستہ حالی پہ کبھی اپنی تو آنسو تو ہبسا      کنہیں تارِ رُفو چاکِ گریباں کے لئے  
 تیرے میدانِ شجاعت میں قدم کانپتے ہیں      ننگ ہے ننگ یہ خود دارِ مسلمان کے لئے  
 مکتبِ عشق میں جادوسِ بڑا ہی لے      اک نیا کعبہ بنا قوتِ ایماں کے لئے  
 زنجِ گلزار بنا اس دلِ صد چاک کو تو      کہ یہ درکار ہے گلستاںِ عرفاں کے لئے  
 منتِ ہر درخشاں ہے اسے موجبِ ننگ      اک شرر کافی ہو جس سوختہ ساماں کے لئے

آتشِ شوق سے کر بزمِ چراغاں غافل  
 دہر پھرتا ہے کیوں شمعِ فروزاں کیلئے



# آپ بیتی!

جناب شرمصاحب صدیقی، اردو لوی،

”آپ بیتی“ داستان حیات کا دہسرا رخ ہے۔ اُن خطوط میں عورت کی فطرت پر ایک مرکب نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی تھی اور زیر نظر خطوط میں ایک گرفتار محبت — شادی شدہ عورت کے خیالات قلب بند کئے گئے ہیں جو مرد کی جانب سے صفت نازک کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی دفع محبت کی، کاوشوں میں بڑی طرح ایسے ہے۔ وہ ایک خود دار مرد کی محبت حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری کائنات لٹانے کو ہر وقت آمادہ و مستعد نظر آتی ہے۔ اُس کا مرکز نظر کسی دوسری عورت کی کافراؤں میں سمو ہے جس کا جذبہ بھی اس کو ظلم و محاسن ہے لیکن وہ جذبہ رقابت سے مجبور ہو کر بھی اباحت و امانہ کے لئے تیار نہیں ہوتی، کبھی باؤس ہو کر سر اٹھانے کی کاٹھار کرتی ہے، کبھی لطیف ترین تیغ رو بہ اختیار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے، اس کا مرکز محبت ”غم روزگار“ کی زنجیروں میں گرفتار ہے، وہ محبت و استقلال کی تلقین کرتی ہے، تسکین دیتی ہے۔ محبوب کی گفتگوں پر غصے کے آنسو بہاتی ہے، پرفریب زمانہ کا روزگار دیتی ہے مگر ایک انوکھی شان کے ساتھ محبت میں اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے، غرضیکہ ”آپ بیتی“ پڑھنے کی حد تک ایک ایسی فضا میں ہمارا شریع کر دینگے جہاں کی ہر چیز آپ کو ”آپ بیتی“ نظر آسکے گی!

شرمصدیقی،

(۱)

نظر فرمایا کرتی ہے، نگاہیں تھر تھراتی ہیں  
محبت ہے وہ افسانہ جسے آنکھیں سناتی ہیں

روح نواز اختر! — نامہ جانفرا کی دلکشی نے مسو کر لیا۔ اُن یہ سحر آفرینی تھیں کس نے سکھائی؟ — جذبات کو دلفریب الفاظ کا جامہ بچا کر — قوت گوئیائی، مٹا کر نابس بھارا کام ہے، کاش یہ تحریر تمہارے دل کا پرتو ثابت ہوتی، سکون کی باخفت منزل کا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو کج کیوں دنیا میرے لئے غارِ آزار بن جاتی۔ اتنا معلوم ہے کہ دولت و ثروت، حکومت و سلطنت اقتدار و شوکت، تفکرات کے ”فولادی قلعے“ سے نجات نہیں دلا سکتے! لیکن یہ کہ دنیا میری بھیال نہ ہو، لیکن مجھے تو جو راحت فاقہ میں ملی بخوان نعمت میں وہ لذت نہ حاصل ہوئی، بس ایک ذی فہم اور محاسنِ دل کے واسطے ہی کافی ہے — کہ وہ دنیا کو بیچ و مصیبت کی سٹفل جگہ سمجھ لے! —

سلہ زیادہ تر خطوط اور جمل ہیں سلہ عاسگیر ماہ اگست ۱۹۳۶ء

اوت میں ان انگاروں کو جس پر بدنامی لکھی تھی چڑھادی گئی ہے، خوب عاتقی پلا — پھاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتے ہیں، دریا اور سمندر خشک ہو سکتے ہیں، آفتاب و ماہتاب ٹوٹ کر زمین پر گر سکتے ہیں، لیکن — نا آشتی، مسرت، غم و غشی تو درکنار سکون کی سرحد سے بھی واقف نہیں ہو سکتے، سفینہ حیات ہے، اور اضطراب کی ذخائر میں، امن کی لذتیں زندگی میں تو فنا سے ہم آغوش نہیں ہو سکتیں، میری جان! تم جیسے باہوش انسان کے لئے یہ خیال کتنا گندہ، اور زہر ملا ہے، موت کا آتشیں جام خود پی لینا، بزدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرو، صبر کی تندہ ہو ایسے کبھی تو غم کے بادلوں کو منتشر کر دینگے، خوب جانتی ہوں — تفکرات کی فراوانی جیسی روح فرسا ہوتی ہے لیکن مردانہ استقلال اس پھاڑ کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے، تم اپنے کو گھلانے ڈالتے ہو، یہ قدرت کا ستم نہیں تو پھر کیسا ہے؟ کہ تمہاری شوخ طبیعت پر خشک مزاجی فتح یاب ہو جائے! — یہ میری بد نصیبی کے کرشمے ہیں، جو میری — قندیل مسرت بھی جھلکانے لگی، اور نہ جب قوت بصارت سلب ہو جاتی ہے

تو چاند کی نور پاشی بھی بے حقیقت ہو جاتی ہے، یاس کے موسم جھونکے  
آرزوں کے لہلہاتے بلغ کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ اس وقت برسات  
پھولوں کا مینہ برسا رہی ہے، فضا سرتوں سے لبریز ہے، پہانکے سینہ  
سے شکوہ دگل پھوٹ نکلتے ہیں! یہی موسم جو کبھی سرخوشی و نشاط کے جام پلاتا  
تھا۔ آج کس قدر چھیکا اور بے کیف ہے۔ اٹ شالار کے غلی فرش  
پر ملاقاتیں یاد ہیں، زمانہ کس قدر جلد رنگ ہر لہجہ۔ گودوں میں محبت  
کے چشمے موجود ہیں لیکن تنہاؤں میں سیلاب نہیں آتا، فراق کی بھیانک صورت  
سامنے کھڑی ہے اور موسم کی خوشگوار یادیں نہ ہر سیرایت کو ہی ہے۔  
خدا کی قسم ہر رات خواہ کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو، میرے لئے ہاڈ بیت کا پاش  
نہیں ہوتی۔ ہاں! تنہائی کے غار بڑی طرح دل میں کھٹکتے ہیں، کون کبھی شب  
بھر سوتا ہے۔ تخیلات کی دادیوں میں بھٹکتی پھرتی ہوں، لیکن تمہارے تبسم  
کی گلیچینی نصیب نہیں ہوتی، تمہارا ماحول تو اس قابل نہ تھا کہ آلام کی بارش  
بار بار جانی کو تباہ کرے، لیکن ۶

تقدیر جو دکھائے سونا چاند دیکھتا ہے؟

تم نے سادوں کی کیف ہادیوں کا ذکر کر کے مجھے وہ زمانہ یاد دلایا جب ہم  
لوگ مرزا پور کے فردوسی گاؤں چندن پور میں مقیم تھے، بنگلہ کے اندر سرسبز وادی  
کے آغوش میں ایک خوبصورت چھوٹا سا تالاب تھا جس کے کنارے جاس کے  
درخت میں جھولا پڑتا اور یہی چیز ہے

بلا تلتے ڈولہ رکھ دے مسافر آئی سادوں کی بہار،

میں اپنے عمل میں جھولا جھلتی تھی سیاں نے بھیجے کہار

چھوٹے داروغہ کا لڑکا اقبال پور سے تان اور سرکے ساتھ گاتا۔ اسے قدرت نے  
دلکش آواز دے رکھی تھی، گیارہ بارہ سال کی عمر! معصوم صورت سے نورانی جلو  
پھوٹ نکلتے۔ بھولی بھالی صورت! نفوں کا دیوتا معلوم ہوتا، میں پھروں،  
اس کے نفوں کی دلکشی میں کھوئی رہتی۔ اب یاد ماضی ایک فسانہ ہے جس کے بیان  
کرنے میں بھی سرور نہیں محال ہوتا ۷

زمین دل کو غم نہیں ڈالا آسمان ہو کر

آج کل دل غم کے حصار میں تڑپ رہا ہے۔ شب کی تاریکیوں میں  
مینڈک اور جمینگروں کی لے کے ساتھ موت کی لوری سسکتی دیتی ہے، تو  
داستغفار کی صدائیں کانوں میں آتی ہیں، لیکن میں تو ابھی مرنا نہیں چاہتی

میری آخری آرزو ہے کہ ایک بار اپنی زندگی میں تمہارے باوقی لبوں سے سرت  
کے پھول جھڑتے دیکھ لوں! پھر اپنی نیند کی آغوش بسالوں تاکہ میری  
روح تمہاری سرت کا احساس کوکے سکون حاصل کر سکے۔

دل گرفتہ۔ تمہاری نرگس

(۲)

پھر بارگاہ عشق میں پہنچا ہوں سرکھٹ  
زخموں سے پاش پاش کلیجہ لئے ہوئے

مجھ سے کبیدہ خاطر اختر! ہمیشہ خوش رہو۔ خط ملا، یہ افسردگی اور غمی  
کیسی، تمہاری تحریر سے بھلائی بے باکی کا احساس ہوا، اور میں نے سخت ندامت  
کے ساتھ اس کا اعتراف کیا۔ خدا کے لئے تباؤ، میرے کس جلد سے تھیں غلطی  
شکوک کا خیال پیدا ہوا، تم خود ذرا ٹھنڈے دل سے اپنی تحریر پر نظر ڈالو، دیکھو  
واغمانہ ہوتی ہے یا نہیں؟ پھر اگر اس کا دل پر اثر ہوا تو کیا سچا ہے۔ تم کیا جاؤ کہ  
تمہاری تحریر کے چند جھولنے مجھے کتنا شرمندہ کیا۔ اور مجھے خود اپنی ہستی کی قدر  
ذلیل نظر آئی، اٹ دہی ہتی جواہر شوہر کی التجاؤں کا جواب ہلکے تبسم سے بھی  
نہ دے سکے۔ تمہارے سامنے نوائی حیا کو چاک کر کے پیکر التجا بن جئے! استم ہے  
یا نہیں! اٹ! میری تحریر سے جو معنی تم چاہو اخذ کرو، وائد میں  
نے ندامت کی گہرائیوں میں غرق ہو کر وہ خط تم کو لکھا تھا۔ تھیں قسم ہے محبت  
رفتہ کی میری اس فروگزاشت کو معاف کر دو، میں اور وہ قاداری کا ثبوت  
دینے کی سعی مجھ میں اتنی قدرت نہیں، خطوط واپس کرنے کی فمائش نہیں ہے  
بلکہ انھیں خاکستر کرنے کی تاکید، وہ بھی مصلحتاً، تم مجھے قابل جواب سمجھو یا  
نہیں، لیکن ان انگلیوں میں جب تک دم ہے اور تم تک پہنچنے کا ذریعہ  
ہاتھ آتا ہے، قلم منہ قرطاس پر دل کا نقشہ اتارتا رہے گا۔ اب تم اسے دیکھو  
یاد دیکھنے سے قبل چاک کر ڈالو، تم بہت جلد کتاب محبت پر فرنگ لگاتے ہو ذرا  
دیکھو تو ابھی کھٹکتے ورق آرزوئے نقش پر خوں بار ہیں، آج کل۔ تا محبت  
کے قریب محراب کا وجود مجھے ڈرائے دیتا ہے۔

تمہاری طالب عفو، نرگس

(۳)

اسی جگہ ہوئی منزل جہان ٹوٹی آس  
تھکائے ڈالتی ہیں گرد و شیں زمانے کی،

کی غایوں کو نہ اچھا لو۔ موضوع سخن بدل دو، تمہارا قلم ہر مرکز پر چول برسکتا ہے۔ — دو پدی جیسا شاہکار افسانہ بھی تو تمہارے ہی نگارش طبع کا، لاثانی فسانہ ہے، — انیس نہانی، — بھی کس قدر دلچسپ رومان ہے کہ بڑھنے سے روح غیر فانی سترت محسوس کرتی ہے، تمہیں قسم ہے کہ ہرگز ہرگز فانی نگاری نہ چھوڑو۔ ہاں کسی کی دل آزادی کا باعث بھی نہ بنو ایسے افسانے لکھو جو ملک و قوم کو نفع بخش سکیں، اب کیا لکھوں، زندہ ہوں مگر قسمت کی تانگیوں میں دست اہل بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔  
آمت آکر دنیا بھی آتا نہیں مجھے گھبرا گئے ہیں اہل جاں کی منسی دیم  
برباد محبت نرگس،

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا  
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

جان آرزو! — کشتہ غم کا سلام لو! خط پڑھا، تمہاری افسردگی کے احساس نے دل میں غم آگیاں راتوں رات پیدا کر دیا۔ اب مجھ بے نصیب کے باعث تمہیں نفذات سے دوچار ہونا پڑا۔ کاش میں نے اپنے قلب کو ان نفذات کی نذر کر دیا ہوتا اور تم تک آج نہ پہنچائی ہوتی، میری دماغی کمزوریاں اکثر خود میری اذیت کا باعث ہوتی ہیں، میرے اخترا میں اور تم سے ناراضی؟ محبت کے لطیف جذبہ کے علاوہ تمہاری قدر و قیمت کوئی میرے شکستہ دل سے پوچھے۔ یہ ادربات ہے کہ سوانی دل میں یہ آرزو چٹکیاں لے لے کر میرے اور صرف میرے "مرکز فطر" بنے رہو؟ درنہ محبت تو تمہاری مسرت کی خواہشمند ہے۔ واقعات، خواہشات کے باند نہیں ہوتے، مجھ جیسی گرفتار علانی ہستی کیلئے ہی کافی تھا کہ عہد گذشتہ کی تصویر کیلئے سے گھٹے بیٹھے ہوں بلکہ خیال آخرت میں ہر درد سے واقف ہو چکی ہوں، پرسوں محبت کی آگ میں جلتی رہی، لیکن تم کو فراموش نہ کر سکی، تمہارا خیال ہمیشہ رفیق حیات بن رہا، واقعات نے مجھادیا تھا کہ تم میرے کبھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ پوش کب آیا جب میرے پاؤں میں..... فرائض کی زنجیریں پڑ چکی تھیں محبت کی ناکامی پر اکثر جی چاہا کہ شمع حیات گل کر دوں، مگر تمہارے..... خیال کی خوشبو میرے لئے بقائے حیات کا باعث ٹھہری۔ میں نے خوش رہنے کی کوشش کی، لیکن کبھی مسرت کی شعاعیں پاؤں دل تک نہ پہنچ سکیں

نرگس! از آخرت خوش رہو خط ملا، میں تم سے نہ کبھی پرست ہوئی اور نہ ہوں، جو کچھ بھی لکھا صرف اس اظہار کے لئے کہ میں تمہاری دلبستگی سے واقف نہیں رہا، ورنہ یہ تو خود مجھے مسموم ہے کہ — میری تحریر بھل، لغو اور مضحکہ خیز ہوتی ہے، — ہاں میری روش تمہارے لئے باعث اذیت کیوں ہوتی جبکہ تمہیں میری قلبی کلیفوں کا خیال و احساس تک نہیں؟ خیر نہ اب میں کبھی اپنے — قلبی کوئت — کا مظاہرہ تم پر نہ کر دوں گی۔ میں اپنے سارے الفاظ تم سے واپس مانگتی ہوں۔ مجھے خود افسوس ہے کہ میں صفائی کا ثبوت تمہیں نہ دے سکی، لیکن یہ محسن کشی ہوتی اگر میں تم سے کہتی، میری رسائی تو حشر تک تمہارے آستانہ تک نہ ہوتی اور میں نہ جانے کب تک غلط فہمی کے عین سمندر میں غوطہ کھایا کرتی۔ تجربے گو رگ رگ میں زہر سراپت کر دیا — آرزو کا ظلم تو زور دیا — تمناؤں کی کشتی دریا برد کر دی — مگر اچھا کیا! نا فہم دل کا غور تو ٹوٹا؟ — ہاں اب اس موضوع کو نہ اب ہی کرنا بہتر ہے۔ میری ناکامیوں کا رد و نامہ تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگا، تم کیا جانو شکست دل کی صدا کیسی ہوتی ہے؟ اب اتنی قوت کہاں کہ اپنے فلسفہ شاد کامی کی تشریح کر سوں — پھر اب تم مجھ ہی کر کیا کر دو گے؟ تمہاری حالی دماغی اور بلند نفسی کا سکھ ایسا نہیں جو دلوں پر نہ بیٹھے۔ تم روشن ضمیر ہو مگر خود پرست نہیں، اسی لئے تمہیں اپنے معاف کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ واللہ یہ میرا حق ظن نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ محبت تو قیر کا جذبہ پیدا نہیں کرتی۔ یہ ذاتی جوہر ہیں جنہیں دشمن بھی ماننے پر مجبور ہوتے ہیں — خدا کی قسم، یہ مبالغہ ہے نہ خوشامد، احساس گناہ بھی روشن ضمیری کی دلیل ہے۔ میں تمہیں فخری سمجھتی ہوں، نہ دروغ گو۔ کیوں اپنے قلم کو بیکار ایسے لفظوں سے گندہ کرتے ہو احتیاط پسند ضرور ہو۔ اپنے راز کی کلیوں کو چٹکنے نہیں دیتے، یہی عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ تم نے اپنی عزت کے موتی سیر دان میں بھر دیئے ہیں — کند فریب سے نکال کر مجھے صرف حیات نو نہیں بخشی بلکہ اپنے اخلاق کی بلندیوں سے آگاہ کر دیا۔ میرے جسم کا وہ ذرہ ممنونیت کے بدلے سے دبا ہوا ہے۔ تمہارے یہ الفاظ اب زور سے لکھنے کے قابل ہیں کہ خواہشات کو زندگی میں مردہ کر دینا آسان کام نہیں؟ —  
تم نے افسانہ نگاری کیوں چھوڑ دی۔ بنجہ میں کبھی اس سے خوش نہیں ہو سکتی کہ تم دینے ادب سے مرنے موز لو۔ میرا تو صرف یہ مقصد تھا کہ ایک کمزور ہستی کی

محبت کی مجبوریاں کوئی ناکشہ نہ در کیا جانے۔ یہ دل صدق کے ساتھ تھا  
پر مشعل کرتا ہے۔ آہ! سب کچھ یاد ہے، وہ سرد آفریں لکھے اب رہبریت  
بن گئے ہیں۔ ایام رفتہ کی خوش عودائیاں مجھ سے پوچھو کتنی لذت آفریں تھیں  
نے چمکا کر مجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں اس قابل نہیں۔ کہ تم مجھے نظر افسانہ  
نہ دیکھو، وہ طاقت آمیز زمانہ گزر گیا۔ اب اتنا ہوش ہے کہ اپنی غایوں کو ضمیر  
کے آئینہ میں دیکھ سکوں، پھر بھی نہ جانے کیوں یہ تمنا غش آفریں میں کردار میں  
سنگی ہے کہ تمہاری نظر توجہ کی آرزو مند ہوں، گو اس معراج پر نہیں پہنچ  
سکتی، لیکن میری سرتوں کا راز تمہاری سحر کن آنکھوں میں مضمر ہے۔ بہت ممکن  
ہے کہ دوسری ہستی بھی تمہاری بجا رہن ہو۔ لیکن۔۔۔ انتر! اتنا کچھ لو، بدل  
تم پر ہر شے والا جذبہ رکھتا ہے۔ آہ تم میری محبت کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے  
کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں، میں اور تم سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو جاؤں  
مکن نہیں۔ فنا کا جام پی کر بھی میری روح شاید تم پر قربان ہونے کو عالم  
بالہ آئے۔ ہاں میں قسم ازل سے مقابلہ نہیں کر سکتی مجھے محبت کا چراغ  
دیکر فراق کے تاریک غار میں جلیں دیا گیا ہے، جہاں میں ٹھوکریں کھا رہی ہو  
اور یاد سوم کے جھونکے۔۔۔ شمع محبت بجھانے پر تپتے ہوئے ہیں، یہ ماتی ہوں کہ  
تم مجھ سے نہیں ملے، تو سنگت، جھکے ہوئے پھول، تمہارے شام جان کو سطر کرنے  
کو موجود ہیں تو ایک۔۔۔ تم جہاں ہوئی کلی کی تھیں کیا پردا ہو سکتی ہے؟ تم  
نے میری محبت کا اعتراف کیا، اگرچہ پوچھو تو یہی سرت میرے لئے کافی ہے،  
ورنہ۔۔۔ ذرا سی سچی پر۔۔۔ وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری امیدوں کو سبوتر  
بنا سکتی ہے؟ میرا کون راز دار ہے، میں نہیں بنا سکتی۔ مجھے تمہاری محبت کی  
زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اس مذموم اور اخلاق  
سوز فوہ سے تمہیں تکلیف ہوگی لیکن۔۔۔ میں مجبور ہوں۔ میں نے جو سنا تھا  
تمہیں لکھ دیا۔ کیا تم۔۔۔ اُن کے گلہ دان کے لئے شاداب پھولوں کے گلہ رستے  
نہیں فراہم کرتے؟ کیا وہ دن رات کا بیشتر حصہ تمہارے قریب نہیں گزارتی  
اکثر میں نہ سوچا کہ تمہیں۔۔۔ سرخ گلاب کے گلہ رستے بنا کر مجھوں لیکن محبت  
۔۔۔ رنگ نے اہازت نہ دی۔ میں اتنی بلند حوصلہ اور عالی ظرف کہاں  
کہ اپنے عزیز ترین محبوب کو کسی دوسرے کے فانوس دل میں جلوہ گرد کھیل  
اور خاموش رہوں، اُن رقابت کی آگ مجھے جلائے ڈالتی ہے  
خدا کی قسم اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا، آج کل جوئی کیفیت طاری ہے

رات بھر نہیں آتی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے کو کیوں کر سبھاؤں، مہمان  
میرا حقوں سے چھوٹی جاتی ہے۔ میں رنگ کے کھانسیز شعلوں کو ضبط کر کے  
میں چھپا چاہتی ہوں، گر ان پر قابو نہیں حاصل کر پاتی؟ اختیار کی منزل پر  
قدم رکھنا چاہتی ہوں لیکن دل کی قوت مجھے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش  
کرتی ہے۔ کاش میں حسن عقیدت کی راہ میں اپنی جان قربان کر سکتی، تم کیا  
جانو مجھ پر کیا گزرتی ہے؟ تم مجھ سے بظن ہوتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں خدا نہ  
کرے دروغ گو سمجھوں، تمہاری جو عزت سے دل میں ہے اُسے رنگ کے  
شعلے خاکستر نہیں کر سکتے، میں تمہاری ہوں اور تا حشر تمہاری رہوں گی، خواہ  
۔۔۔ تم کسی کے ہو جاؤ۔ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں جو شباب کے جھونکوں  
کی طرح فنا نہیں ہو سکتی، حقیقی محبت کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ جہاں لذات  
کی خواہشیں ہمیشہ روح کیلئے مارا تین ثابت ہوتی ہیں۔ اب یہ رالم کہانی  
کب تک سنو گے؟ تمہاری نازک مزاجی مجھے خاموشی کا حکم دیتی ہے۔  
رضعت! سو گوار تمنا۔ رنگس!

(۵)  
خود کشتی بھی بن نہ آئی پھر دو اپنی پاری  
ہائے یہ طغی کہاں تھی رہ رہے تاثیر میں

وسیع النظر اختر!۔۔۔ زندہ باد، تمہارا منصوبہ سے لبریز خطا  
مُنہ سے بے اختیار تمہاری حقیقت شناسی کی داد نکل گئی، مصلحتی دلوں میں  
اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ مدت کا پردہ چاک نہ ہو، مجھ میں شرافت  
کا جو ہر کہاں! فرائض کا احساس اگر مجھے ہوتا تو آج دوسروں کے لئے دبا جان  
نہ بنتی، مجھے اپنی خامکاریوں کا خود صحیح اندازہ ہے۔ میں نے ان غریب کے لئے  
آج تک کچھ نہیں کیا۔ شوہر پرستی کا جذبہ اگر میرے ضمیر میں ہوتا تو آج یہ رویا ہی  
کیوں نصیب ہوتی۔ اول تو احتمالات طبائع کے باعث کبھی نہ بنی دوسرے اب  
کیا بنے گی، مجھ میری۔ سیاہ کاریاں فضلے حیات کو ہمیشہ کے لئے تاریک  
بن چکیں، خدا کے لئے مجھے زیادہ بھر ندامت میں نہ غرق کرو مجھے اپنے لڑکپن  
جذبات کی فراوانی کا بخوبی احساس ہے۔ تم ہو کہ بار بار شانہ ملائے جا رہے  
ہو، پھر بھی میری نفسی پیوندی مجھے ہوش میں لگے نہیں دیتی۔ تمہاری بختہ رس  
نگاہ میں میری جو تصویر ہے، مجھ سے پوشیدہ نہیں۔۔۔ تمہاری۔۔۔ منہی  
منہی چٹکیوں نے دل پر خاص اثر کیا۔ میں جانتی ہوں، میری ظاہری صورت

میرے اعزہ! میرے والدین غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، والدہ لکھنؤ میں  
انہیں میری رکیک فطرت کا احساس تک نہیں ہوا، وہ ان افواہوں کو مٹا  
بعض وعداوت سمجھے بھٹے ہیں، اور اسی باعث بیچاروں نے مجھ پر کئی سختی  
نہیں کی۔ خدا کی قسم میں اس بات سے مطلقاً خوش نہیں کہ لوگ دھوکا کھا رہے  
ہیں، گوری صحت کی تارکی میں ڈوبی ہے مگر بخدا صمیر کی روشنی میں اپنی  
ساری لغزشوں کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ لذت نفس خواہ  
جس قدیمی "خیانت حیات" کے لئے ضروری ہو لیکن باعث شرف و روت ہوتی ہے  
وہ دل جو گنگنا رہے کبھی تنہائی میں بھی گنگنا رہتا ہے، مجھ کو کون نہیں  
خیالات فاسد کبھی انسان کو چین سے سونے نہیں دیتے، اگر تنگ نظری کا  
چشمہ اتار کر چھینک دیا جائے تو ہر انسان خواہ وہ کیسا ہی — رکیک فطرت  
خود غرض کیوں نہ ہو، ذلت کی گہرائیوں کو بخوبی دیکھ سکتا ہے، تمہارے تجربات  
ایک حد تک درست ہیں، تمہاری مصلحتوں کو غلط کرنے کی جرأت کوئی حقیر  
نہیں کر سکتا۔ میں نے بھی تم لوگوں کی کتاب زندگی کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ مگر  
قلم میں اتنی طاقت نہیں جو تمہاری صفت کے خلاف ذہرائیوں، صرف اس  
لئے کہ بہت سی معزز ہستیاں تمہاری صفت میں ایسی موجود ہیں جن کا اعزاز  
دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ مرد کی محبت تارکی چھاؤں ہے۔ وہ نہ کبھی با وفا  
تھا اور نہ کبھی ہے۔ ہزاروں عورتیں مرد کے ساتھ چل رہی ہیں، مگر کچھ تک کوئی مرد  
ستی ہونا تو کچھ دفا کو دفا بھی نہ کہہ سکا۔ ہمیشہ تریاچہ ترکا نہ موم خطاب عورت  
کے لئے رہا۔ تم لوگ بادشاہ ہو، ہم لوگ تمہاری رعیت، جو جو قسم نہ کر دے  
دل جلا کر اس کی پٹھوں سے کھیلنا مرد کا قدیم شیوہ ہے، اگر انصاف پسند ہو تو  
..... میں دیکھ لو تم کو بہت سی ایسی ہستیاں ملیں گی جو صفت نازک  
کو تباہ و برباد کر کے بھی نہیں بڑھاتیں، میں بچہ شرمندہ ہوں، نہ جانے  
ہمیں پاکر کہاں پہنچ جاتی ہوں کہ ساری شرم و غیرت خاک میں مل جاتی  
ہے۔ خواہ وہ تخیلی ہو یا حقیقی، اتنا بھی سوچنا کہ تمہاری نگاہیں ملامت کے  
تیرے سارے ہیں۔

میرے اعزہ! میرے والدین غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، والدہ لکھنؤ میں  
انہیں میری رکیک فطرت کا احساس تک نہیں ہوا، وہ ان افواہوں کو مٹا  
بعض وعداوت سمجھے بھٹے ہیں، اور اسی باعث بیچاروں نے مجھ پر کئی سختی  
نہیں کی۔ خدا کی قسم میں اس بات سے مطلقاً خوش نہیں کہ لوگ دھوکا کھا رہے  
ہیں، گوری صحت کی تارکی میں ڈوبی ہے مگر بخدا صمیر کی روشنی میں اپنی  
ساری لغزشوں کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ لذت نفس خواہ  
جس قدیمی "خیانت حیات" کے لئے ضروری ہو لیکن باعث شرف و روت ہوتی ہے  
وہ دل جو گنگنا رہے کبھی تنہائی میں بھی گنگنا رہتا ہے، مجھ کو کون نہیں  
خیالات فاسد کبھی انسان کو چین سے سونے نہیں دیتے، اگر تنگ نظری کا  
چشمہ اتار کر چھینک دیا جائے تو ہر انسان خواہ وہ کیسا ہی — رکیک فطرت  
خود غرض کیوں نہ ہو، ذلت کی گہرائیوں کو بخوبی دیکھ سکتا ہے، تمہارے تجربات  
ایک حد تک درست ہیں، تمہاری مصلحتوں کو غلط کرنے کی جرأت کوئی حقیر  
نہیں کر سکتا۔ میں نے بھی تم لوگوں کی کتاب زندگی کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ مگر  
قلم میں اتنی طاقت نہیں جو تمہاری صفت کے خلاف ذہرائیوں، صرف اس  
لئے کہ بہت سی معزز ہستیاں تمہاری صفت میں ایسی موجود ہیں جن کا اعزاز  
دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ مرد کی محبت تارکی چھاؤں ہے۔ وہ نہ کبھی با وفا  
تھا اور نہ کبھی ہے۔ ہزاروں عورتیں مرد کے ساتھ چل رہی ہیں، مگر کچھ تک کوئی مرد  
ستی ہونا تو کچھ دفا کو دفا بھی نہ کہہ سکا۔ ہمیشہ تریاچہ ترکا نہ موم خطاب عورت  
کے لئے رہا۔ تم لوگ بادشاہ ہو، ہم لوگ تمہاری رعیت، جو جو قسم نہ کر دے  
دل جلا کر اس کی پٹھوں سے کھیلنا مرد کا قدیم شیوہ ہے، اگر انصاف پسند ہو تو  
..... میں دیکھ لو تم کو بہت سی ایسی ہستیاں ملیں گی جو صفت نازک  
کو تباہ و برباد کر کے بھی نہیں بڑھاتیں، میں بچہ شرمندہ ہوں، نہ جانے  
ہمیں پاکر کہاں پہنچ جاتی ہوں کہ ساری شرم و غیرت خاک میں مل جاتی  
ہے۔ خواہ وہ تخیلی ہو یا حقیقی، اتنا بھی سوچنا کہ تمہاری نگاہیں ملامت کے  
تیرے سارے ہیں۔

تم جو آتے ہو سامنے! تو کوئی اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے

بخدا میں جب اپنے باطن پر نظر ڈالتی ہوں تو خود کو مجسمہ فریب نظر آتی ہوں۔ یہ  
بہت دیکھو سب کچھ جانتی ہوں، ہر بات کا علم ہے، جنت کی خوشگوار سی کا بھی  
خیال ہے اور جہنم کے شعلوں کا بھی احساس؛ مگر نہ جانے کون سی ایسی قوت سیر

(۶) —  
رکھ رکھ کے دل نے آنکھیں میں تصویر بیاہ کو  
قیدی بنا دیا نگہ انتظار کو

مگر محبت اختر! — شاد ہو، کچھ خبر ہے کہ دل پر کیا گزرتی ہے؟  
مناہ میں صاحب فرانس تھی، اللہ اتنے میدرد ہو، بھنری کی حد کردی، خواب  
میں بھی مزاج برسی کو نہ آئے، تم سے زیادہ تو تمہارا خیال — رفیق خلا،  
کیا کون کیسی ہوں، غشی کا ایک دورہ مہینوں کی قوت سلب کر لیتا ہے،  
نقاہت کی تنگ آغوش مجھے سانس بھی لینے نہیں دیتی، ابھی تک طبیعت بکال  
نہیں ہوئی ہے۔ ہاں زندہ ہوں لیکن تنفس کے خار — "چادر حیات" کو  
چھپنی کئے دیتے ہیں، ہر لمحہ صبر شکن ہے، آف، تم میری روحانی اذیتوں کو  
نہیں جان سکتے، ایک ہفتہ سے تمہاری خیریت بھی نہیں معلوم ہوئی، ہاں اتنا  
جانتی ہوں قدرت نے تمہاری دلچسپی کی دنیا سنواری ہے، خدا کرے ہمیشہ  
خوش رہو۔ پریوں حضرت رعد نے تو اس قدر برہمی سے جھڑکا تھا کہ ہمارا کل  
بھی لرز گیا ہوگا۔ میں بد اعمالی کی تاریکیوں میں بھٹک کر کئی بار کانپتی اور تمہاری

صحت و سلامتی کی دعا کرتی رہی۔ غم دوری کی دشت اثر گرفتار نہ دہن استقلال چاک کر دیا۔ تباہ ان قطرہ ہلے اٹسک کو کیونکر تھارے قدموں پر پھیروں۔؟  
بولو، فراق کے دہکتے ہوئے انگاروں پر کب تک سجدہ ریز رہوں۔ بس باب ان شعلوں کو حکم دو کہ مجھے خاکستر کر دیں۔ بیارجمت کی عیانت دل کی جانوسز لپٹیں کب تک کر سکیں گی۔ رات کی ساکت فضا میں اضطراب کی روح دوڑانے والے دلتوا زخما! اب میری روح کو آسمان کی بلندیوں میں گم کرنے کی سعی کرو، فراقی غم نے حسیات کے پھولوں کو مسل ڈالا ہے۔ دل کے گھاؤ اب اندام کے قابل نہیں رہے۔ خدا کی قسم اب دل زندگی سے بیزار ہو چکا ہے۔ ہلے تمھاری یہ خاموشی اور لب بندی جان لیوا ہے یا نہیں؟۔۔۔

فرقت نصیب، زنگس،

~~~~~(۷)~~~~~

اپنی حالت کا کچھ احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اور ویسے سبب کہ پریشان ہوں

زنگس نواز!۔۔۔ تسلیم و سبلا، مختصر نامہ ملا۔ میں اچھی ہوں کوئی بات قابل اشتباہ نہیں ہے، مطمئن رہو۔ یہ پریشانی اور اضمحلال کب تک خاموشی سلگ سلگ کر اپنی صحت کا خون کئے دیتے ہو۔ خدا کے لئے اس بیکاری کا فیصلہ کرو۔ یہ ممکن نہیں کہ انسانی کوششیں بار آور نہ ہوں، تقدیر کو عصا بنا کر تفکرات کی صحراوردی دوراندیشی نہیں کہلاتی۔ قدرت نے انسان کو ہمدردی کا مادہ عطا کیا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اگر یہ لطیف جذبہ کج نیست و نابود ہو جائے تو انسان کیا تمام موجودات عالم میں ایک ایسا اتمام واقع ہو کہ چند لمحوں میں اس کرہ ارض کا بھی تپ نہ لگے۔۔۔ پھر یہ بیجا غیریت کیسی؟ زمانہ کی تنگ نظری کا مجھے کافی احساس ہے مگر تم اپنے لبوں میں جنبش تو پیدا کرو۔ جب سوچ سوچ کر میرا جی گھبراتا ہے تو تمھارا کیا حال ہوتا ہوگا؟ یہ آٹھ پہر کی کوفت اچھی نہیں۔ سرزائوئے تفکر سے اٹھاؤ، اندر بھی کوئی چیز ہے خدا کے لئے کروٹ بدلو۔ زندگی سے عاجزی ابھی نہیں۔ چودے محض کھلانے کیلئے پیدا نہیں ہوتے۔ رب العزت کی رحمت سے یلوس ہو جانا بھی کفر ہے اس نے ایک راستہ اسودگی کا بھی بتایا ہے۔ اسے صرف وہی پایا جو ڈھونڈنے کی حمت گوارہ کر گیا۔ مجھ سے کتب بینی تین ماہ ہوئے چھوٹ گئی، اب داستان حیات کے مطالعہ سے فرصت نہیں ملتی، ہمیشہ کی عادت، رات کو بغیر پڑھنے نہیں آتی

رذائہ حقیقت آتا ہے۔ اسی کو بس گیا رہنے تک الٹ پلٹ کر دیتی دیتی پل قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ ساری دنیا سے جی میرا ہو چکا، اب کسی طرف طبیعت متوجہ نہیں ہوتی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں کہاں ہوں؟ زندگی بے کیف ہے کام کرنے بیٹھوں تو عیدیم الغرضی دامن نہ چھوڑے، لیکن میں ہوں کہ سارا سارا دن چارپائی پر گزار دیتی ہوں۔ وہ بھی کمرے کے ایک گوشے میں خبر نہیں مگر میں کیا ہو رہا ہے؟ اس بے خبری کا جو اثر ستیقین پر پڑے گا! ظاہر ہے؟ مگر سے برابر خطوط آ رہے ہیں کہ جولانی کا ہینہ کشمیر میں گزارو۔ خود بھی اپنے کو کمزور پاتی ہوں، لیکن خود داری اس کی اجازت نہیں دیتی جو ان پر افکار کو ہر خطہ کھول کر پڑھ لیتے ہیں۔ انھیں جب خود خیال نہیں تو پھر میں کیوں۔۔۔ بات بھی کھوؤں التجا کر کے؟۔۔۔ فرصت خدا حافظ!۔۔۔

تمھاری دل شکستہ، زنگس

~~~~~(۸)~~~~~

نہ پوچھ میری میں وہ چوختک صحرایاں  
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا،

آرام جان آخر! خوش رہو، تحریر جعفر علی، مجھے تمھاری قلبی آواز تو لگا خاصہ احساس ہے۔ واٹھ تفکرات کے چال میں دل بری طرح اسیر ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے ایسے قیمتی الفاظ لاؤں جو تمھاری تسکین کا باعث ہوں اے کاش میں صحیح معنوں میں تمھاری شریک درد بن سکتی، ات مجھ میں اتنی قدرت نہیں جو اپنے عزیز ترین محبوب کو افکار کے پنجے سے نجات دلا سکوں۔ پھر یہ زندگی کس کام کی؟ آہ میں صرف تمھارے لئے زندہ رہنے کی آرزو مند ہوں لیکن جب تمھاری ہمدردی کا ثبوت نہیں دے سکتی تو پھر۔۔۔ پیارے یہ زندگی ایک روگ ہے، مجھے اور تمھاری ذہنی کلفتوں کا اندازہ نہ ہو، کیا کروں اور کیسے اپنے دل کی کیفیت دکھاؤں۔ دنیا مجھے مطمئن اور سرور بخشتی ہے، کسی کو کیا خبر کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے! دل میں ملاکھوں زہریلے خار ہو بست ہیں،۔۔۔ پیارے! انھیں کیونکر سمجھاؤں؟ تعلقین صبر مسرود، سچ ہے جس نے گزری ہو یہ دہی جانے۔ خدا کے لئے ایسے یلوس کن الفاظ لکھ کر میری مشتاق آنکھوں کو خونبار نہ بنایا کرو۔ میں انتہائی دہمی اور شکی انسان ہوں! میری جان اگر معتبتوں کا مقابلہ استقلال سے کرے تو خود بخود رحمت کی شعاعیں نصیب ہوتی آغوش میں لے لیتی، اگر میرا تمھارا ساتھ ہوتا تو شاید میں تمھارا دکھ درد مناسی



(9)

بسین عجم نامیدی خاک میں ملجائیگی  
یہ جو اک لذت ہماری سعی و حاصل ہے

یہ اسے آخر! — باری تعالیٰ تمہیں سہرا دے گا۔ تمہارا دوستہ  
حیات افزا ملا جواب دیر سے دے رہی ہوں — معاف کیا، کیا کھول کچھ  
ایسے جھگڑوں میں مبتلا تھی کہ اب تک دماغ کو کیسویں نہ حاصل ہوئی۔ تمہیں میرا  
خط نہ پا کر حیرت ہوئی ہوگی، اور شاید تیرے انتشار کی صورت اختیار کر لی ہو  
اُف، پیارے یہ کیا؟ میری ناکامیوں کے غاروں سے تم کیوں اپنے ضمیر کو بھرنے  
کرتے ہو؟ آہ، میری ایسی قسمت کہاں؟ جو تمہاری شہدیک دردِ بن سکوں؟  
ہائے، اس کیسے محبت میں سوا غفلوں کے ادھر کیا ہے جو تم پر بچاؤ کر دوں، فکر  
کا شکر امیدوں پر زندہ کئے ہے۔ گو تمہارا تصور میری پشت پناہی پر آمادہ ہے  
مگر پھر بھی کاوشوں کے چنگل سے رہائی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ آلام کے چھوئے میز  
غرقابی پر تے ہوئے ہیں۔ یہ کئے تو اب یہ وسیع دنیا ایک — قطرہ زہر  
بن کر رہ گئی ہے — اسے کاش صحویات کی خوفناک لہریں مجھے ہمیشہ کے لئے  
اپنے دامن میں چھپالیں، اتم کیا جانو کہ تمہاری جُسمائی اس ستم رسیدہ ہستی کیلئے  
کتنی ہلاکت آفرین ہے۔ تمہاری پریشانیوں کا احساس — اراسیہ — بن کر  
میں سے پلٹا کیلج کا خون چوس رہا ہے۔ سعی و کوشش ہے اگر مصائب پر قابو مل  
ہو جاتا تو پھر مصیبت — مصیبت نہ رہتی، تمہارا نظریہ محبت کیا ہے، ادرا  
غور کرو، ممکن ہے کہ جسم کے کسی حصہ میں پچانس چھبے ادرا نکمیں اس کی تلاش  
میں سرگرداں نہ ہوں، دل کو درد نہ محسوس ہو، ادرا غئے دوستی تو یہ نہیں کہ تم  
مجھ سے اپنی کلفتوں کو پوشیدہ رکھو، مانا کہ قوت دریاں نہیں رکھتی — ناکامیوں  
کے بادل تک میرے دستِ شل نہیں پہنچ سکتے جو آلام کا گریبان چاک کر دے  
مگر — پیارے تاخیر درد سے تڑپ تو سکتی ہوں، ہائے کیا تمہیں یہ بھی

گوارا نہیں کہ میرے دل پر تمہارے دل کا پرتو پڑے؟ میرے غیور اختر آفتاب  
میں کیونکر تمہارے گوشہ دل سے بجا گیت کی شمع بجھاؤں۔ جلتے ہو کہ جب  
دو مختلف ہستیاں رشتہ محبت میں منسلک ہو جاتی ہیں تو جب تک ایک دوسرے  
کو شریک درد نہ بنائے لطفِ رعیت حاصل نہیں ہوتا۔ ابھی کچھ دن ہوئے تم  
نے ایک خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ "جس میں روحانیت نہ وہ انسان نہیں" تمہارا  
جملہ ناقہ قیمتی ہے کاش کہ تم انھیں بچو لوں۔ اپنے دل کو بسالیتے۔ غریبی  
اور پریشانی کو حقیر نہ سمجھو۔ یہ دل و دماغ پر ہلاک کرنے والی کسوٹی ہے۔ ذرا  
میری آنکھوں سے دیکھو، تباہی کی روشنی تمہاری۔ بلند چٹائی سے  
اُٹی پڑی ہے۔ قدرت کی رحمتوں کی بارش یقیناً تم پر ہوگی۔ میری ہر سانس،  
اسی فکر میں سرگرداں ہے۔ کیا کروں اور کیونکر تمہیں دامنِ طمانیت میں لپیٹ  
کروں۔ کیا میرا غرور دل کبھی خوشی کی ٹھنڈک نہ محسوس کر سکے گا۔ کیا  
یہ پھول جو مجھے جان سے زیادہ ہیں سرت کی خوشبو سے شامِ جان کو سطر زکری  
یاس کا دھواں دم گھونٹ دیتے کچھ پس نہیں جلتا، کیونکر فناءِ محبت کو خوشگوار  
بناؤں، سیداب کی تباہ کاریاں علحدہ جی دہلائے دیتی ہیں، کچھ نکلنا کا حال،  
جلستے ہو نہ لکھو۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے، طبیعتِ عید بد مزہ ہے مگر سکی  
بے ربطی کو نظر انداز کر دینا۔ میرا جی آج کل بہت نڈھال ہے، تم بہت یاد آتے

۵ ————— خدا حافظ

۵ - حفاظت! - ۵

یہ ارہو جائے نیند کی سکردل تائیں سے خفا مکنائے بکے تو ہیں  
مضطرب الحال، برگس،

~~~~~(10)~~~~~

اب کی بھی سیر باغ کی چلی میں بوس رہی
اپنی جگہ بہار میں کنجِ قفس، رہی

آسمان محبت کے تانبہ اختر! — خدا تجھے مبر و ضبط کی توفیق عطا کرے! آئینِ اخلاطِ باطنی کی آواز کو کیا کروں جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں ہم کو ان سے ملنے پر مجبور کروں! یہ امر واقف ہے کہ ظاہری آسائش کبھی قلبی کوفت کا سد باب نہیں کر سکتی، لیکن دنیاوی تفکرات جو انسانی زندگی کے لئے جزد لافیک بے ہوئے ہیں ان کا اندفع ضرور ہو جاتا ہے۔ ابر نیساں کا ہر قطرہ موتی نہیں بنتا۔ سورج کی شعاعیں ہر تھمر کو ہیرا نہیں بناتیں۔ پھر تمہاری نکایتِ لاعلم! اچی چھوڑوان سب تصنیعات کو — آؤ، اور فضائے حیات میں

عشق و محبت کے روح پرور نغمے الایں — دنیا کو اپنے نعموں کی شہسبزی میں گم کر دیں۔ یہاں تک کہ فردوسی نغمے اللہ اللہ اپنے خود بھی اپنے نعموں کو بھول جائیں۔ اس وقت موسم کتنا دلفریب ہے؟ تمہارے مجھے ہوتے بیٹے کے پھولوں کا ہار عجب بہار دکھا رہا ہے۔ پھولوں سے محبت کی خوشبو اس پاس کی فضا کو مس کر رہی ہے۔ سارا گھر ہلک رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے محبت کی لطیف بو سے شام جان — ہوا چل رہی ہے، درخت جھوم رہے ہیں۔ ظالم بدموں نے ادب بھی جذبات میں ایک پر کیف ہوجان پیدا کر دیا ہے ذرہ ذرہ جوش مستی کلبیہا نہ چھلکا رہا ہے — اے کاش! اس وقت تم میسر پاس ہوتے اور یہ ٹھنڈی اور سہانی رات یہ پر کیف موسم مجھے تمہاری قربت سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے — موسم بہار کی آمد ہے — دل کی پرمردہ کلی ابھی سے گلنے کے لئے صبح کا انتظار کر رہی ہے۔ جذبات کی فراوانی معاذ اللہ کچھ نہ پوچھو۔ — نہ جانے کتنی آنرویں کتنے ارمان اس خانہ دل میں پرورش پا رہے ہیں، اللہ اس لئے — موسم ہر سال کی کیف انگریزیاں مجھ ایسی حساس دل ہستی سے پوچھو، کالی کالی گھٹائیں چھائیگی — بجلی چمکے گی — ایسے میں غم کی ماری کوئل کی دردناک آواز میرے دل میں ایک غمناک ہوک پیدا کر دیگی — تم بے اختیار یاد آ جاؤ گے! — پیسے باغوں میں شور مچائیگی! — مستی میں ڈوبی ہوئی ہوائیں چلیں گی، اور ختم ہو جائیں گی، بوند دل کا سیلاب آئیگا اور نکل جائے گا۔ میں فراوانی جذبات سے منسوب ہو کر تمہاری محبت میں گم ہو جاؤنگی، — لگے، پچھلے واقعات یاد آ جائیں گے — میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگے گا۔ — جس کا مقابلہ یہ سحاب نہ کر سکے گا! — تمہاری یاد ہوگی اور میرا سینہ، دنیا کے سارے غم بھول جائیگا — ایک کیف، ایک بخوبی مجھ اپنی سحر آفتابوں میں سحر کر لگی — اس وقت تم مجھ سے کتنا دور ہو گے — یاس فنا امید کی گھٹکھٹکائیں دل با فردہ کے چہرے پر چھا جائیں گی، — آنکھ محبت کی بارش ہوگی، برسات کی راتیں ہوں گی اور — غم فائدہ وہ کہ لمحات؟ — کسی طرف سے

”بالم آئے بسو مورے من میں — کی کیف آفریں مدائیں کانوں میں آئیں گی! — دل تمہارے لئے بچھن ہو جائیگا — نغمے فضا میں اڑتا پیدا کر کے صبح ہوا میں تحلیل ہو جائیگا — لیکن میرے سینے میں دی — تم بن رہا کچھ نہ بھلنے کی کھٹک بدستور جاری رہیگی، — کیا تم مجھ سے اس موسم میں یاد کرو گے؟ — جس کی لطیف ہواؤں میں محبت کا بو، دنیا کو پیغام طرب دیتی ہے۔ اور جس کا پہلا نظرہ جذبات بخود ہی میں یہ بھلا پر درجوش پیدا کر دیتا ہے۔ آہ — اس وقت تمہاری یاد مجھے سرور و انبساط کی دنیا میں گم کر دیگی، میں کھو جاؤنگی! — کیف و بخود کی بے پناہ جذبے میں! — دنیا میں انقلاب آئیگی، اور ختم ہو جائیگی، سوچ اور چاند بدستور دنیا کو روشنی پہونچاتے رہیں گے — دن ختم ہو کر پھر طلوع ہوگا — رات اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ بساط دنیا پر قہر رکھیں گی — باغوں میں کلیاں پھولوں کی شکل اختیار کرتی رہیں گی — موسم بہار اسی طرح دلفریب وادیوں میں — کیف سامانیوں کی تازہ موج پھونکتا رہے گا۔ لیکن — وہ دن جو — جوانی کے بہترین دن تھے — اب پلٹ کر نہ آئیں گے!

نغمہ عالم میں اس طرح تیسرو تبدیل ہوتا رہے گا — پھر کون سا دم وقت کی قدر کریں۔ جوانی پلٹ کر نہیں آتی، پیارے جو کچھ کرنا ہے جلد کر لو، وقت ہو کے دوش پر بھاگا جا رہا ہے، دنیا کی کوئی قوت — قوت وقت کی پرواز کا مقابلہ نہیں کر سکتی — آؤ — آؤ، شباب بھاگا جا رہا ہے — جذبات روٹھے جا رہے ہیں — منائیں! — منائیں ان زریں ساعتوں کو! — جو اس وقت میرے ہیں — پھر کھانسی ہوگی یہ سنہری ساعتیں جوانی کی طرح — اس وقت ایک حسرت — ایک خوشگوار خواب ان کا غم البدل ہوگا۔ میرے پیارے! — آؤ آؤ — جلد آؤ! میں تمہارے لئے دیدہ و دل فرس راہ کئے بیٹھی ہوں۔

سراپا محبت۔ زنگس

~~~~~ (۱۱) ~~~~~

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی

زندگی نام ہے مرم کے جئے جانے کا

درد نواز اختر! — سلام سنا از! مبرنگن نا نے دل میں

بالم آئے بسو مورے من میں  
ساون آیا تم نہ آئے تم بن کسیا کچھ نہ بجائے  
من میں مورے ہوئی محبت کوئل کوکت بن میں

~~~~~(۱۲)~~~~~

کون سی رات آن ملے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

میرے آرام جان آخر! سلامت رہو، انتظار کے شعلے
کب تک مجھ پر ان نصیب کو بھسم کرتے رہینگے! بولو! اب دماغ اب ان گیتوں
کو سلجھانے کے قابل نہیں۔ ہاں زندگی کا ہر لمحہ زمانہ کی بندش میں ابھکر رہ گیا ہے
اب زندگی مجھ سے بیزار ہے اور میں زندگی سے! — خوش ہو جاؤ۔ اہل
کی ساری آرزوئیں فنا کا جام پی چکیں۔ حسین تئناؤں نے چادر الم میں منہ چھپا
ہے۔ یاس کے خاکستر صحرائیں تنہا جھنگ رہی ہوں، بولو اس وقت بھی تم نہ
آؤ گے کیا تمہیں میری بیکسی اور کس سپر سی پر بھی تاسف نہیں آتا۔
پھری ہیں یوں پتیلیاں شب بزم کد شام کی سحر ہوئی ہے
مگر نہ آتا تھا تم نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہوئی ہے،

رات دن زندگی کے فلسفہ پر غور کرتی ہوں لیکن مقصد کیا سمجھ میں نہیں
آتا۔ محبت کی آخری سرحد پر پہنچ چکی ہوں۔ اب اتنا دامن تو بھی باقی نہیں رہا
ظہر کو اب دریا میں مل جلنے دو۔ آئیں انکسار ہیں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ لکھنا
جاتا۔ دماغ چکر کھا رہا ہے۔ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی ہے۔ ایک حسرت
— ایک تئنا — ایک آرزو ابھی دل میں باقی ہے۔ اگر اسے تم قبولیت
کا درجہ دے سکو تو جلد آؤ۔ میری ضرورت روح تمہارے لئے بچپن ہے۔ اگر تم نہ گئے
تو میرا خانہ ہو جائیگا اور پھر ایک خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نظر نہ آئیگا۔ اس وقت
تمہاری زبان پر یہ شعر ہوگا! باقی پھر کہی! —

الٹی ہو گئیں سب ندیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے اس خسر کام تمام کیا
تمہاری بیزار گرس

غم کی آگ بھڑکادی، ات، اپنے نازک لبوں کی آہ کی تاثیر نہ پوچھو — میری
زندگی کا ہر لمحہ تمہارے اندفع پریشانی میں سرگرداں ہے۔ پیارے تم ہی
بتاؤ کہ جب ناکامیاں دامن نہ چھوڑیں تو کیا کروں؟ — دست کشش
شل ہوئے جاتے ہیں اسے کاشش، یہ جان حزیں تمہارے کام آسکتی! —
ہائے کیسی قیامت ہے کہ اپنی آنکھوں سے دل کا خون ہوتے دیکھوں اور پیپ
رہوں، — خاموش رہوں، میرے عزیز محبوب، مجبوری کا پھندا گلا
گھونٹے دیتا ہے، خدا شاہد ہے کہ مجھے تم سے زیادہ کچھ عزیز نہیں مگر جان جان
قسمت کی جانکاہیاں ماحول کو سخت اندوگیں اور خطرناک بنا رہی ہیں
کوئی اپنا ہمسرد و رفیق نہیں! تہمتی ایک جہنمی شعلہ ہے! —
خدا کے لئے اپنے کو سنبھالو — یہ بے مبری تم جیسے عالی دماغ کے لئے زیبا
نہیں — یہ کیا تم بھی عام لوگوں کی طرح غم فراق کی فراوانی سے گبرا
اٹھے۔ بس بس — دیکھو میری — "نگہ انتخاب" کو مجھ سے نہ کرو
ان نگاہوں نے دیر کی ادائیں بہت دیکھی ہیں، اب ذرا — شان
شجاعت — بھی دکھاؤ — مردانہ وار ضبط کے جوہر دکھاؤ، اپنی مثال قائم
کردو — جیوا اور مصیبتوں کو ٹھکر کر ڈیو، ہمت و استقلال کو رفیق بناؤ
تمہاری عزت کی قسم — تمہاری عزت پسندی اور عزت نفس کا شدید
احساس ہے۔ اپنے فرض محبت کو بھی جانتی ہوں لیکن ۶
دست شل کو دخل نامکن خط تقدیر میں
تمہاری ذہنی خلقتاریوں کے خار رگ رگ میں پوسیتا ہیں
خدا کے لئے دامن ہراس نہ چاک کردو — سخت الجھن میں گرفتار
ہوں — ساری ساری رات جاگنے گزر جاتی ہے — جی ڈوبتا جا
ہے، اب رخصت کی اجازت دو۔ شدید گرمی ہے۔ جواس ٹھیک نہیں،
بد نصیب و ناکام، نرگس،

”فاران کی تحقیق“ فاضل جلیل علم بیدیل حضرت علامہ غیاثت رسول مرحوم چرمیا کوٹی کا ایک
بلند پایہ زبردست غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ خاص نمبر ۱۹۳۷ء میں قابل دید ہوگا

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۷ء کا دن کس قدر اچھوتے علمی و ادبی جواہر یاروں سے بھرا ہوا ہے۔

جذبا عالیہ

اعتبار الملک حضرت دل شاہ بھاپوری

میری مزاج داں نگہ بے خبر کہاں،
نظارہ مدعا ہے یہ قسمت مگر کہاں،
تاریک اب تو نرم تصور بھی ہو گئی،
شعلہ تھا دل جو جھبکے ہوا خاکِ لایکاں
رتنے صنمکد میں مگر محو ذکرِ حق !
آتش فتنگی دل کو سمجھتا نشاطِ روح !
زنگین بیاض عشق رہی تا گدازِ دل
تاریکاتِ تابِ سکون منزلِ دراز
اے حسن تو ہی آج اٹھا گوشہ نقاب
زاہد بھی میکے میں ہے ساغرِ بدست آج
احساسِ دل کی چوٹ کا لے دل محال ہے
احساسِ دردِ عشق کہاں چارہ گر کہاں
ذیلے آرزو میں نمودِ سحر کہاں
وہ عالم خیال کا حسنِ نظر کہاں
اب اعتبارِ عشق کہاں وہ اثر کہاں
اتنے جنابِ شیخِ وسیعِ نظر کہاں
ناصحِ رموزِ عشق سے ہر باخبر کہاں
اب نسو و نمبرِ جوش وہ ہے چشمِ تر کہاں
اس بکسی میں دیکھئے ہوگی سحر کہاں
میری نگاہِ شوق میں اب یہ اثر کہاں
میکشش یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت ہر کہاں
رکھے گا ہاتھ آج مرا چارہ گر کہاں

رجوع باطل!

نثر مرہ فاطمہ لیاقت، منشی فاضل۔ بلگرام

مندرجہ بالا عنوان سے رسالہ طہران میں ادیب فاضل آقلے ذبیح اللہ صفا کا ایک بصیرت افروز و پرمغز مقالہ شائع ہوا ہے جس کی دو قسط کا ترجمہ یہ ناطہ سرین ہے۔

فاطمہ لیاقت

ہر زبان میں جو خارجی الفاظ داخل ہوتے ہیں ان کی خاص تاثیر ہوتی ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے اکثر ہومن ادبا کی کوشش ہے کہ عربی کے وہ الفاظ جو کہ فارسی میں داخل ہو گئے ان کی صورت اور معنی میں فرق ہو گیا ہے انھیں اسی اصل عربی صورت میں استعمال کریں جو کہ عربی لغت میں موجود ہو۔ لیکن میں ان عربی الفاظ کے فارسی میں استعمال کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ اس کے خلاف ہے۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ ان کے خیال کو غلط ثابت کر دوں، اس لئے زبانوں کے تغیر اور جڑوں کے اختلاف (جو کہ کسی زبان کے اجنبی الفاظ میں پیدا ہو جاتے ہیں) پر بحث کی جائیگی۔

الفاظ، علامات و کلمات کی ایجاد کا سبب انسان کی ضرورت ہے۔ دورِ اول میں انسان بجائے اس کے کہ اشاروں، کنایوں سے کام لیتا اس نے چھوٹے چھوٹے الفاظ بنائے جن کے ذریعہ سے وہ اپنا مطلب باسانی ادا کر سکے اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھا سکے۔ اس طرح وہ چھوٹے الفاظ بننے رہے جن کی ترقی یافتہ شکل یہ الفاظ بزرگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستِ اول کے افراد کی افراش کے بعد ان کو دوسرے مسکن کی ضرورت ہوئی ہوگی اور انھوں نے مجبوراً ترک وطن کر کے اپنی موروثی زبان ساتھ لے گئے ہونگے، لیکن مسکن جدید میں نئے حالات، نئے ماحول، اور چیزوں کے لئے دوسری لغات کی ضرورت کے مطابق علامتیں (الفاظ) اختراع ہوئیں۔ اس طرح اصلی زبان سے اس میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا۔ علاوہ ازیں مردِ ایم کے ساتھ ہی "محیطِ حسیہ" نے ان کی عادات اطوار پر بھی اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ روحانی

اور جسمانی فرق نے ان کو اہلی قوم سے متمیز کر دیا۔ اس صورت میں زبان اور لہجہ میں نسبتی آگیا۔ جس سے پہلی زبان الگ زبان معلوم ہونے لگی۔ اس طرح بننے دستے اصل زبان سے علیحدہ ہو کر دوسری جگہ بسنے لگے مختلف ماحول اور ضروریات نے ان کی زبان، لہجہ، معاشرت و تمدن پر مختلف اثر ڈالا، اس طرح ہر دستے کی زبان اور لہجہ اصل سے جدا ہو کر ایک نئی چیز معلوم ہونے لگا۔ اور ہر قبیلہ کی زبان میں ایک دوسرے سے فرق ہو گیا۔ وہ تو میں جن کا زمانہ بہت نزدیک تھا لیکن مجاورت میں زندگی بسر کرتے تھے ان میں بھی یہی اختلاف ہے جیسا کہ ایرانی اور سنسکرت میں مانا کہ ہندو ایرانی ایک ہی مانہ میں "روہ جیوں" اور کوہ ہندو کش کے دامن میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی لغت ایک تھی۔ مثلاً ماہ و آفتاب کے لئے دونوں ایک ہی لفظ استعمال کرتے۔ جبکہ انھوں نے ہجرت کر کے ان کا ایک دستہ مغرب کی طرف چلا گیا جس کو بعد میں "ایران" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دوسرا گروہ ہندوستان کی طرف گیا اور ہندو کہلایا۔ اول الذکر نے اپنی لغت میں تبدیلی کر کے "ماہ و شیر" کر دیا اور ثانی الذکر نے "ماس و پتیرا"۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، یہاں تک کہ اگر زبانِ فرس "ہخامنشی" اور زبانِ اوستائی (پہلا ایران کا جنوبی لہجہ ہے اور دوسرا مشرقی) اور زبانِ تہستانی و گیلانی (کہ حقیقتاً ان کے قدیم و جدید لہجوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں) کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اختلاف کلی پایا جائیگا۔ ماحول کے علاوہ دوسرا سبب زمانہ کا اختلاف بھی ہے۔ مرور ایام کے ساتھ۔ دوسرے دست کی اطلاعات، ان کے علوم و فنون کی خبر، لغات

اور مصلحتات قومی کے ساتھ دوسرے تک پہنچتی ہیں، اس طرح سے بھی زبان میں فرق آجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت نژادی۔ ماحول، مسکن اور زمانہ کے ہی وجہ سے زبان پر اثر پڑتا ہے اور ان کی زبان پہلے سے کسی قدر مختلف اور ارتقائی پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں زبان ایرانی، (بلکہ عام دنیا) کا تغیر و ارتقاء، اس کا ثبوت ہے۔ اگر دو قومیں جن کے مصلحت زندگی مختلف ہوں اتفاقاً مل جائیں اور ان کے مصلحتوں و زبان اختیار کرنے لگیں تو جدید لغت پیدا ہو جائیگی۔ جو دونوں کی زبانوں سے الگ ہوگی اب دیکھنا یہ چاہئے کہ آیا اس اختلاف میں لہجہ کا بھی سرق پیدا ہوگا؟ اس مقام پر مذکورہ حوالہ کی تاثیر دوسرے مقامات کی نسبت شدید و سخت تر ہے اور امور لازماً طبعیت سے شمار ہوتے ہیں۔ قافہ میں طبعی کے مقابلہ میں اس کی مخالفت محال ہے۔ مثلاً ہندی، ہندوستانی زبان میں کرہ قمر کو ماں کے لفظ سے یاد کرتا ہے اور ایرانی اس کے لئے ماہ نہیں بولتا اور اس اہل لفظ کو مجبوراً استعمال کرتا ہے۔ اس کی زبان پر آتا گراں اور ناناؤس نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہی قوم اجنبی لفظ استعمال کرتی جس سے کان نا آشنا تھے۔ یا اس کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہوتی تو مجبوراً قافہ میں طبعی، اختصامات نژادی و مکانی کے لحاظ سے اس میں اس قدر تبدیلی پسیدہ کرنی پڑتی کہ جو اس کی طبیعت کے موافق ہو اور کان اس سے مانوس ہو جائیں۔ پس ہر زبان کے لئے نو ایس مخصوص ہیں کہ اجنبی لغات اس کی اجازت سے داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً عربی میں وزن فعلول نادر و نایاب ہے۔ اس کی کیابی ثابت کرتی ہے کہ اس کا استعمال اہل عرب کیلئے گراں و ثقیل ہے۔ بنا بریں اگر کسی اجنبی زبان مثلاً ایرانی سے کوئی لفظ اخذ کیا جائے جو کہ پہلے سے اس میں موجود اور فعلول کے وزن پر ہو تو اس کی ناناؤسی اور گراں طبعی کے سبب اس میں تغیر پیدا کر دینگے۔ مثلاً (ستور) کو دستور (وزیر) زنبور کو زنبور تلفظ کرینگے۔ اسی طرح سے وزن (فعلول) کم مستعمل ہے۔ کوئی لفظ ہو تو اس کا نقل و در کر کے فعلول کے وزن پر استعمال کریں گے۔ یعنی کرہ باس کو کرہ باس، سرداب ایران، زبانوں میں علاوہ اختلاف اوزان کے اختلاف حروف بھی پایا جاتا ہے مثلاً عربی میں حروف ث۔ گ۔ پ۔ کا وجود نہیں۔ اگر کوئی ایسا لفظ اس میں شامل ہو تو اس کو دوسرے حرف سے بدل دینگے، ز۔ سے۔ پ۔ پ۔ سے۔ ف۔ گ۔ ک۔ ج۔ سے مثلاً یزدگرد۔ (یزدگرد)۔ گند شاپور (جندیساپور)

اکثر حرکات کا بھی فرق ہو جاتا ہے۔ ان طریقوں سے اہل عرب با سانی ان الفاظ کو صرفی و نحوی قواعد کے مطابق لاسکتے اور صیغہ جمع میں بھی استعمال کرتے ہیں، اس قسم کے تصرفات تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً فرانسیسی میں کوشش ہے بھی کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکتا جو غیر زبان کا شامل ہو گیا ہو اور اس میں کوئی تبدیلی نہ پائی جاتی ہو۔ جیسے لفظ لازورد (معرب لا یورد) جب فرانسیسی میں آیا تو وہاں مصلحت ہو گیا باوجودیکہ اس کا لازورد و معرب ہے اس کو لام تعریف قرار دے لیا۔

فارسی کے متعلق خیال ہے کہ جو الفاظ زبان خارجی سے اس میں داخل ہوئے ان میں تغیر ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی اور زندہ زبانوں کی طرح اس میں بھی جو الفاظ زبان غیر سے داخل ہوتے ہیں ان میں بھی تغیر ہوتا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ الفاظ عام فارسی سے آراستہ ہو کر اپنی اہلیت اور اجنبیت ہی کھو دیتے ہیں، چنانچہ اپنے دعویٰ کی تائید میں مشتے نمونہ از خروارے مثالیں پیش کر دوں گا۔

(۱) الفاظ کے لئے اکثر اعراب ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی رعایت نہ کی جائے تو سنی ہی خط ہو جائیں۔ لیکن ایرانی اس کے عادی نہیں وہ نہایت سادگی سے لغت کا استعمال کرتے ہیں، مثلاً انیر۔ اسیر۔ اساس وغیرہ کو ایک ہی ترتیب سے کہینگے۔

(۲) عربی کے ان کثیر التعداد الفاظ میں جو کہ جزو فارسی ہو گئے ہیں۔ اکثر تغیرات ہوتے اور اس کے سنی بدل جاتے ہیں۔ اکثر اہلی معنی کے باطل متضاد استعمال ہوتے ہیں، مثلاً لفظ فراغت، کہ عربی میں اس کے معنی "جذع و قلق" کے ہیں لیکن فارسی میں "آسودگی" کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن عربی کے فراغ و فروغ، کامراد و فہم جیسا کہ نظامی کہتا ہے۔

بسوئے افوج فراغت چناں کسٹم پرواز

ازین ضیفض کاشکستہ است بال و پریم

تقدہ عربی میں ارادے کے معنی میں مستعمل ہے۔ فارسی میں علاوہ اس معنی کے "ازپے آزار و باکشتن کسے برخاستن" کے بھی آتا ہے۔

تقدہ جانست طمع در لب جاناں کردن

تو مراہیں کہ دریں کار بجائ می کوشم

تجزہ کے معنی عربی میں منع کرنا، زور سے ڈانٹنا یا کھانڈلکے ہیں

فارسی میں عذاب دادون، تنگنہ کردن کے ہیں۔

جان بیگانہ ستانہ ملک الموت بزجر

زجر حاجت بنود عاشق جاں افشا ترا

رعنا، عربی میں خود پسند اور احمق کے لئے ہے لیکن فارسی میں خوبصورت خوش قامت کے واسطے۔

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را

کہ سر کبوتر و سیب باں تو دادہ مرا

عربی کی حالت تراکیب فارسی میں حالت وضعی و اسمی میں متعل ہوئی ہے مثلاً "لا ابالی" عربی میں "باک ندارم" اور فارسی میں کوئی شخص جو کہ کسی چیز کا پابند نہ ہو۔

لا ابالی چہ کند دفتر دانائی را

طاقت و عطا نباشد سر سودائی را

اللہ و اکبر (خدا بزرگ ہے) فارسی میں تعجب شدید کے اظہار کے لئے کہا جاتا ہے۔

کنوں ہر کہ آنجہ نیکہ دیدہ باشد

بصیرت ہی گوید اللہ اکبر

اقبال ۶۰ بی میں رونے آوردن کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن فارسی میں اس طرح بہت کم مستعمل ہے، بلکہ محبت کے معنی میں اساتذہ کے کلام میں بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے۔

بکشا دوست گاہ در اقبال بر جہاں

فرخندہ باد بر ملک شرق بہت گاہاں

(۳۳) حرکتوں میں تبدیلی کرنا یا بعض حروف میں زیادتی یا کمی کر دینا اکثر کلمات عربی کے الفاظ کو الٹ دینا۔ اس کی مثال فارسی میں بہت ملتی ہے جیسا کہ قمار (کبسر اول) سے قمار (بغم اول) حیوان (بفتح اول و ثانی) سے (بفتح اول و سکون ثانی)۔ اکثر عربی کی حرکت پر اور حرکت بڑھا دیتے ہیں مثلاً لموعو (بمکون ثانی) کو تحریک ثانی بھی دے دیتے ہیں۔

فردوسی نے لفظ عفو، یوسف زلیخا میں کی جگہ اسی طرح استعمال کیا ہے۔
دگر است گوئید با من سخن عفو تاں کم کردائے کہن
عفو کردن ز الگناہ عظیم لجاجت بخواہم زرب کریم

(۴) ایک خاص تغیر جو ایرانیوں نے عربی لغت میں کیا ہے وہ آلف کو قی سے تبدیل کرنا یا ادبا کی اصطلاح میں "رأی الف ثبے" اس قاعدے کے تحت میں بہت سے عربی الفاظ میں تغیر ہو گیا۔ مثلاً آمن کو بصورت تغیر "ایمن" بولیں گے۔

خال را بخانہ باز فرستاد مسخر روئے

با خلوت و نوازش دبا ایمنے بجاں

"ولکن" بدل کر "ولیکن" ہوا۔ آخر میں تخفیف ہو کر ولیک، ولے سے بدل گیا۔

جڑے نہ کردہ ام کہ عقوبت کند ولیک

مردم بشرع می نکشد ترک مست بہت

وہ الفاظ جن کا الف مقصورہ قی سے بدل جاتا ہے، اساتذہ ہمیشہ اس کا قافیہ قی سے کرتے اور الف ممدودہ سے کرنا عیوب سخن میں سے سمجھتے ہیں۔ سائنوری کہتا ہے۔

صبا بہ سبزہ یار رحمت دار دینی را

نمودہ گشت زیں مرغزار عقبی را

خداے عزوجل کوئی از طہ بن مزاج

باعتماد ہوا دادہ جان معنی را

اسی قاعدہ کے مطابق کتاب، رکاب، سلاح وغیرہ کو بدل کر کتاب، رکیب، سلاح کر دیتے ہیں۔

(۵) عربی میں معمولاً اسمائے ناقص کے "یائے آخر" کو بوجہ اجتماع کسین حرف کر دیتے ہیں جیسے داعی، قاضی، مسطی وغیرہ کو "دع" "قاض" "مسط" پڑھتے ہیں۔ لیکن فارسی میں چونکہ اس قسم کے کلمات کا استعمال گراں سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ اسی طرح بولے جاتے ہیں۔

(۶) اکثر عربی معادیر فارسی میں اسمائے معادیر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اسراف، رؤت، عفو کو ایک مصدر بڑھا کر بصورت مصدر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً اسراف کردن، عفو کردن، عفو شدن، رؤت کردن، رؤت شدن وغیرہ۔

(۷) اسمائے جموع کے آخر کا تہزہ اور مصادر و صفات کا تہزہ حرف ہوتا ہے مثلاً اقیاء، کسریاء، ابقار، ضیاء وغیرہ ضیاء، ابقیاء، ابقیاء، ابقیاء

باشکم کو باب، باسماں، و بشکم پڑھیں گے۔
چور وئے یار سن شد دہر گوئی
ہمی چہرہ بشوید باب کوثر
فاطمہ لیاقت، بگرام

شکر پس نعمت و منت خستہ گارا
پروردگار خلق و خداوند کبریا
(۸) الف مقصورہ یا ہمزہ کو جو کہ "بائے اضافہ" یا کاف تفسیر یا داؤ
حلف کے بعد آتا ہو پڑھتے وقت حذف کر دیں گے۔ باب، باسماں

عظمتِ نسوانی!

شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام کی ایک دلکش نیگالی نظم کا ترجمہ

میری نگاہ میں مرد و عورت سب برابر ہیں! — دینکے شہمت و جلال کی تعمیر میں عورت کا اتنا ہی حصہ
جتنا مرد کا! — سوز و ساز، غلش و تیش، ریاکاری اور آنسو، ان کی تخلیق میں مرد کا اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا عورت کا!
دیوی! — تجھے گناہ کا سبب کون بنائے؟ کہہ دے! — گناہ کا تخم پونے والا ابلیس مرد
ہی کا ہم جنس تھا۔ اس ہسان میں جتنے درخت ابھرتے ہیں، جتنے پھول کھلتے ہیں — عورت ہی
نے ان میں رنگ دیو، شیرینی و لطافت کی روح پھونکی ہے! — ہمنشین تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے
اندر ممتاز آرام کر رہی ہے، باہر شاہ جہاں محو خواب ہے!

عورت دل ہے — مرد جسم، — اگر مرد سورج کی تپش اُبادِ سموم کا جھونکا ہے تو عورت —!
چاند کی کرن، اور نیم میچ گاہی! — اگر مرد شہنشاہ لب صحرانی ہے تو عورت چلم کوثر، عورت ہی نے
شاعری کی بنیاد ڈالی اور مرد کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا — مرد نے ہل چلایا — عورت نے پانی سے
سینچا — ان دونوں کے جوگ سے کھیتی اہلہ انھی، مرد کی ہر فرخ و طفر عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔
تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا۔ لیکن کون بتائیگا کہ کس کے لئے عورتوں نے
کس طرح اپنا سہاگ اجاڑا، اور ماں نے دل کے ٹکڑوں کو کیونکر نکال پھینکا۔ یہ شجاعت کی داستانوں میں لکھا
ہے کہ کس کس فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے برق دم بنا دیا تھا — اس لئے — مرد سونے
مکہ عورت کو جتنا کچلے گا اتنا ہی نامرد ہوتا جائے گا! —

عورت! — تو نے اپنے نازک ہاتھوں سے دُسیا کو آج تک امرت کے پیلے پلائے ہیں —
لیکن اب انھیں ہاتھوں سے سم قاتل پلے جا — پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب مرد کے ساتھ ساتھ عورت
کے اعزاز میں بھی زمین سے شادمانی کے نعرے بلند ہوں گے! —

فاطمہ لیاقت (منشی فاضل)

(ترجمہ)

سائیں بابا

اثر خامہ علامہ محبت رحید آبادی

دنیاۓ دوروزہ میں آمجد! کیا جان کو کاش ہوتی ہو
اک خواہش بوری ہوتی ہی پھر دوسری خواہش ہوتی ہو
ہے موت و حیات کا ہنگامہ، ہر دم میں جو داؤدیم علم
وہ بھر کیلئے جو منتہے ہیں وہ دھوپ میں بارش ہوتی ہو
تم جس کو کمال سمجھتے ہو وہ زوال کا ہے زینہ بابا
پیدائش سے مرنے تک بچوں کی طرح سب روتے ہیں
ہم جیسے جاگنے والوں سے اچھے ہیں جو قبر میں سوتے ہیں
جب ساری میں گردش میں ہے پھر ہکو سکون کیا خاکسے
ہم فکر میں خاطر جمعی کو بیکار پر نشیاں ہوتے ہیں
اب سکا نکلتا شکل ہو جو ٹوٹ گیا کاٹا بابا

ہر بندگی کو کھلنا ہے، ہر سانس کو تن سے نکلنا ہے
ہر شخص کو خاک میں ملنا ہے، ہر جسم کو سترنا گلنا ہے
جو کرنا ہے وہ بھڑنا ہے، جو لینا ہے وہ دینا ہے
ہر نیکی کا بدلہ ملنا ہے، ہر شاخ بدی کو پھلنا ہے
مشہور مثل ہو دنیا میں، ہر جیسے کو تیس بابا
رونے کو سوا یاں کام نہیں، دنیا میں خوشی کا نام نہیں
یاں کوئی مسرت ایسی نہیں ہے، غم جس کا انجام نہیں
ہر بھول کی تیرہ کی ٹٹا ہے، ہر سیر کی بچے کالا ہے
سب لڑتے ہیں انکار و بے یاں چین نہیں آرام نہیں
ہر سارے جہاں کا حال ہی اک ہی نہیں تنہا بابا

ہر کھونے کو آخر پانا ہے، ہر پانے کے آخر کھونا ہے
ہر رونے کو پیچھے ہٹنا ہے، ہر ہٹنے کو پیچھے رونا ہے
پتری، بالک، دھن، دولت ہو بیش و طرب، اور ارجست،
یہ ہے، وہ ہے، سب کچھ ہو، ہر ہونے کے بعد نہونا ہے
سمجھا دیا جو سمجھا نہا تھا، اب سائیں ہاں سے چلا بابا

انجمن، انجمن

یہ نظم ہمارے ایک فقیر دوست سرین بابا کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔

”زیاں تھانہ سو دھتا“

ڈراما!

از جناب بابر بیالوی بی۔ اے (آنر)

انفراد، نعیم، ایک رئیس زادہ،
عذرا، نعیم کی بیوی،
صنیا، عذرا کا لالچ کلاس فیلو اور دوست،
جمیلین، خادمہ،
خدا بخش، خالناں،

موسم کی بہت تعریف کی ہے۔ میں اس کی دونداد مفر دیکھ رہا تھا۔
عذرا - وہ بیچارہ مناظرے ہاں کیا مغلوط ہوا ہوگا۔ کیا اتنا ہو سکتا ہے جتنا ہم اس
روز پکنک پر —؟
نعیم - واقعی اس روز تو کمال ہو گیا تھا۔ صرف تیری سمیت کا اثر تھا عذرا،
جو میں نے اس روز اپنی زندگی کو اس قدر مستغرق لطف و لطافت
پایا۔ کہ کشمیر کے مرغزاروں میں پہلے کے ہوئے سب سفر، سچ ہو گئے
تم جیسے خزانہ بیگانہ کے پہلو پہلو شراب عشق سے مدہوش ہو کر ان لاؤنڈ
لالہ زاروں میں ان وجدانچیز خوشبوؤں میں سیر کرتے رہنا کیا بھول
جانے والا واقعہ ہے؟ تم جیسے لطیف نادرہ عشق کے ہاتھ میں ہاتھ
دیکر ان بلند قامت چناروں کے نیچے (چناروں کی طرف اشارہ
کرتا ہے) اس ملک حسن میں جہاں اس عطر بیز ہوا اس نعیم عشق
و سودا میں سانس لیکر اس سوئے ہوئے سبزے پر مصروف گلگشت
ہونے کا کوئی نعم البدل ہو سکتا ہے؟

عذرا - ہوں ہوں، (اٹھتی ہے) آپ تو بس یونانی (نعیم کے پیچھے گھڑی ہو کر)
اس کے سبز بہار تھوڑے کھڑے فاشوش کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہاتھ کو چیم لیتا ہے)
نعیم - کیا میں غلط کہہ رہا ہوں (اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے سینہ

(ہلکونی شکل کا کھلا سا برآمدہ جس میں لمحہ کر کے دودھ فانی کھنٹے ہیں
سلنے چھڑا سا خوبصورت کٹہرہ لگا ہوا ہے۔ غلیچے پر دائیں جانب بیانا اور ذرا ہٹ کر
بید کی تین کرسیاں، ایک پر نعیم بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ پاس ہی چٹائی پولیش پلیٹ
میں رکھا ہوا سگریٹ دھواں دے رہا ہے۔ دوسری پر عذرا سوزن کاری میں مشغول
ہے۔ سلنے چنار کے دخت اور پھاڑ نظر آ رہے ہیں۔ آسمان ابرا کو دھسے —
عذرا کی آنکھیں اپنا تک آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ موسم کی عمدگی سے متاثر ہو کر
لوں پر ہلکی سی سکا ہٹ آجاتی ہے اور وہ بے اختیار بیانا پر جا بیٹھتی ہے، مگر نعیم
کو مصروف مطالعہ دیکھ کر پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھتی ہے اور سوزن کاری میں مشغول ہو جاتی
ہے۔ گاہیں بار بار اوپر اٹھتی ہیں۔ آخر ایک آدھ گھڑی کے بعد کہتی ہے)
عذرا - اخبار میں سب ہی کچھ بھول گئے۔ شاعر ہو کر یہ بے توجہی۔ موسم تو دیکھیے۔
نعیم - (سر اوپر اٹھا تہے) اہا ہا! آنے دو گھنٹیں پیاری، لگوں سے ٹپکے گا
زندگی سستی ہوا کر گئی شراب پیدا (اخبار کو تپائی پر رکھتے ہوئے) اس
میں بھی یہی کچھ پڑہ رہا تھا۔ (سگریٹ کو اٹھا کر کش لیتا ہے)۔

عذرا - یہی کچھ کیا؟
نعیم - یہی کچھ موسم کا ذکر۔ کوئی ڈاکٹر شاہ ہے۔ باٹنی کا پروفیسر، کسی پوے
کی تلاش میں گھر گیا تھا۔ اس نے وہاں کے حین مناظر اور دلکش

پر رکھ لیتا ہے) میری عذرا! تم نے مجھ کے جو رنگ نہ دیکھے تو اب دیکھ
نہی ہو کہ نہیں؟

عذرا۔ (لحاجت سے) دیکھ رہی ہوں، آپ کی بدولت،

نعیم۔ کیا؟

عذرا۔ کیا؟ قدرت کے جنت نگاہ مناظر میں ایک سحر محسوس کر رہی ہوں
(سانے پہاڑوں کی چوٹیوں اور چناروں کو دیکھتی ہے) درختوں کی
سرسراہٹ میں جو نہ سنا تھا اب سن رہی ہوں جو خوشبوئیں کبھی
نہ سونگھی تھیں اب میرے شام جان تک پہنچ رہی ہیں۔ آپ کی
بدولت، صرف آپ کی،

نعیم۔ (اپنے سر کو کرسی کی پشت پر ٹیک کر عذرا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے) اس
سحر اور شام کی روح رواں تم ہو، عذرا، تمہیں نے، صرف تمہاری
موجودگی نے قدرت کے ان روح پرور نظاروں میں شریعت کا رنگ
بھر دیا ہے ورنہ میرے لئے یہ ایک پھیکے چلے آ رہے تھے۔ (اس کو
ہاتھ سے مونہ کر سانس کی کرسی پر بٹھاتا ہے)۔

تیری مناسبت بہاروں میں رنگ میرے تصور سے جو حسن باہ میں

عذرا۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اتنا مبالغہ!

نعیم۔ عذرا، یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ تباؤ و گرگ کی خاک کے خزانےک پامال ہونے
کی آرزو مند رہیگی۔ بیجاری تمہارے پاؤں چھنے کو ترس رہی ہے۔

عذرا۔ اس طرح کیوں کہتے ہیں آپ! بس ہی توجہی چاہتا ہے کہ مجھ غریب
بناتے رہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس بے وفائے نے طبیعت ایک سی

نعیم۔ میں نے تو فکر میں ایک سیزن گزارا ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ جانا
تو نصیب نہیں ہوا نا؟

عذرا۔ میرے ساتھ جانے میں کیا ہے؟

نعیم۔ تمہارے ساتھ جانے میں؟ مت پوچھو، پھر کوئی مبالغہ کرتا ہوں۔

عذرا۔ ادھر نہ بھول گئی،

نعیم۔ نہیں اپنے سوال کا جواب لو۔ (عذرا مسکرا کر اپنی شکست کا اعتراف
کرتی ہے) باغ کی ملکہ معلوم ہے کون ہوتی ہے۔؟ ہمار۔ اس

کی عدم موجودگی میں چمنستان کا دربار درہم برہم رہتا ہے مگر جونی ڈ
آئی اس کے حضور میں وہ دربار اپنی پوری شان حال کر لیتا ہے،

بھول کھلے جاتے ہیں، کلیاں شکستہ ہو ہو جاتی ہیں، بلبلیں سینہ بھاڑ
پھاڑ کر گاتی ہیں۔ میں جب گلرگ میں رہا ہوں وہاں کے تمام عین
طبیعیہ رائگاں جا رہے تھے۔ ملکہ موجود نہ تھی۔ اب جب تم جاؤ گی عذرا
بھول کھل جائیگے۔ میں تمہیں ان باتوں سے گن گن کر تباہ و دنگا کر،
یہاں یہ موجود نہ تھا۔ وہاں وہ موجود نہ تھا۔ یہاں گلاب نہ تھا وہاں
آبشار نہ تھا، پھر اگر یہ تیری خاطر داری نہیں تو کس کی ہے۔؟

عذرا۔ تو بہ تو بہ، جلے دیجئے، اچھا میں چلوں گی، (مسکرا کر) مگر آپ عذرا
وہاں پھیلیاں نہ پکڑیں۔ (دونوں ہنستے ہیں)۔

نعیم۔ (مسکراتے ہوئے) اس روز تمہارا کہنا پتھر پر لکیر ہو گیا۔ ورنہ میں نے
اسی دوری سے کئی بار شوکار کیا ہے۔

عذرا۔ میرے کہنے پر کہ کوئی پھل نہیں چھپے گی آپ کو بھی خند ہو گئی، اور پھر آپ کی
ناکامی، تو بہ، لطف دیجیے، میں واقعی اس مذہبت نہیں تھی۔

نعیم۔ تعجب ہے، تم کھاتے وقت تو نیز پر پھل کا ایک ٹکڑا نہیں چھوڑتیں
پھر نقد وقت روکتی ہو کہ نمی جانیں ہیں۔ (تھکتے ہوئے)

عذرا۔ ہائے سی تکرار میں تو میری نئی ساری خراب ہو گئی،

نعیم۔ پانی اتنا گلہ لا تو نہ تھا۔؟ بچاتے بچاتے ہی پاؤں جا پڑا۔

عذرا۔ اگر میری ساری پرداغ نہ پڑ جاتے تو پکنک بہت ہی اچھی تھی۔ شاید
پنرول سے مٹ جائیں۔

نعیم۔ بے پردہ ہو کر) مٹ جائیگے۔ آتش ساری اور تمہارا بدن خوب بھی
آتی اس دن۔ یہ ساری، رنگ تو اچھا ہے مگر وہ چیز دیگر تھی۔

عذرا۔ (پلو کو ہاتھ میں لیکر) پکڑا ڈرا گف ہے۔

نعیم۔ واقعی پردہ نصف لطف زندگی ضایع کر دیتا ہے۔ کیوں عذرا، ہم
اپنی موجودہ زندگی سے جو حظ اٹھا رہے ہیں وہ پردہ کے سایوں کے کماں

نصیب؟ کیا وہ اتنی آزادی سے پکنک پر جا کر اس طرح گلے
اڑا سکتے ہیں، شاید اس سرور زندگی کی ایک جھلک بھی اتنی نہ پہنچ سکے

عذرا۔ کل آپ پر نے کھائی بنے ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی آپ کی۔

نعیم۔ حامی نہ تھا۔ پردہ اٹھنے کے چند نقائص کہہ رہا تھا۔ بالخصوص جب
کوئی غیر شخص بوی کی طرف گھور کر یا ٹنگی باندھ کر دیکھے تو کم از کم میرا

تو برداشت نہیں کر سکتا۔ خصوصاً میری خود داری تو اس کی تحمل نہیں کرتی

عذرا - قربا ہر چیز کے پہلو پہلو چند ایک برائیاں بھی تو ہوتی ہیں جہاں گل ہے، وہاں خار بھی ہے۔

نعیم - ہاں ٹھیک ہے، مگر یہ وہ خار ہے جو مجھے بے طرح لہو لہان کئے دیتا ہو ابھی کچھلے ہفتہ ہی کی بات ہے، شیش پر تم لیڈی کپور سے باتوں میں مشغول تھیں۔ میں کرسی پر لٹیا سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر چوہدری نے پارٹنر بنانے کے لئے مجھ کو اصرار کیا۔ مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے اسے ٹال دیا۔ میں اس وقت تجھے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر دراز ہو کر تجھے دیکھتے رہتا میری پیاری عذرا میرے لئے بہت بڑی داغی عسرت ہے۔ میری نظر اچانک جو پھر میری توجہ پر پڑی، میں نے وہاں وہ کچھ دیکھا جو میری تفریح کی بربادی اور تخریب عسرت کے لئے بہت کافی تھا۔ وہ تجھے دیکھ رہا تھا۔ کن نظروں سے — میں نہیں تباہا تھا۔ میں نہیں تباہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذلت، ہوس، میں نہیں تباہا تھا۔ وہ عین ہے۔ خبیث!

عذرا - میں ہیں! کیا ہو گیا؟ ضیا، میں اسے چار پانچ سال پہچانتی ہوں بڑا اچھا، نعیم - تم عورتیں سادہ لوح ہو۔ مرد کو نہیں جانتیں۔ وہ کس طرح اچھا ہے تباہ؟ عذرا - (گھبراہٹ سے) میں کالج کے زمانے سے اسے جانتی ہوں۔ ہمارے گروپ کا بیکریٹری تھا۔ میرا اور اس وراثت کا ہم جماعت بڑا رفیق تھا۔ نعیم - ہوگا، مگر اب یہ تجدید رفاقت، مجھے نہیں بھاتی۔ انگلستان کا پانی پی کر آدمی میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ میں تو پچھتا تا ہوں کہ مجھے تم نے اس سے متعارف کیوں کر دیا۔ اب وہ ہر دوسرے تیرے لئے آدھا ہو گیا ہے۔ اس کی یہ بے تکلفی ابھی نہیں، تم اس سے ملنا کم کر دو پھر دیکھو کیونکر آتا ہے۔

عذرا - (تمنائے ہوئے چہرے سے) آپ تو غصے میں آ گئے۔ نہ خطا، نہ قصور، میں ہر حکم ماننے کے لئے تیار ہوں مگر یہ تو کئے آخر اس میں آپ نے کون سی اتنی بڑی برائی دیکھی ہے جو اس طرح پیچھے ہٹا کر اس کے پیچھے بڑھ گئے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، جذبہ ہے، انگلستان کا فارغ التحصیل ہے، چونکہ دنیا نیامیاں آیا ہے، اس کی یہاں کسی سے لمبی چوڑی ملاقات ہے نہیں، اس روز سرگرمی پر اتفاق ملاقات ہو گئی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے قیام کے متعلق پوچھنے پر جب اسے یہ معلوم

ہوا کہ میری شادی ہو گئی ہے تو اس نے بڑی مگر خوشی سے مجھے مبارکباد دی، اور آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، ایسا ہی ہے نا، جیسے آپ کے کسی رفیق کی شادی ہو جائے تو کیا آپ اس کی بیوی کے دیکھنے کے لئے مندر نہ ہونگے؟ اس بیچارے کا قصور کیا ہے آخر؟ یہی کہ میری نظر دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے؟ آپ کی طبیعت میں وہم بہت ہے اگر اس نے دیکھ بھی لیا ہے تو کیا ہے؟

نعیم - کیا ہے؟ میری طبیعت کو کدہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے میں بہت بڑا خود غرض ہوں سنا تم نے اٹھا اسے چہرے پر میری کجی ہوئی نظر کو اس بات کا احساس ہونا کہ وہاں کسی اور کی بھی ٹہری نظر ٹھنک رہی ہے مجھے زندہ در گور کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کسی کی نگاہ ہونا کہ کو کیا مجال کہ تیرے رخسار سے چھو بھی جائے۔ ضیا کو تجھے بار بار دیکھنے کا کیا حق تھا؟ ایک خاتون کو ٹھنکی باندھ کر کھڑا اور پھر اس کے شوہر کی موجودگی میں، بھری کلب کے اندر یہ کہاں کی تہذیب ہے؟ اس کی آنکھیں مجھے اس وقت سے لیکر اس وقت تک خطرناک معلوم ہو رہی ہیں۔ اس ہلکے حادثہ کی بنا پر رزقا و خوف کی آگ کے قتل سوز شعلے مجھے اندر ہی جلا رہے ہیں، تم کہتی ہو کہ اگر اس نے دیکھ لیا ہے تو کیا ہے؟

عذرا - وہ کیا تھیں نظریں، آؤ، جنہوں نے اتنا برا لکھتے کر دیا ہے۔ آپ کا دماغ بہت وہمی واقعہ ہوا ہے۔ بے بنیاد وہموں اور فکروں کو جو دیدہ نیابھی تو اچھا نہیں ہوا کرتا۔ کیا تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کی اس وسیع قلبی، وسیع قلبی ہی کہوں نا، اور خود غرضی نے اتنی شدید اور ہلکے صورت اختیار کر لی ہو کہ ضیا کی معمولی نگاہ کو بھی آپ نے کیا کیا لکھا؟ نعیم - آہ کاش! یہ حقیقت مٹا دو ہم! بے بنیاد وہم بھی بن جائے میں نے تو اسی دن سے اس کی حرکات و سکنات کو جانچنا، تو لانا شروع کر دیا تھا۔ عذرا، کیا کہوں، ہر چیز وہم سے روشن حقیقت اور ٹھیک سے تعین میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اگر علم النفس کا سالہا سال کا مطالعہ اور شاہد بھی چشمِ زدن میں غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ان محرکات الٹا راکتوں کا انبار، اگر نفس کے اسرار و رموز پر کچھ ہونے وہ ڈھیر جو میری نظر سے گزر چکے ہیں، ایک پل میں بے نتیجہ

لا حاصل اور بے معنی ہو کر رہا ہو سکتے ہیں تو میں مان لوں کہ میں نے اس ملعون کی مختصر اور معمولی نگاہ کو اپنی کوتاہی سے سبب اس سے بہت زیادہ سمجھا ہے۔ مگر عذرا اس نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں اس کی آنکھوں میں اس کا ناپاک دل اچھل رہا تھا اس کی آنکھیں بہت خطرناک ہیں، تجھے بچنا ہو گا عذرا، سنتی ہو۔

عذرا۔ (دنگ کر، آنکھیں پر نیم لپی ہیں) یا خدا میری جان کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ پیاسے میدان ہلکی باتوں کو خدا راجم کرو۔ آپ کن وہمی خیالات میں تنگ رہے ہیں۔ چوروان کو اے ہم کیا جی باتیں کر رہے تھے۔

نعیم۔ میں آج تک اس غبار اور وکتار رہا، مگر آج شدت جذبات سے رہا آپ ہی آپ کھل گئی، میں نہیں چاہتا کہ ضیاء میرے مکان پر گئے تمہارے دوستانہ مراسم تو کیا۔ میرے لئے تم دونوں کی صاحب سلامت بھی گرا خاطر ہے۔ اس کو تم خود کہہ دو کہ میرے مکان کی دہلیز سے نہ گزرے ورنہ خود میں اس کو وہ ڈانٹ دوں گا کہ یاد کر گیا۔ اور تم اس سے خورا اگلے پچھلے تمام تعلقات منقطع کر دو۔ بس،

عذرا۔ کیا یہ باتیں میں نعیم سے سن رہی ہوں جو۔
نعیم۔ ہاں نعیم سے جس کو عذرا کی مفتوحیت اور محبت نے ٹٹل بنا دیا ہے۔
عذرا۔ کچھ سوچئے بھی تو۔ دو دن کی گیانگت کو قطع کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے چہ جائیکہ برسوں کے دیرینہ مراسم کو چشم زدن میں منقطع کر دیا جائے۔
کالج کا ہم جماعت، ٹینس کا پارٹنر، پانارافق، اور پھر طرہ پر کہ بظاہر کوئی دجہ نظر نہیں آتی۔ ضیا تو بھی یہی اس معاملے میں مقصورہ اگر کوئی بیگانہ مجھے ناشائستہ بد اخلاق اور شکر کیا کیا کچھ نہ کہے گا۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ ضیا جو آج تک میرا احترام کرتا رہا ہے مجھے بالآخر بے الفاظ سے یاد کرے۔ ڈیر نعیم! میں آپ کا ہر جائز حکم ماننے کیلئے تیار ہوں۔ آپ تسلی رکھئے میں وہ طریقہ اختیار کروں گی جس سے سناپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ دراصل میرے کام لیجئے گا۔ میں اتنے آہستہ آپ کے حکم کی تعمیل بھی لالہ میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کروں گی۔ آدمیت کا اور تعلیم یافتہ ہونے کا تو یہی تقاضا ہے کہ میں آج کل برسوں ہوئے ہوئے اس سے تعلقات کا دامن سمیٹ چاہوں

اس طرح کہ اسے محسوس بھی نہ ہو اور اگر ہو بھی تو وہ اسے محض اپنے وہم ہی پر محمول کرے۔ زندگی میں کون کسی سے کوئی روز روز ملتا ہے۔ میرے اچھے نعیم جی! میرے اخلاق کی ہر کس دن اس کے سامنے تعریف کوئے دلا میرا پرانا مدح انجام کار میری طرف سے یوں خواہ مخواہ شکی ہو جائے۔ کیا فائدہ نعیم میرا بھرم بنا رہے نہ وہ بچپنے دوشنبہ کو وہ مجھ سے مس دارت کی شکایت کر رہا تھا کہ اس نے اس کے انگشتان سے پیچھے ہوئے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ دراصل ایک میں قربان ہر خط کا جواب دینا اتنی فرض سمجھتی رہی ہوں۔ میں جانتی تھی وہ حساس اور زود اثر آدمی ہے۔ میرا بھی بھلا خط لکھنے میں آخر کیا گستاخا آخر کوئی خوشی خوشی ملے تو اسے دکھانے میں دینا چاہئے۔

نعیم

تم خط کا جواب دیتی رہی یا نہ دیتی رہی ہو، پھلی باتوں کو جھوٹو بین اخلاق کا وہ مالک ہے۔ میں جان گیا ہوں، میں پاگل نہیں، نادان نہیں بے سمجھ نہیں۔ تم کو جو کہنا ہوں، ماننا پڑیگا معاملے کو طول نہ دو گرتھیں میرے دل دماغ کی پریشانی جو دیرانی کا خیال ہے تو یہ معاملہ آج ہی دوروں ٹوک ایک کر دو۔

عذرا۔ مگر۔۔۔!

نعیم۔ میں اگر مگر سننے کے لئے تیار نہیں میں اس روز نہیں لائیں ہی میں اس کا بہت لحاظ کر چکا ہوں، کوئی اور ہوتا تو میں آنکھیں میچ لیتا خدا کی قسم!

عذرا۔ مگر آپ اتنا تو خیال کریں کہ۔۔۔

نعیم۔ کر چکا، بہت کیچکا ہوں، عذرا میرا شر کھاؤ تمہیں میرا کہنا ماننا ہو گا کیا کج آئیگا وہ؟۔۔۔ بولو، بولتی نہیں؟

عذرا۔ (سندھیل چھوڑ کر) شاید۔!

نعیم۔ سن لیا جو میں نے کہا؟

عذرا۔ (آنکھیں پوچھتے ہوئے) آج؟؟؟ دو ایک کی جلت،

نعیم۔ پھر وہی بحث، میں کہتا ہوں آج، ہاں کہو یا نہ۔

عذرا۔ کل سہی!

نعیم۔ پھر میں نپٹ لوں گا اس سے آج،

عذرا۔ میرے اچھے، آپ کیوں تیرے ہو رہے ہیں؟

نعیم۔ (کڑی سے اٹھ کر ٹھٹھ کرے میں داخل ہو جاتا ہے) تیری ضد بہت تھجا

غذرا۔ میرے خدا میں کیا کروں، ان کو بے وجہ منہ ہو رہی ہے۔ غصیا، کو چہا
تک میں جانتی ہوں بہت نیک اور عمدہ آدمی ہے۔ میں آج مکمل اس
کی عزت کرتی آئی ہوں، ان خوشگوار حالات میں میں کیوں کر اس کو
اپنے مکان پر آنے سے یا کلب میں ملنے سے انکار کر دوں۔ وہ نووارد
ہمارے سوا اس کا یہاں کوئی واقعہ نہیں، کبھی کبھی آجاتا ہے، ہائے
قدرت کی ستم ظریفی، جس کے سائنڈ گزشتہ بیام میں ہماری کیا نگہ
نے وہی طالب علمی کی اسی دوستی کی بلندی اختیار کر لی ہے۔ اگر
مجھے بالآخر اسے حکم دیکر ہی گرانٹا تو ہم اتنی بلندی پر نہ پہنچ گئے
ہوتے، اسے چوٹ آجائے گی، ہائے مجھے برا لگتا۔

(نیم ہاتھ میں کوئی کتاب لے کر سے برآمدے میں آتا ہے۔ اپنی کرسی
گھسیٹ کر غذا سے کچھ دور پر بیٹھ کر کتاب پڑھنا شروع کرتا ہے۔ اس کی ٹھوکی
پشت غذا کی طرف ہے۔ غذا بھی اسے دیکھ کر تپائی پر سے اخبار اٹھا کر پڑھتی
ہے۔ کبھی کبھی نیم کو کن، اچھیلوس دیکھ لیتی ہے! مگر ایک آدھ منٹ کے بعد
اخبار کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتی ہے)

(پرہہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

منظر دوم

(دائیں طرف کوٹھی کا ایک ہشت پہلو کمرہ، جس میں دو دروازے ہیں
ایک کھنسلے اندر اور دوسرا دائیں طرف برآمدے میں اس دروازے کے مقابل،
اسی کمرے کی ایک کھڑکی جس کا رخ میدان میں ہے۔ کچھ فاصلے پر بائیں جانب باورچی
خانہ ہے۔ جس کی چوٹی سے دھواں نکل رہا ہے۔ میدان میں کچھ بھڑکی بھی ہوئی ہے
اور گلوں سے آراستہ ہے۔ پس نظر پھاڑ کی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ نیم ہاتھ میں
دو ایک پکیٹ لئے اور ایک نئی چھتری جس پر ابھی کاغذ کا غلاف لپٹا ہوا ہے
بائیں جانب سے آتا ہے۔ ہشت پہلو کمرے میں غذا پیا نو پر گاہری ہے۔ ع
دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تھیر تو ہو
وہ کھڑکی کے قریب آ کر رک جاتا ہے اور گانا سنتا ہے۔)

نیم۔ (سُکرا کر) کیا سرلی آواز ہے، شعلہ سا لپک اٹھتا ہے (اندھے
ہلکی ہلکی منگھ کی آواز آتی ہے اور پیا نو دم ہو جاتا ہے) خود ہی کیا نہیں رہی آ
داہ۔! (ایک گھٹے پیا نوں رُطہ زکھڑکی کے شیشوں میں سے، اندر جھانکتا ہے)

اور گھبرا کر اتر آتا ہے) غصیا۔ غصیا۔ (پکیٹ ہاتھ سے گر پڑتے ہیں۔ پیا نو
رک جاتا ہے۔ خود ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور چھتری کی ٹوک ایک گھٹے
پر رکھ کر جھک کر سوچتا ہے)۔ غصیا سے نہیں رہی ہے۔ غصیا۔ آہ یہی
تمام اندیشے مجھے برباد کئے جارہے تھے، خوف و اضطراب کی ضحیت رہیں جو
کئے دن میرے آشیاں مسرت پر منڈلایا کرتی تھیں مجھے اب کھا رہی ہیں
گھل رہی ہیں۔ آہ! میں کیا کروں۔ غصیا۔ غصیا کا گلا باز رہیں، بوجھ لیتا۔
اسے مار ڈالتا۔ میرے قریب ہی سے تو گزر کر گیا تھا۔ میں نے نہ جانا شیطان
اسی طرف آ رہا تھا۔ (بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے، وہ قفل ہے۔ دوسرا کھولتا
ہے، وہ بھی۔ لات مارتا ہے) غذا! غذا! دروازہ کھولو، سنتی نہیں، غذا
(پچھلے دروازوں میں سے دیکھنے کی پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا ہے پھر
دروازہ کھٹکھٹاتا ہے) میں کواز توڑ دوں گا، سنتی ہو، (برآمدے کی بیڑھیاں
از کر دی جاتی حالت میں ادھر ادھر تھیرتا تلاش کرتا ہے۔ اسنے میں دیکھتا ہے کہ
غلام چائے لئے جا رہی ہے اور برآمدے کے قریب پہنچ چکی ہے) جیلین ٹیڑ
جیلین (وہ ایسے چلی جاتی ہے جیسے سنا ہی نہیں۔ نیم اس کی طرف جھانکتا ہے
اسنے میں وہ اندر داخل ہو جاتی ہے اور دروازہ فوراً کھٹ سے بند ہو جاتا ہے
وہ لپکتا ہے اور دروازے کو مقفل پاتا ہے، لات مارتا ہے) اندر کیا ہو رہا ہے
کچ، جیلین، تو باہر آئے، تیری گردن، نارا دونوں (ایک طرف ہو کر ملے
پر ہاتھ مار کر آہستہ سے) اے خدا یہ کیا سازش ہے۔ وہ چلے پی رہے
ہیں کیا؟ خدا کے کانوں کو کیا ہو گیا کچ؟ کیا غصیا اسے دروازہ کھولنے نہیں
دیتا۔ (جوش میں آکر) او ذلیل، کینے غصیا، غصیت، اگر اپنی خیر چاہتا ہو
تو دروازہ کھول دے۔ کھول دے میں تجھے کہہ رہا ہوں۔ آخری بار، (دروازہ
کو پھر کھٹکھٹاتا ہے) غذا!۔ نیم بول رہا ہے سنتی نہیں، میں پولیس
کو بلواؤں گا۔ غصیا اندر ہے میں جانتا ہوں، تم کچ اپنی، میری عزت کا خیال
کرتی ہو تو دروازہ کھول دو۔ میں تجھے معاف کر دوں گا۔ ہاں دروازہ کھول دو
میں وعدہ کرتا ہوں، اگر میں کواز توڑ کر اندر آگھسا تو پھر تم دونوں کی خیر
سن لو، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں نادان نہیں ہوں میں معلوم کرو اب
پہچان گیا ہوں۔ (دروازے کو پھر کھٹکھٹاتا ہے۔ بائیں ہو کر تھیرتا تلاش کرتا ہے
اور دھیمی آواز میں کہتا ہے) آہ، غذا کو میں کچ تک فرشتہ خصلت سمجھتا
رہا۔ میری بھول تھی، اس کے محبت بھرے الفاظ کو معراج زیست سمجھ رہا

میری حماقت (سر پر ہاتھ مارتا ہے) آہ وہ عورت نکلی، صرف عورت، نکار،
فوری، دغا باز، اس کی نظر گھلے پر پڑتی ہے اسے اٹھا لیتا ہے اور دروازے
پر دے دیتا ہے گھلا گھٹنے ٹکڑے ہو جاتا ہے، یونی کے ساتھ آج نوکروں نے
بھی سازش پر کمر باندھ رکھی ہے۔ جمیلین، تجھے تو آج میں زندہ نہیں چھوڑتا۔
(برآمدہ سے آتا ہے) اور خدا بخش، خدا بخش! (راویچی جھلنے کی طرف جاتا
ہے۔ اس کا دروازہ بھی بند ہے) آج سب دروازے بند ہو رہے ہیں۔ آہ، سیر
خدا، آج میرے دل کا دروازہ بھی عذرا پر بند ہو جائیگا۔ وہ بھی کیا یاد
کریگی۔ (دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے) — خدا بخش!
خدا بخش۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) جی حضور — آپ ہیں حضور۔
نعم۔ اور حضور کے بچے، دروازہ کیوں بند ہے؟
خدا بخش۔ جی، جی، ہوا سرد چل رہی تھی،
نعم۔ جی ہاں، باہر تو تو نیا ہو رہا ہے۔ کتنا کتنا ہے؟ جمیلین کہاں ہے؟
خدا بخش۔ اندر بیٹھی ہے حضور،
نعم۔ اندر۔۔۔؟
خدا بخش۔ جی صاحب!
نعم۔ کہاں ہے وہ؟ باہر تو بلا اسے،
خدا بخش۔ جمیلین! باہر آؤ صاحب بلا رہے ہیں۔
(جمیلین آتی ہے، نعم کا ہاتھ جانتا ہے)
نعم۔ کہاں تھی اتنی دیر تو؟
جمیلین۔ یہیں بیٹھی تھی ہجور۔!
نعم۔ یہیں؟ جھوٹ کتنی ہے تو، چلے لیکر تو نہیں گئی؟
جمیلین۔ کہاں ہجور۔؟
نعم۔ کہاں کی پیچی۔ اندر کرے میں بیگم صاحب کے پاس۔
جمیلین۔ کب؟
نعم۔ ابھی پان سات منٹ ہوئے، بھلا تو جانتی ہے۔ جب میں تجھے آواز
دی تھیں اور تو سنی ان سنی ایک کر کے اندر گھس گئی۔
جمیلین۔ بھلا میں آپ کی آواز نہ سنوں۔ ہجور کبھی ہو سکتا ہے۔
نعم۔ (غصے سے تھلا کر) بہت اچھا یہ بات ہے۔ کیوں اور خدا بخش ایہ
چلے لیکر نہیں گئی؟

خدا بخش۔ نہیں غریب نواز!
نعم۔ ابے او بندے کھوسٹ، تو بھی جھوٹ بکتا ہے۔ یہ ڈارمی دیکھ،
مجھے جھٹلا رہا ہے نکھر ام، کیا میں اندھا ہوں؟ میں نے خود سے
جانتے دیکھا ہے (جمیلین سے) کیا نادان بنی کھڑی ہے۔ بول سچ ورنہ
از آتا ہوں (ایک دھڑکتا ہے) بول نہیں تو یہ ایک اور آید
اور دھڑکتا ہے) تیری کھال ادھر پڑو گھا۔
جمیلین۔ جی۔ بو۔ لٹی ہوں — (خدا بخش کا پتا ہے)
نعم۔ بول پھر۔؟
جمیلین۔ گئی تھی۔
نعم۔ دیکھا۔ واپس کہاں آئی تھی؟
جمیلین۔ پھلی کھڑکی سے۔
نعم۔ اب ٹھیک بک رہی ہے۔ تو سیدھی میرے پاس کیوں نہیں آئی؟
اتم سب لچرچو، پاچی کہیں کے، (خدا بخش سے) چلے لیکر چلے
اور تجھے علم نہ ہو، خانہ ماں بنا پھر رہا ہے۔ حرامی، جھوٹا، اور تو
اور، میکے ساتھ جھوٹ؟ بد کہتے؟ بد کہتے؟ بد کہتے؟ بد کہتے؟
بی کے بچے، بولنا کیوں نہیں؟ دوں تجھے بھی ایک چپٹ، چلے
یہ پگڑی فیتے دار، نواب زادے، کتنا کیوں نہیں، میرے ساتھ جھوٹ
کیوں بولا تو نے۔ جانتا نہیں میں کون ہوں؟
خدا بخش۔ (ہاتھ جوڑتا ہے) حضور بیگم صاحبہ لے۔!
نعم۔ بیگم صاحبہ نے کیا۔؟
خدا بخش۔ شکر دیا تھا اور یہ۔ (مددری میں ہاتھ ڈالتا ہے)
نعم۔ رک کیوں گیا۔ کتنا کیوں نہیں۔ یہ کیا؟ کیا ہے جیب میں؟
خدا بخش۔ (دس روپے کا نوٹ نکالتا ہے) جمیلین کو دیا تھا کہ آدھ آدھ،
نعم۔ اول، بیگم نے دیا تھا جمیلین کو؟ کیوں جمیلین؟
جمیلین۔ نہیں جی بیگم صاحبہ نے نہیں، جی صاحبہ نے۔ میں تو لٹی نہیں
تھی۔ انھوں نے جبر دتی کہا کہ جاؤ لے جاؤ، تمہارا اور کھاتا مال
حصہ ہے، چلے کا انعام ہے اور۔
نعم۔ (غصے سے کانپ رہا ہے، چہرہ سرخ ہو رہا ہے) اور۔
جمیلین۔ (ہاتھ باندھ کر) کہا کہ صاحب لاکھ پوچھیں تم چلے لیکر گئی تھی

(پردہ گرتا ہے)

کیفیت کیا

سحبان الہند حضرت علامہ مفتی چسپریاکوٹی

جہاں سے ہونگا ہیں پڑ رہی ہیں روئے جاناں پر
پڑا وہ ہاتھ وحشت میں مرسچاک گریباں پر
جنوں نے یاد دین بھیلے ہیرا بصر اکے اماں پر
قفس سے حق پہونچتا ہے مرفصل بہاراں پر
میں سمجھا کہ دل لائے ہیں میرا نوک پکیاں پر
بہارا آئی ہے ابھی ٹوٹ کر میرے گریباں پر
گواہی خود مری ہو وہ بھی ایک کفر عصیاں پر
بناتا نظر حلین کا پردہ روئے جاناں پر
مری آنکھوں کا پردہ ڈال لو تم روئے تاباں پر
کہ مجھ کو ناز اس کے سامنے ہے اپنے عصیاں پر
یہ جی میں ہے کہ خود زخموں کو رکھ دوں بیکداں پر
کبھی ان پر نظر ہے اور کبھی ہے دل کو اداں پر
ہے کچھ آگے آنکھوں میں جسے کچھ آگے مڑگاں پر
گھٹا چھائی تھی مینا نے پہ، برسی ہے بیاباں پر
رہا جب تک یہ سر ٹپکا کیا، دیوار زنداں پر

اُدھر ہر درخشاں پر، اُدھر رنگ گلستاں پر
نہیں آیا جو دست شوق میں دامن نازان کا
کہیں ہیں جیب کے ٹکڑے، کہیں ٹکڑے گریباں کے
بہ قد جوش حسرت میں قدم لیتا ہوں آنکھوں سے
کچھ اس انداز سے دیتے ہیں گل وہ اپنے ہاتھوں سے
مراد مست جنوں وہ رنگ لایا ہے کہ میں سمجھا،
بھری مغل ہو محشر کی الہی حشر کیا ہوگا
ہجوم شوق نظارہ نے کیا پس لونا کا لاہر
مجال دید بھی ٹھہرے تو کوئی اور کیوں دیکھے
اسے حسن طلب کی شوخیاں کہتے ہیں رحمت سے
مرے دل کی تسلی چٹکیوں سے نہیں سکتی
وہ آئے ہیں مگر اس شکل سے باور نہیں آتا
جگر کے چند ٹکڑے تھے ہوئے برباد رسوائی
بھارت تھا تھادل، آنکھوں سے اشکِ غم نکل آئے
الہی داد کیسے کو ملے جوشِ اسیری کی

عراقی ستارہ پر

مصر کے مشہور عربی رسالہ الهلال سے خاص عالمگیر کیلئے

ترجمہ کیا گیا

از جناب مولوی عبدالوالی صاحب قریشی آروی

پرستش کے خیال کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی اس حد تک نشوونما ہوتی ہے کہ انسان ہر اس شے کے سامنے سرخم کر دیتا ہے جس سے وہ خائف ہو اور جس کی حقیقت سے جاہل ہو اور جو اس کی نگاہ میں عجیب و غریب معلوم ہو حتیٰ کہ جتنے انسان ہوئے اتنے خیالات پیدا ہو گئے اور یہ خیالات اس حد تک ترقی ہو گئے کہ فطرت کی تمام قوتوں کو ایک قوت کے ماننے پر تیار ہو گئے۔ تیز ہوا روشن آفتاب، بھڑکتی ہوئی آگ، موجود سمجھی جاتی تھی، لوگ ان کی پرستش کرتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تمام قوتیں کو اکب سیارات کے ماتحت مانی جانے لگیں اور ایک زمانہ کے بعد کو اکب سیارات کی قوتوں کا انکار ہونے لگا۔ خدائے واحد کے سوا تمام قوتیں ختم ہو گئیں اب اختلاف محض خدائے واحد کی صفات اس کے شریک و ہمسر بننے اور نہ ہونے کا اختلاف نہ رہا۔

صائبہ کی قسم!

صائبہ کا ذکر قرآن میں بھی ہے لیکن ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے اور ہمارے لئے ان کے عقائد کا با تفصیل بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کتب الملل و الملل کے مصنف نے صائبہ کی ایک قسم بیان کی ہے جس کا نام صائبہ حرائیہ رکھا ہے بعضوں نے یہ کہا ہے کہ یہی قدیم صائبہ میں سے ہیں لیکن بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ وہ قدیم صائبہ میں سے ہیں درست نہیں کیونکہ علامہ ابن ندیم نے اپنی فہرست (مطبوعہ یورپ) کے صفحہ ۳۲۰ میں یہ لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کا اس کی ادا عمر میں بلاد روم سے غزوہ کے ارادے میں دیا ر مصر پر گزر ہوا

قبل ازیں کہ تمدن جدید اطراف عراق پر چھا جائے، عراق سینکڑوں مذاہب اور لاکھوں جذبات کا گوارہ تھا، لیکن ان مختلف مذاہب اور متفرق جذبات کو تمدن جدید کا تباہ کن سیلاب خس و خاشاک کی طرح بہلنے لگا حتیٰ کہ مجموعی حیثیت سے ان کی تاریخ پر بھی مطلع ہونا دشوار ہو گیا۔

ایک عجیب و غریب فرقہ کے حالات آج میں بیان کرنا چاہتا ہوں جو ہر حیثیت سے دوسرے انسانوں سے مختلف ہے۔ یہ اپنے رسوم و معاشرت اور خیالات و عادات میں دوسرے انسانوں سے جدا گانہ حیثیت رکھتا ہے اس فرقہ کو صائبہ کہتے ہیں۔ اگر اس فرقہ کی جداگانہ حیثیت کا یہی حال رہا تو اپنے رسم و رواج پر اسی طرح جمار ہا تو یقیناً صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیگا۔ عراق ہی آخری ملک ہے جس کی آغوش میں یہ فرقہ پرورش پا رہا ہے اور قدیم مذاہب کی تاریخ کا آخری صفحہ اسی پر ختم ہو گا۔

عام اصول

ابتداءً آفرینش سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ عالم کی عجائبات و فطرت کی رنگینیاں انسان کو اپنی تعلیم پر اور بڑا سمجھ پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً طوفان، ہوا جب چلتی ہے انسان فطرت کی اس عظیم الشان قوت کو دیکھ کر تعجب و مگرردا ہو جاتا ہے اور خوف سے اس کے جسم میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ فطرت کی ان نیرنگیوں کو خاص قوت عطا کی گئی ہے اپنے کو ان کے مقابل میں کمزور سمجھتا ہے اور ان کو بڑا اور پاک سمجھ جانے کے لائق خیال کرتا ہے یہیں

یہ عراق کے ان قصبوں اور دیہاتوں میں آباد ہیں جو کسی بہتے دریا کے کنارے واقع ہیں مثلاً قمارہ - قلعہ صالح - قرنہ - کرتمہ - عزیزیہ - سوق الشیوخ - تھارہ - بقرہ اور بعض صابئیوں نے بغداد - مصر - قاہرہ - ایران کو بھی اپنا وطن بنا لیا ہے۔ وہ ان شہروں اور قصبوں کو جو نہر جاری کے کنارے پر آباد ہیں اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ان کی عمارتیں امدان کے رسم و رواج کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ بہتے پانی میں غسل نہ کریں اور رسوم کو وہاں ادا نہ کریں۔ اب میں ان کے عقاید و رسوم کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو کسی قدر دلچسپ اور عجیب و غریب ہیں۔

صابئہ کے عقاید

صابئہ کا اعتقاد ہے کہ خدا کی اہلیں مخلوق روحانی تھیں جب تک نام ان کی اصطلاح میں حییٰ قدما یا یعنی حی قدیم ہے اللہ نے اس کو پیدا کیا اس کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے عوالم کو اور عوالم کے ساتھ ساتھ غیر متناہی نفوس مقدسہ کو پیدا کیا۔ اس کے بعد دوسری مخلوق پیدا کی جس کا نام ہی تینا ہی ہے اس کے ساتھ بہت سے دوسرے نفوس پیدا کئے اس کے بعد تیسری مخلوق پیدا کی جس کا نام حیی تلیثانی رہتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی ان چیزوں کو پیدا کیا جو پہلے دونوں کے ساتھ پیدا کی تھی۔ نفوس دوسم کے ہوتے ہیں ایک انزی (عوالم) دوسرے ملی (بادشاہ) اس کے بعد سات عوالم پیدا کئے جن کو آرمی دھشو یا یعنی عوالم مظلمہ کہتے ہیں جو آفتاب کی روشنی سے نور ہوتے ہیں ان میں بسنے والے انزی بھی ہیں اور ملی بھی اور ان ہی سات میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

آسمان وزمین کے متعلق ان کی عجیب و غریب تحقیق یہ ہے کہ وہ مربع یعنی چوکور ہے زمین کے نیچے پانی ہے جس پر زمین پھیلی ہوئی ہے آسمان سات طبقوں کا مجموعہ ہے آفتاب چوتھے پر ہے اور ستارے ساتویں پر۔

آسمان وزمین بلکہ ساری کائنات آگ و ہوا سے مرکب ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا جب زمین کے بننے سے فارغ ہوا تو اس نے زمین پر عالم انوار جس کا نام آبی دھنور ہے اس سے ایک فرشتہ درختوں کے گانے کے لئے

لے عراق کی مشہور نرزاب اکبر اور زاب اصغر مراد ہے تلہ یہ شہر جنوبی عراق میں واقع ہے تلہ یہ نہر جنوبی بصرہ میں ہے (مترجم)

اہل مصر نے خلیفہ مامون کا شاندار استقبال کیا۔ ان میں ایک جماعت حرائیوں کی بھی تھی۔ اس زمانہ میں ان کی ہیئت یہ تھی کہ وہ عبا پہنا کرتے تھے ڈاڑھی بڑھائے رہتے تھے۔ ان کی یہ ہیئت مامون کو پسند نہ آئی اس نے ان سے پوچھا کہ تم مسلم ہو یا یہود و نصاریٰ، انھوں نے جواب یہ دیا کہ ہم کسی سے تعلق نہیں۔ مامون نے دوبارہ یہ پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی آسمانی کتاب ہے؟ انھوں نے کہا۔ نہیں،

مامون نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ میرے والد بزرگوار کے زمانہ کے سرکش لوگ ہیں قتل کی خواہش ظاہر کی حرائیوں نے یہ کہا کہ ہم جزیہ ادا کرتے ہیں۔ خلیفہ مامون نے کہا تم ملحد ہو جزیہ تو ان کا قبول کیا جاتا ہے جو اسلام کے خلاف ہیں اور اہل کتاب میں سے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ لیکن غزوہ روم سے واپس آنے تک تمہیں جنت دیتا ہوں۔ علامہ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ حرائی اپنی زندگی سے یاکوس ہو کر مشرف باسلام ہونے لگے ڈاڑھیاں کٹوا دیں اور نہایت مضطرب و پھین نظر آنے لگے حرائی مرزا رو میں سے ایک کے پاس آئے اور کہا کہ میری نجات کی کوئی راہ بتلایے اور سردار کے سامنے بہت ساری انٹرفیاں بطور نذرانہ پیش کیں سردار نے کہا کہ خلیفہ جب آئے تو اس سے یہ کہنا کہ میں صابئہ میں سے ہوں، میرا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

صابئہ کا ایک فرقہ اور بھی ہے جو ان دنوں عراق میں آباد ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ قدیم صابئہ میں سے ہے۔ ان کے بارے میں سیو ہنری پونیون لکھتا ہے کہ یہ مندا بیہ ہے جو اس زمانہ میں صابئہ کے نام سے مشہور ہے اس فرقہ کا بانی دوسو سال کے عرصہ میں گرفتار تھا۔ وہ ان شہروں سے جو زابین کے درمیان واقع ہیں مقام میٹان میں آگیا۔ یہ جیسی تھا اس کا نام دیدا اور اس کی ماں کا نام ام کشطا تھا۔ اس کے بعد وہ نہر قاردن کے کنارے پر آباد ہو گیا اور یہیں اس نے اپنے نئے دین کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کا اکثر حصہ مارقونین مانوئین اور کنتین اور قدیم فرقہ صابئہ سے ماخوذ ہے۔ زمانہ کے ساتھ یہ بنیادین بھی ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ دیدا کے متبعین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور نہر قاردن کے علاوہ عراق کے دوسرے دیہاتوں اور شہروں میں بھی یہ دین پھیل گیا۔

اس زمانہ میں صابئیوں کی تعداد پانچ چھ ہزار کے قریب ہے اور

بھیجا۔ اور ایک دروازہ ہوا اور پانی کے لئے کھول دیا اور دوسرا دروازہ روشنی کے لئے۔ اسی سے آفتاب روشنی حاصل کرتا ہے تاکہ دوسرے ستاروں کو بالواسطہ روشنی پہنچے۔

انسان کی ابتدا کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ اولیں انسان کورہ قدیا (یعنی اہم علیہ السلام) تھا کہتے ہیں کہ خدا نے ایتنا میل (جبریل) کو زمین کی طرف بھیجا کہ آدم کو اس کی شکل پر بنائے۔ ایتنا میل نے خدا کی صورت پر کورہ قدیا کو مٹی سے بنایا اور اس کی بائیں پسلی سے حوا کو پیدا کیا پھر کورہ قدیا اوہ حوا کے جسم میں روح قدس کو اتارا اور فرشتوں نے کورہ قدیا کو ان تمام چیزوں کے نام بتائے جو زمین پر ہیں۔ اس کے بعد حکم ربانی تمام فرشتوں نے کورہ قدیا کو سجدہ کیا مگر ہادیشہ نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس نے خدا سے یہ کہا کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور کورہ قدیا کو مٹی سے، میں کیونکر اسے سجدہ کر سکتا ہوں؟ اس نافرمانی کی سزا میں خدا نے حادیشہ کو جنت سے نکال دیا۔

لہ شیطان کو کہتے ہیں۔

عالم کی تاریخ کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا ۵۸۷۳۹۵ سال سے آباد ہے اور اس عروج کو ثابت کرنے کے لئے پھر پھر دلائل اور بے سربا قصص و حکایات بیان کرتے ہیں جن کو ایک معمولی عقل والا انسان بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوگا خیر و شر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ خیر و شر کتم عدم سے عالم وجود میں انسان کی وجہ سے آئے ہیں اور انسان کے افعال سے ظاہر ہوتے ہیں انسان اپنے خیالات میں بالکل آزاد ہے اسی وجہ سے قیامت کے روز خدا کے دربر سوال و جواب ہوگا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے خیر و شر کے راستوں کو انسان پر واضح کر دیا ہے۔ اسے آزادی ہے جسے چاہے اختیار کرے۔

موت کے بارے میں صاحب کا اعتقاد یہ ہے کہ موت انتقال روح کا نام ہے۔ فاعرج کا نام نہیں۔ روح جسم سے نکلنے کے بعد فنا نہیں ہوتی بلکہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف چلی جاتی ہے حتیٰ کہ عالم انوار میں پہنچ جاتی ہے اور ان کے خیال میں اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ وہ جسم ظاہر سے نہ نکلے۔ اسی وجہ سے عالم نزع میں میت کو غسل دینا اور کفننا ان کے نزدیک واجب ہے تاکہ روح جسم سے ظاہر نہ نکلے۔ جب میت جس مہلے

آپسج کیلئے جارہے ہیں

تو امرتھارا کو ساتھ لے کر بھولے یہ بچے دوست کی طرح ہر وقت آپس کے جسم کی، دولت کی حفاظت کریں گی اور آپ کو تکلیف اور مصیبتوں سے بچا دیں گی۔ جناب مولانا اختر علی خان صاحب سرزندان جرنل حضرت مولانا ظفر علی خان صاحب مالک اخبار زمیں دار اپنا تجربہ زمیندار میں یوں تحریر فرماتے ہیں!

جہاز میں امرتھارا "دوسرے صبح کے وقت شیخ عبداللہ سلیمان ملاقات ہوئی ان کی طبیعت کسی قدر خراب تھی میں گریز تھی میں نے کہا کہ میرے پاس ایک عجیب و غریب چیز ہے چنانچہ اسی وقت اپنے آدمی کے ہاتھ امرتھارا کی ایک شیشی منگو کر ان کی خدمت میں پیش کی شیخ صاحب نے قہقہہ میں مل کر اسے پیا اور ایک گھنٹہ بعد طبیعت بالکل بحال ہو گئی کہنے لگے یہ بڑے مزے کی چیز ہے میں نے کہا اس دل کے ایجا دکرنے والے لاہور کے شہر طبیب پندت تھا کہ امرتھارا ہندوستان کے چھپ چھپ شہر ہے ہر ایک شخص اپنے گھر میں اسی ایک شیشی ضرور رکھے خاص کر جب سم بدلے۔ دوا بعد مفید ثابت ہوئی میں ہمیشہ اپنے پاس ایک شیشی ضرور رکھتا ہوں شیخ صاحب نے مجھے پندت ہی کا پتہ لیکر رکھ لیا

امرتھارا گھر میں یا باہر سب جگہ ہر ایک انسان کو کیاں مفید ہے ہمیشہ اس کو پاس رکھو اور وقت بے وقت کی تکلیف تشویش اور خرچ سے بچو لاکھوں آدمی آزمائے چکے ہیں۔ امرتھارا آزمائش سے گزرنے والی ہے سب کی ہی بات ہے کہ ہمیشہ پاس رکھو قیامت فی شیشی سالم علی نفعت شیشی ہم نونہ کی شیشی ۸ احتیاطاً۔۔۔ نقلوں سے بچو کیونکہ سخت دیرینہ امرتھارا میں ہو کہ دیکر دکھو تشویش کو بڑھانے کی صحت کے معاملہ میں کبھی نقلوں پر اعتبار نہ کرو

خط و کتابت اور تیار کے لئے پتہ: ملشتہ کبڈا دھارا شدہ دھارا لہو امرتھارا بھو امرتھارا دھارا لہو۔ امرتھارا دھارا لہو۔

تو اس کا چھوٹا حرام ہے جو شخص ناگمانی موت کے پنجہ میں گرفتار ہو کر مر گیا وہ کافر مر۔ میت پر اس کے وارثوں کا نوہ کرنا درست نہیں اس لئے کہ رونے والے کے آسنو کا ہر قطرہ بحرِ پیدائش میں داخل ہو جاتا ہے اور روح کو اپنی دہنورد (عالمِ انوار) کی طرف جانے سے روک دیتا ہے۔ موت کے بعد میت سے دنیاوی عمل کے بارے میں دو فرشتے سوال کرتے ہیں اگر عمل حسنہ ہو تا ہے تو روح عالمِ انوار کی نظر میں بھیجا جاتا ہے اور اگر عملِ سیئہ ہو تا ہے تو روح پر عذاب ہوتا رہتا ہے سنی کہ حق پاب ہو جاتی ہے۔

صابنہ کے دینی احکام

صابنہ کی نماز وہ پہلی نماز ہے جس سے انسان کا مشاہدہ اس نماز میں قیام و رکوع نہ ہونے میں تین پر پابانہ کئے جیتے ہیں۔ دن میں تین مرتبہ ادا کرتے ہیں طلوع شمس کے وقت، غروب شمس کے وقت۔ زوال شمس کے وقت دیر تک ذکر خیر میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کی ابتدا طہارت، وضو، اذان سے کرتے ہیں۔ طہارت سے مراد غسلِ جنابت ہے۔ وضو سے مراد چہرہ کا دھونا ہاتھوں کا دھونا۔ شہ گاہ کا دھونا کان اور ناک کا مسح کرنا اور اذان سے مراد آہستہ آہستہ پست مقام پر کھڑے ہو کر ذکرِ طہیر کرنا۔ عراقی صابنہ کے نزدیک روزہ جائز نہیں حالانکہ حرائیوں اور ان بابوں کے نزدیک جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ کھانا مسہ سہن ہے۔ عراقیوں کے نزدیک روزہ رکھنا گویا ان چیزوں کو حرام کرنا ہے جن کو خدا نے حلال کیا ہے۔ باوجود اس عقیدہ کہ عراقی ۳۶ دن گوشت نہیں کھاتے ہیں جیسا کہ نصاریٰ کرتے ہیں اور کبھی کبھی بڑی دسی مسلمانوں کو دکھلانے کیلئے روزہ بھی رکھ لیتے ہیں۔

صابنہ کے یہاں ایک سے چار تک شادی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ مساوات قائم رہ سکے اور طلاق بھی دی جا سکتی ہے بشرطیکہ زندگیاں حیض کے بعد غسل کرنا چوری کرنا، نماز نہ پڑھنا ثابت ہو جائے۔ مسلمان قاضی کے دیباہ میں یا اسلامی حکومت کے محکمہ میں طلاق دی جاتی ہے تاکہ صابنہ کا کاهن مطلقہ عورت کو جب وہ توہ کو لے اور صفائی مانگ لے تو پہلے شوہر کے نکاح میں لاسکے۔

ان کے یہاں نکاح کا طریقہ یہ ہے۔ جب ایک شخص کا نکاح ہوتا ہے تو عورتیں دھن کے گھر جاتی ہیں جن سے کاهن یہ معلوم کرتا ہے کہ دھن دو شیر ہے۔ کہ لے کہ اس عورت کا نکاح پڑانا جو شیرہ نہ ہو ان کے کاهنوں کو بخش کر دیتا ہے

نکاح کی رسم سردی کا موسم ہو یا گرمی کا بستے پانی میں ادا ہوتی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ کاهن اپنے دوستوں کے ساتھ دھن کے مکان پر آتا ہے اور دھن کو اپنے ساتھ دیکھ کے کنارے پرے جاتا ہے اور وہاں اس کو پانی میں غوطہ دیتا ہے اور ایک خاص قسم کی دعا پڑھتا ہے جب دعا پڑھ لیتا ہے تو اس کو پانی سے نکالتا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک شعل دیتا ہے جس سے لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھن ہے اور گھر کی طرف لجاتا ہے گھر پہنچ کر ایک خاص قسم کی دعا پڑھتا ہے پھر اس کو ساتھ لیکر دیکھ کی طرف آتا ہے سابق کی طرح پھر غوطہ دیتا ہے اور دعا پڑھتا ہے اس کے بعد گھر لاکر نو عودی کے حجرہ میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ شوہر کے انتظار میں نو عودی کے تحت پر بیٹھے۔ کاهن دو دھن کے ساتھ بھی دی رسم ادا کرتا ہے جو دھن کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور دو دھن کو دھن کے دیکل کے ساتھ لیکر دھن کے قبرہ میں آتا ہے اعزہ و اقربا جمع ہوتے ہیں کاهن نکاح کا خطبہ پڑھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد ہمانوں کے سامنے باریک آئے کی روٹی رکھی جاتی ہے اگر حاضرین اس کو نہ کھائیں تو فقرا کو دے دی جاتی ہے۔ یا پانی میں ڈال دی جاتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد دی کاهن میں نے نکاح کی رسم ادا کی تھی اپنا مخصوص لباس زیب تن کر کے آتا ہے اور دھن کو دو دھن کے پاس لے جاتا ہے۔ دھن کی پشت دو دھن کی پشت سے ملا دیتا ہے اس کے بعد دھن کو حکم دیتا ہے کہ وہ دو دھن کے سامنے آکر اس کے سر پر تین دفعہ دھوئے بنائے۔ ہر دائرہ کے بعد کاهن ایک ایک خاص قسم کی دعا پڑھتا ہے۔ پھر دو کو زبے جو اس رسم کی اختتام کے لئے تیار کئے جاتے ہیں کاهن انھیں توڑ کر اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ دین ہر نکاح کے بعد مقرر ہوتا ہے جس کو عورت ایک مرتبہ میں لے سکتی ہے۔

بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی عورت سے جو چاہے.... کر لے نہ وہ خود غل مجاہدگی اور نہ اس سے خلاصی کی کوئی تدبیر کرگی اور نہ اس کا مقابلہ کرگی اگر وہ کچھ کرتی ہے تو بس اتنا کہ زمین یا تخت یا کرسی جو بھی قریب ہے اس پر ہاتھ رکھ کر یہ کہتی ہے۔ اے خدا تو دیکھ رہا ہے۔ جس سے اس کی ناراضگی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن آج تک اس کا راز معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے

صابنہ کے کاهن

صابنہ کو کوئی مجازات نہیں ہے کہ بغیر دینی سرداروں کے مشورہ کے

کے لئے اجابت نہیں کہ وہ اس سے اعلیٰ درجہ کی طرف جانے کی کوشش کرے اور دوسرے دینی امور کی مشق کرے اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے پیر وہ کام کئے جائیں گے جو ایسا کرنے والے کی سزا ہے۔ حلالی اگر ترمیدہ کے درجہ کو حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف درجہ کے دینی سرداروں کے سامنے ماہ جاری میں غسل کرے اور ان کے ساتھ سات دن تک رہے اور سات دن پلنگ ذرا چھینچیں جو دوسرے اس بات سے کہ نہیں شیطان ایک پر حملہ کرے۔

گنزدہ (خازن یا کتاب گنزدہ) کا کام اس کا یہ ہے کہ وہ اس ترمیدہ سے جو درجہ علی کے حصول کا خواہاں ہو وہ وعدہ کرے کہ وہ ماہ جاری کے قریب کے گنوئیں پر لکڑی کے تخت پر کھڑا ہوگا اور ماہ جاری میں دینی سرداروں کے دربار میں غسل کرے گا۔ اس درجہ کے سردار آج تک کل سات ہوئے ہیں ریش امہ (ریش الامہ) آج تک اس درجہ میں صابیوں میں کوئی نہیں پایا گیا۔

رہائی اول سے آخر تک کوئی اس درجہ کو پہنچنے والا نہیں ہے۔

کاہنوں کا کھانا

کاہن کیلئے اپنے گھر کے سوا دوسرے گھر کا کھانا حرام ہے اس عورت کے ہاتھ کا پکایا ہوا بھی حرام ہے جس نے غسل نہ کیا ہو مصل بیوی کے ہاتھ کا کھانا جائز ہے جس پر اس کو اعتماد ہو کہ وہ کھانا پکانے کے عمل سے واقف ہے اور براہ غسل کرتی ہے اگر اس کی بیوی نہ ہو تو اسے خود کھانا پکانا چاہئے۔ کاہنوں کے لئے جو جانور ذبح کر کے کیا جاتا ہے اس کے ذبح کا طریقہ عام لاگوں کیلئے جانور ذبح کرنے کے طریقہ سے مختلف ہوتا ہے۔

صابنہ کا غسل

صابنہ کے نزدیک کھانا کھانا حرام ہے جب تک وہ غسل نہ کرے۔ بچہ جب تک غسل نہ کرایا جائے پاک نہیں ہوگا۔ خدا سے اپنے گناہوں کو بغیر غسل کے کوئی معاف نہیں کر سکتا غسل کو ہر طریقے سے

وہ کسی کام کو کرے۔ نکاح۔ جنازہ۔ ذبح کرنا۔ نام رکھنا۔ وغیرہ یہ سب امور دینی سرداروں کے ہاتھ انجام پاتی ہیں۔ دینی سردار یا اعتبار درجہ کے ذبح قسم کے ہوتے ہیں ہر وہ شخص جس پر کسی ایک یا تمام امور ہوں وہ شریک ہو سکتا ہے۔ وہ قسم بہ ہیں۔ مثلاً ترمیدہ۔ گنزدہ۔ ریش امہ۔ اترانی،

غزلی جو اس صابنہ میں اسوہ ہوں۔ وہ عظیم المہم جو پیدا شدہ کوئی عیب نہ ہو مصل اس سے تین شپ اپر باپ دادا ان صفات کے ساتھ موصوف ہوں ان کی مال سے جس وقت کہ اس کے باپ نے شادی کی ہو وہ بیہ نہ ہو۔ اسی طرح سے سات پشت تک اس کی مائیں ان صفات کے ساتھ موصوف ہوں۔ دینی ائمہ انی کتابوں کو اتنا پڑھے جس سے وہ اس نعمت کی رسم کو جو اس فرقہ کے لئے مخصوص ہے جان لے اور اس کا کام یہ ہے کہ جانور ذبح کے ذبح کرنے کے واسطے ادا کرے۔

ترمیدہ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ترمیدہ کا کلچر پڑھے اور اس



Ezacta

RELIABLE, DURABLE

&

ATTRACTIVE

اپنے مقامی ڈیلروں سے طلب فرمائیں !!

صابئی کی مقدس کتابیں

۱۵ مطبوعہ نسخہ جرمن میں ملتا ہے۔

منہ کا پتہ
 منجھڑ صاحب المصنفین عظمیٰ (پوئی)
 منجھڑ صاحب دارالافتاء

ابر کا ٹکڑا اور ستارہ

جناب سید محمد فاروق صاحب فاروقی - بانسپاری

کسی تلے نے اس بستی کے شیدائی سے یوں پوچھا
شعلے مہر تے بھگوئی دسینا دکھائی ہے
کسی انسان کا دل تو نے چھپا رکھا ہے سینے میں
زمین پر وہ کسے بھی حاصل جسے گردوں نشینی ہے
سنا ما جا ذرا دیناے آب و گل کا افسانہ
وہاں بھی کیا ہی آئین بزم زندگانی ہے
جبین مہر سے واں بھی ہی چشمہ ابلتا ہے
وہاں بھی داخل فرض بقا کیا ہے زبانی ہے؟

فلک پر شب کو محو گشت تھا اک ابر کا ٹکڑا
زمین سے جانب گردوں تجھے تقدیر لائی ہے
نہیں بے وجہ بیتابی کی صورتیرے نگینے میں
وہ انسان جس کے شیشے میں شراب تختہ بینی ہے
بیاں کر اس سراپا راز کی محفل کا افسانہ
یہاں تو جذب باہم زلیست کا راز نہانی ہے
حیات و موت کا ساغر بیاں تو روز چلتا ہے
خموشی جس کو کہتے ہیں یہاں کی زندگانی ہے

بنائے ٹوٹ جانے کے لئے پیما انسان
وہاں کی خاک میں خوابیدہ ہیں شمس و قمر لاکھوں
گر انداز واں کے مرنے جینے کا نرالا ہے
بدل جاتی ہے واں ہر شے اہل سے آشنا ہو کر
بنائے اختلاف آرایوں پر بزم انسان کی
وہاں کی زندگی ہنگامہ شور و فغاں تک ہے
سراپا ہوش ہو کر ہوش سے رہتا ہے بیگانہ
ستم ہے یہ کہ سینے میں دل آگاہ رکھتا ہے
ضنائے باغ حنیت سونکا لایوں گیا ہوں میں
ہوس نے طبع انسان کو کیا ہے اپنا گرویدہ

نہ پوچھ اے غنچہ بلوغ فلک افسانہ انسان
ٹٹے ہیں محفل عالم میں ہو کر جلوہ گر لاکھوں
فنا کا ہر طرف بزم جہاں میں لعل بالا ہے
حیات تو تجھے حاصل نہیں ہوتی فنا ہو کر
بہار جذب باہم روح ہے تیرے گلستان کی
قیام ہستی انجم خموشی زبان تک ہے
سناؤں کیا تجھے اس خاک کے پتلے کا افسانہ
فریب نفس کھا کر آپ کو گمراہ رکھتا ہے
سمجھتا ہے کہ نارغم میں ڈالا کیوں گیا ہوں میں
گر یہ آگاہی ہے پردہ غفلت میں پوشیدہ

اگر اپنی حقیقت سے بشر آگاہ ہو جائے
یہ ظلمت خانہ ہستی تحت لی گاہ ہو جائے

پریدی پیا!

از جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب سیالکوٹی

”الوداع میری جان!“

”خدا حافظ میری پیاری!“

فلورنس زنگ آلود پھاٹک پر جمی ہوئی، اپنے خاوند کو شہر کی طرف
جلنے والی مشرک پر تیز رفتاری سے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد
موز پر وہ نظروں سے چھپ گیا مگر فلورنس اسی طرح کھڑی رہی۔ ہولکے، ایک
شریر جھونکے نے اس کی بل کھائی ہوئی زلفوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا۔ مگر
اس کی بخود ہی کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔

فلورنس زیادہ خوبصورت نہیں تھی، بچپن میں اس کا حسن پانچ نظر
تھا۔ زمانہ تعلیم میں اس کے ساتھی اس سے محبت کرتے تھے۔ مگر اب اس کی عمر
تیس برس سے زیادہ تھی اور طفلانہ خوبصورتی کے نقوش دم دم ہو کر غائب ہو چکے
تھے تعلیم سے فانی ہونے کے بعد اسے ایک دفتر میں باپسٹ کی اسامی مل گئی،
اور وہ اپنی ذمہ داریوں میں اس قدر کھو گئی کہ بیاہ کرنے کی بھی فراموش نہ ملی۔

ان ایام میں وہ ایک بارہ محبت سے آشنا ضرور ہوئی۔ دفتر میں
اس کے قریب ایک کلرک بیٹھا کرتا تھا جس کا نام مارٹن تھا۔ وہ بارہا دیدہ
نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا کرتی تھی مگر مارٹن کا ایک چھوٹا بھائی تھا اور وہ
اپنی فالتو آمدنی اس کی تعلیم میں صرف کر رہا تھا۔ اس لئے اس میں فریگیوں کا گنگا
عشق خریدنے کی ہمت نہ تھی۔

اچانک قسمت نے کرڈٹ پارلی اور فلورنس کی خوشنحی کا سارہ
انکار کر کے تاریک بادلوں کو حیرتا ہوا افق امید پر ظاہر ہوا۔ اس کا ایک چچا
مر گیا اور اس کے لئے اتنی حامد اچھوڑ گیا کہ وہ فانی مالیاتی سے زندگی بسر کرتی
تھی۔ فلورنس مالی مشکلات سے پھٹکارا حاصل کر چکی تھی، اور مارٹن اپنی زندگی
اس سے وابستہ کر کے جین د آرام سے زندگی بسر کر سکتا تھا مگر توقع کے خلاف

وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ اب فلورنس سرمایہ دار تھی، مغزور تھی اور مارٹن کو
دکھانا چاہتی تھی کہ اس کے جانے والے سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔

اتفاق نے اسے ہنری کے راستے میں لاکھڑا کیا۔ وہ ایک بچہ میں اس
کا عاشق ہو گیا اور ایک ہینس کے اندر اندر وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے۔

اس واقعہ نے مارٹن کے دل میں محبت کی جیپی ہوئی چنگاریوں کو ہوا
دی۔ یہی وہ فلورنس کے پاس مجسم حال بن کر آیا اور محبت کی بھیک مانگی مگر فلورنس
نے اس کی چاہت کو تعارت سے ٹھکرا دیا۔

”ہنری بالکل اپنی ہے نہیں، اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“

”تم نے ایک ہفتہ میں یہ رائے کیسے قائم کر لی؟“

”محبت فلسفہ نہیں ہے کہ اس پر برسوں محنت کی جائے؟ فلورنس
ناز سے کہا اور مارٹن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”میں تم سے ہمیشہ محبت کر رہا ہوں۔ مارٹن نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”میرا بھی یہ خیال تھا۔ فلورنس نے جواب دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ
میں آج تک محبت سے بالکل نا آشنا تھی۔“

مارٹن ناکام لوٹا مگر اس کے دل میں محبت کا آتش نشانی پہاڑ پھٹ
چکا تھا اور اس کیلئے خیال محبوب سے دامن چھڑانا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ فلورنس

اور ہنری نکاح کے مقدس رشتے سے باندھ دیئے گئے تھے۔ مارٹن مغربی عاشق تھا
اگر اس کی رگوں میں مشرقی خون نہ تھا تو اپنے رقیب کے پیٹ میں آگ بھڑکتا مگر

اس کے ارد گرد بیسیوں ناکام محبت انسان گھوم رہے تھے اس لئے مبرک کے ٹھیکر ہا
شادی کی دوسری رات فلورنس نے خواب دیکھا۔ اس کا شوہر دم توڑ

رہا تھا۔ مارٹن اس پر جھکا ہوا تھا اور اسی کے طاقتور ہاتھوں نے ہنری کو آغوش مرگ

میں سلا یا تھا۔ فلورنس ماتم کرنے کی بجائے اپنے شوہر کی موت پر تسکین گزارتی اور مارٹن نے اسے آغوش میں دبا رکھا تھا۔

یہ خواب جس سے زیادہ بھیانک تھا۔ مگر پندرہ دن میں زمین بارہی خواہ دکھائی دیا جس سے وہ ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ اس تحت بھی وہ اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنے شوہر سے ذکر نہیں کیا تھا مگر وہ اصل وہ اسے مارٹن کی زندگی سے محفوظ رہنے کے لئے ایک غیبی تنبیہ خیال کرتی تھی ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے بخود ہی سے چوکا دیا اور وہ دہرے ملاقات کے کمرے میں گئی۔

”کون صاحب ہیں؟“

”فلورنس، میں ہوں مارٹن؟“

”آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟“

”میں نے ایک ہفتہ کی بھست ملی ہے اور یہاں ایک ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اگر کوئی امر ملح نہ ہو تو آج رات شرف ملاقات حاصل کر دوں!“

”نہیں“ فلورنس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آپ کی تشریف آوری کی ضرورت نہیں کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر صبرت دیا جیسی کے لہجے میں مارٹن کی آواز ملنے دی۔ بہتر نہیں آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔“

فلورنس کو ٹیلیفون میں اس کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”آج رات ہمارے یہاں ایک دوستانہ آئے ہوئے ہیں۔“ فلورنس نے متاثر ہو کر کہا۔ ”آپ کل رات تشریف لاسکتے ہیں۔“

”شکریہ“ مارٹن نے جواب دیا مگر اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ میں کل صبح یہاں سے چلا جاؤں۔ خدا حافظ۔“

فلورنس نے ریسپور کو شکا دیا اور اطمینان کا سانس لیا۔

”وہ یہاں نہیں آسکتا، وہ یہاں نہیں آسکتا۔ اس نے کئی بار کہا۔ میں خوش ہوں کہ وہ مجھ سے ملاقات نہیں کر سکا۔“

خیالات کی کشمکش سے گھر اگر وہ ٹہلنے کیلئے باغ میں چلی گئی۔ بہار کا موسم تھا۔ دوسرے درے پر جوانی کا عالم تھا۔ گلاب کے تختے میں ٹہل گئی تھی اور اس کے نغمے محبت کے آئینہ دار تھے۔ یہ بلبل اور مکان جس کا درہ درہ جنت نگاہ تھا

ہنری نے شادی سے چند روز پہلے اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا تھا۔ فلورنس نے جب اسے دیکھا تو اس کی خوب چوہل پر دیوانی سی ہو گئی۔ یہ جگہ بالکل ناگ تھلگ اور آبادی سے دو میل کے فاصلہ پر تھی، مگر اس کے کشادہ کمرے خوب صورت عمارت

دلکش باغ، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون کا تعلق ان سب چیزوں نے مل ملا کر اسے بہت دلچسپ بنادیا تھا۔ اس کے مالک کو روپے کی ضرورت تھی اس لئے وہ مکان کو کرایہ پر دینے کے بجائے بیچنے پر آمادہ تھا۔ اگرچہ ہنری بہت امیر تھا مگر نقدی کی ضرورت میں اس کے پاس صرف ہزار پونڈ تھے اور مکان کا مالک تین ہزار طلب کرتا تھا۔ فلورنس نے اپنا نصف سرمایہ دیکر وہ مکان خرید لیا۔ نوکر چاک اس ویرانے میں گھبراتے تھے اس لئے فلورنس نے مکان کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کا انتظام خود سنبھال لیا مگر باغیچہ کو درست رکھنے کیلئے ہفتہ میں دو بار گاؤں سے ایک بوڑھا مالی آیا کرتا تھا۔

بانچہ میں جاتے ہی فلورنس مالی سے دو چار ہوتی جو بھولوں کے ایک تختے کو سیراب کرنے میں مصروف تھا۔ وہ شرائط کے مطابق شکل اور ہفتہ کو آیا کرتا تھا اور اس روز خلاف معمول معجزات کا دن تھا۔

”جارج، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ فلورنس نے اس کے قریب جا کر کہا۔

”بوڑھا جھک کر آداب بجا لایا۔“

”ہفتہ کو میرے یہاں ایک تقریب ہے، اس لئے میں آج حاضر ہو گیا ہوں۔“ یہ ہے کہ آپ اور سرنہری میری مجبوری کو نظر رکھتے ہوئے معاف فرمائیے۔“

”معمولی بات ہے!“ فلورنس نے سسکا کر کہا۔

”میں نے سنا ہے کہ کل آپ لندن تشریف لے جا رہی ہیں۔“

”میں تو کہیں نہیں جا رہی!“

”میں نے سرنہری سے سنا تھا کہ کل صبح آپ دونوں لندن جا رہے ہیں اور صبح تک وہیں رہیں گے۔“

”غلط ہے“ اس نے سسکا کر کہا۔ ”تم نے غلط سمجھا ہو گا!“

اگرچہ وہ باغبان سے مصروف گفتگو تھی مگر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ہنری نے ایسا کیوں کہا تھا۔ لندن جا رہے ہیں، درحقیقت وہ لندن سے کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔

”میں شہری زندگی اور خاص طور پر لندن سے نفرت کرتی ہوں۔ اس نے ہر ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ جارج نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے یہاں رہنے سے مجھے خوشی ہے۔“

”اس مکان کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ فلورنس گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

”آج نو بجے رات آپ کا کیا پروگرام ہے؟“ فلورنس نے مسکرا کر اپنے اپنے خاوند سے پوچھا۔

ہنری کے چہرے پر سیاہی دوڑ گئی اور گھبرا کر بولا: ”کیا مطلب؟“
فلورنس نے ڈائری کا ورق اس کے سامنے رکھ دیا۔

ہنری نے شکل اپنے حواس پر قابو حاصل کیا اور مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے بولا: ”آج رات ایک سینہ سے ملاقات کا وعدہ ہے اس کے بال بھورے اور آنکھیں نیلی ہیں جو ہر ہفتہ تھری شکل کی ہوتی ہیں۔“

”یہ نہیں سمجھی“ فلورنس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں، میں نے یہ الفاظ یادداشت کے طور پر کہے تھے۔ آج رات میں چند فوٹو دھونا چاہتا ہوں اور اس کام میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“
”اور نو بجے رات کے سوا اور کوئی وقت موزوں نہیں ہے۔“

ہنری گھبرا گیا۔

”میری پیاری! اس نے صادق لہجے میں کہا۔ ہر ایک کام کے لئے وقت مقرر ہونا چاہئے اس سے زندگی باقاعدہ ہوتی ہے۔“
اس نے بعد ہنری نے آرام کرسی پر لیٹ کر سگار پینا شروع کر دیا اور فلورنس اپنے خیالات میں کھو گئی۔

”میں تھکنے متعلق کچھ نہیں جانتی۔“ فلورنس نے جذبات کی کشمکش سے تنگ آکر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”ہنری چونک اٹھا۔ یہ سوال بالکل نیا اور انوکھا تھا۔“

”پیاری! میں نے اپنی زندگی کے تمام اوراق تمہارے سامنے اٹھائے ہیں۔ میں شکاٹا کر میں پیدا ہوا۔ آسٹریلیا میں شباب کی بہار دیکھی۔ پچھلے دس سال جنوبی افریقہ میں مقیم رہا اور وہیں یہ تمام دولت پیدا کی۔“

”کیا اس سے پہلے آپ کو کسی سے محبت پیدا ہوئی؟“

”ہرگز نہیں، میری پہلی اور آخری محبت تھیں ہو۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”مگر آج مات تم ہی دو، اذکار باتیں کیوں پوچھ رہی ہو!“

فلورنس کمرے میں ادھر ادھر ٹپکنے لگی۔

”آج صبح سے میری طبیعت بیکار ہے۔“

”کیوں؟“ ہنری نے پوچھا۔

”آج ہر ایک چیز مجھے پریشان بنا رہی ہے۔“ جارج مجھے ایک عجیب

”یہ مکان لندن کے ایک رئیس نے بنوایا تھا اور باغیچہ کو درست کرنے کے لئے اس نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ اس نے مکان کی تعمیر پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ میں نے اسے بازار کھنے کی کوشش کی اور کہا کہ تم اس روپے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکو گے مگر اس نے جواب دیا کہ میں اس کے پورے دو ہزار پونڈ وصول کر دوں گا۔“

”اس نے بیس ہزار پونڈ لئے ہیں“ فلورنس نے سر اڑا کر کہا۔

”دو ہزار“ جارج نے دہرایا۔ ”قیمت میرے سننے سے بڑھ چکی تھی۔“

”تھیں ہر محلے میں غلط فہمی پھیلی تھی۔ یہ مکان تین ہزار پونڈ میں بک جائے جھک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔“

”اس کی قیمت دو ہزار پونڈ بڑھ چکی تھی۔“ اس نے زربل بڑبڑا کر کہا۔

~~~~~۲~~~~~

فلورنس نے اس سے مزید گفتگو نہ کیا اور آگے بڑھ کر پچھلے لوگ کا دستہ تیار کرنے لگی۔ جب وہ بیگین اور کتے ہوئے بچوں سے دان بھر کر واپس جا رہی تھی تو اسے ایک پودے کے سبز پتوں میں ایک چھوٹا سا کاغذ دکھائی دیا۔ چونکہ وہ اس کے خاوند کی ڈائری سے بھاڑا گیا تھا اس لئے اس نے جھک کر اس پرچہ کاغذ کو اٹھا لیا۔

ہنری باقاعدہ زندگی بسر کرنے والا انسان تھا اور ہر روز طے شدہ پروگرام کے مطابق کام کرتا تھا۔ اس ورق پر اس کی جمہوریت کی تاریخ درج تھی اور چونکہ وہ اسی دن سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے فلورنس نے شوق سے اپنے شوہر کا پروگرام پڑھنے کے لئے ورق کھولا مگر وہاں ”نو بجے رات“ کے سوا کوئی لفظ درج نہ تھا۔ فلورنس اس عمر کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ وہ بار بار سوچتی تھی کہ ”نو بجے رات“ لکھنے سے ہنری کا مطلب کیا تھا مگر غور و فکر سے کسی نتیجہ پر پہنچنا دشوار تھا۔ آخر کار اسے ارٹن کے یہ الفاظ یاد آئے۔ ”یہ آدمی بالکل اجنبی ہے۔“ تھیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔“

انجام کار اس نے خیالات کو دل سے نکال دینے کا عزم ارادہ کر لیا اور باورچی خانے میں جا کر کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ شام کے قریب ہنری گاؤں سے واپس آیا اور دونوں میاں بیوی نے مل کر کھانا کھا یا اور بعد میں وہ ملاقات کے کمرے میں جا بیٹھے۔ وہاں گری کا اثر غالب تھا کھربیاں کھلی ہوئی تھیں اور خوشبو سے بھری ہوئی ہوائی جھونکے دل میں خوشی پیدا کر رہے تھے۔

ابھن میں ڈال گیا ہے۔ اس نے تمہاری زبانی سنا تھا کہ کل صبح ہم دونوں لندن جا رہے ہیں۔

”نامقول“ ہنری نے دانت پیستے ہوئے کہ۔

فلورنس جیت سے اپنے خاوند کی طرف دیکھ ہی تھی اس کی آنکھوں غصے کی چنگاریاں کل ہی تھیں اور پیش سے بوٹی بوٹی پھرک رہی تھی۔

”تھیں کیا ہو گیا؟“ فلورنس نے گہرا کر کہا۔

”وہ بڑا بد معاش ہے۔ ہنری نے غصے سے بھرتے ہوئے کہا۔

”کیون اسے یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟“

”میں نے اس سے ہرگز ذکر نہیں کیا۔ ہاں یاد آگیا۔ ایک روز میں

اس سے مذاق کیا تھا کہ ہم تھیں لندن نہ جائیگے۔“

وہ گھبراہٹ میں اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر فلورنس نے مکان کی قیمت کا ذکر کیا۔ ہنری کچھ یوں سوچنا رہا پھر

کہنے لگا۔ ”وہ دو ہزار پونڈ نقد وصول کر چکا ہے اور جب ہم مزید ایک ہزار پونڈ دا

کرئیگے تو اس وقت ہیں مالکانہ حقوق حاصل ہونگے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ فلورنس نے جواب دیا اور کلاک کو دیکھ کر کہنے لگی۔  
”لو بجھیں صرف پانچ منٹ باقی ہیں چلو تو لو دھولیں۔“  
”دیکھا جا بیگا۔“ ہنری نے بے نیالی سے جواب دیا۔

۳

صبح کو جب فلورنس بیدار ہوئی تو غم و اٹھار کے بادل غائب تھے اور  
حسب معمول کامیاب زندگی کی ستریں اس کے سامنے سکرا رہی تھیں۔ دن بھر  
مارٹن نے کوئی پیغام نہ بھیجا اور نہ کوئی احوال مہمولہ وغیرہ پیش آیا۔ مگر شام  
کے قریب وہ دوبارہ پریشان ہو گئی۔ یہ آدمی بالکل نیا ہے اور میں اس کے  
متعلق کچھ نہیں جانتی۔

”خیالات دوبارہ اس پریشانی کی چونک تارکیوں میں گھسٹ کر  
سے گئے اور وہ اپنے دل کو تسلی دینے لگی۔ ”کام کو تسلی میں اور ہر گھومنے لگی  
”کل مات دو نو بجے کس عورت سے ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ تو تو دھونا محض ایک  
بھانا تھا؟۔ وہ ہارج پراتنا ناراض کیوں تھا؟۔“

اگلے روز ہنری کچھ ضروری اشیاء خریدنے کے لئے بازار گیا فلورنس

جس طرح جھوٹی چیزوں کو شہرت دینا ایک گناہ عظیم ہے اسی طرح مفید عام اور بہترین اشیاء کو چھپانے کا بھی ایک بڑا گناہ ہے۔

## ہنٹ براؤن اوکان کی تمام بیماریوں کی شرطیہ علاج

بروئے زمین پر کان کی تمام بیماریوں کی ایک منظمیروا بلب اینڈ سنر میڈیسنٹ) پہلی بھیت کا ایجاد کردہ روغن کرامات حشر ہے

ملاحظہ ہو دنیا کیا کہتی ہے (جناب ڈاکٹر فیض الدین خاں) سالہا سالہ ہسپتال دہلی (برصا) اقام فرمے ہیں کہ یہ آوری نو شکر مرصہ کولاج سے کامیابی ہو رہی (دوا میں صلد اور حرمت نہ رہیں۔)

جناب ڈاکٹر پوت صاحب نے بھی (جناب) اقام فرمے ہیں کہ (دوسرے ملکی فائدہ ہوا کہ شیشی اور جیویر) جناب سرمدان مسما سبک پور میں (دوا) اقام فرمے ہیں روغن کرامات سے مواد

کا جانا بالکل بند ہو چکا ہے (کیشی اور جیویر) جناب سرمدان مسما سبک پور میں (دوا) اقام فرمے ہیں روغن کرامات سے مواد

اقام فرمے ہیں دو سال پیش آپ روغن کرامات سٹوایا تھا اس نے مجھے بہت ہی فائدہ پہنچایا (دوشی اور ارسال کریں۔ بلب اینڈ سنر میڈیسنٹ) پہلی بھیت کا ایجاد کردہ

روغن کرامات ہنٹ براؤن۔ کہنے شکر سے طرح طرح کی آدازیں ہوتے۔ دو۔ زخم۔ مرنشیا کچھ چیزیں۔ کوری بچوں یا بزرگوں کے ہاں سے اپنی سوا یا کہ خون نہ جہتے۔ پھنسی

نا سورا کی کہنے پڑ جانے اور کان کی تمام بیماریوں کی ایک سی منظمیروا دوا اور مالک طلبہ کہیں کی کوئی دیگر نظیر آج آپ نے سہی برین سے قیمت فی شیشی عروپہ چار گنے تین شیشی ایک ہی پارل سے

طلبہ نے پراس ملکیں بھول کر بیکنگ صرف مشا طلبہ نے وقت مرض کا پورا حال اور اپنا پورا پتہ مع تمام صاف لکھنے۔ صرف بتلے۔ کان کے اندر سے ہر قسم کی لنگی وغیرہ کو بلا ہجاگ

لئے یا کہ بلا امداد پانی و پھر کسی خود سانی صاف نہ لاتی ہے شیشی آدہ مراد شاہی مجھن ہے دانت جو دیتا ہے دانت کی ہر ایک بیماری اور گندہ بینی پر خاص صحت چیز ہے فی ہیکٹ ہر

ہمارا پتہ یہ ہے ہنٹ براؤن کی دوا۔ بلب اینڈ سنر (میدلسٹ) پہلی بھیت (یو۔ پی)۔ انڈیا





"ہیلو!" اس نے کہا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

فلورنس نے مشکل سے اپنے حواس کو درست کیا۔ مگر بار بار وہ مضطرب ہو کر ادھر ادھر دیکھتی تھی۔ اور بالکل خاموش تھی۔ گھر آکر مہزی نے اس کے

ایک کار



فلورنس نے سکر اکر کلاک کی طرف دیکھا آٹھ بجو پچیس منٹ تھے مرن  
یقیناً وہ بجے سے پہلے یہاں موجود ہوگا۔

”کچ قہوہ کچھ بد مزہ تھا ہنری نے ماتھا سیکڑے ہوئے کہا۔

”ایک دوکاندار نے نوڈ کے طور پر بیجا تھا۔ آئندہ ہم اسے استعمال  
نہیں کریں گے۔“

فلورنس ان دنوں ایک دھال کاڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنا سامان  
نکالا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ ہنری ایک کتاب پڑھ رہا تھا اچانک اس نے  
کلاک کی طرف دیکھا اور کتاب ایک طرف پھینک دی۔

”ساڑھے آٹھ ہو چکے ہیں صواب چل کر نوڈ دھولیں۔“

سوئی فلورنس کے ہاتھ سے گر پڑی۔

”اس وقت نہیں۔۔۔ مجھے کام ہے۔“

”نہیں میری جان ساڑھے آٹھ ہو چکے ہیں۔ میں نے ہی وقت مقرر کیا تھا  
”درا ٹھہرو!“

”تجس یاد ہوگا کہ میں ہمیشہ سے وقت کا پابند ہوں اب میں اینٹ

کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔“

فلورنس سر سے پاؤں تک لرز اٹھی۔ ہنری کا ہولناک ارادہ بے نقاب  
ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں اشتیاق سے چمک رہی تھیں اور وہ بار بار اپنی  
مٹھیوں کو بند کر کے اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیرتا تھا۔ اس کی حرکات  
میں دیوانہ کی اور اشتیاق کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ ہنری جذبات کے زیر  
اثر آٹھ ٹھہرا ہوا اور فلورنس کو کندھوں پر پکڑ کر خوب جھنجھوڑا۔

”چلو ورنہ میں تجس ماتھا کر لیجاؤں گا۔“

فلورنس نے بڑی شکل سے اپنے آپ کو اس کی مضبوط گرفت سے  
چھڑایا اور سماگ کر کونے میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گردہ مجبوراً  
بے اختیار تھی ہنری دانت پیتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

”فلورنس آؤ، آؤ۔“

”نہیں، نہیں!“

اس کے ہونٹوں سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

”ہنری، ٹھہرو! میں تم سے کھ کنا چاہتی ہوں!“ مجھے اعتراف ہوا



تمہارے بچے کو بھی ضرورت ہے!  
”ڈوگرے بال امرت“ کی!  
ڈوگرے بال امرت کیا ہے؟

(۱) نیچوں کے واسطے نہایت مفید خوراک ہے (۲) یہ کمزور و نحیف بچوں کو تندرست کرتی ہے  
(۳) یہ کھانسی اور عمومی بخاروں کو دور کرتی ہے (۴) نیچوں کے دانتوں کو مضبوط رکھتی ہے۔

لاہور پرنٹ

بھگت رام پوری اینڈ سنز۔ سوتھ سنڈی۔ لاہور

فلورنس نے اطمینان کا سانس لیا۔  
 "اس زہر سے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے مگر ڈاکٹر ہی سمجھتے ہیں کہ موت  
 دل کی حرکت بند ہو جانے سے واقع ہوتی ہے۔ میں نے اس زہر کی کچھ مقدار چرائی  
 اور اپنے پاس رکھی۔" وہ پھر رک گئی۔  
 "کئے کہنے!"

"آج نہیں پھر سہی!"

"نہیں نہیں! میں کچ ہی سسنا چاہتا ہوں۔"

"ہماری شادی کو ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ میں اپنے نوڑے شوہر کی تدفین  
 میں کوئی کمی روا نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر ایک سے میری تعریف کرتا تھا اور ہمسایوں میں  
 میری خدمت گزاری اور اطاعت کے چرچے تھے۔ میں ہر روز شام کو اپنے شوہر کیلئے  
 قہوہ تیار کرتی تھی، ایک روز میں نے موقع پا کر تھوڑا سا زہر اس کے پیالے میں ڈال دیا۔"  
 فلورنس خاموش ہو گئی اور بڑی اضمیاط سے سوتی میں دھاگہ ڈالنے لگی۔  
 اپنی زندگی میں کبھی ایکٹ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر اس وقت وہ دنیا کی بہترین  
 ایکٹرس کو شرمندہ کر رہی تھی اور ایک غمخوار قاتل کا پارٹ کمال خوش آہوئی  
 سے ادا کر رہی تھی۔

"میں بالکل مطمئن تھی اور اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑی  
 سی بھرااری ظاہر کی اور کہنے لگا کہ میرا دم ٹھنک رہا ہے۔ میں نے کھڑکی کھول دی مگر  
 وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا اور تھوڑی دیر کے بعد مر گیا۔ فلورنس مسکرا رہی تھی۔ نو۔  
 بجے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ مارٹن ابھی آتا ہوگا۔"  
 "بیمہ کار روپیہ کتنا تھا؟" ہنری نے پوچھا۔

"دو ہزار پونڈ! مگر میں نے اسے جلدی برباد کر دیا اور اپنی اسامی پر  
 واپس چلی گئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ وہ  
 مجھے دو فیروزہ خیال کرتا تھا اسے مجھ سے محبت ہو گئی اور ہم دونوں ویلز میں جا کر  
 میاں بوی بن گئے۔ میرا شوہر حسین اور امیر تھا اس نے میرے حق میں زندگی  
 کا بیمہ نہیں کرایا مگر وصیت میرے حق میں مرتب کی۔ میں حسب معمول ہر روز اس  
 کے لئے قہوہ تیار کرتی تھی۔ فلورنس ناز واداسے مسکرائی۔ "آپ جانتے ہیں کہ  
 میں قہوہ بہت عمدہ تیار کرتی ہوں؟"

ہنری نے تیز تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 "اچانک ایک دن میرے غاوند کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ میں

وہ رک گیا۔!۔  
 "اعتراف؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔  
 "ہاں اعتراف گناہ! فلورنس نے اپنے شوہر کی توبہ کو جذبہ کیجے ہوئے کہا۔  
 ہنری کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔  
 "کوئی پرانا عشق؟"

"نہیں، فلورنس نے کہا۔ "نہیں ایک جرم!۔۔۔ جس کی میں  
 شرمکب ہوئی تھی۔"

فلورنس نے ہنری کی دھمکی بھٹی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خود جرائم پیشہ  
 تھا اور اس لفظ سے اسے بہت ڈبسی تھی۔  
 فلورنس دوبارہ صورت حالات برقرار کرنا چاہتی تھی۔  
 "بیٹھ جاؤ" ہنری نے کہا۔

فلورنس آہستہ آہستہ اپنی کرسی کی طرف بڑھی اس کا دلچ ایک ایسا  
 افسانہ تیار کرنے میں مصروف تھا جو کم از کم میں منٹ تک اس کے غاوند کو متوجہ  
 رکھے۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا کہ میں پندرہ سال تک  
 ایک دفتر میں ٹائپسٹ رہی مگر حقیقت سے بعید تھا۔ دوبار میں نے ملازمت  
 ترک کی جب میں بائیس برس کی تھی تو ایک دولت مند بوڑھا مجھ پر عاشق ہو گیا اور  
 ہم دونوں میاں بوی بن گئے۔" وہ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ "میں نے اسے مجبور  
 کیا کہ میرے حق میں زندگی کا بیمہ کر لے۔"

ہنری اس کے قصہ کو غیر معمولی دلچسپی سے سن رہا تھا اس کے ہونٹ لٹکے  
 ہوئے اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"جنگ عظیم کے دنوں میں میں ایک ہسپتال میں کام کرتی رہی تھی۔ وہاں  
 میں نے ہر قسم کے زہروں سے واقفیت حاصل کی۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی۔ ہنری پوری پوری دلچسپی لے رہا تھا۔  
 ناامیدی کے اندھیرے میں امید کی کرن جھلک رہی تھی۔

"وہاں ایک زہر تھا۔ سفید رنخوف۔ اس کا ایک ذرہ مرگ  
 ناگہاں کل پیام تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں زہروں سے واقفیت ہوگی؟"

یہ سوال اس نے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔ اگر ہنری زہر کے قسام سے  
 واقف ہوا تو اسے کمائی وضع کرنے میں محتاط رہنا پڑے گا۔  
 "میں زہروں سے بالکل نا آشنا ہوں۔"

زار زار روتی اور اپنے سر کے بال نوچتی تھی۔ ڈاکٹر کو مجھ پر شبہ نہیں تھا مگر وہ میرے شوہر کی ناگمانی موت پر بہت حیران تھا۔ ہم یوں نے مجھے تسلی و تشفی دی اور میں اپنے دفتر میں واپس جا گئی۔ دوسرے خاندان کی موت پر مجھے چاہئے ہزار پونڈ ملے اور میں نے انھیں چیک میں جمع کروا دیا۔ تب —  
ہنری بقیہ ہوا کر اٹھ ہزار ۱۰۱۔ اس کے چپے کے کارنگ اڑا ہوا تھا۔ سانس رک رک کر آتا تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلی سے فلورنس کی طرف اشارہ کیا۔

”تھو، او میرے خدا تھو!“

فلورنس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہی وجہ ہے کہ وہ ذرا کڑوا تھا۔ شیطان بمسم تو اپنی عادت سے باز نہیں آئی۔“

وہ اپنی کرسی کے بازو کو زور سے پکڑے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوراً اسے دبوچ لیگا۔

”تم نے مجھے زہر دیدیا ہے“

فلورنس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس الزام کی پر زور تردید کر رہا تھی مگر معاف سے ایک نئی بات سوچتی۔ ہنری اسے دبوچ لینے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس نے اپنے حواس جمع کئے اور پوری بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”ہاں میں نے تمہیں زہر دیدیا ہے۔ زہرا بھی سے اپنا اثر دکھا رہا ہے اب تم کرسی سے حرکت نہیں کر سکتے — حرکت نہیں کر سکتے۔“

وہ اپنی پوری قوت ارادی سے اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک جانب زندہ رہنے کی خوشگوار امید تھی اور دوسری جانب ہر موت اپنے سرد پنجوں سے اس کا گلہ دبوچ رہی تھی۔ اگرچہ منٹ تک وہ اپنی کرسی سے حرکت نہ کر سکے تو کامیابی یقینی ہے۔ ورنہ —

یہ کیا ہے شکر پر قدموں کی چاب سناٹی دے رہی ہے صدر دروازے کی چوٹیں چیخ رہی ہیں۔ پگڈنڈی پر چھنے کی آہٹ ہے دروازہ کھولا جا رہا ہے!

”تم حرکت نہیں کر سکتے اس نے چیخ کر کہا۔“

فلورنس اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑ کر مارٹن کے آغوش

میں بیٹھ کر گر پڑی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

مارٹن کے ہمراہ پولیس کا ایک باوردی سپاہی تھا۔

”اندر جا کر دیکھو!“

مارٹن نے فلورنس کو احتیاط سے کوچ پر لٹا دیا۔ ”میری بات“

اس نے جھٹ کر کہا۔ ”میں حاضر ہوں۔“

فلورنس نے آنکھیں کھولیں اور کمزور لیجے میں اس کا نام لیا۔

”اندر ایک آدمی کرسی پر لیٹا ہے۔“ پولیس مین نے کہا۔ مگر

صوف حرکت سے عاری ہے۔“

”وہ مر چکا ہے۔“

فلورنس کی آنکھیں بند تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ

میندر میں بڑبڑا رہی ہے۔

تمنا زمین۔ بیل۔ سیالکوٹ

## بال سنہری کرلو

جن بورمیں کے بال سنہری نہیں ہوتے وہ فیشن سے کرتے ہیں۔ فیشن ایک عرق ہے جو تیل کی طرح بالوں میں لگایا جاتا ہے جس سے بال نہایت خوبصورت سنہری رنگ کے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گارنی کھجاتی ہے سفید یا سیاہ

بال جن کو فیشن سے سنہری کیا گیا ہو ہمیشہ سنہری رہتے ہیں اور مرد و عورت کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتے ہیں قیمت فی شیٹ پیپم صرف ایک ہزار فیشن کی فروخت تک محصولہ اک و پیننگ معاف ہوگا لہذا جلد طلب فرمائیں۔

دی بڈ ہاؤس لین چھ قرون باغ دہلی

# کیفستان!

جناب پر فیسیر گھوٹی سہائے صبا فراق لیم لے

چکنا در ہے یا آتشیں بادہ ہر ساغر میں  
بہر کیف عدم عالم کے رنگارنگ منظر میں  
ہوا میں ہے نہ پانی میں نہ آتش میں پتھر میں  
یہ کس نے بجلیاں کھدی تھیں ہر برگ گل تر میں  
پکار آئے اسے ہم آج جا کر کوئے دلبر میں  
وہ نہ عم رہنمائی دیکھتے جاتے ہیں رہبر میں  
نہی اک جاتی ہوئی دنیا یہاں اک ایک منظر میں  
میں کس کے ساتھ جانا ہوں جہنم ناز دلبر میں  
یہی اک راز پنہاں تھا طلوع صبح محشر میں  
یہ حسرت آج کیسی ہر نگاہ ناز دلبر میں  
بہت کچھ ہے ابھی تو تیرہ نختوں کے تقدیر میں  
گداز دل ہو تو دکھتی رگیں ملتی ہیں پتھر میں  
نہ نختہ خضر میں ہے نہ تقدیر سکندر میں  
شہید ناز آخر سو گئے آغوش خنجر میں  
فنا کے راز پنہاں ہیں خرام ناز دلبر میں  
فراق ایسی کہاں ہر شام غم سب کے تقدیر میں

نہ جانے کیا ہے ساقی زور پستوں کے مقدر میں  
محبت نے فسانہ کبر کے چھوڑا رہتی دنیہ کو  
یہ لرزش یہ گداز دل، یہ گرمی، یہ گراںباری  
نشیں جل ہے ہیں ہر حمن شعلہ بد اماں ہے  
دل گم گشتہ کیا آیا صدائے باز گشت آئی  
کچھ اس سے رہروان عشق کو دبستگی سی ہے  
نہ کھولی آنکھ تم نے بادہ ہستی کے متوالو!  
پیام ناگماں ہر موت کا یاد دل ہے پہلو میں  
تجھے دیکھیں مرا چاک گریباں دیکھنے والے  
دل غمیں ذرا آواز دنیا عمر رستہ کو  
ایسراں بلایہ شام ہجرال جہیل ہی لینگے  
نہ ہوا حساس تو ہے ساری دنیا بچیں مرہ  
ہیں ہیں زندہ درگور اور حیات جاودانی بھی  
چھڑا اس رنگ سے افسانہ بید دی قاتل  
صدائے آمد آمد دل سے اٹھی خیر ہو یا رب  
گداز انجم میں اک در ماندگی کا کیف عالم میں

# غزل

کوئی کیا سمجھے مرے کیف کی دنیا کیا ہے  
(از ماسٹر تبارک علی عبرت صدیقی بریلی)  
موج سانی ہوں مجھے حاجت صہبا کیا ہے  
حسن کیا چیز ہے اور عشق جنوں ز کیا ہے  
اب تو ہر سمت سے آتی ہے انہیں کی آواز  
ذرہ خاک بھی محسوس ہو رہی نہ رہا  
مجھ کو محسوس ہوا راہِ وفا میں اکثر  
یہ بھی حس اب مجھے اے جوشِ تمنا نہ رہی  
اس میں آتے ہیں نظرِ دیر و حرم کے جلوے  
غرق ہو کر نظر آیا مجھے ساحلِ کائنات  
آپ اب یاد دلائیں تو مجھے یاد آئے  
کچھ سو آرزوئے چشمِ تماشا ہو جائے  
اے مرے دردِ محبت کے مٹانے والے

یہ بھی معلوم ہے انجسامِ مداوا کیا ہے  
میں سمجھتا ہوں کہ اس پردہ کا نشان کیا ہے  
یہ بھی معلوم ہے انجسامِ مداوا کیا ہے

اس طرف ہے وہ نظرِ مائل پرشِ عبرت

میں ادھر سوچ رہا ہوں کہ تم کیا ہے



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

# جلد ۲۵ فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۶ء نمبر ۱۵

| نمبر شمار | مضامین                   | اثر خاتمہ                    | نمبر صفحہ | نمبر شمار | مضامین                       | اثر خاتمہ                      | نمبر صفحہ |
|-----------|--------------------------|------------------------------|-----------|-----------|------------------------------|--------------------------------|-----------|
| ۱         | فہرست مضامین             | مینجر                        | ۱         | ۱۳        | جذباتِ قضا                   | جناب فقہا جاندہری              | ۳۰        |
| ۲         | ملاحظات                  | ایڈیٹر                       | ۲         | ۱۴        | رہپور میں ملی اور لکھنؤ الہم | جناب مرزا محمد بشیر ایم۔ اے    | ۳۱        |
| ۳         | منا اور موتی             | مستر حسن عزیز جاوید          | ۴         | ۱۵        | غزل                          | مولانا خیال مراد آبادی         | ۳۲        |
| ۴         | غزل                      | ماسٹر باسط بسوانی            | ۸         | ۱۶        | چار خط                       | جناب طفیل احمد خان صاحب        | ۳۵        |
| ۵         | سیانج یونان کا دلچسپ ورق | محترمہ فاطمہ لیاقت منشی فاضل | ۹         | ۱۷        | شام                          | مولانا محمد اسماعیل ساہمدانی   | ۳۸        |
| ۶         | طوفانِ نوح               | حضرت نوح ناروی               | ۱۲        | ۱۸        | نغمہ یاکوس                   | جناب علی احمد صاحب             | ۳۹        |
| ۷         | بگینا مجرم               | دسیم صاحب انصاری             | ۱۳        | ۱۹        | ایشیا                        | محترمہ صادق بیگم صاحبہ         | ۴۱        |
| ۸         | سحر حلال                 | مستر قراق گوگھوری ایم۔ اے    | ۱۸        | ۲۰        | لمعات                        | جناب تیرام تسری                | ۴۷        |
| ۹         | گلزار                    | مولانا خواجہ عبدالرؤف عشرت   | ۱۹        | ۲۱        | ہندوستان کا بے نظیر گویا     | جناب قاضی محمد رمضان صاحب قسٹم | ۴۸        |
| ۱۰        | جذباتِ عالیہ             | حضرت دل شاہ جہانپوری         | ۲۶        | ۲۲        | مرد کامل                     | مولوی عبدالحکیم صاحب صدیقی     | ۵۰        |
| ۱۱        | کنول                     | مولانا قیس حیدر آبادی        | ۲۷        | ۲۳        | غزل                          | جناب نحر الد آبادی             | ۵۶        |
| ۱۲        | رباعی                    | ماسٹر باسط بسوانی            | ۲۹        | ۲۴        | اشتمارات                     | مشہرینِ کتاب                   | ۵۷        |

عالمگیر خاں نمبر ۱۹۳۷ء دسمبر ۱۹۳۶ء کے پہلے نمبر میں اپنی نمایاں خصوصیات کے ساتھ شائع ہوگا

مکتبہ جامعہ دہلی

اگر آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم عزیز ہو تو مکتبہ جامعہ اسلامیہ دہلی کا باتصویر رسالہ پیامِ تعلیم طلب فرمائیے۔ قیمت سالانہ چار سالگہ نمبر ۱۹۳۵ء ۸ روپے پرچہ ۲ روپے ملنے کا پتہ۔ جامعہ اسلامیہ بقولِ باغ۔ دہلی!

مکتبہ جامعہ

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر نمبر پچیسویں عالمگیر ایکٹ کپرس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر مانا رسد ہوا لاہور سے شائع کیا۔

# ملاحظیات

## شمارہ نمبر ۱۹۳۶ء میں لے ہونے والے کراخان سے متعلق چند گزارشات

عمر خیام کی ایک رباعی - عمر خیام کی رباعیات پر پیشتر ازیں تبصروں آپ کے ملاحظہ سے گذری ہوگی لیکن یہ تصویر اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی اور آخری تصویر ہے۔ جس شخص نے بھی اب تک اس تصویر کو دیکھا وہ خراج تحسین و آفرین ادا کرنے پر مجبور ہوا۔

التجائے محبت - کہنے کو تو ایک تصویر ہے لیکن فی الحقیقت آرٹ کا ایک ایسا بے پناہ اور قیامت آفرین نمونہ ہے جس پر خود مصوری کو بھی بجا ناز ہے۔ تصویر دیکھنے اور صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ان تصاویر کے علاوہ اور بھی متعدد بہترین سہ رنگی و یک رنگی تصاویر ہیں جن پر عدم گنجائش کے سبب اظہار خیال ناممکن ہے۔ خاص نمبر میں ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے۔

**مضامین** بوجہ خاص نمبر ۳۳ کے مضامین عالمگیر کے گذشتہ خاص نمبروں کیلئے بھی قابل رشک ہیں چند مضامین بالاختصار اظہار خیال کرتا ہوں۔

ابن ماجہ - ہندوستان کے مشہور مورخ علامہ حکیم سید شمس قادی کا قلم کار مضمون ہے جو اپنے ازراہ کرم خاص طور پر عالمگیر کیلئے لکھا ہے۔ ابن ماجہ کون ہے؟ اس کا مفصل حال تو آپ کو مضمون کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا مختصر طور پر یہ عرض کرتا ہوں کہ ابن ماجہ مشہور عرب ہمازراں تھا جس نے ہندوستان کا راسخ معلوم کرنے کیلئے واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی۔ یہ شخص بہت زیادہ قابل اور عظیم المرتبت تھا لیکن اب تک قعر گنجائی میں ہے حالانکہ یورپ والے اس کی قابلیت کے معترف ہیں۔

فاران کی تحقیق - علامہ عنایت رسول مرحوم چریا کوٹی کا اتنا بلند پایہ غیر مطبوعہ مقالہ ہے جو عالمگیر کی خوش قسمتی سے اس کے خاص نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ علامہ عنایت رسول مرحوم وہ محترم شخصیت ہیں جن سے سربسرجم

حسب معمول اس سال بھی دسمبر کے پہلے ہفتہ میں عالمگیر کا خاص نمبر ۳۳ اشیا، اشاعرہ، عزیزان ہنگامہ خیر خوبیوں اور معرکہ آرا خصوصیات کے ساتھ منصفانہ شہود پر جلوہ گر ہوگا، جو عالمگیر اور صرف عالمگیر کے خاص نمبروں کا حصہ ہیں میری دلی تمنا ہے کہ میں خاص نمبر ۳۳ میں شائع ہونے والے گرافتد مضامین اور تصاویر کے تعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کر کے عالمگیر کے ناظرین کرام کو یہ یقین دلادوں کہ فی الواقع آپ کے عالمگیر کا خاص نمبر ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے اپنی نظر آپ ہوگا۔ لیکن میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں تمام مضامین، تمام افسانوں، تمام حصہ نظم، اور تمام تصاویر پر مختصر سے مختصر طور پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔ میں صرف چند مضامین، چند افسانوں، چند نظموں اور چند تصاویر کے متعلق کچھ لکھوں گا۔ لیکن کن مضامین اور کن تصاویر سے محترم ناظرین کرام کو متعارف کراؤں، یہ انتخابی مرحلہ میرے لئے بیحد مشکل ہے۔ عالمگیر کے خاص نمبر کے مضامین اور تصاویر تو بلابالغہ شروع سے آخر تک اس قدر دلآویز اور کامیاب ہیں کہ ان میں سے چند ایک کو منتخب کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

زفر کو تباہ قدم ہر کجا کہ می نگریم  
کر شمع دامن دل میکشد کہ جا اینجاست  
بہر حال میں اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

**تصاویر** خاص نمبر ۳۳ کی تمام تصاویر کے بلاکس خاص طور پر عالمگیر کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ تمام تصاویر میں سے صرف تین چار پر کچھ لکھ سکا اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ۔

نور جہاں اور گلاب پھول - اتنی بہترین اور ایسی ملاحظہ تصویر ہے کہ قابل تصور نے اس پر اپنے تمام کمالات فن کو پوری کوشش کے ساتھ صرف کر دیا ہے آپ تصویر ملاحظہ فرما کر نقیضاً عیش عیش کراہیں گے۔

نے ہرانی زبان سیکھی تھی۔

کو لمبیس۔ کے نام سے ہندوستان کا تھوڑا سا وقت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔  
نیرتی۔ اس نے نہایت کاوش سے اس پر سیر حاصل معنون لکھا ہے اس کی تصویر بھی  
شیلہ کجاری ہے جس کے لئے ولایت تک خط و کتابت کرنا پڑی۔

اردو شریا ایک نظر پر دیکھ کر مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے کا زبرد  
تحقیقی مقالہ جو پڑھنے اور صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

شہزادہ مراد بخش۔ حضرت کوثر چاند پوری کا بہن بن تاریکی معنون۔  
غالب اور فلسفہ حیات۔ مولانا طاہر القادری کا قابل قدر علمی معنون  
ہے جو بہت زیادہ کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے۔

ان کے علاوہ اور متعدد بیش قدر مضامین  
بھی شریک اشاعت ہیں۔

افسانے خاص نمبر ۳۷ کے تمام افسانے

اتنے دلکش اور دلہن ہیں کہ اس سال  
کے کسی خاص نمبر میں آپ کو ایسے  
وہمپ افسانے نظر نہ آئیں گے جنہیں افسانوں  
کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

زمین کی تحریر، باپ کی قربانی  
(تاریخی افسانہ)، جہازی لیٹرن، دبیدہ کے آبا، دعوتِ نہر (تاریخی اور علمی)  
روپ متی اور باز بہادر۔ (تاریخی اور با تصویر) موت کی دھم دیو ملاقاتیں  
پر دیکھو (سائنٹفک افسانہ) عجیب مسافر، وغیرہ وغیرہ،

نظم حصہ ہمارے دھوی ہے کہ عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۶ء کا حفظ نام بلند ہے  
کہ اس کا جواب شکل ہے۔ ان جوئی کا بہترین ثبوت تو خود خاص نمبر  
ہے لیکن مندرجہ ذیل سطور سے بھی آپ کو ایک حد تک اندازہ ہو سکے گا۔

خاص نمبر میں ملک کے موجودہ تقریباً تمام شعرا مثلاً علی گنجاب نواب  
نصرت جنگ بہادر حضرت علیل شاہ حضور نظام خدائے اللہ ملک علی گنجاب نواب اختریار  
جنگ بہادر۔ اعتبار الملک حضرت دل، حضرت جگر مراد آبادی پرنسپل راجپوتی

فراق ایم۔ اے۔ کونر لطافت علی خاں طالب باقیق۔ مولانا فطرت، حضرت  
فوج نامہ دی جانشین دلغ وغیرہ وغیرہ کے غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ ایسے قابل  
احترام شعرا، کا غیر مطبوعہ کلام اور غیر مطبوعی گرامی نامے بھی شریک اشاعت  
ہیں جو کج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً۔

حضرت امیر مینائی، حضرت اکبر الہ آبادی، حضرت  
حکیم برہم گورکھ پوری، حضرت ریاض خیر آبادی وغیرہ

یقین ہے کہ مندرجہ بالا سطور سے عالمگیر کے خاص نمبر

کی قابل رنگ خصوصیات کا ایک  
حد تک آپ اندازہ کر سکیں گے  
لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاص نمبر ۱۹۳۶ء  
کو ملاحظہ فرمائے بغیر اس کی خوبیوں

کا کما حقہ اندازہ کرنا ناممکن ہے، یہ  
یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ  
ادارہ عالمگیر نہایت نیک نیتی کے  
ساتھ اپنی ان تمام کوششوں کو بڑے  
کار لار رہا ہے جو اس کے حیطہ امکان  
میں ہیں۔ ادارہ عالمگیر اپنے فرائض کو

پوری سعی سے انجام دے رہا ہے۔ عالمگیر کے محترم قارئین و ناظرین بھی اپنے  
فرائض کا احساس فرمائیں اور عالمگیر کی توسیع اشاعت  
یکملے زیادہ سے زیادہ کوشش فرما کر اپنے عالمگیر

کی جائز اعانت کو فرض سے عہدہ آ ہوں۔  
(حافظ) محمد عالم مدیر عالمگیر عرفی منہ

خریداران عالمگیر سالانہ ہذا کو صفحہ پر اعلان ضروری  
ضرور ملاحظہ فرمائیں!

## اگر آپ

عالمگیر کا وہ محرک آنا، اور تمام ہاشان خاص نمبر جو اگلے مہینہ میں نیا کتاب نامہ شائع ہوگا  
حضرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کج ہی ایک سال کیلئے فرائض خریداری کی بجائے اس شخص کو حاصل کیجئے  
سالانہ خریداری کی صورت میں آپ کو جو شے میں شائع ہونے والا سالانہ نمبر بھی مفت ملے گا۔ مثلاً  
خریداری میں ہر حال آپ کا فائدہ ہے قیمت ایک سال کیلئے چار روپے چار آنے کے علاوہ مجھ کو ایک  
بیاز منس :- میخبر عالمگیر ہو

# منا اور موتی

ایک واقعہ  
از مسٹر حسن عزیز جاوید

ہی سے شروع ہوتا ہے۔ منا اور موتی بیچاے بھلا کب مستثنیٰ رہنے والے تھے  
ساس کو مرے چند ہی روز ہوئے ہونگے کہ دونوں بہوؤں نے انقلاب منہ ہوا  
کے ترے لگانے شروع کر دیے اور انجام کار دونوں بھائیوں کے کمر  
کے درمیان میں جو صحن تھا اسے ایک پختہ دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کر کر  
دم لیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کھیتی بھی منقسم کر کر لطف اندوز ہوتیں لیکن  
گاؤں کے چار پنجوں نے جو فیصلہ کر دیا تھا کہ دونوں بھائی ایک ساتھ  
کھیتی کریں اور جب فصل تیار ہو جائے۔ کٹنی ہو چکے، اڑاؤنی ہو چکے تو  
چوکیدار کا حق۔ لوہار، برہمن، چہار کا حق خدمت اور لگان نکال کر دونوں  
بھائی ادھا ادھا غلہ بانٹ لیا کریں۔ اس کے سبب ان کی ایک تہ چلی تہا ہم  
آئے دن دھڑکی کی دال نیاری ٹال۔ "سترہ بھلی کی کھیتی بُری" خدا  
کون دن لائے جب ہل کی چھاریں تک الگ ہو جائیں۔ ان کے زبان زد  
نعرے تھے۔ دیورانی کے نزدیک جھٹائی اور جٹھ اور جٹھائی کے نزدیک  
دیورانی اور دیورایسے تھے کہ اگر صبح صبح ان کا منہ دیکھ لیا جائے تو دن بھر  
بھونے ہوئے چنے بھی نہ ملیں۔

فہرت اور کدورت نے یہاں تک ترقی کر لی تھی کہ پنگھٹ اور  
نہلنے کے گھاٹ پر اگر ایک دوسرے کا سامنا ہو جاتا تو آپ ہی آپ نمبر  
کے فٹ بال بلڈر کی طرح بدبیچ منہ اور گال پھول جاتے اور آنکھوں  
ہی آنکھوں میں زہر کے بجھے ہوئے تیر ایک دوسرے پر برسا دیے جاتے۔  
گاؤں میں اگر کوئی شادی، مونڈن یا اور کوئی تقریب ہوتی یا بھگوان جی  
کی پوجا، ست نارائن کی کھتا۔ رت جگا۔ داورے ہوتے تو جہاں ایک بٹھتی  
اس جگہ دوسری کا بیٹھا ایسا تھا گویا بول کے کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو،

کچی سڑک تھی۔ شام کا جھٹٹا ہو چکا تھا۔ اسی وقت گھیری ندی کے  
پل کو عبور کرتے وقت موٹر کا ٹائر پھٹ گیا۔ میں نے شو فر کو گاؤں میں آدمی  
لانے کیلئے بھیجا تاکہ موٹر کار دھکیل کر بستی میں پہنچائی جائے۔ ایک گھنٹے تک  
انتظار کرنا پڑا۔ جب کہیں بارہ تیرہ آدمی شو فر کے ہمراہ آتے ہوئے دکھائی  
دیے۔ دیر اس لئے ہو گئی تھی کہ سب کسان اپنی اڑاؤنی۔ نعلے کی ناپ۔ تول  
اور کھلیاں سے لے جا کر گھروں اور کوٹھیلوں میں بھرنے میں مصروف تھے  
موٹر کار کہاں رکھی جائے اور ہم لوگ رات کہاں بسر کریں اس کا فیصلہ  
شو فر نے اٹانے راہ ہی میں کر لیا تھا۔ گاؤں میں سب سے اہم کاشتکار  
منا اور موتی تھے انھیں کے ہاں ہم دونوں ناخاندہ ہمان ٹھہرنے والے  
تھے۔ منابر بھائی تھا، موتی چھوٹا بھائی۔ کسی زمانے میں دونوں بھائی  
ایک ہی گھر میں رہتے تھے جو پچیس ایکڑ کی آرائشی وراثت میں ملی تھی  
اسے دونوں بھائی خوشی خوشی جوتے بوتے تھے۔ جو غلہ اٹا اس کی دیکھ بھال  
یکجہتی سے کرتے تھے اور پیداوار ایک ہی کوٹھی میں بھر کر اس میں سے خرچ  
کرتے تھے لیکن ماں کے مرنے سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ساس ہمیشہ  
دوا اور دوسے زیادہ بہوؤں کے درمیان ثالث بالجبر کا مرتبہ رکھتی ہے۔ او  
جب ساس یا دوسرے نعلوں میں حاکم خانہ اپنے دن پورے کر کے اپنے بیٹوں  
کو بہوؤں کے رحم پر چھوڑ جاتی ہے تو ایسی کا یا لپٹ ہوتی ہے کہ ایک چوٹے  
کے دولہا محال ہو جاتے ہیں۔

حضرت نوح کا طوفان بھی بڑھیا کے تو رہی سے شروع ہوا تھا۔ بینہ  
اسی طرح ہندوستانی زندگی کا طوفان "افراق و انتشار" بہوؤں کے چوٹوں

بات بات میں طعن و تشنیع تو معمولی امر واقعہ تھا۔

موٹر کار دھکیل کر سستی میں نے جانے کیلئے جب تیرہ آدمی آئے تو منا اور موتی پیش پیش تھے۔ گھنٹوں سے اونچا جا گھنٹوں تک کاکھدر کا گول ہر دے والا لنگر کھانسی میں سینے کے قریب بند بندھے تھے منہ کے زبہ جسم تھا۔ دوپٹی ٹوپی اوڑھے تھا۔ گھنٹوں تک کی لال کنارہ کی دھوتی باندھا تھا اور لائن نری کا جو تہ پہنے تھا۔ جسے بڑے لوگوں سے ملنے کے وقت پہننے کی خاطر سے بجا طلت رکھ چھوڑا تھا۔ موتی کا بھی قریب قریب اسی قسم کا لباس تھا۔ دونوں بھائیوں نے قریب ہونچکر زمین بوس سلام کیا اور دیگر بھائیوں کی سمیت میں موٹر کار دھکیل کر بجا کر اپنے کھیمان کے اندر کھڑی کر دی۔ فطری سادگی۔ دیہاتی بھولا پن ان کے بشرے سے ہوبیدا تھا۔ ایک لکھ بات کا جواب دیتے وقت جی سرکار ضرور کہتے تھے۔

۲

ایک بان کی چار پائی میرے لئے لاکر بچھائی گئی۔ اس پر گودوں کا پیال ڈالا گیا۔ اس پر میرا بستر بچھا۔ میں ابھی ہاتھ منہ دھو کر بیٹھا تھا کہ ایک پتل کے لوٹے میں چھا چھ اور ایک پتے کے دونوں میں گوڑ منہ کے تھیاں سے اس کا بڑا بیٹا منسی لایا اور میرے سامنے سلام کر کے ہاتھ میں لئے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہر چند انکار کیا لیکن لڑکا بہت عاجزی کے ساتھ مٹھو کر کہ میں چھا چھ ضرور پی لوں چنانچہ آدھا لوٹا میں نے پی لیا اور باقی شوفر کو دیدیا منا اور موتی چلم پیتے پیتے میرے سامنے ان بے شمار حکام اور صاحبان کا ذکر کرتے رہے جو ان کے یہاں وقتاً فوقتاً ٹھہرتے رہے اور ان کے ساتھ منا اور موتی نے کس طرح کا برتاؤ کیا تھا۔ دوران گفتگو میں انھوں نے اپنی شادی، اپنے بیٹوں بیٹیوں کے حالات، اپنی والدہ کے انتقال کی داستان اپنی خصلوں کی حالت اور بیویوں کے مرنے کے کوائف بھی سنائے اور باوجودیکہ عورتوں کے باعث الگ الگ ہو گئے تھے تاہم ان دونوں میں کیسی سچی برادرانہ محبت برقرار رہے اس کا بھی بڑے فخر کے ساتھ اعتراف کیا۔ لیکن ان دونوں کو اپنی بیویوں کی حالت پر افسوس تھا جو انھیں ایک جگہ ہل کر نہیں رہنے دینا چاہتی تھیں۔ منانے بڑے ناز کے ساتھ یہ بتا بھی سنائی کہ اس کا موتی اگرچہ چھ بچوں کا باپ ہو چکا ہے اور بازو برابر ہے لیکن اگر وہ اسے دس جوتے بھی مار دے تو موتی اتنا شریف ہے کہ کبھی اُٹ

نہ کرے گا۔ اسی طرح موتی نے بھی کہا کہ منا بھیا مجھ سے الگ ہیں مگر اپنی اولاد سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔ اگر میرے پاؤں میں کاٹا بھی چھو جائے تو انھیں درد محسوس ہوتا ہے۔ دیر تک میں ان کی دیہاتی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان سے سوالات کرتا رہا۔ گاؤں کس کا ہے۔ آبادی کتنی ہے؟ کس قوم کے کہتے آدمی رہتے ہیں۔ پولیس والے تو تنگ نہیں کرتے۔ اس کے بعد منا کے گھر سے میرے اور شو فر کے لئے بھگی، دال، چاول، پاڑ، اچار پتیل کی تھالیوں میں رکھا ہوا آیا۔ ہم نے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔ منا اور موتی بھی اپنے اپنے گھر کھانا کھانے چلے گئے۔

۳

رات بہت ہو چکی تھی۔ بھانگن کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ گاؤں میں ایک طرف عورتیں ڈھولک بجا کر ہمنوائی سے اپنے دیہاتی تگیت گار تھیں اور میں چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ جب وہ دونوں کھانا کھا کر گئے تو بہت دیر تک بیٹھے چلم پیتے رہے۔ پھر بڑے قریب اگر اندازہ لگایا کہ میں سوتا ہوں یا جاگ رہا ہوں۔ میں نے اور کتنی بھیں بند کر لی تھیں اور خراٹے لینے لگا تھا۔ اس لئے انھیں میری جانب سے اطمینان ہو چکا تھا۔ شو فر بھی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ شاید نئی جگہ ہونے کے سبب میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ منانے کہا۔ "تے بھائی موتی! آج تو ہی اپنے ہاتھ سے بوا رہ کر۔"

موتی بیباختہ بولا۔ "میں نہیں بھیا مجھ سے بڑگڑ نہ ہوگا۔ تم بڑے ہو خود ہی میرا حصہ الگ کر دو۔"

منانے ہنس کر کہا۔ "اگر تو آج حصہ کر دگا تو کیا ہو جائیگا۔"

موتی بولا۔ "نہیں بھیا۔ تمہارے پہلے میرا ہاتھ لگانا اچھا نہیں"

میں باپ کا سختی ہونا نہیں چاہتا۔ تم باپ کے برابر ہو۔ تم ہی سب کچھ پوچھتا پوتر ہاتھوں سے ڈھیریاں لگاؤ۔ ایک ڈھیری میں اٹھالے جاؤں گا ایک تم اٹھا لینا۔"

منانے ہنس کر کہا۔ "ادھنہ! بھائی تو بڑا سورا کہ ہے اچھلے جیسا"

تو کہتا ہے ویسا ہی کرتا ہوں۔"

اڑائے ہوئے غلے کا جو انبار لگا تھا اسے منانے دھسوں میں

تقسیم کرنا شروع کیا۔ دو گھنٹے کے بعد کہیں جاکر دو ڈھیر تیار ہوئے۔ منانے کہا۔ "اچھا اب لے لے کون سا ڈھیر لیتا ہے۔" مگر موتی نے کہا۔ "نہیں جو"

ڈھیر تیر دو گے بھیا دہی میں لوں گا۔

منانے پھر تبسم کا اٹھا کر کیا اور ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا یہ ڈھیر لے جاؤ۔"

موتی نے اپنی نوکری میں گہوں بھرا اور سر پر رکھ کر گھر لے گیا جب منانے دیکھا کہ موتی دور نکل گیا ہے تو جلدی سے پندہ میں نوکری گہوں اپنے انبار میں سے نکال کر اس کے ڈھیر میں ڈال دیا۔ پھر منانے اپنی نوکری پھری اور موتی کے آنے کے بعد اپنے گھر پہنچنے چلا گیا۔ اس کے دور نکل جانے کے بعد موتی نے جلدی سے اپنے ڈھیر میں سے بارہ نوکری گہوں نکال کر منانے کے ڈھیر میں ڈال دیئے اور اپنی نوکری بھر کر گھر لے چلا گیا۔ بھائی کی آمد کا انتظار کرنے لگا جب مناد ایس آگیا تو موتی اپنی نوکری لیکر گھر چلا گیا۔ پھر منانے دس بارہ نوکری گہوں اپنے ڈھیر کے نکال کر موتی کے ڈھیر میں ملا دیئے اور جب موتی آگیا تو وہ اپنا غلہ نوکری میں لیس کر رکھنے کیلئے چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد موتی نے بھی اپنے بڑے بھائی کے ڈھیر میں اپنے ڈھیر میں کچھ غلہ شامل کر دیا۔ دو گھنٹہ تک یہی تماشہ دیکھتے رہنے کے بعد منانے سے ضبط نہ ہو سکا اور میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا جبکہ موتی منانے کے ڈھیر میں غلہ ملا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اس طرح تو تم دونوں بھائی رات بھر یہی بھی اپنا غلہ اٹھا کر نہ لیجا سکو گے۔"

انسانستے ہی موتی چونک اٹھا اور میرے پاس آ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کرے گا۔ "سرکار ہم سمجھے آپ سو گئے ہیں۔ آپ نے تو دیکھ لیا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم آخر ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

موتی نے کہا۔ "صنودہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ ان کے یہاں آنے جانے والے، اہمان، سپاہی اور چڑا اسی سب ٹھہرتے ہیں۔ اس لئے خرچ زیادہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مبادا اس سال بھر کے اندر ہی ان کا غلہ ختم نہ ہو جائے اور ان کو خرچ کی مصیبت ہو۔ اس لئے اپنے حصہ میں سے اسی جگہ ان کے حصہ میں ملا دیتا ہوں کہ خرچ پورا ہو جائے اور عورتوں کو بھی خبر نہ ہونے پلے لیکن میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ ان سے نہ کہنا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن مرد خدا وہ جی تو اپنے ڈھیر میں سے"

اسی طرح تمھارے ڈھیر میں ملانا جاند ہے۔"

موتی نے بڑے تعجب کے ساتھ کہا۔ "اچھا۔" پھر خاموش ہو گیا جیسے وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ہو۔

میں پھر سونے کا جیلہ کر کے لیٹ گیا اتنے میں مڑا آگیا۔ موتی نے خاموشی سے اپنی نوکری اٹھالی اور گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

جب منا بھی چند نوکری غلہ اپنے ڈھیر میں سے نکال کر موتی کے ڈھیر میں ڈال چکا تو میں نے کہا۔

"تم لوگ یہ کیا تماشہ کر رہے ہو؟ اس طرح تو تمام رات بیت جائیگی مگر غلہ نہ اٹھ سکیگا۔"

موتی کی طرح وہ بھی چونک اٹھا۔ پاس آگیا۔ کہنے لگا۔ "اے سرکار جاگتے ہیں!"

میں نے کہا ہاں نیند نہیں آ رہی۔ آخر تم یہ کیا کر رہے ہو؟ منانے کہا۔ "جی کچھ نہیں، وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کے یہاں کھانے والے بت ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں ایسا نہ ہو اس کا غلہ سال کے اندر ہی ختم ہو جائے اس لئے بڑے بھائی کی حیثیت سے اس کی بغیر اطلاع اپنے حصہ میں سے کچھ غلہ اس کے حصہ میں ڈال دیا ہے کیونکہ اگر اسے معلوم کر کے دیا جائے تو وہ ہرگز نہ لیگا۔ لیکن سرکار میں ہاتھ جوڑتا۔ دن اس سے تذکرہ نہ کرنا اسی جگہ غلہ زیادہ دے دینا اس لئے مناسب تھا کہ عورتوں کو خبر نہ ہونے پائے ورنہ مفت میں جھگڑا برپا ہو جاتا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "مگر بھائی تم صرف اس کے ڈھیر میں ملاتے جاؤ تو اچھا تھا۔ جتنا تم ملاتے ہو اتنا ہی وہ دوبارہ تمھارے ڈھیر میں ڈال دیتا۔ منانے کہا۔ "ہیں!"

میں نے کہا۔ "بالکل واقعہ ہے۔ موتی کا بھی یہی کہنا ہے کہ بڑے بھائی کو تکلیف نہ ہو۔ ان کا خرچ زیادہ ہے۔ اس لئے میں ایسا کر رہا ہوں۔"

منا پر استعجاب طاری ہو گیا وہ سر کو ہاتھ لگا کر بیٹھ گیا اور گویا ہوا۔ "موتی میرا بچہ کا بھائی ہے۔" اور پھر آہ سرد بھرنے لگا۔

خاص نمبر ۱۹۳۷ء کا دامن بہترین علمی و ادبی ہارپون سے بھرا ہوا ہے ضرور ملاحظہ فرمائیے

جہاں کہیں بھائیوں کی نفسانیت اور نفیض کا تماشا نظر آتا ہے۔ مٹا اور موتی کی یاد آ جاتی ہے۔

حسن سحریر جاوید

دوسرے دن نامور دست کر کے ہم لوگ گیزی سے روانہ ہو گئے۔ سالہا سال بیت چکے۔ مگر پھر اس طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا تاہم یہ واقعہ نہیں بھولتا۔ ہمیشہ منا اور موتی کی برادرانہ الفت کی تصویر آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔

## چار آنے کی ٹکٹیں

”ضروری اعلان“

عالمگیر کے جن خریدار حضرات کی سیاد خریداری ختم نہیں ہے اور جن کے نام کے ساتھ چٹ پر ”س“ چھپا ہوتا ہے، وہ اپنا خاص نمبر ۳۳۷ بے غفلت تمام حاصل کرنے کیلئے چار آنے کی ٹکٹیں برائے رجسٹری ارسال فرمائیں، تاکہ ان کا خاص نمبر ڈاک میں مبالغہ ہونے سے محفوظ رہے۔

جن خریدار حضرات کے نام کے ساتھ ”خ“ چھپا ہوتا ہے وہ ٹکٹیں نہ بھیجیں ان کی سیاد خریداری البتہ اس پرچہ (نومبر) کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ خاص نمبر ۳۳۷ ان کی خدمت میں آئندہ سال کے چند مکملے بندوبست وی۔ پی ارسال ہوگا۔

میجر عالمگیر لاہور

۵۰۰۰

عالمگیر کے جس خاص نمبر پر تقریباً پانچ سو روپے کی خطیر و کثیر رقم صرف کی جا رہی ہے اس کو بالکل مفت حاصل کرنے کیلئے عالمگیر کی خریداری ایک سال کیلئے قبول فرمائیجئے۔ اس صورت میں جون ۳۷ء میں شائع ہونے والا سالانہ نمبر بھی مفت ملے گا۔ قیمت سالانہ چار روپے چار آنے علاوہ موصولہ ڈاک

حاصل نمبر ۱۹۳۷ء

انشاء اللہ ہر اعتبار سے کامیاب۔ عیدم نظیر فقید المثال اور قابل دید ہوگا



# غزل

مقصود جناب باسط جان بولنی

اُن کو بھی افسردہ گل کا استیج دھوکا ہو گیا  
دل کے آتے ہی سربازار رُسا ہو گیا  
کمدیا ہاں کمدیا بیسری نگاہِ شوق نے  
نقدِ دل کی کیا حقیقت: نقدِ دل کیا چیز ہے  
اہل محفل سے چھپایا لاکھ ہم نے رازِ دل  
عشق نے اس کو سکھائے ناز و انداز و غور  
عکس پر اس کی نظر ہے آئینہ ہے سارے  
آ رہا تھا دل میں کچھ کچھ تو بہ کرنے کا خیال  
اشکِ خویش و بچہ کردہ پوچھتے ہیں ناز سے  
دل کی دنیا ہی بدل دی اس نگاہِ ناز نے  
ابتدائے عشق میری بن گئی معراجِ عشق  
خود ہی وہ اٹھلا کے چلنا، خود ہی سب سے پوچھنا  
آپ سے پوچھنا تھا۔ آپ نے کیا کر دیا ؟  
اہل باطن نے نظر کی جلوہ گاہِ قلب پر  
اُن ری ذبیحے محبت اُن رستے تیرے اقلاد  
دل کے آنے سے ہیں کچھ اور تو آیا نہیں  
خطابیں جو تیرے لکھا ہے پیش آتا ہے وہی  
دل بھی ہے قربان باسط جان بھی میری نثار  
خود خود ہنستا ہوں باسط خود بخود دنا ہوں میا

ایک داغِ عشق سے کیا دل کا نقش ہو گیا  
بیری الفت کا جو ہونا تھا نتیجہ ہو گیا  
ہو گیا رازِ محبت اُن پہ انشا ہو گیا  
جان دینا بھی محبت میں گوارہ ہو گیا  
خود گاہیں کہہ اٹھیں الفت کا سودا ہو گیا  
خود بخود کب سُن خود ہیں و خود آرا ہو گیا  
خود تماشا دیکھنے والا تماشا ہو گیا  
شکر ہے تنے میں بابِ سب کدہ وا ہو گیا  
کس لئے روتے ہو کیا خونِ تنہا ہو گیا ؟  
دل کے جانے کے قابل، دل ہمارا ہو گیا  
راہِ الفت میں قدم رکھتے ہی رُسا ہو گیا  
کیوں قیامت آگئی۔ کیوں حشر برپا ہو گیا  
آپ مجھ سے پوچھتے ہیں آپ کو کیا ہو گیا  
اہل ظاہر کے لئے مستند ہی کعبہ ہو گیا  
قیس لیلیٰ بن گیا۔ یوسف زلیخا ہو گیا  
جان دینے کا سگر کچھ سلیقہ ہو گیا  
یہ بھی کیا کجنت قیمت کا نوشتہ ہو گیا  
کوئی میرا ہونہ ہو، میں تو کسی کا ہو گیا  
خود ہی بہروں سوچتا ہوں ٹھکویہ کیا ہو گیا

# تیلخ یونان کا ایک پسے ہرق

محررہ فاطمہ لیاقت صاحبہ منشی فاضل، بگرام!

ایک حکومت کے زیر نگین نہ تھا بلکہ ہر بڑے صوبہ کا ایک ایک الگ حکمران تھا اور ان میں ہمیشہ خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی لیکن دو تین خاص حکومتیں اسپارٹا، اتھنز، مقدونیہ، سرب میں طاقتور اور ذی مرتبت سمجھی جاتی تھیں۔

یہ خانہ جنگی اُس وقت تک قائم رہی جب تک سکندری کی سی عظمت اور بہادری نہ تھی اس کو مٹا کر ایک سلطنت میں منسلک نہ کر دیا سکند کا باپ فیلقوس شاہ مقدونیہ بید شجاع تھا لیکن وہ شجاعت کو زیادہ فریب و مکاری سے کام لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کا بہن ثبوت شہر الاٹھ کی تعمیر ہے۔ اس کا دست ہوس کبھی ریاست فوکس کی طرف بڑھتا تھا کبھی ایلیکا کی طرف، جب اس کی دست درازیاں اور ہوس راہیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو تمام صوبوں نے باہم اتحاد و مصالحت سے اس ظالم کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنے کی خاطر ایک صلح نامہ مرتب کیا اور دوسو تھینز مشہور مصلح یونان کی جادو بیانی سے کافی فوج جمع ہو گئی۔ اتحادی فوج بیوشیس سے نکل کر فیلقوس سے نبرد آزما ہوئی۔ ذلت ٹھکائی قسمت میں لکھی تھی اس لئے سب کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور فتح نے فیلقوس کا اقتدار اور بڑھا دیا۔ شیرینیہ اور تھینز کی شکست نے تمام یونان کے حوصلے پست کر دیئے۔ اتھنز نے ڈر کر فیلقوس سے جو صلح کی اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ آئندہ وہ فیلقوس کو تمام یونان کا سردار تسلیم کرے گیے اور خود کوئی سیاسی اتحاد قائم نہ کرے گیے۔ اس عام غلامانہ حالت میں اگر کسی ریاست نے سر تسلیم خم نہ کیا تو وہ آپارٹا تھی۔

تقریباً سارے یونان کی تسخیر کے بعد اس کو ایران پر لشکر کشی کی حسرت ہی تھی کہ شہنشاہ ق۔م میں ایک مقدونی امیر کے ہاتھ سے مارا گیا۔

تین سو سال قبل مسیح دولت یونان دنیا کی سب سے بڑی قوت تھی اور وہ دور ایسا درخشاں دور تھا کہ اس کو اہل یورپ یونان کا قابل فخر زمانہ کہتے ہیں، اس کی تہذیب و معاشرت، علوم و فنون تمام دنیا پر فوقیت رکھتے تھے، ایک طرف فن کی ترقیوں کا یہ حال تھا تو دوسری طرف شجاعت و بہادری اور حب الوطنی کی یہ کیفیت تھی کہ شہنشاہ ق۔م میں جب دار یوش شاہ ایران کے جانشین ندرکیز (خسرو) نے یونان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کیں اور ایک لشکر عظیم بیکرجس کی تعداد بارہ لاکھ اسی ہزار بتائی جاتی ہے آہل درہ دانیال کو مجبور کر کے شہر سوپلی کے مشہور درے تک پہنچایا گیا اس وقت یونان کی تمام اتحادی فوج وہاں پہنچ چکی تھی اور صرف یونی ڈس شاہ اسپارٹا بقول مورخین پانچ ہزار دو سو سوار کے ساتھ اس کی یورش کو روکنے درہ شہر سوپلی پر موجود تھا چنانچہ اس نے ادراس کے ساتھیوں نے سرمتھیلی پر رکھ کر ایسی سرفروشانہ جنگ کی کہ ایرانیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اگرچہ یونی ڈس مع جلد سپاہ کے مرٹا لیکن اس کی قربانی بیکار نہ گئی بلکہ اس نے سارے یونان میں حب الوطنی، غیرت، آزادی اور جہاں بازی کی روح پھونک دی اور وہاں کا بچہ بچہ دشمنوں سے جنگ کرنے پر تیار ہو گیا۔ بقول ایک مورخ کے، اسی جدوجہد میں اس نے یورپ کی روح کو ایشیا کا غلام ہونے سے بچا لیا۔ گویا آئینی آزادی کے اس مخم کو فائدہ ہونے لیا جس کا ایرانی استبداد کے ہاتھوں فنا ہو جانا یقینی نظر آتا تھا۔

ہر کمالے راز وال کے مصداق اب اسی یونان کی حالت اچھا عالم طوائف الملوکی اور خلفشار اس کا خاتمہ کر رہی ہے۔ وہ تیسرے درجہ کی قوت سے بھی کم خیال کیا جاتا ہے، یوں تو اُس وقت بھی سارا یونان

تخت نشینی کے وقت وہ صرف مقدونیہ جیسے معمولی علاقہ کا حکمران تھا لیکن اس کی کشورستانی نے بحیرہ مارمورا سے لیکر جنوبی یونان تک زیر نگین کر لیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد سکندر زینت آرائے اورنگ شاہی ہوا جس کو تاریخ نے سکندر اعظم کا خطاب دیا ہے اور جس کے جنگی حوصلے، شجاعت و دلیری کا افسانہ صفحہ تاریخ پر سہرے حروف میں مرقوم ہے اس کی شہرت و عظمت بلاوجہ نہیں، تخت نشینی کے وقت ۳۳۶ ق۔ م میں اس کی عمر بیس سال اور فتح ایران کے موقع پر پچیس سال کی تھی ۳۰ سال کی عمر میں، مصر و شام، ایشیائے کوچک، سندھ، باختر اور بہت سے مقامات اس کے زیر حکومت آچکے تھے۔

فیثوس کے مرنے کے بعد دارالتخت کی کمسنی کے خیال نے تمام قبویہ چکو متوں کو بغاوت آزادی کے خواب دکھلانے شروع کر دیے لیکن نوجوان اور عقلمند حکمران نے جس کے انگریز دست بستہ تھی ان سب کے خواہلے شیریں شرمندہ تعمیر نہ ہونے دیے، اور جتنی تدبیریں مخالفین نے سوچی تھیں الٹی ہو گئیں۔

اس نے سب سے پہلے عہد نامہ کی "انجمن دلیفی" سے تجدید کرائی جس کی رو سے وہ بھی فیثوس کی طرح محافظ دین اور سپہ سالار یونان بن گیا۔ تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر کورنتھ میں ٹینگ کی جس میں تمام یونان کے نمائندے شریک ہوئے انھوں نے بھی اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اس کو حکمران یونان تسلیم کر کے ایران پر لشکر کشی کی اجازت دیدی اس طرح شورش سے قبل ہی سارا یونان سکندر کے زیر حکومت تھا۔ اب اس نے تسخیر ایشیاء کا ارادہ کیا۔ لیکن ابھی تیاری نہ کر سکا تھا کہ تھریس تھینز کی بغاوت کی خبر کانوں میں پہونچی۔ بجعلت ادھر سے روانہ ہو کر ایک خونریز جنگ کے بعد سارا جنوبی کنارہ اور تھینز باغیوں سے صاف کر دیا۔

۳۳۴ ق۔ م میں جب سکندر نے آبنائے درہ دانیال کو عبور کر کے اپنے مرحوم باپ کی خواہش کے مطابق ایران پر حملہ کیا اس وقت دارائے ثالث حکمران تھا۔ اس کو تاریخ اچھے اوصاف اور الفاظ سے یاد نہیں کرتی۔ اس کی پہلی جنگ ایرانی گورنر نے گرانی کس (بیاچائی) ندی کے کنارے ہوئی فتح نے اس کی ہمت بلند اور ایرانیوں کی ہمت پست کر دی دوسری جنگ ایک سال بعد ایسوس میں ہوئی جہاں خود دار اپنی فوج کے ساتھ

تھا۔ سکندر نے حملہ کیا۔

دوست آوریدہ بکوششیں بہر دست شمشیر الماس گوں  
دوستی چٹائی گزارید تیغ کز خصم را جاں نیامد دریغ  
جویر فرقہ پیل آمدت خنجر شش فرد تختے زیر پائش سرش  
جنگ زور و شور سے ہو رہی تھی میدان کارزار جہانین کی کوششوں  
کے کشمکش گاہ بنا ہوا تھا جس کا نقشہ نظامی گنجوی نے سکندر نامہ  
میں یوں کھینچا ہے۔

دو لشکر چو مورد بلخ تاختند نبرد جہاں در جہاں ساختند  
سپہ از دو مو صفت بیاراستند ہزیراں بہ پنجیر بر خاستند  
پیشہ شمشیر پولاد و تیسرے خدنگ گز گاہ بر مور کردند تنگ  
زسم ستوراں در اں پین شوت زمیں شش شد و آسمان گشت شہت  
ملکرتاب شد نعرہ ہائے بلند گلوگیر شد حلقہ ہائے کمند  
ز تاب نفس در ہوا بست تیغ جہاں سوخت از آتش برقی تیغ  
ابھی کسی کی قیمت کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ بزدل دارا فرار ہو گیا جس

سے علم لشکر میں انتشار پھیل گیا۔ بے سر کی فوج جواب تک بہادری سے قدم جمائے لڑ رہی تھی اب کس طرح ٹھہر سکتی تھی، اس نے بھی اپنے بادشاہ کی تقلید کی ایک جنگ میں سکندر کو دارائے حرم اور کثیر مال غنیمت ملا۔ اب اس نے شام اور سغان کی طرف عنان توجہ پھیری، یو صولے کچھ زیادہ متعطل نہ دکھلا سکے لیکن شہر صور (مار) نے سکندر کے دانت کھٹے کر دیئے۔ طویل حملے کے بعد جبکہ سکندر عاجز آ گیا تھا اس نے مجبوراً ہتھیار ڈالے۔ اسی طرح شہر گارنے بھی سید دلیری اور جانبازی سے متاثر کیا۔ اس کی فتح کے بعد اب نغریاب بادشاہ کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے مصر پر حملہ کیا۔ مصر نے جو کہ ایرانیوں کے زیر حکومت ہو کر مذہبی تشدد سے گھرا گیا تھا زیادہ مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ یہاں اس نے اسکندریہ کی بنیاد ڈالی جو آئیں اس کی عظیم نشان فتوحات کی شہادت دے رہا ہے۔ اب اس نے پھر ایران کا رخ کیا۔ دارائے مغربی علاقہ اور اپنی بیٹی اس کی زوجیت میں دیکر صلح کرنی چاہی لیکن سکندر کی اس شرط نے کہ شاہ ایران اس کے دربار میں حاضر ہو۔ صلح نہ ہونے دی۔

جنگ کے دن ہوز شعلے پھر پھر اٹھے۔ ۳۳۱ ق۔ م میں

چاہتا تھا۔ چنانچہ جب اس کی آتش کے قریب آتا تو گھوڑے سے اتر پڑا اور دارا کا سر اپنے رانہ پر رکھ کر خاک و خون صاف کیا اور نہایت افسوس سے کہنے لگا۔

تو اجم کہ بر خاک بودے سرت نہ آلودہ خوئ شود سپیکرت دار نے سکندر کو ہر اجم پا کر چند وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ

ہاں روشنک را کہ دخت نشت ہاں ناز کی دست بخت نشت  
ہمراہی خود کنی نہ سہل بند کہ فرخ بود گوہر ارجبند  
دل نہ از دوست برناہ کہ باروشی بہ بود آفتاب  
اور ہجرت دیاس را ہی ملک جاوداں ہوا۔

بہ بازوئے بہمن بہ اسود مار، ز روئیں و ژاقتا د اسفندیار  
بہار سبیدوں دگلزار جسم بہ باد خزاں گشتہ تاراج غم،  
نسب نامہ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے بردہ باد  
تن مر رہاں دید در خاک و خوں کلاہ کیانی شدہ سرنگوں  
ایران کی فتح کے بعد اس نے سیستان کا بل فتح کر کے سکندر پر یاریوں  
(موجودہ ہرات) کی بنیاد ڈالی۔ سمرقند لیکر ہندوستان پر حملہ آور ہوا کئی لڑائیوں میں  
کامیابی حاصل کرنے کے بعد جب راجہ پورس کو شکست دیکر آگے بڑھنا چاہا تو  
اس کی مانہ و خستہ فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اب مجبوراً ہندوستان میں  
اپنے چہرے کے لیے کوہ نور تاج بنانے والے ہونا پڑا۔ اس نے وشنو کے شادی  
کی اور خوب جشن منایا۔ اس نے جس بابل آ کر عرس پر حملہ کرنے کا ارادہ  
کر رہا تھا کہ کل نفیس فی القہۃ الموت کا مصداق ہو کر اس عظیم الشان سپہ سالار  
کو دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔

سکندر خیالات اور کرکچر کے لحاظ سے بھی ایک قابل تعریف شخصیت کا  
مالک تھا۔ شاگرد اسطوہونے کے سبب اس میں دانائی، عدل، مساوات  
ہمدردی استقلال جیسی صفات موجود تھیں لیکن بعض مورخین کی رائے کے  
مطابق فتح ایران کے بعد اس کی صفات اگر ختم نہیں تو کم ضرور ہو گئی تھیں  
اس میں بہمیت و خود پرستی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو انتہا سے بڑھی ہوئی  
دولت و ثروت کا لازمی نتیجہ ہے۔

اگرچہ (موجودہ محفل) کے نزدیک دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جہاں دارا نے  
پھر فرار ہو کر عزت ایران پر بزدلی کا دھبہ لگایا۔ سکندر نے بڑھ کر پانچ تخت  
سوس پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد سارا ایران اس کے پاسے ظفر پر سجدہ ریز  
ہو گیا۔ اب اس کو ستوا سال قبل کی ایتھنز کی بربادی یاد آئی اور اس نے  
اصطخر کو جلا کر اپنا دل بھنڈا کر لیا۔

اگرچہ اسے بھاگ کر دارا ہمدان پہنچا۔ سکندر نے اسے یہاں بھی  
جین نہ لینے دیا اور گرفتار کرنا چاہا۔ دارا نے صلح کی خواہش کی لیکن اس کے  
امراء نے اس کو ذلت سمجھ کر مجبور اور بے بس کیلکہ ایران کو اپنی زیر نگرانی  
کر لیا وہ ہر کامیابی کے مقام پر پہنچے تھے کہ سکندر سے مقابلہ ہو گیا۔ سین ہر سین  
اٹھائی۔ نثار ہوتے وقت دارا کو بھی اپنے ہمراہے جانا چاہی لیکن دارا نے توجہ  
تقدیر ہو کر اٹھا کر لیا۔ ناچار بادشاہ کو اب موت کے سوا کون بچنے والا تھا،  
زمانہ کی انقلاب پسندی کے ساتھ سب کی نظریں پھر کچی تھیں۔ نظامی کے  
قول کے مطابق خصوصاً اس کے دو حکمران مقرب اس کے قتل پر آمادہ ہوئے  
بدارادہ سرسنگ بود فاضل باخلاص نزدیک و دوزخ خلاص  
زبیداد دارا بخت لعل آمدہ دل آزدگی در میان آمدہ  
چو زنیگونہ بازاری آراستہ بخوں از سکندر اماں خواستہ  
کہ ماییم خاصان دارا و بس ہمارا ز ماحص تر نیست کس  
بخواہیم نہ دہر و ناخستہ زبیداداد ملک پر دختہ  
چو فردا علم بر کشد در صفات خور و ضربت تیغ پہل شگافت  
ولیکن بشرطیکہ بدست رنج ہمار کشادہ کنی قفسل رنج  
زماہر یکے را تو نگہ کنی! زندکار ماہر دو چوں زر کنی!  
سکندر کاں خواستہ ہم نسبت یہیماں دزاں خواستہ دادست  
بہ بدولوں کور نمک دارا کو مکو و قریب سے دھوکہ دیکر میدان لڑنے  
بدیں عشوہ دادند شدہ را سکیب یکے بر دلیری یکے بر فریب  
اور اس کو قتل کر دیا۔  
دوسرے سرسنگ غدار چوں پیل نشت ران پیلین بر کشادہ دست  
در افتادار ابدان زخم تیشہ ز گیتی در آمد یکے رستخیز  
دخت کیانی در آمد بچاک بغلطید در خوئ تن ز خمناک  
بعض مورخین اور نظامی کی رائے ہے کہ سکندر دارا کو قتل کر دینا نہ

# طوفانِ نوح

ناخدائے سخن، تاج الشعراء، فصیح لہجہ حضرت نوحؑ ناروی

اب وہ سرستی بہا نہیں  
اہلِ محفل کو دیکھتے رہے  
دوستی اُن کی، دشمنی اُن کی  
کیا مے دل سے برق کو نسبت  
بڑھتی جاتی ہے اُن کی زلفِ دراز  
شوخیوں نے بنا دیا مجبِلی  
زندگی پر زمانہ مرتا ہے  
جار ہے ہیں شباب کے ایام  
آپ کہہ لیں ذلیل و خوار مجھے  
جھلملاتے ہوئے چراغ ہیں سب  
بعد مرنے کے دل ٹھہر بھی گیا  
مجھ کو دیتے ہیں اس لئے وہ شراب  
کیا خبر سانس کب اکھڑ جائے  
لوگ کہتے ہیں ناخدائے سخن،

نشہ کیسا مجھے خمار نہیں  
کون ہے کون بہیت رار نہیں  
مجھ کو دونوں کا اعتبار نہیں  
ہے مگر اتنی بہیت رار نہیں  
اس طوالت کا اختصار نہیں  
اب انہیں اک جگہ تزار نہیں  
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں  
میرے کہنے میں یہ بہا نہیں  
عشق لیکن ذلیل و خوار نہیں  
بزمِ ہستی کا اعتبار نہیں  
زلزلے میں مرا منہ زار نہیں  
جانتے ہیں یہ بادہ خوار نہیں  
اس ہوا پر کچھ اختیار نہیں  
نوح دنیا میں بے وقار نہیں

# بیگناہ مجرم!

جناب وسیم صاحب انصاری، ردو لوی!

(۱)

”معلوم ہوتا ہے کہ دلی محمد صاحب اب تک حاضر نہیں ہوئے“  
میں نے اخبار نامہ کے ذاتیات ”کا کالم پڑھتے ہوئے کہا۔  
”کون دلی محمد؟ جاسوس خالد نے مجھ سے دریافت کیا۔

”کل میں نے آپ کو ایک اشتہار سنایا نہیں تھا۔ جس میں دلی محمد اور  
اس کے صندوق کا ذکر تھا۔ یہ اشتہار مسلسل شائع ہو رہا ہے کہ دلی محمد کو اپنا  
صندوق ایک ہفتہ میں مال گودام سے نکال لینا چاہئے ورنہ وہ نیلام کر دیا جائیگا  
اشتہار کیلئے ایک دھمکی ہے۔“

میں جاسوس کے ہمراہ چائے نوشی میں مصروف تھا کہ ایک سفید پوش  
شخص کمرہ میں داخل ہوا۔

”جناب میں انتہائی ادب سے معافی چاہتا ہوں کہ میں بغیر اطلاع کے  
آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ پریشانیوں نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے۔ خدا  
کے لئے آپ میرے معاملات میں دلچسپی لیتے اور ایک بیگناہ کی جان بچا لیتے“  
میں نے جاسوس کی طرف دیکھا۔ اور جاسوس نے سخی خیر نگاہوں  
سے مجھے دیکھا۔ قریب ہی تھا کہ میں اسے دیوانہ سمجھتے ہوئے نکلوا دوں کہ  
جاسوس نے اس سے مزید حالات بیان کرنے کی فرمائش کی۔

نووارو، میرا بھائی دلی محمد انتہائی تعجب انگیز معایب میں  
مبتلا ہے۔ فی الحال وہ پولیس کی حراست میں ہے اور قتل کے مقدمہ میں  
ماخوذ ہے!“

جاسوس، آپ تمام واقعات بلا کم و کاست بیان کیجئے۔  
نووارو، میں تمام واقعات بلا کم و کاست بیان کروں گا۔ مشکل  
یہ ہے کہ ان کی ابتدا کہاں سے کی جائے۔ ان میں کچھ تجارتی معاملات ہیں

اور کچھ خانگی، میں تجارتی معاملات سے ابتدا کرتا ہوں۔ دلی محمد جواہرات  
کی ایک بڑی دکان کا سفری ایجنٹ ہے۔ سفر کی حالت میں وہ بہت کم  
سامان اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ بڑے دوکانداروں کو یہ سامان بطور نونہ دکھایا  
جاتا تھا اور بچھونے سودا گروں کے ہاتھ اسے فروخت بھی کر دیا جاتا تھا۔ ہفتہ  
کے ختم ہوتے ہوتے وہ مکان واپس آجایا کرتا تھا۔ ابکی مرتبہ جب وہ جلنے لگا  
تو اس نے تمام سامان ایک بڑے صندوق میں رکھا اور تجوری کو خالی کر دیا  
خدا جانے اس مرتبہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بہر حال صندوق لیکر وہ دلی گیا،  
مالگدام میں اسے رکھ دیا اور تفریح کیلئے روانہ ہو گیا۔ وہ ایک غیر آباد سڑک  
پر چل رہا تھا کہ اسے ایک بٹوہ ملا۔ اس پر کسی کا نام نہیں تحریر تھا۔ دلی محمد نے  
ارادہ کر لیا تھا کہ اس کو تھانہ پر جمع کر دیا جائیگا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے کرایہ کی گاڑی روکی اور اس میں  
بیٹھ گیا چند قدم چلنے کے بعد ایک عورت نے گاڑی کو روک لیا اور اس کے قریب  
بیٹھ گئی۔ جب گاڑی والے نے کرایہ کا مطالبہ کیا تو عورت نے اپنے جیبوں  
کی تلاشی لی۔ اس کے بعد دلی محمد سے بٹوہ کی واپسی کی مطالب ہوئی۔ اس نے  
بٹوہ سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس مکارہ نے اب شور و غل مچایا کہ اس نے  
میری گرہ کاٹی ہے۔ گاڑی والے نے آگے چل کر دونوں کو سڑک پر کھڑے  
ہوئے پولیس مین کے سپرد کر دیا۔ تھانہ پر داروغہ نے عورت سے چند سوالات  
کئے۔ میرے بھائی کے غم و غصہ کی انتہا تھی جب اسے معلوم ہوا کہ عورت  
اسی بٹوہ کا ذکر کر رہی ہے جسے اس نے سڑک سے اٹھایا تھا۔ اور جو اب  
اس کی جیب میں تھا۔ دلی محمد نے واقعہ بیان کیا لیکن یہ کہنا فضول ہے کہ  
وہ باور نہ کیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ گلو خلاصی مشکل ہے اس نے اپنا نام بھی  
غلط بتا دیا۔

کرسمس کی تعطیلات کے بعد مقدمہ پیش ہوا، مدیر حاضر عدالت نہیں ہوئی اس وجہ سے دلی محمد رہا کر دیا گیا۔ رہا ہوتے ہی وہ اسٹیشن کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے اخبار نامہ خرید اور ذاتیات کے کالم میں اس کی نگاہیں خود اسی کے نام پر پڑیں۔

”ایک صندوق کے متعلق میں نے اس کی بات کلتے ہوئے کہا۔“  
”جی ہاں! کیا آپ کی نگاہوں سے وہ غصہ گنداسہ ہے؟ اس صندوق میں جواہرات تھے اور اسی نے وہ ریشمان تھا۔ وہ جب اسٹیشن پہنچا تو اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔“

(۲)

”اچھا اب اس کی خانگی زندگی کے حالات سنئے، تو دارونے کسا تیں افسوس کے ساتھ عرض کر دینگا کہ دلی محمد ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا جس سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے عقد کر لے گا لیکن ساتھ رہنے کے بعد اسے نہایت تلخ تجربات ہوئے۔ وہ اس کی صورت کا غلام تھا لیکن سیرت کا دشمن۔ وہ بد مزاج تھی اور شرابی کر تو وہ اہل عمل کیلئے مستقل مذہب ہو جاتی تھی۔ تھینٹر کی ایک کمپنی سے اس کا معاہدہ بھی تھا۔ اس کا میل جول بھی مشکوک لوگوں سے تھا۔ حادثہ سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ دلی محمد نے اس سے مل کر شرفاء کی صحبت کو قریب قریب غریب ہی کہہ دیا تھا۔ آخر کار ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ پھٹک ہی گیا۔ میرے بھائی نے ایک شریف عورت سے عقد کی سلسلہ جنبانی کی جس کو اس نے اس شرط پر منظور کیا کہ وہ محتاط زندگی بسر کرے اور کچھ رقم پسند انداز کرے اس کے بعد دلی محمد نے اس عورت کو جس کا نام جمیلہ تھا، گھر سے نکال دیا۔ لیکن اس نے ایک تیمامت برپا کر دی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ مکان کا ایک حصہ اسے رہائش کے لئے دیدیا جائے۔“

مکان کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اس کی کبھی جمیلہ بائی نے اپنے پاس رکھی۔ وہ وقتاً فوقتاً اب بھی مکان میں آتی رہی۔

بہتر ہو گا کہ اب آپ اپنی توجہ اسٹیشن دہلی کی جانب مبذول فرمائیے۔ دلی محمد کے مال گد ام سے جانے کے ایک ہفتہ بعد لوگوں نے شکایت کی کہ مال گودام میں بوجہ بوسہ۔ اسٹیشن ماسٹر اور محافظ مال گودام نے صفائی کرائی۔ دلی محمد کے کہیں کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ میعاد سے زیادہ چکا ہے۔ اسے ہٹانے پر

معلوم ہوا کہ بدو اسی صندوق سے آرہی تھی۔ پولیس طلب کی گئی۔ اشتہار دیا گیا اور صندوق کھولا گیا۔ اس میں سے ایک عورت کا بایاں ہاتھ اور کچھ خون آلود کپڑے برآمد ہوئے۔ مزید تفتیش سے پولیس نے یہ نتیجہ نکالا کہ دلی محمد ایک دن مچھلیوں کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تالاب میں جال ڈالا گیا اس میں ایک داہنا ہاتھ جو بظاہر دستیاب شدہ ہاتھ کا جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ برآمد ہوا ایک پیر بھی دستیاب ہوا جس کے متعدد ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ صندوق سے جو ہاتھ برآمد ہوا تھا اس کی شناخت بھی آسان تھی اس پر لفظ ”رج۔ ب“ کندہ ہوئے تھے۔ اور یہ حروف جمیلہ بائی کے ہاتھ پر کندہ ہوئے دیکھے جا چکے تھے۔ لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جمیلہ بائی آخری بار میرے بھائی کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھی گئی ہے۔ اس اطلاع پر پولیس مکان میں داخل ہوئی اور تلاشی لی۔

”کیا تمہیں علم ہے کہ ان کو کوئی چیز مکان سے بھی دستیاب ہوئی؟“  
جاسوس نے سوال کیا۔

”نہیں جناب مجھے اس کا علم اب تک نہیں ہو سکا۔“ نووارد نے جواب دیا۔

”تمہارے بھائی نے تمہیں بتایا کہ ہاتھ اس کے صندوق میں کیسے نکلا؟“  
”جناب! اس کا خیال ہے کہ مال گودام میں اس کے جواہرات خاں کے لئے گئے اور وہ ہاتھ صندوق میں رکھ دیا گیا۔ مال گودام میں ہر شخص اپنا سامان جمع کرنے کیلئے جاسکتا ہے۔“

”کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو مقتول سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو؟“  
جاسوس نے پوچھا۔

”مجی نہیں! کوئی خاص آدمی میری نگاہ میں نہیں ہے۔ جمیلہ بائی سے اہل عمل متفرغ ضرور تھے اور میرا بھائی اس سے چھپکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔“  
”ابھی تم نے حادثہ کا نام لیا تھا۔ ان میں تو کوئی لڑائی جھگڑہ نہیں ہو؟“  
”وہ دونوں انتہائی خلوص سے ملتے تھے اگر لڑائی ہوئی ہوتی تو حادثہ اس سے علحدہ ہو سکتا تھا۔ قتل کا ارتکاب کیوں کرتا؟“

”حادثہ کے متعلق تم اور کچھ جانتے ہو؟“  
”وہ ایک لڑھکتا ہوا پتھر تھا۔ کبھی ایک مقام پر نہیں رہا۔ آج یہاں کل دہاں، ہر طرح کی ملازمتیں اس نے کی ہیں یہاں تک کہ اس نے مردہ کو



کو عجائب خانوں میں فروخت کیلئے، لیکن جناب قتل کرنے میں اس کی کیا غایت پوشیدہ ہو سکتی ہے؟“

”یہی تو ایک سوال ہے تمہارے بھائی کے یہاں خشتہ اور غایت“  
دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ اچھا ولی محمد نے کبھی جمیلہ بانی کو قتل کی دھمکی تو نہیں دی؟“ جاسوس نے پوچھا۔

”افسوس ایسا بھی ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا اب میں اس معاملہ پر غور کروں گا یہ کہنا بیکار ہی ہے کہ حادثہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔“ جاسوس نے کہا۔

”درست ہے! لیکن ہم کو خداوند کریم پر مہر و سہ رکھنا چاہئے! جناب وہ بالکل بے گناہ ہے! اسے پھیلے!“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا تپہ میز پر رکھ دیا اور سرخ و افسوس کے ساتھ رخصت ہوا۔

(۳)

”میرا خیال ہے کہ آپ اپنی تحقیقات دہلی اسٹیشن سے شروع کیجئے گا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! ہم کو عجلت کرنی چاہئے۔ پولیس سے اجازت حاصل کر لیں؟“ جاسوس نے دریافت کیا۔

”ہاں اجازت حاصل کر لی ہے، لیکن امین صاحب آپ سے قبل تفتیش کے لئے روانہ ہو چکے ہیں میں نے کہا۔“

جاسوس نے اپنا سفری بیگ جسے وہ کسی حالت میں بھی غلط نہیں کرتا تھا اٹھایا اور اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستہ میں میرے مخاطب کرنے پر بھی اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اسٹیشن پر امین صاحب تہا سرگرمی سے تفتیش فرما رہے تھے۔ ہمارے جاسوس کو دیکھتے ہی بولے، ”آئیے آئیے! خالد صاحب! مگر دیکھئے آپ ملزم کی اعانت نہ کیجئے گا۔ ورنہ اس معاملہ میں آپ کی شہرت پر بہت ہی خراب اثر پڑے گا۔ میں نے اس کمرہ کا بھی معائنہ کر لیا ہے۔ وہاں ایک بوتل میں کچھ گولیاں فراہم ہوئی ہیں کہ وہیں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ہم لوگ قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں لاش کے کچھ ٹکڑے بھی ملے۔ میں نے ماہرین کے پاس انھیں بھیجا۔ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ وہ ایک عورت کی لاش کے ٹکڑے ہیں، اس کی عمر کا اندازہ

۱۲ سال کیا جاتا ہے اور تقریباً یہی جمیلہ بانی کا بدن تھا۔ گولیوں کے زہر

کا اثر بھی لاش سے ظاہر ہو رہا تھا۔ دیکھئے یہ گولیاں ہیں۔“ خالد کا یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ معاملہ کی تفتیش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ان سے کیا کہا گیا ہے اس وقت بھی وہ اسی صورت سے تحقیقات میں مصروف تھے جیسے کہ ان کو لاش کے متعلق کوئی علم ہی نہیں تھا۔ انھوں نے لاش کا معائنہ کیا۔ ہر ٹکڑے کی پیمائش کی۔ اس کے بعد مردہ انگلیوں کے نشانات آمارے۔ وہ کھڑے ہوئے حروف پر خاص توجہ دے رہے تھے بار بار خوردین لگا کر انھیں دیکھتے تھے۔

خالد کو اس طرح مصروف دیکھ کر امین صاحب نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے خالد صاحب کو خوردین استعمال کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے میرا خیال ہے کہ اگر تاج محل ہو تو اس کا معائنہ بھی خود دین ہی سے کیجئے۔ دیکھئے! جو حروف میں فٹ کے فاصلے سے پڑے جا سکتے ہیں ان کو بھی وہ خوردین سے دیکھ رہے ہیں۔“ خالد اب تک اسی طرح مصروف رہے اس کے بعد انھوں نے اپنی نوچ صندوق پر مبذول کی جس پر ”و۔م“ لکھا ہوا تھا۔ اس کی بھی پیمائش کی گئی۔

”اب آپ لوگ چل سکتے ہیں! خالد نے کہا۔“

”ولی محمد نے بیان غلط دیا ہے! کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا تھا کہ لاش لے جلے صندوق خالی کرے۔ پھر دوسرے صندوق سے لاش نکالے اور اس صندوق میں رکھے۔ صندوق میں نہایت عمدہ قفل لگا ہوا تھا جو توڑا بھی نہیں گیا۔ میری موجودگی میں میرے حکم سے وہ قفل توڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مال گودام میں ہر وقت آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہاں کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ لیجئے سمنے سے محافظ مال گودام بھی آرہے ہیں“ امین نے خالد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خالد۔ کیوں محافظ صاحب ولی محمد کی روانگی کے بعد کن لوگوں نے مال جمع کیا۔؟“

محافظ، بہتر ہوگا کہ آپ رجسٹر دیکھ لیں۔“

خالد نے رجسٹر سے چند نام اپنی نوٹ بک میں نقل کئے اور امین صاحب سرکاری سراغزساں اور محافظ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تماشہ کے محل ہیرو ولی محمد سے ملنے کے لئے جیل کی جانب قدم اٹھائے۔

(۴)

”دیکھو دلی محمد! تم جس قدر واقعات بیان کر گئے اسی قدر آسانیاں اپنی راہ میں پیدا کر گئے؟“ خالد نے کہا۔

”سرکار! میں کیا عرض کروں، میں بالکل بے تصور ہوں، جمیل کے خون سے میرا دامن ویسا ہی پاک ہے جیسا آپ کا۔“

”میں واقعات پوچھتا ہوں واقعات! کیا اپنی بے تصور کی کارگاہ اپنے سے مجرم بے تصور سمجھا جاتا ہے، ہمت کرو، شاید کوئی ایسی بات جسے تم اہم نہ سمجھتے ہو، میرے نزدیک اہم ہو۔ وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟“

”جمیل بانی کا قد پانچ فٹ ۷۔ انچ تھا۔ اس کے بال نہرے تھے میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی دشمن نہ تھا۔ وہ اپنی جماعت میں ہر دلعزیز تھی۔“

”تمہارے کمرہ سے امین صاحب سرکاری سراغ رساں نے کچھ گولیاں برآمد کی ہیں!“

ایک بار میں طبل ہوا تھا۔ ڈاکٹر جمیل کے مشورہ سے انھیں میں لایا تھا۔ لیکن ان کو میں نے مطلقاً استعمال نہیں کیا۔ وہ شیشی سر بھر رکھی ہے۔

میری حیرت کی انتہا نہ تھی جب خالد نے رخصت ہوتے وقت دلی محمد کو اطمینان دلایا کہ ”تم کو رنجیدہ اور غم جو ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرا خیال ہے کہ تم بڑی ہو جاؤ گے۔“

(۵)

میں نے امین صاحب کو اس وقت چا، پردہ عوکیلے اور اب ان کی تشریف آوری کا منتظر ہوں۔ خدا خدا کہ وہ وقت آگیا کہ میں دلی محمد کو بری کر سکوں۔“

امین صاحب کمرہ میں داخل ہوئے اور معمولی صاحب سلامتی کے بعد فرمایا۔ ”خالد صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں۔ دلی محمد کلاسن جمیل بانی کے خون سے پاک؟ میں نے اپنی تحقیقات کے نتائج مرتب کیے ہیں۔ ہمارے پاس جمیل کی لاش ہے۔ دلی محمد اور جمیل کے تعلقات نامہ شگوار ہیں۔“

دلی محمد کے صندوق سے لاش برآمد ہوئی ہے، دوسرا حصہ مکان سے برآمد ہوا ہے۔ دلی محمد نے اکثر تفتو کو دھمکایا ہے۔ زہریلی گولیاں پائی گئی ہیں۔ دلی محمد صندوق جمع کرنے کے بعد عرصہ تک لاپتہ رہا، کیا اب بھی کسی بات کی کمی ہے؟ کیا اب بھی دلی محمد قاتل نہیں ہے؟ غلط، سرکار۔“

”سراغ رساں کی باتوں کو سن کر خالد سکریا۔“

”آپ نے غلط آدمی، غلط صندوق اور حدیث ہے کہ غلط لاش دستیاب کی ہے۔“

امین پر معلوم ہوتا تھا کہ بجلی نے اپنا اثر کر دیا ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ میری بھی یہی کیفیت تھی۔

”خالد صاحب! لاش پر نام کے ابتدائی حروف بھی نوکھڑے ہوئے ہیں امین نے کہا۔“

”جمیل بانی طویل القامت تھی اس کی لمبائی پانچ فٹ پانچ انچ تھی اور عورت پانچ فٹ تین انچ سے تجاوز نہیں کرتی جمیل کے بائیں ہاتھ پر گولے کے نشانات تھے، اس عورت کے نہیں تھے۔“

”نہیں تھے؟ کیوں؟ میں نے اور آپ نے ان نشانوں کو لاش پر نہیں دیکھا؟“ امین نے سوال کیا۔

”میں لاش کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، بلکہ عورت کا، جن نشانات کو ہم نے دیکھا ہے وہ مرنے کے بعد بنائے گئے ہیں اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ زندگی میں یہ نشانات نہیں تھے، خالد نے جواب دیا۔“

”کیا آپ کو اس کا یقین کامل ہے؟“ امین نے فریاد کیا۔

”ہاں! اگر خوردبین سے آپ دیکھیں تو آپ میرے ہم خیال ہونگے زندہ جسم میں سوئی کے نشانات بھر جاتے ہیں اور مردہ جسم میں کھلے رہتے ہیں اور خوردبین سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مردہ جسم کو مجرم نے خوب غسل دیا اور اس کی سطح کو کسی نرم چیز سے دیا یا تاہم سوراخ نمایاں ہیں۔ ان میں نشانی بھی موجود ہے۔“ خالد نے جواب دیا۔

”اچھا، اب صندوق کا معاملہ لیجئے، آپ کو اس کا علم کیونکر ہوا کہ وہ دوسرا صندوق ہے؟“ امین نے کہا۔

”یہ بھی بالکل صاف ہے۔ دلی محمد کا صندوق ”احسان اینڈ سنز“ کے کارخانے کا بنا ہوا ہے۔ گزشتہ اپریل کی ۹ تاریخ کو اس نے خرید کر اپنے نام کے ابتدائی حروف لکھائے تھے۔ قفل پر تاب اینڈ برادرز کے کارخانے کے ہیں۔ قفل اعلیٰ پیمانہ کے ہیں، اس لئے ان پر جبری شدہ نہیں ہیں۔ اس قفل پر وہ نمبر بھی نہیں ہیں۔ پر تاب کے یہاں جلنے سے معلوم ہوا کہ یہ تالے تیرہ جولائی کو فروخت ہوئے۔ اب آپ سمجھے؟ خالد نے جواب دیا۔“

”اچھا یہ فرمائیے کہ یہ صندوق کس کا ہے؟“ امین نے تھک کر کیا۔

”ابلیہ پریم کا!“

”یہ کون ہے؟“

”جو پہلے جمیلہ بانی کے نام سے مشہور تھی۔“

”مرحومہ! لیکن وہ اپنا ہاتھ کیسے چھوڑ جاتی، لاش کے ٹکڑے کس سے ہیں؟“

”ٹھہریئے! آپ کو گرہ کٹنے کا علم ہے۔ دلی محمد پر یہ الزام مایہ تھا۔ یہ

ایک سازش تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ دلی محمد اتنے دنوں کیلئے اس مقدمہ

میں الجھ رہے تاکہ ان کو اس کا موقع مل جائے کہ صندوق بدلے جائیں اور

لاش کے ٹکڑے مکان پر اور دریا میں رکھے جاسکیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے

والے ایک سے زیادہ ہیں۔ جمیلہ بانی تک ان کا پہنچنا نہایت ضروری تھا

تاکہ وہ پوری نقل اتار سکیں، مردہ جسم پر جف کئے دہرنے کے وہ ماہر ہونگے۔

دلی محمد کے یہاں ان کی آمد رفت ہوگی، ان کے قبضہ میں ایک عورت کی لاش

بھی تھی۔“ خالد نے کہا۔

”لیکن ایسی عورت اور کون ہو سکتی ہے؟“ امین نے پوچھا۔

خود جمیلہ بانی! اور حامد جس سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے

حامد اس سے قبل ایسی تجارت کر چکا ہے۔“

”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔“

”اور سنئے حامد صاحب کی اہلیہ بھی مفقود ہیں؟“

۲۹ جولائی کو دلی محمد اسٹیشن آیا، گرہ کٹ کی حیثیت سے

گرفتار کیا گیا اس کے بعد اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ انہیں تاریخوں میں اہلیہ

حامد لاپتہ ہوئی۔ اس کے بعد اہلیہ پریم دلی اسٹیشن کے مال گدام میں ایک

صندوق جمع کرتی ہے جو یقیناً انہیں تاریخوں کے اندر خرید لگایا ہے اس

صندوق سے عورت کا ہاتھ دستیاب ہوتا ہے اس کے بعد لاش کے ٹکڑے

دلی محمد کے یہاں برآمد کئے جاتے ہیں۔ دلی محمد مصلحتاً رہا کر لیا جاتا ہے، مدعیہ

مضر عدالت نہیں کی جاتی۔ دلی محمد قاتل کی حیثیت سے گرفتار کیا جاتا ہے

دلی محمد اگر قاتل ہوتا تو اس نے لاش کا کوئی حصہ اپنے صندوق میں بند ہی

کیوں کیا ہوتا اور پھر اسے مال گدام میں چھوڑ ہی کیوں کیا ہوتا؟“

”اپنے مجمع نتائج اخذ کئے ہیں، میں غلط راستے پر تھا اچھا اب ہم کو حامد

کی جستجو کرنی چاہئے۔“ امین نے کہا۔

”آپ اس کو مکان پر نہیں پائینگے۔ وہ دیہات میں ہے۔ اسے ہنگ

کا حساب بھی منتقل کر لیا ہے۔“

”تو ہیں دیہات کا سفر اختیار کرنا چاہئے!“

۴۔ چار مہینہ بعد میں خالد صاحب کو انہی گوشوں پر مبرا رکھا پیش کی گئی کہ اچھا مد کے قاتل

اپنی کینفر دار کو پہنچے حامد کو سزا موت ملی اور جمیلہ بانی کو گولہ قید باشت کی سزا!

## خام نمبر ۱۹۳۷ء

کی تیاری میں اردو کے تمام چوٹی کے بلند پایہ

ادباء اور شعراء نے حصہ لیا ہے آپ اس،

مجموعہ رنگ و بو

کو ملاحظہ فرمائیں مگر یقیناً بہت زیادہ

مخطوطا ہونگے

گلستان علم و ادب کے رنگارنگ اور اچھوتے پھولوں کا،

ترقازہ اور شاداب گلستانہ

عالمگیر

## خام نمبر ۱۹۳۷ء

کے نام سے،

بزم اردو میں دسمبر کے پہلے ہفت میں

پیش کیا جائیگا

# سحرِ حلال

پرفیسر فراق لیم۔ اے، گورکھپوری،

اے دردِ ہجر تو ہی بنا کتنی رات ہے  
حیرتِ سرائے عشق میں دن، نہ رات ہے  
اب عشق ماورائے حیات و ممات ہے  
اور یوں تو عمر خضر بھی کیا، بے ثبات ہے  
خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے  
وہ دل قرار پائے تقدّر کی بات ہے  
کس کو دماغ کاوش ذاتِ صوفات ہے  
زندگیاں عقل تیری تو کیا کائنات ہے  
جن سے یہ تیری تاروں بھری بات ہے  
بیگانہ قیود حیات اب حیات ہے  
یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے  
ان کی بھی اہل کشف و کرامات ذات ہے  
تم دل دکھاؤ وقت مصیبت تو بات ہے

ہوش و حواس میں شبِ غم کب حیات ہے  
دورِ فلک یہاں نہیں دورِ حیات ہے  
کچھ بے ثبات ہی ہے نہ کچھ باثبات ہے  
جینا جو آگیا تو اجل بھی حیات ہے  
کیوں انتہائے ہوش کو سمجھے ہیں بخودی  
ہستی کو جس نے زلزلہ سا مال بنا دیا  
یہ مونگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر  
توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے  
گردوں! شرارِ برقِ دل بہت سارا دیکھ  
ٹوٹے فریبِ بخودی و ہوشِ عشق میں  
ہستی کو تیرے گردنے کچھ اور کر دیا،  
گم ہو کے ہر جگہ ہیں زخود رنگانِ عشق  
یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بد نصیب

عنوان غفلتوں کو ہیں فرقت ہو یا حال  
بس فرصتِ حیاتِ فراق ایک رات ہے

# گلزار

## شاہی زمانہ کے شاہی چور کی حیرت انگیز داستان

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

کیونکہ شاہی جیلخانے میں بھی قیدیوں کو کوئی تکلیف گھرانے کے سوا نہ تھی مہنی غذا تو اچھی نہ ملتی تھی باقی سب طرح کا آرام تھا کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ دوست احباب دیکھ سکتے تھے، عزیز و اقارب مل سکتے تھے، اگر تکلیف تھی تو یہ تھی کہ قیدی گھر نہیں آ سکتا تھا۔ بعینہ یہی حالت تھی جیسے آج کل انگریزی جیل خانوں میں انگریز قیدی مگر اس پر بھی میر صاحب کو زندگی حرام تھی، یارباش اور زندہ دل آدمی ان کے لئے تو اتنی قید بھی دوزخ کی کم نہ تھی۔

معرم سے دو ماہ قبل بادشاہ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ فدوی گردش فلک سے چوری کے الزام میں ناحق گرفتار ہو کر مبتلائے مصیبت ہے شیعہ مذہب ہے اور محرم کا زمانہ قریب ہے اور میں ماتم دار حسین ہوں۔ ہر سال تعزیر رکھتا ہوں۔ اگر اس زمانہ میں بھی زندان مصیبت سے رہا نہ ہوا تو قیامت میں دربار حسین میں فریاد کروں گا۔ واسطہ خون حسین کا مجھے تعزیر داری کی اجازت دی جائے۔ بعد ایام غزا حاضر ہو کر سزا کی مدت پوری کر دوں گا۔ یہ عرضی نصف الدولہ سید باقر صاحب قبل مجتہد مہتمم عدالت فوجیہ کے حضور میں پیش ہوئی اور حکم ہوا کہ لازم بری کیا جائے۔ میر غلام عباس بہا ہو خوشی خوشی گھر پر آئے۔ بیروازی ہونے لگی۔ یاروں میں افیون چلنے لگی محرم میں ماتم دار حسین بنے۔ سیاہ کپڑے پہنے گلے میں ناڑا ڈالا۔ خوب خوب مجلسیں کیں۔ ہر جگہ شریک بزم غرا ہوئے اور بعد اربعین منصف الدولہ بہادر کے اجلاس پر حاضر ہو گئے کہ بقیہ سزا بگلت آؤں۔ عدالت نے ازراہ ترحم سزا معاف کر دی اور ہدایت کی کہ تم شریف آدمی ہو ایسی حرکت آئندہ سرزد نہ ہو۔

میر غلام عباس لکھنؤ کے قدیم باشندے اور ایک شریف ب کے بیٹے تھے۔ صورت شکل اچھی گورے چہرے۔ میانہ قد۔ کم رو۔ نحیف الجشتہ۔ تعلیم یافتہ و صندار۔ دوست نواز۔ علم مجلس سے واقف۔ باتیں ایسی لچھے دار کہ بہروں سنا کیجئے۔ معمول تھا کہ سہ پہر کو چوک کی ہوا کھانے ضرور نکلتے تھے۔ جالی کا کرتہ اور شربتی کی اچکن، کندھے پر چکن کا رومال، ہاتھ فیروزے کی انگوٹھی، دوپٹی چکن کی ٹوپی گھڑی میں سونے کی زنجیر۔ دیکھنے میں شریف و رئیس معلوم ہوتے تھے مگر اس شکل و صورت کے ساتھ خدانے ایک سبب بھی دیا تھا یعنی چور اول نمبر کے تھے۔

حضرت خاقان زماں محمد امجد علی شاہ کا زمانہ ہے۔ امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر و الفقار جنگ خلعت اور ہاتھی بالکی سے سرفراز ہو کر سند وزارت پر جلوہ گر ہیں۔ مرزا علی رضا بیگ کو تو مال شہر رومی دروازے پر کو تو الی کر رہے ہیں۔ میر غلام عباس کی سفایوں کا شہر میں شہر ہے وہاں اپنی دولت کی حفاظت میں کوشش بلیغ کر رہے ہیں۔ لیکن میر صاحب کی کارروائیوں کا سکہ ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ لوگ ان کی خدمت میں دینے نہیں کہتے جس رئیس سے جتنی رقم طلب کی جاتی ہے گھر بیٹھے چلی آتی ہے اسی چوری کے مال سے میر صاحب خمس و زکوٰۃ بھی نکالتے ہیں مغرب غراب کے ساتھ سلوک ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی جگہ دھرائے گئے اور بعد تحقیق جرم ثابت ہوا عدالت سے ایک سال کی سزا ہوئی مہینہ بھر تک دوران مقدمہ میں بند ہو جانے میں رہے گھر سے کھانا جاتا تھا۔ جس دن سے سزا کا حکم سنایا گیا سچے دل سے اسٹبل میں قید ہوئے۔ تو بھی گھر سے کھانا، افیون، متبا کو، روٹیاں پہنچتا تھا

ایک دن ڈپٹی نواب معین الدولہ نے میر صاحب کو ایک گھر بنایا دکھایا جس کی چمک سے میر صاحب کی آنکھوں میں خیرگی آگئی اور ارشاد کیا کہ میرے پاس اس کی ایک ہی فرد ہے۔ یا تو کہیں سے مجھے ایسا موتی بہم پہنچا دو یا اسے تم چرایا جائے۔ میں نے تم کو بھل کیا۔ میر صاحب نے کئی روز کا وقفہ دیکر رات کو پشت دولت سرا سے کند ڈالی۔ کوٹھی میں داخل ہوئے دیکھا نواب محسن خان میں مسہری پر آرام کر رہے ہیں۔ آپ نے آہستہ آہستہ پنکھا جھلا، نواب صاحب نے کردٹ بدلی۔ کبھی کاٹھا ازار بند میں بند ہا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو معلوم ہوا ازار بند میں ایک دوسری گرہ بھی دی ہوئی ہے۔ اسے بھی کھولا تو وہی موتی نکلا۔ میر صاحب نے کبھی کاٹھا تو باندھ دیا اور موتی لیکر چلتے ہوئے۔ دوسرے دن نواب کی ملاقات کو آئے تو وہی موتی پیش کیا اور کہا غلام نے آپ کی فرمائش پوری کر دی۔ نواب نے دیکھا تو حقیقت میں موتی ویسا ہی تھا۔ بہت پسند کیا اور کہا بھئی اس کی قیمت کیا لوگے؟ میر صاحب نے کہا پہلے آپ اپنا موتی محل سے لائیں اور دو نوں کو ملا کر دیکھیں۔ نواب نے خیال کیا کہ موتی تو میرے پاس ہے مگر ان کے سامنے ازار بند سے کالنا کر کیا بات ہے۔ اس لئے محل میں گئے اور وہاں دیکھا تو ازار بند خالی ہے۔ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے اور کہنے لگے ۶

این کاراز تو آید و مرداں چنین کنند

پھر میر صاحب کے کہا۔ بیش مانوگا، کوئی ہزار دھارے قلعہ میں ہے ورنہ میر موتی کا غائب ہونا خلاف قیاس امر ہے۔ میر صاحب نے اول سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ سن کر بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے تو یہ موتی آپ کی محنت کا صلہ ہے آپ ہی اسے قبول کریں یا مجھ سے اس کی قیمت لے لیں میر صاحب نے کہا میں نے آج تک کسی دوست کے مال پر نظر نہیں ڈالی میرے محلے کے لوگ گھر کا دروازہ بند کر کے نہیں سوتے اور ان کا ایک تنکا بھی نہیں جاتا۔ مجھ پر تو آپ کا مال حرام ہے۔

میر صاحب حیدری طوائف کے عاشقوں میں سے تھے صورت، شکل تو کچھ اچھی نہ تھی۔ سانولا رنگ، بیک کے داغ اس کثرت سے گھرے گھرے تھے کہ الامان اگر گلا نور کا پایا تھا۔ امیر مرزا ایک بانٹے تھے، وہ بھی اسی پر مرتے تھے مگر میر صاحب کی آشنائی سابق سے تھی اور حیدری میر صاحب سے محبت کرتی تھی۔ اس کا وسیع اماں بارہ انھیں کی دولت سے تعمیر ہوا۔ ایک

دن حیدری نے فرمائش کی کہ میر صاحب تمہاری بدولت بہت چہن کیا دو و ثروت جو کچھ میرے پاس ہے سب تمہاری دی ہوئی ہے مگر میں نے کج کرم بخش طوائف کے ہاتھ میں میرے کے جڑاؤ کڑے شیر دہاں دیکھے تو دل لٹ ہو گیا۔ جہاں سے بنے مجھے بھی ویسے ہی کڑے بنوا دو۔ میر صاحب نے کہا مجھے وہ کڑے دکھا دو اس نے کرم بخش سے ٹکوا دیئے آپ نے غور سے دیکھا اور کہا بس یہی دیکھنا تھا مجھے معلوم ہو گیا جس سنا نے اسے بنایا ہے۔ لیکن ہوا تو اس سے بہتر تم کو بنوا دوں گا۔ اپنے شاگردوں سے بھی کہہ دیا کہ اس طرح کے کڑے کی جوڑی کہیں دیکھنا تو ہیں اطلاع دینا۔

خبر ملی کہ آٹوچی قادر بخش کی ماں کے پاس ایک جوڑی کڑے کی بہت نفیس قدسیہ محل کی دی ہوئی موجود ہے اور وہ آج کل پٹنہ سے لکھنؤ میں آئی ہوئی ہیں اور گولہ گج کے قریب کسی کوٹھی میں رہتی ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی میر صاحب کو فکر پیدا ہوئی۔ کوٹھی کو دیکھنے گئے۔ موقع دیکھا ملازموں سے ملاقات کی۔ پہرہ داروں کے نام پوچھے۔ آرام خاص کا وقت دریافت کیا۔ مکان کا نقشہ دیکھا پوچھتے پوچھتے یہ پتہ بھی مل گیا کہ آٹوچی کے پاس جہاں دزیورات کی قسم سے نواب قدسیہ محل کا دیا ہوا تھوڑا بہت جو صرف سے باقی رہ گیا ہے وہ سب لوہے کی الماری میں مقفل ہے اور الماری کے پاس آٹوچی کی مسہری لگی ہوئی ہے اور وہاں دن رات کھوناسی بیٹھی رہتی ہیں صرف دو تین مرتبہ چوکی پر تو جاتی ہیں نماز کے لئے مسہری کے پاس چوکاٹا ہوا ہے اس پر سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے اور جاننا زکھی ہے اس پاس پیش خدمتیں مائیں اپنے اپنے دالانوں میں رہتی ہیں قریب ہی باؤچی خانہ ہے آدمی رات تک تو کھانے سے فراغت ہوتی ہے۔

میر صاحب جب سب پوچھ چکے تو ایک دن اندھیری رات میں مکان کی چھت پر باہر سے چڑھے اور زینہ سے آہستہ آہستہ اتر رہے تھے کہ آٹوچی کے کھنکار نے کی آواز آئی۔ یہ سمجھ گئے کہ میرے باؤں کی چاب سے کھنک گزرا۔ چپکے کھڑے ہو کر جھانک کر دیکھا تو آٹوچی بیٹھی ہوئی ہیں اس وقت گھڑی دیگھی تو دو بجے تھے اب میر صاحب اس خیال میں ہیں کہ آٹھ لگے تو زینہ سے اتر کر مکان میں جاؤں مگر وہ خدا کی بندی اسی طرح بیٹھی رہی ابی بہت اندھیرا تھا کہ ماسے لائین جلو کر چوکی پر گئیں۔ اتنی فرصت میں میر صاحب مکان میں جلتے ہی کمرے میں گئے اور مسہری کے پاس سے الماری

کے قریب پہنچے تو دیکھا مامع لائین واپس آ رہی ہے اور آتو جی اب فریضہ صبح کے استعام میں میں یہ تو جھٹ الماری کے پیچے لیٹ رہے اور سچا رہے بھوکے پیاسے دن بھر لیٹے رہے سانس تک نہ لی۔ رات کو آتو جی جو کی پر گئیں اور لوگ کھانا پکانے میں مصروف تھے کہ انہوں نے آہستہ سے زت ماری تو الماری کا قفل کھٹ سے پیچے گر پڑا۔ آپ نے جواہرات کا سہند و تچہ اپنے پاس رکھ لیا اور تین بجے رات کو جب چوکیدار بھی خواب ناز میں تھے زینے سے کودے پڑا در کو کھٹ سے لگی میں جا کر بی حیدری کے امام باڑے میں پہنچے اور کہا ان چیزوں کو ذرا حفاظت سے رکھنا۔ صبح کو نہر میں ایک عام تہرت تھی کہ بی آتو جی کے گھر میں جھارو پھر گئی ایک تھک تک نہ بچا۔ خدا میں عرضی دی گئی۔ کو تو ال کو تھجیقات کا حکم ملا لیکن کچھ سراغ نہ لگا۔

کئی مہینے کے بعد عیش بلغ میں ساون نے سیلے ہو رہے تھے اور ساون کے آخری جمعے میں بُری دھوم دھام تھی تمام شہر کی زبڈیاں خیمے ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔ بی حیدری بھی ایک خیمہ میں فروکش ہیں جو نہایت نفیس قالینوں سے آراستہ ہے۔ کرمیاں نوٹ سے قرینے سے لگے ہیں خیمہ لگا نئی وردیاں زیب جسم کئے کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ہیرے کے کڑوں کی شیر دہاں جوڑی ایسی زینت دے رہی ہے کہ دیکھنے والے شہ نہر رہ جاتے ہیں۔ شہ شاہ کسی مخبر نے یہ خبر مرزا رضا علی بیگ کو تو ال کو پہنچائی وہ بجلہ ان کے خیمے میں آئے کڑوں کو غور سے دیر تک دیکھتے رہے۔ اتنے میں میر صاحب بھی آگئے۔ کو تو ال نے پہلے تو حیدر جان سے کہا۔ ماشاء اللہ آج تو آپ کا زیور سب زبڈیوں سے سبقت لے گیا سبحان اللہ مگر یہ کڑے کی جوڑی تو سارے لکھنؤ میں فرد ہے ذرا تکلیف نہ ہو تو اتار کر مجھے دکھائیے اس نے ایک کڑا اتار دیا۔ کہنے لگے دوسرے ہاتھ کے بھی اتار دیجئے تو دونوں کو ملا کر دیکھوں۔ پھر کہنے لگے یہ کب آپ نے بنوائے۔ اس نے کہا صاحب ہم کو بنوانے کی کیا ضرورت ہے اللہ رکھے میر صاحب کو جن کے دم سے ہم نے بہت کچھ چھین کیا۔ یہ بھی انھیں کا عطیہ ہے۔ میر صاحب دل میں کہنے لگے ہے ہے کیسی بیوقوف عورت ہے اول تو کو تو ال کے اتنے ہی اسے کڑے چھپا دیتا تھے اور نہ چھپائے تھے تو میرا نام لینا کیا ضرورت تھا۔ یہ کلہ سن کر کو تو ال صاحب میر صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔ کیوں جناب میر صاحب قبل آپ نے اس زیور کو کہاں سے بنوایا۔ میر صاحب نے حواس بجا کر جواب دیا۔ جناب

ہم کو زیور بنوانے کی کیا حاجت ہے۔ لکھنؤ آباد رہے ہمارے دم کے واسطے کیا کمی ہے اچھے سے اچھا کھاتے ہیں۔ اچھے سے اچھا پہنتے ہیں۔ مزے کرتے ہیں۔ کو تو ال صاحب نے کہا اچھا اس کا مزہ آپ کو اب چکھایا جائیگا۔ میر صاحب نے کہا ہتہ۔ کو تو ال کے ساتھ جو پولیس باہر کھڑی تھی اسے حکم دیا کہ میر صاحب کے ہاتھ میں تھکریاں ڈال دو۔ تھکری کا نام سن کر میر صاحب نے تیرے پیلے ہوئے جب پولیس والے تھکریاں پہنا چکے تو میر صاحب نے کو تو ال سے کہا کہ رضا علی کی تم اپنے دل میں سمجھتے ہو کہ میں ایک شریف سید کو بے عزتی سے گرفتار کر کے لے جاسکتا ہوں یہ کہہ کر دونوں ہاتھوں کو ایسا جھٹکا دیا کہ ہاتھ تھکریوں سے باہر نکل آئے اور پیچھے ہٹ کر کہا اچھا تم اتنے جوان ہو اور سب کی کمر میں تلواریں اگر مجھ کو گھیر کر پکڑ لو تو خط غلامی لکھے دیتا ہوں مرزا رضا علی تو جانتے تھے کہ میر صاحب کے مقابلے کا آج کوئی جوان شاطر نہیں ہے اس لئے خوشامد کرنے لگے۔ میر صاحب غلطی سے آپ کی خدمت میں گستاخی ہوئی۔ معاون کیجئے گا۔ پولیس دیہات کی ہے آپ کے حفظ مراتب کا اسے کیا خیال ہوتا آپ میرے دوست ہیں۔ میں سرکاری حکم سے مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ورنہ ایسا خیال بھی نہ ہوتا۔ اگر آپ کو ہماری بدنامی منظور ہے تو بسم اللہ آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اور اگر کچھ پاس ملاقات ہے تو عدالت تک تشریف لے چلئے ہم پیش کر کے اپنے عہد سے بری الذمہ ہو جائیگے اس وقت آپ کو اختیار ہے۔

میر صاحب نے کہا اچھا چلئے۔ ہم کو آپ کی آبرو کا پاس اپنی جان سے زیادہ ہے۔ میر غلام عباس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور بعد ثبوت جرم کچری سے گل لگانے کا حکم نافذ ہوا۔ مرزا رضا علی بیگ نے حکم پاتے ہی اس کی تعمیل کو لازمی سمجھا۔ کیونکہ وہ بھی میر صاحب سے جلے ہوئے تھے اور عہد شاہی میں اس قسم کی سزا بہت محبوب سمجھی جاتی تھی۔ جب تک میر صاحب کی سفارش کو اکابرین شہر آئیں آئیں مرزا رضا علی بیگ کو تو ال نے دو کڑے کے گول چھتے جن کا دور پیسے کے برابر تھا آگ میں لال کر کے میر صاحب کی دونوں کپٹیوں پر لگا دیئے۔ اس دن سے میر غلام عباس گلاباز کے نام سے مشہور ہو گئے۔

کچھ زمانے بعد غدر ہو گیا لوگ چار مہینے تک خانہ بدوش رہے بہت سے بے قصور آدمی بھوٹیوں کے ہاتھ سے مارے گئے بہت سے شرفا



میں ایک چمکے کے پیچھے ڈول سی لٹکی ہوئی تھی ہم کو آپ کی فرمائش کا خیال آگیا۔ دو آدمی ہمارے ساتھ اور بھی تھے انھوں نے دھوئی ندی میں چھائی اور گیلی گیلی لیکر شرک پر آگئے۔ ہم نے کہا اس دھوئی کو کھول کر کھانے کے بہانے سے اس چمکے کے پیچھے گھا دو جب انھوں نے آڑ کر لی تو ہم نے ڈول سی اتار کر کچھ انچ بھر لیا یہ دہی ڈول ہے۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ایک مہاجن سود بہت کھاتا ہے اور پرامالدا ہے۔ میرے صاحب نے ایک منہ و توجہ زیور جواہرات کا اپنے پاس سے نکالا اور اسی وضع قطع کا ایک منہ و توجہ بوالیا۔ اس پر زلف کا خلاف چڑھایا اور باج چھ آدمیوں کو دریاں نئی پھائیں اور ایک پنیں میں پردے کے منگوائی۔ نو بجے رات کو کھار بھوکرا اس پنیں میں دونوں منہ و توجہ رکھ دیئے اور پنیں کے ساتھ چند سپاہی کر دیئے اور ایک آدمی کو داروغہ صاحب بنا کر ہمراہ کیا۔ داروغہ صاحب بہت شان و شوکت سے مہاجن کے مکان پر آئے اور میان کیا کھنڈت پور کی رانی صاحبہ تشریف لائی ہیں چوڈیشی میں مقدمہ ریاست کی کل ایک پیشی ہے یہ ٹھاکر بلجدر سنگ کی بیوہ ہیں کچھ روپیہ سر دست ملے والوں کو دینے کی ضرورت ہے اور نہ دیا جائے تو مقدمہ خراب ہوا جائے۔ یہاں اس قدر روپیہ نہیں ہے علاقہ منع سیتا پور میں ہے سر دست پانچ سو روپیہ چلے ہے اگر تم نے رانی صاحبہ کا نام سنا ہو یا انھیں جانتے ہو تو اس وقت روپیہ دیدو جو سو دنگا دنگ ادا کیا جائیگا۔ اور پرسوں تمہارا سب روپیہ گاؤں سے منگوا دیا جائے گا اس میں بھی عذر ہو تو رانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میرے پاس جو زیور چالیس ہزار کی مالیت کا ہے اسے اپنے پاس رکھ لو۔ مہاجن نے کہا بھلا اس وقت روپیہ کی تدبیر کہاں ہو سکتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ زیور کا رکھنا جانچنا بھی تو مشکل ہے سویرے حوالہ ملے ہو سکتا ہے۔

داروغہ صاحب نے کہا۔ بات یہ ہے کہ اتنی جلدی اور ایسی سخت ضرورت نہوتی تو ہم بغیر سودی سو جگہ سے چالیس پچاس ہزار تمہاری دھاکے مانگ لاسکتے تھے۔ نواب شیش محل سے بھی لین دین ہے مگر رشوت کا معاملہ جوڈیشل کٹر کا عملہ فریق ثانی کی کوشش پر تو اسی وقت پانی پھر سکتا ہے جب ہم رات ہی کو ٹھکی گرم کر دیں ورنہ دوسرا فریق کامیاب ہو جائیگا کیونکہ رشوت تو قرض نہیں ہو سکتی دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا مال تو چالیس

کے گھرنے۔ تمام دو تہہ ذی عزت دانہ دانہ کو قلعہ ہو گئے۔ باغیوں کے شہر میں بہت سے ناکردہ گناہ تیر تیغ ہوئے۔ بعد تسلط ہزاروں نوجوان بڑے باپ کے سامنے عیش باغ کی بارہ دری میں سولی پر لٹکائے گئے۔ گورنمنٹ نے قبضہ کر کے تمام شہر میں کھڑیاں قائم کیں جیلخانے بنوائے اور ان کو خطر ناک سزائیں ملنے لگیں۔ رام بانس کو تے کو تے ہاتھوں میں چھاپے پڑ گئے چکی پیستے پیستے دم ناک میں آگیا۔ سخت محنت لی جانے لگی۔ بید پڑنے لگے یہ سب حال میرے صاحب نے سنا تو چوری سے توبہ کر لی اور نیا قانون ایجاد کیا بعض روسائے ہنسی سے کہا کہ حضرت آپ اپنے اپنا پیشہ اب کیوں چھوڑ دیا کہنے لگے بھائی وہ زمانہ اور تھا۔ ہم قوم بادشاہ تھا۔ ہم قوم حاکم تھے۔ یہ انگریز ست سمندر سے آئے ہیں ان کو ہمارا کیا درد ہوگا ان کی بلا سے مردہ و زنج میں جائے یا جنت میں انھیں اپنے صلوے ماندے سے کام ہے۔ یہ تو دشمن کی طرح سزا دیتے ہیں۔ ہمارے جینے مرنے کا انھیں افسوس نہیں ان کے وقت میں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہئے!

چوروں کے مختلف اقسام ہیں۔ ٹھاکر، یہ لوگ ایک قوم ہیں دیہات میں رہتے ہیں مسافروں کو دھوکہ دیکر جھگ کی طرف لے جاتے ہیں اور ان کو زہر کھلا کر یا پھنسی دیکر مار ڈالتے ہیں۔ چوریہ لوگ مختلف اقوام کے ہیں رات کو نقب لگا کر یا کند بھینک کر چوری کرتے ہیں کسی کی جان نہیں لیتے ڈاکو یہ ایک جماعت ہے جو دن دہائے گھر میں گھس کر مالک مکان کو ہلاک کرتے ہیں۔ اھاس کا اسباب لوٹ لے جاتے ہیں۔ تیرے۔ یہ بھی دن کو انکھوں کے سامنے سے چیز لیکر بھاگتے ہیں۔ گرہ کٹ یہ راہگیروں کی گرہ کاٹ لیتے ہیں۔ آجکے یہ ہاتھ سے چیز چھین کر لے بھاگتے ہیں۔ غرضیکہ چوری کی سزا تو اتنی سخت ہے کہ میں اس کی برداشت نہیں کر سکتا میں نے تو یہ کر لی ہے لیکن قانون کی رو سے میں نے ایسے ضابطے مقرر کئے ہیں جو اس الزام میں نہیں آسکتے۔

شاہی کے بعد میر غلام عباس نے رسی بٹوں کے محل میں قیام کیا، وہاں تمام محل چوری سے محفوظ رہنے لگا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی وہی کچھ خدمت کرتے تھے۔ گنگا نامی ایک شاگرد تھا اس نے آپ کو ایک نفیس ڈول دیا جو بھائی یہ تم کہاں سے لائے ہو اس نے کہا استاد پار سے دس بارہ سویرے اور چمکے گئے گھوں کے جا رہے تھے ان کے بیچ

ہزار کا ہے زیور میں کہاں تک دغا اور کھوٹ ہوگی۔ تم پر کھنڈا نڈا کر لو تمہاری طبیعت جتنے تو روپیہ دو در نہ کسی دوسری جگہ سے کوشش کی جائے کیونکہ ہمیں تو صرف ایک ہی مہینہ کا سود دینا ہوگا اور روپیہ اسی معاوضہ کے اندر ادا کر دینا ہے لالہ پہلے تم زیور تو دیکھ لو۔

داروغہ نے پنیں کے پاس جا کر کہا حضور ذرا صندوق دیکھئے اور صندوق لیکر لالہ کے پاس رکھ دیا اس نے دیکھا زلفیت کے غلاف پر چاندی کا صندوق ہے۔ زیور کو اچھی طرح جانچا۔ سونے کی چیزوں کو کوئی پر رگڑا جب اپنا اطمینان کر لیا تو کہا اچھا اس وقت چار ہزار کا بندوبست ہو سکتا ہے اور دو روپیہ سنیکڑہ سود لیا جائیگا۔ داروغہ نے کہا سود تو بہت کہتے ہو لیکن میں ضرورت ہے اس کی کوئی بات چیت نہیں ضرورت کے وقت ایسا ہوتا ہے مگر روپیہ تم کو پورا پانچ ہزار دینا ہوگا۔

زیور دیکھ کر ہماجن کے منہ میں پانی بھر آیا کہ کسی طرف بچاں ہزار تو۔۔۔ کم کمال نہیں ہے رہ گیا تو کچھ دے جائیگا۔ اسی وقت مال کی کیفہ رست بنائی وزن لکھا گیا۔ نوعیت لکھی گئی۔ اور ہر چیز میں ایک چٹھی لگا کر ہماجن سب کے سامنے صندوق بند کیا تغل لگا کر کبھی داروغہ صاحب کو دیدی، داروغہ نے کہا ذرا سا گوند تو رانی صاحبہ اپنے نام کی قہر قہل پر چسپاں کریں تاکہ تنک باقی نہ رہے۔ ہماجن نے اس کو پسند کیا صندوق فوج پنیں میں گیا، اور بہت جلدی تغل پر چھری کا غڈ چکا ہوا داپس آیا۔ پانچ ہزار کے کھدرے نوٹ ہماجن نے دیدیئے۔ یہ لوگ روپیہ لیکر چھپتے ہو گئے مہینہ بھر تک تو ہماجن نے صبر کیا۔ لوگوں سے دریافت کیا کھنڈت پود کا پتہ نہ لگا۔ اور معلوم ہوا کہ کسی بیوہ رانی کا مقدمہ بھی نہیں ہے اس وقت اسے بہت افسوس ہوا لیکن دل مضبوط تھا آخر صندوق فوجی کڑا کر کے کھولا اس میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں بے چارہ باوجودیکہ کثیر دولت رکھتا تھا مگر اس صدمے سے جا بزنہ ہو سکا۔

میر غلام عباس نے شائع عام پر ایک کہہ نوالیا اور اس میں دو چار نمبر باز دو چار فیوٹی بیٹھے ہوئے ہیں حقہ چل رہا ہے گئے پھل رہے ہیں گویا تمام محلہ انھیں کی اردلی میں رہتا ہے دس گاڑیاں گھوڑوں کی جارہی ہیں دو شریف آدمیوں نے انھیں آواز دی اور کہا اگر تم بیچنا، چاہتے ہو تو بیس سودا میر صاحب کے ہاتھ کر لو۔ گاڑیوں میں ایک مکھیا بٹو

اس نے کہا اچھا۔ گیہوں کا نرخ طے ہوا اور مال تلنے لگا۔ محلہ کے لوگ دو دو چار چار روپیہ کا اناج خرید رہے ہیں اور جو کوئی دس روپے کا لکھتا ہے پانچ روپیہ میر صاحب کو دے جاتا ہے اور کہہ جاتا ہے کہ باقی پھر دیدی جائیگا وہ سب روپیہ اپنے پاس جمع کرتے جاتے ہیں چار روپیہ کا اناج اپنے گھر میں بھجوا دیتے ہیں جو سپاہی پرے پر ہوتا ہے اسے بھی دو روپے کا اناج مل جاتا ہے اس صورت سے سب اناج بک جاتا ہے اور جو کچھ روپیہ جمع ہوتا ہے میر صاحب اس میں سے دس روپیہ نکال کر باقی روپیہ مکھیا کے ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ کہتا ہے باقی روپیہ تو دیجئے کہتے ہیں کہ باقی روپیہ بھی دو مہینہ کے بعد آگے جانا کیا ہم کہتے ہیں اپنا حساب کر لو ہم سے لکھوا لو۔ وہ لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ محلے والے تو سب ان کے شریک ہوتے ہی ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب انھیں کی طرف سے بولنے لگتے ہیں آخر کا غڈ لکھوا کر چلا جاتا ہے۔ دو مہینے کے بعد پھر آتا ہے۔ میر صاحب فرطے ہیں بھی روپیہ کا ابھی تک بندوبست نہیں ہوا ذرا صبر کرو آج کل میں روپیہ آنے والا ہے آخر وہ مجبور ہو کر دیوانی میں نالش کرتا ہے ان کی تحریر پیش کرتا ہے۔ میر غلام عباس فوراً اقرار کر لیتے ہیں کہ بیشک اس کا روپیہ واجب الادا ہے۔ اور یہ تحریر بھی میرے ہاتھ کی ہے اور اس کا نرم حساب صحیح ہے۔ سرکار اسے ڈگری دیدی ہے اجرائے ڈگری کرتا ہے تو مکان میں ٹوٹی چار پائی بھی نہیں ملتی ہے۔ مجبور ہو کر ان کی ذات پر فرقہ لانا ہے اور میر صاحب گرفتار ہو جاتے ہیں، اس صورت میں نالش کرنے والے کو سزا روپیہ ہمارا قیدی کی خداک کے دنیا پڑتے ہیں اور میر صاحب بیٹھے بیٹھے آرام سے کھاتے تھے اور جس مہینہ میں خوراک کا روپیہ جمع نہ ہوا یہ چھوٹ کر گھر چلے آئے پھر وہی مشاغل شاہی۔ بڑے بڑے کھاتے کھلے ہوئے ہیں لوگ حساب جانچ رہے ہیں۔ حقہ بھرا ہوا ہے یا روگ عین اڑا رہے ہیں کوئی شامت کا مارا دیہاتی مل گیا۔ لوگ گھر گھر کر اسے لائے خود بھی مال کھایا۔ محلہ والوں کو بھی کھلایا اور قرضہ کا سر خط لکھ دیا۔ ماہوار ادا کرنے کی رقم طے ہو گئی۔ اب سال دھنی سر پٹیا کرے روپیہ کہاں جو ملے۔ شہر والے تو سب جانتے ہیں بہت کم پختے تھے۔ دیہات والے غریب ہمیشہ تنکار بھا کرتے تھے۔ آخر کو ان ذات شریف سے نصف صاحب بھی واقف ہو گئے تھے جب کسی کی عمر مٹی ان کی ماتہ گزری اور مدعی مد علیہ دونوں میں ہومے

پولیس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں ان کے آب میں کوئی چیز مال سرودیں سے نہ تھی۔ پولیس ناکام واپس آئی۔

قانونی ترسیم کو آپ نے میر صاحب کی سن لیا اب عقلی ترسیم سنئے ایک میم صاحب خوش پوشاک حسین اور ان کے صاحب بہادر امین آباد کی ٹرک پر جا رہے ہیں۔ کوئی حاکم معلوم ہوتے ہیں۔ میم صاحب سونے کی بیش قیمت گھڑی گھٹائے ہیں۔ ایک دس برس کا لڑکا روتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے میم صاحب مارے آنا ہے۔ ایک آدمی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ لڑکا میم صاحب کے قدموں پر گر رہا ہے۔ مجھے بچائیے میم صاحب اسے اٹھاتی ہیں، وہ میم صاحب سے لپٹ کر کہتا ہے مجھے بچائیے۔ ارے والا تو انگریز کی شکل دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور لڑکا میم صاحب کی گھڑی نکال کر چلتا ہوتا ہے۔ میم صاحب کو خبر تک نہیں ہوتی۔

دوسری ترسیم نخاس میں ایک مسلمان غریب آدمی لوہے کے کلب بھڑا طوطے کے واسطے چکا تا ہے اور بہت سمجھ بوجھ کو کہے چھ آنے کا بھڑا مول لیتا ہے۔ کمر سے ہیبانی کھول کر اس میں سے ایک روپیہ نکال کر دوکاندار کو دیتا ہے پیسے واپس لیکر چوک کی طرف رخ کر رہا ہے کہ ضرورت کی چیزیں اور مول لے ہیبانی کھولنے وقت گنگھٹے بھانپ لیا۔ سوسو اور پیسہ اس کے پاس ہے جس گلی میں یہ مسلمان ضعیف آدمی مڑتا ہے اسی گلی سے ایک ہندو غری بھی اس کے آگے آگے جاتی ہے اور اس سے غفلت میں ایک خوبصورت بٹوا گر پڑتا ہے۔ مسلمان بڑھے کے پاس ہی سے ایک دوسرا آدمی نکل کر اس بٹوے کو اٹھا لیتا ہے اور مسلمان سے ہاتھ جوڑ کر اشارے سے اپنے ساتھ ایکے سری گلی میں لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائی تم نے تو دیکھا ہی ہے کہ اس ہری کا یہ بٹوا اگر اسے اور ہم نے اٹھا لیا ہے اور یہ خیال کیا کہ مل بانٹ کے کھاؤ گے تو ہضم ہو جائیگا دیکھو تو اس میں کیا ہے؟ کھول کر دیکھا تو ایک سونے کے کڑے کی چڑی اور ایک پھیلوں کی ہے آدمی نے کہا بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ اسے بازار میں چل کر اٹکوا میں جتنے کو بکے آدھے دام ہم لیں اور آدھے دام تم لے لو۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں وہی عورت دد ہائی دینے لگی۔ ہے میں لٹ گئی، میرا بٹوا ہاں گر گیا۔ جس کسی نے پایا ہو مجھ سے دس پانچ روپیہ لے، میرا بٹو سوکا مال تھا۔ یہ لوگ اس کے غل چانے

منصوب صاحب نے صورت دیکھتے ہی مدعی سے کہدیا، تم بھی کہاں پھنسے یہ پرانا ناگومیر غلام عباس ہے تم نے اس کا نام سنا ہوگا۔ اس کے پاس کیل ہے جو تم کیلورگے سیکڑوں قریاں کی جاچکی ہیں ایک پیسہ بھی نہیں وصول ہوا وہ بیچارہ نام سننے ہی تھا کہ اسے دست بردار ہو جاتا تھا۔

ایک دن تھنا کا مارا ایک چڑیا آئی۔ میر صاحب کو اس پیشہ کے نام سے نفرت تھی۔ آپ نے ایک ایک پیسہ چڑیاں خریدیں اور سب غل والوں پر سے صدف کر کے چھڑوا دیں۔ جب چٹکی خالی ہو گئی تو آپ نے دو آنے پیسے چڑیا کو دیئے اس نے کہا خداوند یہ کیا دیتے ہیں ایک روپیہ چھ آنے کا مال چھوڑا ہے۔ کتنے لگے نہیں یہ دام نہیں دیئے تم کو آج کھانے کو یہ دو آنے دیئے ہیں۔ کل آکر حساب کر لینا۔ وہ چلا گیا دوسرے دن سویرے تھنا کو آیا تو کسی محلہ والے نے کہدیا ابے کس سے مانگتا ہے جاتا نہیں یہ میر غلام عباس گھبراہٹ میں کیا آج بھی کچھ شاتوں نے گھیرا ہے وہ نام سننے ہی رنچو چکر ہو گیا لاکھ لاکھ لوگ پکارتے رہے ایک جواب نہ دیا۔ نوبت بیان تک پہنچ گئی کہ اس راستے سے مال والوں نے راستہ چلنا موقوف کر دیا۔ اور گاؤں گاؤں میں شور ہو گیا کہ شہر میں ایک گھبراہٹ ہے جو لوگوں کو لوٹ لیتا ہے جب یہ بازار بھی ٹھنڈا پڑ گیا تو میر صاحب کی طباعی نے ایک اور جدت کی، خوش پوشاک تو ہمیشہ سے تھے اور صورت و شکل سے شریف معلوم ہونے والے مکن خاں حکاک سے جویشے کو الماس بنا دیتے تھے کچھ عینے خرید کئے اور سونے کی انگوٹھیوں پر انھیں جڑوا کر آپ خود رئیس بن کر دو چار خد گھا ساتھ لیکر ہلکتے بھٹی میں جا کر ہماجنوں کے ہاتھ فروخت کر کے لکھنؤ چلائے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ پولیس کو اکثر ان کی ذات پر شبہ ہوا کہ چوری ضرور کرتے ہیں ورنہ ایسا شاہانہ خرچ کہاں سے چلتا ہے مگر کوئی موقع انھیں گرفتار کرنے کا نہیں ملا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے کسی شاگرد نے لمبی چوری کی تھی اور اس نے حسن غنیمت سے اس میں سے کچھ اسباب استاد کی نذر کیا پولیس کو اس امر کی خبر مل گئی۔ وہ تو ان کی دشمن تھی فوراً کو تو مال صاحب دوڑ لیکر آپو پچھے اس زمانہ میں میر صاحب محلہ صطبل میں محمد علی خاں بٹی دار کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے جیسے ہی آپ کو معلوم ہوا کنوئیں میں اتر کر اس کی کسی گوشے میں رکھ آئے اور آپ مکان کی چھت سے لپٹے پڑے رہے

میر غلام عباس ہیں۔ مزایہ ہے کہ خود کبھی ایسے کیس کے ترکیب نہیں بنے مگر کرنا فریب و دغا میں ان کی ایسی قفل کسی کو نہ تھی۔ آپ جو کام کرتے تھے نو جداری کے قانون سے بھرا اس عقلندی کے سبب زندگی بھر راحت سے بسر ہوئی۔ مزاج میں فیاضی اور رحمتی بہت تھی، ایک صاحب کہتے ہیں یہ تو ہماری آنکھوں کی بھی بات ہے کہ ایک دن میر صاحب گھر سے نکلے تو ایک آدمی پتھی لئے جا رہا تھا۔ آپ نے اسے پکڑ لیا۔ ابے کیلئے جاتا ہے؟ وہ اچکا تھا اس نے کہا استاد گرم گرم گلے ہیں اور کچھ ان کی نذر کئے میر صاحب سب دوست صاحب کو بانٹ دیئے۔ وہ گلے ہم نے بھی کھائے تھے۔

یہ تو خاص بات ہے جس گلے میں میر صاحب رہتے وہاں کبھی چوری نہیں ہوئی۔ آپ کی تعریف یہ ہے کہ بس قفل پر لٹا مارنے تھے وہ ٹوٹ جاتا تھا۔ لشکر کی طرح جو منزلے مکان پر چڑھ جاتے تھے پکی دیوار پر اس طرح پاؤں رکھتے تھے جیسے کوئی گھر بنے پر۔ چھکی کی طرح دیوار میں چمٹ جاتے تھے اگر زری زلف میں کسی نہ وہ گرفتار ہوئے نہ قید ہوئے مگر بدنام بہت تھے غدر کے سمیٹیں برس بعد تک تو وہ زندہ تھے اس کے بعد مر گئے اور سناٹا ہے کہ ٹالکٹور سے کی کر ٹاٹیل فن ہوئے۔

خواجہ عبدالرؤف مشت نکلوی

کے خون سے ایک دوسری گلی میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ اب یہاں بڈے کو لالچ نے گھیرا۔ کہنے لگا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔ جو قیمت آج کو ہم دیدیں یا تم دے دو اور لے لو اس نے کہا اچھا ڈیڑھ سو کا مال رکھئے پھر روپیہ ہم نے لیجئے۔ کہنے لگے واہ تین سو کا مال اور کچھ تر روپیہ تم ہم سے تنو روپیہ لیلو آخر روکد کے بعد اس نے روپیہ لے لیا اور چل دیا۔ چلتے چلتے بڑے بیان کو شک گذر کہ ایسا نہ ہو مال کم ہو ذرا انکو لینا چاہئے۔ مباحثہ کو دکھایا اس نے کہا پتیل پر سونے کا طبع کیا ہوا ہے یہ تو کوئی چیز نہیں کیجہ پڑے کے رہ گئے پولیس میں رپورٹ لکھوائی دن بھر پریشان رہے کچھ حاصل نہ ہوا، یہ بھی میر صاحب کی ایجاد تھی آپ نے اس کا نام پتکار رکھا تھا۔

تیسری ترمیم یہ تھی کہ تین آدمی ہیں ایک آدمی گھنچہ کے تین پتے لئے ہے اور اسے ہاتھ سے لئے رکھتا ہے اور کہتا ہے تاؤ کون سا پتہ ہے اور جو کچھ لگنا ہو گاؤ۔ ایک آدمی ایک روپیہ لگتا ہے کہ یہ بادشاہ ہے۔ وہ جیت جاتا ہے۔ اسی راستے سے دوسرا آدمی جا رہا ہے اور ایک لاکھیر سے کہتا ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ وہ ایک روپیہ لگتا ہے اور بار جاتا ہے پھر دوسرا اور تیسرا روپیہ لگتا ہے جیت جاتا ہے۔ راگیر کو بھی شوق ہوتا ہے ایک روپیہ لگتا ہے جیت جاتا ہے پھر دو چار روپیہ بار کر چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد یہ لوگ بھی وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اس کے موجب بھی

غزل

یہ کس نے مری زندگی کو دُعا دی؟  
دعاؤں کی دُنیا پہ سبب لی گمادی  
یہ کس نے مجھے بندگی پھر سکھا دی  
مری خاکساری کی عظمت ٹمہادی  
بنا کر مٹادی، مٹا کر مٹادی  
کسی نے مجھے اس طرف سے صدا دی  
بڑے کام کی چیز تھی جو ٹٹا دی

مرے درد کی ہائے لذت بڑہادی  
میں اب حسرتوں کا بھاں چاہتا ہوں  
دُعاؤں کی لذت بڑہا دینے والے  
مرے عزم ہستی کو برباد کر کے،  
مرے مولا! ہستی سے کیا کر رہے ہو  
سیفنے کو موجوں میں کیوں لے گیا تھا  
خزین جس میں حسن ازل موجزن تھا

آمین عزیز  
بھادپور،

# دُعا عالیہ

اعتبار الملک حضرت دل شاہماں پوری

یاد ہے اے ہم نشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے  
تاقیامت بھول سکتی ہی نہیں وہ سرگزشت  
جس جگہ آنکھیں لڑی تھیں وہ ہے منظر سامنے  
جس جگہ دل ہو گیا تھا زخمی تیرے نظر  
وہ مری بتیا بیات وہ جوش چشم اشجار  
اُن وہ چشمِ فتنہ بخار اُن وہ نگاہِ سحر کار  
اک بُتِ نا آشنا کا فردا کے عشق میں  
وہ نگہبانوں کے پہرے پر بھی باعجز و نیاز  
وہ نطف اور وہ اُس کا تلون ہلے ہلے  
اُس کو میرا یہ پیام اے کاش پہونچتا کوئی  
اے جفا جو اے ستمگر لطف فرما ہو کبھی

دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے  
اپنے ہاتھوں خاک میں دل کا ملنا یاد ہے  
جس جگہ ہوش اڑ گئے تھے وہ ٹھکانا یاد ہے  
وہ جگہ وہ وقت وہ صدمے اٹھانا یاد ہے  
وہ کسی گلِ پیر بن کا مسکرانا یاد ہے  
اُن دلِ عاشق پہ وہ بجلی گرنا یاد ہے  
یاد ہے رہ رہ کے وہ آنسو بہنا یاد ہے  
حالِ دل پر دے ہی پر دے میں سُنانا یاد ہے  
وہ نگاہیں ملتے ہی آنکھیں چُسرانا یاد ہے  
جس کو سب وعدے تو بھولے بھول جانا یاد ہے  
یہ بھی کوئی بات ہے بس دل دکھانا یاد ہے

داستانِ دل نہ بھولی ہے نہ بھولے گی ضمیر  
ابتداءِ عشق کا اب تک زمانہ یاد ہے!

# کنول

جناب شہید شیر حسن صاحب قیس جید آبادی

دیر میں نے بھی نظریں کے شرما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سینا گھوڑ دوڑا، لکھرواٹ  
سٹی تھمیر، کیفے، کیا دھسپ دن تھے اور اب وہ بہت دور اس سے  
جدا ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کا پیام محبت کنول کے کانوں میں گونجنے لگا۔ جلتی  
ہوئی آنکھوں میں سُرمی دوڑ گئی۔

وہ انہیں خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کی ملی کمرے میں آکر  
اس کے بیروں پر لوٹنے لگی چونک پڑی۔ اس نے اسے اٹھالیا سینے سے  
چمٹایا۔ ”میاؤں! میاؤں!!“

”پیاری بی! مجھے بھوک لگی ہے۔“ اس نے میز پر سے دو دھکا  
پیالہ اٹھا کر اسے دیا۔ وہ دو دھپینے لگی۔ کنول نے محبت سے چھپکا۔ ”غ“،  
کسی کی آہٹ سنائی دی! دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا، شرما  
بھی اسی طرح بے پاؤں چپکے سے آکر اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور وہ،  
اگر سوئی ہوتی تو چمکی لیکر پٹنگ کے پیچھے گھس جاتا! چونک پڑ پڑ کر  
کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا شرما کا خط سمجھ کر اس طرف  
دوڑی۔ قالین میں پیرا بھا، سبھلی، جلدی سے لفافہ چاک کیا، گردہ تو  
شما کا تھا۔ گرم گرم آنسو نکل پڑے۔

طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ شاید اس نے خط لکھا ہوا اور  
ملازم نے ڈاک میں نہ ڈالا ہو۔ شاید کلج کی مصروفیات سے فرصت نہ ہوئی  
ہو۔ شاید وہ بیمار ہو، اس قدر کہ کھنے کی طاقت نہ ہو۔ پھر اس نے تار  
کیوں نہیں دیا۔ یا پھر دوستوں میں رنگ رلیاں منارہا ہو، کالج کی دوست  
لڑکیوں کا اس نے بارہا ذکر کیا تھا۔ ”کنول مجھے تم سے محبت ہے۔ کنول  
کیا تم مجھے تھم لے کر دے گی؟“ اسے یاد آ رہا تھا۔ کنول کی آنکھوں سے جھری  
لگ گئی۔ بی! اس کے بیروں پر لوٹنے لگی میاؤں! چڑ کر اس نے ٹھوکر مار دی۔

پوچھت رہی تھی، پیازوں کی بلند چوٹیوں پر سے سو بج کی کرنیں،  
جھانک رہی تھیں ٹرک پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔

”کمرے کے گھر کے تمام لوگ جاگ اٹھے تھے لیکن کنول اپنے بستر پر پڑی  
کروٹیں بدل رہی تھی۔ سو بج کی تیز کرنیں آراگاہ کی گھڑکی میں سے داخل  
ہو کر بستر پر پڑ رہی تھیں۔ وہ زیادہ رات گئے سوئی تھی اور اب صبح و پکار سے  
بیدار ہو گئی تھی۔ کرنیں الگ ستارہ تھیں۔ وہ جھنجھلائی، غصے سے گھڑکی  
بند کی اور دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر اب نیند کہاں!

”رانی جی آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“ بوڑھی آیا نے چونکھٹ پر سے آواز دی۔  
”چلی جاؤ! مجھے سونے دو۔“ اس نے چڑ کر کہا۔ وہ سچین تھی اس کی  
خوار آلود آنکھیں سنبھ ہوئی جاتی تھیں۔

آخر کار وہ اٹھ بیٹھی۔ بیٹھے بیٹھے کچھ سوچتی رہی۔ پھر تہ آدم آئینے کے  
پاس آکر بال سلجھانے لگی۔ بار بار اپنے کنول جیسے چہرہ خوبصورت نگاہ جسم  
کو دیکھتی رہی۔ ساری کا پلو ڈھلک گیا تھا اسے درست کیا۔ انگڑیاں  
لیں، خود اپنے انداز اور بالکین کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر گھڑکی کی طرف  
نظر دوڑائی۔ ”آٹھ بجے تھے۔“ آج ضرور اس کا خط آئے گا۔ اس نے  
دل میں کہا۔ کنول ایک ہفتے سے اپنے منگیتر شرما کے خط کا انتظار کر رہی  
تھی اس نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ ہفتے میں دو تین بار ضرور چٹھی  
روانہ کروں گا۔ وہ آج ہی کے روز کلکتہ گیا تھا۔ کسی اندرونی جذبے کے تحت  
اس نے اپنے سیب جیسے گال کو چھوا، شرما کا اودامی بوسہ، وہ شرانگنی۔

ایک سال قبل! ہاں! اسے وہ دن یاد آیا جب وہ شرما کے ساتھ  
موٹر میں ٹھکی کلکتہ کی سیر کر رہی تھی اور شام کو لالہ پارک میں اس نے گوجوشی  
سے چمٹایا تھا اس نے کہا تھا۔ ”کنول کیا تم مجھے قبول کر دے گی؟“

اسکول کی موٹر لگئی : کیا نہ کہا۔

”میں نہیں ہاؤنگی ! جی ٹھیک نہیں ہے!“

پھر وہ ہلنگ پریٹ لگئی۔ ٹکٹے کے پیچھے سے شرمکے خطوط نکال کر ایک ایک کر کے پڑھنے لگی۔ عطر محبت میں بسے ہوئے نلے، پیارے پیارے خطوط۔ ایک کو میرا سنا اس نے چوم لیا۔ ”کتنا پریمی ہے۔ وہ مجھے ہرگز نہیں بھلا سکتا۔“

”میاؤں! میاؤں! اس نے گھر کی کھول دی، امان پہاڑیوں کو موٹر سے دیکھنے لگی جن پر اکثر دونوں چڑھاکو تھے۔“

”آپ کے نام تارا ایسے رانی جی!“ آیا ایک لغاف لیکر آئی۔

اس نے کانپتی ہوئی آنکھوں سے لغاف چاک کیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ شب کی گاڑی سے آ رہا ہوں، شرابا، وہ خوشی کے مارے اچھلنے لگی، آیا کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ ”سنا تم نے، شرابا رات آ رہے ہیں!“ جلدی سے میز کا خانہ کھولا ادا شتی نکال کر اسے دی۔ ”سجاؤ تارو لے کو دے آؤ۔“ پھر وہ اس کے پاس لگئی۔

”تا جی! شرابا آ رہے ہیں، شب کو۔“

”کیا خط آیا ہے؟“

”نہیں تا جی تارا۔“

وہ دوڑی ہوئی باورچی خانے لگئی، باورچی کو تاکید کرنے لگی۔ ”آج رات کا کھانا اعلیٰ درجہ کا پکاؤ، شرابا آ رہے ہیں!“

پھر وہ اپنے کمرہ میں آئی اور آیا کو بلا کر کہا۔ ”دیکھو شو فرسے کو ٹھیک بے نیچے کا تیار رہے یہ لو پٹرول کے دام۔“ اس نے دور پہنچنے میں سے نکال کر دیئے۔ ”دل کہہ رہا تھا کہ آج ضرور خط آئے گا! او وہ خود ہی آ رہے ہیں۔ وہ ہار سوئم پر گلنے لگی۔“

شام کو چار پیکر وہ لباس کے کمرے میں گئی۔ جس کھول کر ساریاں اور بلور الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی پہنے؟ چند منٹ بعد وہ ایک نفیس ساری زیب تن کئے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی کبھی بال سنو آرتی کبھی پلور دست کرتی۔ اس کے پیچھے آیا کھڑی سکر ای تھی وہ مومنہ پر بیٹھ گئی، وقت کاٹنے نہیں کٹ رہا تھا۔ ۵ بجے تھے۔ اس نے

سکرتے ہوئے گھڑی کی سوئی سات پر رکھ دی۔ یکایک الارم بجنے لگا۔ وہ اچھل پڑی، دھڑکی انجن نے سیٹی دی لیکن ابھی تو وہ ہی بجے ہیں۔ وقت گزاری کے لئے اس نے تازہ اخبار اٹھالیا۔ اشتہارات، جلی سرخیاں، فوٹو سینلکے پروگرام متحرک تصاویر کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اس نے اخبار بھینک دیا۔

اس نے باورچی خانے میں جا کر پھر تاکید کی۔ ”تھوڑا سا میٹھا چکھا۔ آہا کیا مزے کا ہے۔“ وہ کھا کر بہت خوش ہو گئے۔ ”موٹر کے ہارن کی آواز سناؤ دی۔“ اس نے ایک بار اور خود کو آئینہ میں دیکھا۔ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کیا جلد جلد کافی پی اور جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔

”پہلے رانی باغ چلو۔“

سیلم پشٹر، رانی گنج، جان کلب، آخر رانی باغ آگیا۔ تھوڑی دیر سیلیوں کے ساتھ دل بہلاتی رہی۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ ”بجے تھے۔“ ”اب میں جاتی ہوں۔“ کنول نے سیلیوں سے کہا۔

”کیوں، کہ ہر کار ارادہ ہے؟“ ایک سیلی نے کہا۔ ”آج تو تم بڑے ٹھاٹ سے نکلی ہو، کوئی بات ضرور ہے۔“

”کیس نہیں، ایشیون ٹیک ایک عزیز کو لینے جا رہی ہوں۔“

”سمجھی“ اومانے قہقہہ کھاتے ہوئے کہا۔ ”وہی نہ جن کا نام شرابا ہے۔“

”ہم تو تجھے نہیں جانے دینگے، کیا وہ ہم سے بڑھ کر ہے؟“

”جھو، اس کی موٹر میں دریا کی سیر کریں۔“

”بہت ٹھیک، بہت ٹھیک، سب سے ایک زبان بول کر کہا اور سب کی سب کنول کو گھسیٹ کر موٹر میں بیٹھ گئیں۔ کنول کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اومانے شرارت سے گال فوج لیا۔ ”اچھا تو سیری سن، انگلیتر کی آمد کی خوشی میں ہم سب کو انس کریم کھلاتے ہیں تمہیں جلد چھوڑ دینگے۔“

”منظر“ کنول کا چہرہ کھل گیا اور موٹر ایک ریٹورنٹ کو سامنے رکھ کر کنول نے ہینکل بھجا چھڑایا اور جب موٹر گھنٹا گھر پہنچی تو اس وقت ہونے سات تھے۔ وہ خود موٹر چلا رہی تھی چوراسے کے جوان نے تیز رفتاری کی علت میں موٹر روک دی، بورڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”۱۵ میل فی گھنٹہ۔“



"لیکن مجھے جلد آئین پہنچنا ہے تم نہیں سمجھ سکتے"  
"غیر آہستہ لیجائیے"

موٹر آئین کے احاطے میں رک گئی۔ ابھی گاڑی آنے میں نہ ہونٹ  
باتی تھی۔ "آج تو پون گھنٹہ لیٹ ہے" کسی مسافر نے قریب سے کہا۔ لیکن اسے  
یقین نہیں آیا۔ اس نے ٹکٹ بالو کے پاس جا کر دریافت کیا تو صبح نکلا وہ  
تھک کر ایک بیچ پر بیٹھ گئی۔

دونوں جوان سوٹ پہنے سگریٹ پیتے اس کے قریب گزرے دونوں  
نے سکرانے ہوئے دیکھا چند قدم آگے بڑھ کر بیٹھے اور اسی بیچ پر ایک طرف بیٹھ  
گئے کنول سمٹ کر کونے میں کسک گئی اور اپنی نوٹ بک دیکھنے لگی۔

"کیوں اس نے مجھ کو سوٹ تو نہیں کھدھ بچا؟" ایک نے کہا۔  
"مجھے تو امید نہیں کہ آج آئے۔ جلا وہ کیسے آ سکتا ہے استخوان پر  
پر کھڑا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"وہ تو ایسا مذاق کیا ہی کرتا ہے!" کنول کے کان کھڑے ہو گئے۔  
"نہیں منو ہر وہ ضرور آئیگا۔ تاریخ صاف لکھ ہے کہ ہم سیشن پر موجود  
آگے آجائے تو سید ہے رائل ملیں گے۔ ماما ہری چل رہا ہے۔  
"مگر یار جب تک شانتی نہ ہو بے لطفی رہیگی۔"  
"کیا کرنا بھی آج ہی بیٹنے سے آ رہے ہیں۔ کنول نے فٹ کیا۔

"جی ہاں!" منو ہر بولا۔ "کیا آپ انھیں جانتی ہیں؟"  
"کیوں نہیں، آخر وہ عزیز ہی تھے۔" شرا بھی تو کلکتہ سے آ رہے ہیں  
"اخواہ، آپ کنول ہیں، انھیں کو لینے آئی ہیں نہ؟"  
"ہاں!"

"عجب اتفاق ہے۔"

گاڑی کی آمد کی گھنٹی اور تیز روشنی دیکھ کر کنول اٹھ کر پلیٹ فارم  
کے اس حصے میں کھڑی ہو گئی جہاں سیکنڈ کلاس کا ڈبہ رکنا ہے۔ ٹرین رکتے  
ہی کنول ڈبے میں کھسی لیکن وہ اس میں نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے تمام ڈبے  
دیکھ ڈالے مگر شرا غایب، پریشانی میں وہ زمانے ڈبے میں گھس گئی، اور

پچھلے پیر لوٹ آئی۔ اجن نے سیٹی دی اور گاڑی چل پڑی۔ وہ آخری ڈبے  
کے نظروں سے اوجھل ہونے تک حسرت سے ٹرین کو دیکھتی رہی۔ اس کی  
آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

موٹر شرا ہراہ پر آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ سڑک کی روشنی وقفے  
وقفے سے کنول کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کی آنسو بھری آنکھیں  
چمک جاتی تھیں۔

موٹر ایک چھوٹے سے راستے پر مڑی۔ مین موٹر پر دوسری سمت سے  
ایک تیز رفتار موٹر کا ایک لکڑی گئی۔ قریب تھا کہ بری طرح ٹکرائے مگر  
شوفر نے ایک دم برک دبا دیا۔ ایک شخص تیزی سے اتر کر آیا اور شوفر کو  
ڈنسنے لگا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر کنول آواز پہچان گئی۔

"شرا" اس نے جھانکتے ہوئے کہا۔

"تم ہو کنول!" وہ خوشی کے مارے موٹر پر سے اتر پڑی۔

"تم کہاں تھے؟ میں ابھی آئین سے آ رہی ہوں۔"

"میں بھی تو وہیں سے چلا آ رہا ہوں۔"

"تم تو کہیں دکھائی نہیں پڑے ڈبہ پر چھان مارا۔"

"تمیں ستانے کیلئے چال چلی۔"

"دونوں موٹر میں بیٹھ گئے۔"

خفافہ خفافہ  
سن تو گھر میں آ رہی ہیں  
نہر کا غنا خجما کی تابیں  
سچا آج بھی ان میں کی کوئی بات سچی  
تج سب آسٹریٹ نام کی تابیں  
جسٹ بولن

حالیہ نمبر کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ عالمگیر کا خاص نمبر ہوگا اور عالمگیر ہی کے تمام  
گزشتہ خاص نمبروں کیلئے دعوتِ مقابلہ ہوگا! یاد رکھیے یہ عالمگیر خاص نمبر ہے  
دوسرے کے ہر نمبر میں شرا ہوگا!

# جذباتِ فضا!

## جنتابِ فضا لندری

محبت داستان در داستان معلوم ہوتی ہے  
نگاہ یاس دل کی ترجمان معلوم ہوتی ہے  
نگاہ شوخ ادا کیوں بدگمان معلوم ہوتی ہے  
محبت میری رگ رگ میں نہاں معلوم ہوتی ہے  
عیال بھنے پر بھی سب کو نہاں معلوم ہوتی ہے  
ہر اک گردش میں برقِ بے باں معلوم ہوتی ہے  
مجھے ہر سانس اک موجِ رواں معلوم ہوتی ہے  
چمن کی پتی پتی گلستان معلوم ہوتی ہے  
محبت اب نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے  
کہ ہر پتھر کی صورت جانتاں معلوم ہوتی ہے  
رگ گل اس کو شلخِ آشیان معلوم ہوتی ہے  
محبت کی مکمل داستان معلوم ہوتی ہے  
جہاں ہر ایک کوششِ راگماں معلوم ہوتی ہے  
مری رگ رگ میں اک برقِ طپان معلوم ہوتی ہے  
ہر اک تیلی قص کی آشیان معلوم ہوتی ہے  
جہاں اپنی جبین خود آستان معلوم ہوتی ہے  
کہ اب تو زندگی اک داستان معلوم ہوتی ہے  
کہ اب منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ہر آہِ سرکشِ رازِ جاں معلوم ہوتی ہے  
غلش اب تک جو پنہاں تھی عیاں معلوم ہوتی ہے  
یہ درپردہ شریکِ سمان معلوم ہوتی ہے  
نہ دل معلوم ہوتا ہے نہ جہاں معلوم ہوتی ہے  
تجلی حیرت افزائے جہاں معلوم ہوتی ہے  
تمہاری ان جبین نظروں میں لاکھوں طور پنہاں ہیں  
دل درو آشنایہ جوشِ یہ آشفگی کب تک  
بری نظریں تجلی آشنا دل کیفِ ساماں ہے  
محبت بعد ضبطِ غم نہیں اب کاشِ خاطر  
شرارِ حسن شاید تم نے ان میں بھر دیا ہوگا  
ملا ہے رنگ و بوبیل کو فردوسِ نظر ہو کر  
زبان بے گنج میری، نگاہ بے زباں میری  
دل پر شوق اس عالم کو معراجِ طلب کہئے  
ادلے انفاتِ حسن عالم سوز کیا کہئے  
مکمل ہو گیا شاید مرا شوق گرفتاری!  
نیازِ عشق نے اب دل کو اس عالم میں پہنچایا  
کسی نے مسکرا کر دل میں برپا کر دیا محشر،  
کیا ہے شوقِ بچید نے یہاں تک مجھ کو فارتہ

گماں ہوتا ہے اُن کلاے فضا اب ہر تجلی پر  
نظر اپنی خدا جانے کہاں معلوم ہوتی ہے

# راکپور میں دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا اجتماع

جناب میرزا محمد بشیر صاحب ایم اے

”بھائی شاد دوسویں کلام نہیں، کلام اس میں ہے نواب صاحب دوستانہ اور شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو تو کہ نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی، معاملہ و عظیم جس طرح احباب میں رزم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے نواب صاحب لکھنؤ کے متعلق امیر لکھتے ہیں۔“

”میرے ساتھ خاص جوان کا بڑا ڈھادہ سولے میرے اور ان کے کسی کو نہ معلوم تھا۔ دوسو سولہ ماہوار تو خواہ وہ مجھ کو دیا کرتے ہیں اور ہر سال ختم سال پر چار پانچ سو روپیہ دیدیتے تھے اور اس طرح دیتے تھے کہ وہ جلتے تھے اور میں اور خدا بس اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔“ غالب لکھتے ہیں۔ نواب صاحب (کلب علی خاں) از روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیرہ رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تولیدار ہیں۔ جو شخص فقر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے لئے میں دیر نہیں لگتی۔“

— ادب اردو کی تاریخ شاہد ہے کہ جب دہلی و لکھنؤ پر تباہیوں کی گھٹائیں چھائیں اور قدرے شہر نے اس بہارستان کو تاراج کیا تو سوکا راکپور کے کہیں اور ٹھکانا نہ رہ گیا۔ اگر جغرافیہ کے اعتبار سے رام پور کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دہلی اور لکھنؤ کے درمیان واقع ہے چنانچہ شعراء و اصحاب علم و فضل دہلی اور لکھنؤ سے جوق جوق اس طرف آنے لگے یہاں تک کہ ”قدر کے بعد دہلی اور لکھنؤ میں جس فن کا کامل تھا اس کو راکپور کے سوا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔“

۶۔ مکتب امیر خانی صفحہ ۳۳ ۷۔ اردو معنی ۸۔ گل رعنا صفحہ ۱۸۳

تاریخ راکپور پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اس کے تاجدار شروع سے صاحب علم و علم دوست رہے ہیں۔ نواب علی محمد خاں کے بیٹے نواب محمد عہد اللہ خاں ذی علم بھی تھے اور سخن گو بھی مگر فارسی میں کہتے تھے۔ شخص کہیں عاقی کہیں آزاد، کہیں مبتلا نظر آتا ہے۔ تاجداران راکپور میں پہلا فرمانروا جس نے اردو میں شعر کہا نواب احمد علی خاں شخص بہ رند تھے ان کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ساقی و مطرب و شراب ہے آج

خانہ تو بہ بس حشر ہے آج

حشر کو جب حساب مانگیں گے الاماں شیخ و شاہ مانگیں گے

اپنے ساقی لا ابالی سے، رندواں بھی شراب مانگیں گے

راکپور میں باہر کے شعراء کی آمد نواب یوسف علی خاں کے عہد سے قبل ہی شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ شیخ قیام الدین قائم دہلی کی تباہی کے بعد نواب محمد یار خاں والی ٹانڈا کے یہاں رہے۔ لیکن بقول مصنف گل رعنا جبکہ ان کا بھی کام بڑا رام پور چلے گئے اور احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اس پر قناعت کی۔ اس بیان کی تائید مقدمہ مخزن نکالت ”مصنف قائم سے بھی ہوتی ہے۔“

نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں نواب کی سخن شناسی اور قدردانی کی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا ایک جگہ راکپور میں نظر آنے لگا۔ دونوں رئیس خود شاعر تھے اور اصحاب علم و فضل کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مرزا غالب نواب یوسف علی خاں ناظم کے متعلق فرماتے ہیں

۱۔ انتخاب یادگار صفحہ ۲۱ ۲۔ انتخاب یادگار صفحہ ۶

۳۔ گل رعنا صفحہ ۱۸۳ ۴۔ صفحہ ۳ ۵۔ اردو معنی

صفت تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں۔ رام پور حیدر آبادی ایسے دو بڑے دربار تھے جنہوں نے ان محنت اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رامپور میں دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا اجتماع قبل از غدر شروع ہو گیا تھا۔ نواب ناظم کے عہد میں غدر ۱۸۵۷ء کے پیشتر ہی مومن خاں مومن رام پور میں آچکے تھے مومن کا شعر ہے ۵

دلی سے رام پور میں لایا جنوں عشق

دیرانہ چھوڑ آئے ہیں دیرانہ تریں ہسم

اور نواب ناظم ان کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔ ”پہلے مومن خاں دہلوی سے مشورہ تھا پھر مرزا نوشہ غالب سے ملے ہوئے۔ اس کے بد نشی مظفر علی خاں آسیر لکھنوی کو کلام دکھلایا۔ سب سے اخیر جناب آسیر صاحب مینائی سے شعر و سخن میں مشورہ رہتا تھا۔“

مرزا غالب مرحوم ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ”نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں میرے شاگرد ہوئے ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔“ اس کے بعد در رامپور جانے کا حال تحریر کیا ہے۔ یہ سب غدر سے پہلے ہوا۔ آسیر بھی غدر سے پہلے آچکے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورا اجتماع دونوں اسکولوں کا غدر کے بعد ہوتا ہے۔ دلغ۔ آسیر۔ جلال غدر کے بعد رام پور پہنچے ہیں اور اس ادبی اجتماع کا شباب کلب علی خاں کے عہد میں ہوا۔

نواب کے عہد میں شعرا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور پھر شعراء ہی پر موقوف نہیں ہر ایک فن کے کامل وہاں پائے جاتے تھے۔ ریاست رامپور کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بالکالوں کے علاوہ اتنے شعراء کا بار کیونکر اٹھایا جاتا تھا۔ بات یہ ہے کہ نواب کلب علی خاں نے برائے نام کچھ نہ کچھ خدمت ہر شاعر کے ذمہ لگا دی تھی اور اس کام کے اعتبار سے ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ مگر خود اپنے پاس سے وہ انعام و اکرام بھی دیا کرتے تھے اور یہی سب تھا کہ نواب ناظم کے بعد شعراء دہلی و لکھنؤ کا مجمع وہاں بڑھ گیا۔

رام پور کی سرکار سے دہلی و لکھنؤ کے جن شعرا کا دامن وابستہ ہوا ان میں سے خاص خاص یہ ہیں غالب، مومن، دلغ، تسلیم، رحیم الدین جیا، حسین علی خاں شاداں، آسیر، آسیر جلال، آجرو، خواجہ اسد علی خاں

۱۔ تاریخ ادب صفحہ ۱۲۰ ۲۔ اخبار الحنا دیہ جلد دوم صفحہ ۱۲۵ ۳۔ اردو کی تاریخ

تلق، ان دونوں کے یکجا ہوجانے سے رامپور میں خصوصاً شمالی ہند میں غما ادب و شاعری کا ذوق وسیع ہو گیا۔ امیر مینائی نے رامپور میں ایک تذکرہ ”انتخاب یادگار“ لکھا ہے۔ وہ دیباچہ میں فرماتے ہیں ”ایک تذکرہ شعرائے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس خاص دارالریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی کیفیات سخن گوئی کی حقیقت نقش صفحہ روزگار ہو.....“

مجموع شعراء اس تذکرہ میں چار ہیں۔ ان چار سودس میں عربی فارسی بھاشا اور اردو کے شعراء بھی شامل ہیں۔ ایک اہم نتیجہ جو ان دو اسکولوں کے اجتماع سے نکلا وہ یہ تھا کہ۔ ”نواب صاحب موصوف (نواب یوسف علی خاں ناظم) نے شعراء دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا۔ یعنی دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔“

اس بیان کی وضاحت کیلئے ان دو طرزوں کی چند ماہرہ الامتاز خصوصیات کا ذکر ناگزیر ہے مثلاً اہل دہلی جذبات کو الفاظ پر فوقیت دیتے ہیں جذبات کی ترجمانی سید ہے سامے الفاظ میں کرتے ہیں۔ فلسفہ و منطق کی دھن میں وہ روح کو دیکھتے ہیں۔ جسم کی چڑا نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے اہل لکھنؤ کے یہاں زبان کو جذبات پر فوقیت ہے۔ خیالات آتے ہیں مگر الفاظ کا شوخ جامہ پنکڑ۔ تخیل کی جولانیاں، تشبیہ و استعارہ کی پڑ بیج راہوں سے گذرتی۔ عربی الفاظ کی کثرت، منظر و بدائع کی کلکاریاں محاورات کا صحیح استعمال، دفن و عجز کی سخت پابندیاں ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، جب یہ دونوں اسکول ایک سرکار کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے، تو ایک طرف صفائی زبان کے معاملہ میں لکھنؤ کے شعراء سے دلی کے شعراء متاثر ہوئے اور دوسری طرف جذبات نگاری میں اہل لکھنؤ نے دلی کا اثر قبول کیا چنانچہ نواب یوسف علی خاں ناظم کو ایچے جو مومن، غالب اور آسیر کے شاگرد تھے ان کا کلام دونوں طرزوں کے اتحاد کی ایک بین مثال ہے۔ آسیر کی محاورہ بندی اور رعایت لفظی کا لطف اٹھانا ہو تو ناظم کے یہ شعر پیش کئے جاسکتے ہیں ۵

آبرو کیا پیر ہیں جبے گریباں گیا بارے آنسو چھو گئے حیر کہ دامان گیا

۱۔ انتخاب یادگار صفحہ ۵۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۲۰

سنبھل کے پیچ سُن کے وہ کھانا تھپا چکا تھا  
فالت و مومن کا طرز ملاحظہ ہو

وہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو  
ہوتے ہی دردِ دل کا بیاں اٹھ کھٹے ہوئے  
گو یا یہ ایسے ہیں کہ زال سے سستا گیا

نواب گلبدین خان نواب کا غلام امیر کے رُکس میں ڈوبا ہوا ہے  
مگر پھر بھی دلغ کی بھلک پائی جاتی ہے۔ شنہ

پچا ہوا تھا جو کچھ تیری چال سونڈتہ  
بدل کے رنگ وہی گردِ نہ مانہ ہوا  
اواسے ناز سے غم سے سر سکرانے سے

سارے دینکے مرنے کھوتا ہے جانا دل کا  
بچ تو یہ ہے کہ براہِ تلب ہے آنا دل کا

دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کے دواوین بھی راپور سے بکثرت شائع ہوئے  
دواوین میں امیر کا دیوان "صنمناز عشق" "گوہر انتخاب" وغیرہ دلغ کا

"گھزار دارغ" "آفتابِ دلغ" اور ایک شہسوئی فریادِ دارغ۔ "قبیلہ کا تیسرا  
دیوان "نظمِ دل افروز" "دفتر خیال" راپور ہی سے شائع ہوئے۔ امیر

جلال۔ تیسرا اور شعراء کا کلام بھی یہاں سے شائع ہوا۔ امیر و جلال کی شاعری  
کا بہترین زمانہ وہ تھا جو رام پور میں گذرا۔ دارغ کی شاعری کا آغاز لال قلعے

سے ہوا جو اردو کے معنی کا گہوارہ تھا اور اس کے شباب کا زمانہ نواب گلبدین خان  
مرحوم جیسے قدرِ دال کے سایہِ عاطفت میں بسر ہوا۔

نظم کے قدمِ بعدِ مژدہ کو بھی ترقی ہوئی، امیر، جلال اور امیر نے نثر  
میں رسالہ اور کتابیں لکھیں۔ چنانچہ امیر کی تصانیف میں خیابانِ آفرینش

"انتخابِ یادگار" وغیرہ امیر کی زرِ کامل عبارت اور جلال کی سرایہ زبانِ اردو  
"مفیدہ الشعراء" قواعدِ منتخب مفید کتابیں ہیں۔ سب سے بڑی خدمت

جو اس سلسلہ میں ہوئی وہ امیر اللغات تبت۔ امیر مغفور کے ذہن میں اس  
لغت کا خیال ایک عرصہ سے تھا لیکن جب خلد اشیاں نواب علی

خال بہادر کا عہدِ بابتِ فرصت نہ تھی۔ دیکھی لیکن کچھ بھی ہو یہاں  
دہن بندھی رہی۔ سب سے اعلیٰ علوم کے قدر دان سرائیہ لائبریری

بہادر لغت گورنر ممالک مغربی۔ شامی نے نواب خلد اشیاں طاب ثابہ

سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی نواب خلد اشیاں نے مجھے حکم دیا یہاں  
تو تمنا بھی تھی۔ نوراً آکھ کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا۔

راپور ایک ادبی مرکز کی حیثیت سے فوراً ولیم کالج کلکتہ سے بہت  
مشابہت رکھتا ہے جہاں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے

اوائل میں انگریزوں کے زیرِ سرپرستی نثر نگار جمع ہوئے انہوں نے سب سے پہلی  
عبارت ترک کر کے نثر عاری اختیار کی جو ملک میں مقبول ہوئی۔ راپور میں

لکھنؤ اور دہلی کے بالکل شاعر کا جمع ہونا نوابانِ دی شان کے ادبی ذوق و  
علم کی سرپرستی کا نتیجہ تھا۔ یہاں نثر نے سلاست و صفائی پائی۔ تصنیف اور نثر

کا سکھ اٹھ گیا۔ جب نواب گلبدین خان کی شمعِ حیات گل ہوئی تو اس پر  
کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ نواب حامد علیاں المتخلص رشک کے عہد میں  
دشاعری کا چرچا کچھ نہ کچھ رہا۔ کتب خانہ جس کو نواب فیض اللہ خاں نے قائم کیا تھا

نواب ناظم اور نواب گلبدین علیاں کے ہاتھوں اس نے بہت کچھ ترقی کی اور  
نواب حامد علیاں رشک کے زمانہ میں کتابوں کی تعداد اکیس ہزار پانچ سو

تیراؤ تھی۔ جن میں آٹھ ہزار چار سو ستر قلمی ہیں۔ ان میں اردو کی  
بہت سی غیر مطبوعہ کتابیں بھی شامل ہیں مثلاً تسلیم کا سفر نامہ نواب راپور

جس میں پچیس ہزار شعر سے کم نہ ہونگے راپور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی  
موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نواب گلبدین علیاں کی موت راپور کے اس تعلق  
کو جو دہلی اور لکھنؤ سے قائم ہوا تھا منقطع کر گئی۔ امیر مرحوم لکھتے ہیں۔ ایشیائی

بارغ حوا انہوں نے (نواب گلبدین علیاں) نے دنیا بھر سے گل بوئے جن کو لکھایا  
تھا خزاں کے ہاتھوں اجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس بارغ کا ایک کھلایا ہوا

شجر ہوں جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں  
اب جب اصل شجر میں نقصان ہے تو پھول پیکھری کی طراوت معلوم۔

امیر کا یہ شعر رام پور کی ادبی سرگرمیوں کے اختتام اور دہلی و لکھنؤ کے  
تعلقات کے خاتمہ کی تائید ہے۔

امیر اب ہم کہاں اور اب کہاں دلغ

یہ جیسے ہو چکے خلد اشیاں تک

# غزل

علامہ خیال مراد آبادی

مجھ کو بے ہوش جو کہتا ہے اُسے ہوش نہیں  
 شعلہ آتش ازل ہوں کوئی مینوش نہیں  
 ختم ہو جائیگی اک روز جفا کو شئی حُسن  
 عشق کو اپنی حقیقت کا ابھی ہوش نہیں  
 ضبط و احتلائے محبت تو ہے خامی کی دلیل  
 عشق ہر رنگ فغاں کوشن ہر خاموش نہیں  
 وہ تھا آغازِ محبت یہ ہے انجامِ جنوں  
 عشق بے ہوش تھا جب حُسن کو اب ہوش نہیں  
 یہ مرے شوقِ فراواں کو ستم ہیں مجھ پر  
 ورنہ وہ حسنِ حقیقت ہیں ستم کوش نہیں  
 جس کے اک قطرہ سی ہو جاتا ہر عالم ہوش  
 جامِ میرا بے مرے بادۂ سر جو ہوش نہیں

نارسانیِ نگہ شوق کی ہے ورنہ خیال

جلوہ حُسنِ حقیقت کبھی روپوش نہیں

# ”فخار خط“

چار خط! جناب طفیل احمد خاں صاحب سلطان پوری

گوپال بھائی!

اگر محبت کی جذباتی دنیا سے الگ یونانیوں کا کیو پڈ واقعی کوئی آہستی ہے تو وہ یقیناً ”تم“ ہو۔ میں نہیں کہتا تھا کہ تم اپنے ساتھ میرا سکون بھی لئے جا رہے ہو؟ اپنا دھڑکتا ہوا حس دل میرے برت کی فاش جیسے دل سے بدل کر لے گئے، بلکہ چرائے گئے۔ آج تمہیں کالج چھوڑے ہوئے دس دن گزر گئے مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی گئے ہو یقین کرو! آدھا لطف تو تم اپنا زادراہ بنا کر لے گئے اور آدھا

نہیں کوٹا۔ تم منہ سو گے! اسی وجہ سے تو کہہ رہا ہوں کہ تم نے مجھ سے دلوں کا تبادلہ کیا ہے، ورنہ جانتے ہی ہو کہ میں نے آج تک کسی حسین مسکراہٹ کا جواب سولے قہقہے کے اور کسی چیسے نہ نہیں دیا۔ تم سے کم کسی نے میرا مطالعہ کیا ہوگا، اگر یہ تو بتاؤ کبھی تم نے مجھے فطرت، ذروان، سے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرتے ہوئے بھی سنا ہے؟

تمہیں اس دھندلی شام کا واقعہ تو ضرور یاد ہوگا جب تم اور یوسف ندی کے کنارے کیو پڈ و سائیکل کا افسانہ محبت پڑھ رہے تھے اور اتنے غوطے میں کہ میں کہا اور تمہیں خیر تک نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ میں نے پیچھے سے تمہاری آنکھیں بند کر دیں اور تم چونک پڑے جیسے کسی نے خواب سے جگایا ہو۔ جب یوسف حسین سائیکل کے اس فقرہ پر پہنچا

”وہ سکوت، وہ فکر میں ہی تو ہوں، جو تیری گناہوں کو نیسے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا دیتی ہوں۔“ تو میں نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور تم جھنجھلا اٹھے۔

میں نے تم سے ”روسو“ کی تاریخ زندگی لینے پر ہمارا کیا تھا، مگر تم نے انکار کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم نے کہا تھا: ”اس میں سوائے لٹوکا ناموں کا انسانی خونریزی کی داستانوں کے اور کیا ہوگا۔“

آخر تمہاری نظر انتخاب، باؤن کے خطوط محبت پر پڑی اور تم نے اسے بڑے شوق سے لے لیا۔ بتاؤ! کیا ایسے آدمی سے توقع کر سکتے ہو کہ وہ ایک بیک کسی پر کیف ساغ میں اپنی روح کھو بیٹھے گا؟ چونکہ کوئیں بغور سے سنے جاؤ، یہ ایک سلسلہ نظر یہ ہے کہ جو جس لہول میں پتا ہے وہی اس کا ملک الموت ثابت ہوتا ہے۔

”والیئر“ انقلاب فرانس کا مشہور ہیرو، مذہبیت کا دشمن، مذہب ہی کی گود میں پلا تھا۔

ہاں، تو اب میں وہ ہمیش نہیں ہوں جسے تم متحرک بتا کر لے تھے۔ تم میں اور مجھ میں اب صرف اتنا ہی فرق ہے کہ تمہارے دل میں فطرت کے ہر جن کا عشق سا سکتا ہے لیکن میرا دل صرف ایک آسانی تلی کیلئے اپنی تمام وقعیں وقف کر چکا ہے۔

میں اسے آسانی تلی ہی کہتا ہوں۔ اس خط کے جواب میں جانتا ہوں کہ تم مع شفق بن کر میری ممت کرو گے، گروڑے بچے! مجھے اب اس کی کیا پروا ہے۔

تمہارا ہمیش

۲

پیارے گوپال!

مجھے تعجب اور سخت تعجب ہے کہ تم میری فطرت کے اس مہم بالشت



انقلاب کو ایک معمولی سا واقعہ تصور کرتے ہو۔

تمہارا خط، کاغذ کا ایک غیر شاعرانہ محو "میں ہیں ایک لٹے ہوئے انسان کو اور لوٹنے کی کوشش کی گئی تھی ملا! — اگر میں تمہاری گئے ہوتا اور تم میری جگہ تو میں تمہیں خود کشی کر لینے کا ضرور مشورہ دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ تم بھی بدل گئے۔

خیال تھا کہ اب ہم دونوں کا فطری اختلاف جتنا رہا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ باوجود انقلاب کے ہم دونوں مختلف ہی رہے۔ خدا کے لئے مذاق نہ کرو! گو تم بہت کچھ جانتے ہو لیکن تمہیں کیا معلوم کہ "کمال" میرے لئے کیلئے ہے؟ یہ کمال — کون سی نئی بلا ہے؟ — یہ کوئی نئی بلا نہیں میاں شعرا — میں نے صرف دل بہلانے کے لئے اس کا نام "آسانی تلی" کا — "کمال" نام رکھ لیا ہے جو میری زندگی کا سرمایہ نشا ہے۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں اور بے انتہا محبت! میں اسے نہیں جانتا، مگر وہ میرے نزدیک ہے بالکل نزدیک، یہاں تک کہ اس کے تصور سے قلب میں ہر گھڑی ایک دھڑکن سی محسوس کرتا ہوں۔ جو کبھی کبھی درد کی صورت میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔

وہ میرے دل کی ایک تنہا ہے اور میری تنہائی میں زیادہ تر میرے دل ہی میں رہتی ہیں۔ وہ میرے دل سے کیونکر دور ہو سکتی ہے جبکہ میری زندگی کے ہر سکون اور درد جانی جنبے اسی کی آرزو سے برقرار ہیں۔

پیارے گویاں! معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب دنیا مجھے چین سے بیٹھنے دینا نہیں چاہتی۔ یہ وقت گو میرے لئے ناکامیوں اور محرومیوں کا ہے لیکن اتنا تسکین دہن دے کہ یہ گریز نہ یہ چاہتا ہے کہ یہ کیف "بھی چھین جائے اور میرے حصے میں صرف ناکامیاں ہی ناکامیاں رہ جائیں۔

کل شام کو کلب سے واپس آیا تو سب سے پہلے نوکر نے والد صاحب کا خط دیا۔ تم خود پڑھو اور بتاؤ کہ میں کیا کروں۔

فیروز پور

عزیز بیٹا! ایشیہ تمہیں خوش رکھے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤں۔ تمہاری عمر اٹھارہ سال سے تجاوز کر چکی ہے پڑھنا ہے تو پھر پڑھنا ہے رہنا۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک لائحہ

فرض ہے۔ تمہاری شادی یہاں سے کچھ دور ایک بڑے زمیندار کی لڑکی سے طے ہو گئی ہے۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہے اور تمہارے حسب خیال۔ اسی ماہ کی میں کو شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے آج سے کل میں روز اور رہ گئے ہیں اس لئے تم اب جلد حوالہ نہ کرو اور آج ہی گھر کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ امید ہے کہ اپنے بڑے باپ کی اس آخری تمنا کو پامال نہ کرو گے۔ تمہارا اہلی خواہ.....

جنتے ہو یہ خط پڑھ کر تیار ہو یا ہوں اُف — کیا قیامت ہے! میرا دل کسی اور کو چاہتا ہے اور گھر والے زبردستی مجھے ایک نامعلوم وجود کو بیا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ میں نے اس خط کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا ہے کیا جواب دوں؟ تمہارا ہمیشہ

اچھے گویاں!

تمہارا خط موت کا پیام بن کر پہنچا۔ میں نے تم سے مشورہ طلب کیا تھا مگر تم تجربے بتانے لگے، ظالم کہیں کے، اپنے کو تجربہ کار اور مجھے نا تجربہ کار سمجھ کرے مائے دینے بیٹھے کہ میں آگ سے کھینچنا شروع کروں۔

مجھے تمہاری زبان سے ایسی باتیں سن کر سخت حیرت ہوئی۔ خدا کیلئے مطالعہ جو درد۔ گناہوں نے تمہاری فطرت کو مسل کر رکھ دیا ہے۔ محبت کو تجربہ کاری سے کیا نسبت؟ وہ محبت ہی نہیں جو لہروں کی طرح پر جوش نہ ہو۔ جیسا اس کی پردہ انہیں کہ ان کی ٹھوکریں ساحل پر کیا آفت ڈھاری ہیں وہ محبت محبت نہیں جس کا نتیجہ چاند سے چمکتی ہوئی کائنات کی طرح خلوش اور پرسکون ہو، محبت بجائے خود ایک کامیاب تجربہ ہے اس میں کسی مزید تجربے کی ضرورت نہیں، لیکن تمہارا حکم نال نہیں سکتا تھا۔ گھر گیا اور آج واپس آیا۔ صاف صاف کیوں نہ کہ دوں، بھاگ آیا۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری یہ حرکت مسلح کی نظر دل میں حدود و ذیل اور قابلِ نفرین سمجھی جائیگی لیکن مجھے اب اس کی کیا پروا؟ "سلاح کے بجلا بھگت" میرے تعلق کیا کیا خیال آرا یاں کرتے ہو گئے۔ اس کا اندازہ تم مجھ سے بہتر کر سکتے ہو اس لئے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو میں بالکل مجبور تھا۔ شادی نہ کرنے کی صورت میں جائداد سے محروم ہو جانے کا

صرف تم نے اور تمہاری سلج نے!  
ناکام محبت تمہارا ہمیشہ۔

۴

پیلے گویاں!

آج کلا کو مرے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا، آہ، میری آسانی تھی جس کے ہاتھوں میں نے اپنی قسمت بچھڑی تھی، ہاں ہاں، وہی گلاب کی نوخیز کلی جو ہمیشہ میرے شام تھیل کو مسطر رکھتی تھی، وہی سرخ رنگ کی حین دوشیزہ جس کو میں نے ندی کی لہروں سے پھینکا تھا۔ آہ پھلی گئی۔۔۔ اپنی اہلی دنیا میں۔۔۔

اب مجھے اس دنیا سے کیا دلچسپی ہے، اُف، کتنا ہوشربا سا نسخہ ہوا ہے۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے محبت بھی کی اور نفرت بھی۔ میں نے اسے چاہا بھی اور دشمنکارا بھی۔ اور آہ، وہ میری روح کی لپٹ ہونے کے باوجود میرے لئے اجنبی بنی رہی۔

اُف! محبت کا کتنا تلخ زہن ڈرامہ ہے، اور میں کس طرح کلہرا محبت بن کے ناکام محبت رہا ہوں، بالکل اس طرح جیسے کالی کالی گھٹائیں آئیں، بجلیاں چمکیں اور بارش نہ ہو۔

آہ! اس کی حیرتناک موت! وہ ایک غمزدہ، ناشگفتہ تھی جس سے میں محبت کی اور پھر توڑ کر گراگ میں جھونک دیا۔ تمہارا خیال صحیح ہے گویاں! یہ پاگل ہوں اور بالکل دیوانہ،

آج آٹھ روز ہوئے مکان سے نارا آیا۔ لکھا تھا جلد آؤ، تمہاری بیوی گھڑی دو گھڑی کی ہمان ہے۔ میں گھر پہنچا تو تمام لوگ پریشان تھے اور اندر سے باہر تک ایک مسلسل آمد و رفت جاری تھی۔ اس وقت اس کی حالت بہت زیادہ نازک ہو گئی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ بستر پر خاموش پڑی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر چادر ڈال دی گئی تھی۔

میں اس کے سر پر ہاتھ پڑا۔ بٹھا دیا گیا۔ اور چہرے سے چادر ہٹا دی گئی۔ میں حیرت میں پڑ گیا، وہ کلا تھی، وہی آسانی تھی۔ میری زندگی کا سہارا، لیکن آہ! اس کا سرخ چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اور اس میں اب ایک مسئلہ ہوئے پھول سے زیادہ دلکشی نہ تھی۔

میں نے بتایا، اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں

اندیشہ تھا، مگر کبھی کیا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ سوسائٹی کے سامنے عارضی طور پر تسلیم غم کر دوں۔ اگر سلج نے مجھے اپنے جذبات مجروح کرنے پر زور دیا تو میں نے بھی اطاعت کے پردے میں انتقام کی صورت نکالی۔

سلج بظاہر مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گئی۔ مگر میرے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔ میری زندگی صرف کلا کے لئے وقف ہو چکی ہے اس پر کسی اور کا کیا حق ہے خواہ وہ برنس پارلیمنٹ کی ممبر ہو یا جرمنی کی وزیر تعلیمات مجھے یہ لالچ دیا گیا کہ وہ دولتمند ہے اور تعلیم یافتہ، اور حین بھی ہے ذرا غور تو کرو، یہ باتیں کتنی مضحکہ خیز ہیں۔ کیسے جاہل لوگ ہیں، کیا کہو پڑ؟

کاتیز صرف دو نمٹن مل، اہ تعلیم یافتوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ میں نے اس کو دیکھا بھی نہیں کہ وہ ہے کیسی؟ اور دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تم نے لکھا تھا کہ میں ایسا کروں گا تو ایک دوشیزہ پر ظلم ہوگا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، یہ ظلم ہے کس کا؟ میرا یا سلج کا! اس تکس دوشیزہ کی زندگی کس نے تلخ کی، میں نے یا سلج نے؟

میں نے تو ہمیشہ مخالفت کی مگر سننا کون تھا مجھے کلا سے محبت ہے اور وہ میری بھارتی شریک حیات تھے۔ اس لئے کہ ہم دونوں سلج کے کٹنگا ہیں۔ میں نے کج اس کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں اس فریب کار از فشا کر دیا ہے جو اسے سلج کی طرف سے دیا گیا ہے۔ میں نے صاف صاف اس کا اظہار کر دیا ہے کہ میرے دل پر کسی دوسرے کی حکومت ہے۔ آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ اس کا انتقام سلج سے لے لے۔ میں نے اس کا میا بی کی بھی امید دلائی ہے وہ یقیناً میرے حکم کی تعمیل کرے گی۔ میں نے اسے بتا دیا ہے اور اس راز سے آگاہ کر دیا ہے کہ عورت کا انتقام بہت زیادہ ہولناک ہوتا ہے اور خصوصاً اس وقت جب وہ اپنے آنسوؤں کی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس وقت وہ ایسی شیرنی کی طرح ہو جاتی ہے جس کا بچہ اس کے سامنے مردہ پڑا ہو اور قاتل بھی اس کے سامنے ہو۔

میں جانتا ہوں اور عورت کی کمزور فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ میرا خط پڑھ کر بہت روئے گی۔ یہاں تک کہ اس کی اچکیاں بندھ جائیں اور مجب نہیں کہ کسی بچکی کے ساتھ اس کی روح بھی دھوکے میں باہر نکل آئے۔ تم میرا یہ خط پڑھ کر منہس دو گئے اور کہو گے پاگل ہو گیا ہے۔ ہاں تمہارا خیال صحیح ہوگا۔ میں بالکل پاگل ہو گیا ہوں۔ لیکن پاگل کس نے بنایا ہے

میں آج پھر ندی کے کنارے جاؤنگھا۔ جہاں پہلی بار اس سے ملا تھا  
اور کچن نہیں کہ وہاں اس لئے پیارے گویاں اپنے برباد محبت میں کو  
بھول نہ جانا، اور جب کبھی محبت کے دو کھلاڑیوں کو دیکھنا تو مجھ پر حسرت  
کے دہانے ضرور بہا لینا۔

برباد محبت، اکلا کا گنہگار  
نہیش

کھل گئیں اور وہ مجھے ایک دم توڑتی ہوئی چہرے کی طرح خیرت سے دیکھنے لگی  
اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور بول پر تبسم کی لہریں دوڑنے لگیں اس نے  
اپنی نازک اور گوری گوری بائیں میری گردن میں ڈال دیں مگر آہ ایسین  
بہت جلد ختم ہو گیا۔ وہ میری آغوش میں سرد ہو گئی اور ہمیشہ کیلئے غائب  
دنیا کج کہتی ہے، میں گنہگار ہوں۔ بہت بڑا گنہگار، اور مجھے  
اکلا کی روح کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

## شام!

مولانا سید محمد اسماعیل صاحب ہمدانی ایم۔ اے۔ گولڈ میڈلسٹ

بادہ نبا ہے خونِ دل آنکھوں کے جام کیلئے      سوزِ الم جو شمع ہے، ہجر کی شام کیلئے  
دن جو کٹا دکھائی دی، اپنے وطن کی سرزمین      صبحِ الم ہوئی نثار، عیش کی شام کیلئے  
آئے سمجھ میں کیا تمہیں تیرگی شبِ فراق      تم کو چیراغِ رنج ملا، زلف کی شام کیلئے  
آیا شبابِ جوش پر دل میں منگیں کیوں نہوں      کتنے چیراغِ جل گئے، عیش کی شام کیلئے  
وعدے کر وقت کی مہنسی کس لئے ہونہ دلفریب      پھول ہیں کتنے خوشنما، وصل کی شام کیلئے

سُرخِ چشم ہے رسا، سوزِ غمِ فراق سے  
پھولی ہوئی ہے یا شفق، ہجر کی شام کیلئے

# نغمہ مایوس

دھلے ہوئے آسمان پر جب ابر کے چھوٹے چھوٹے رنگارنگ کے ٹکڑے افق کی گود میں کھیتے ہیں۔ ہوا کے سحر طراز  
جھونکے انھیں مختلف شکلوں میں تبدیل کرتے ہیں اور جب ان فانی بادلوں کا سنہرا اور بھورا رنگ طلسم نگاہ بن کر  
نظرت کی ہمدردیوں کو بے نقاب کرتا ہے تو

اس وقت میں تمہارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں  
مگر افسوس تم نہیں آتے

دریا کی تیار لہریں جب کسی کی یاد میں مضطرب ہو کر ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، ارگستان کے درے جب کسی کے خیال  
میں گولوں کی شکل میں فلک سے سرگوشیاں کرتے ہوئے اٹھتے ہیں اور جب نظر قریب آبشار پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے پگھلی  
ہوئی چاندی کی طرح نشیب میں گرتے ہیں تو

اس وقت میں تمہارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں  
مگر افسوس تم نہیں آتے

جب غروب ہونے والا آفتاب کسی کے صحن بے بنیاد کی طرح دھلتا نظر آتا ہے اور اس کی ضوفاں گریں سطح سمندر پر  
پڑ کر منعکس ہونے لگتی ہیں اور جب شفق کی سرخی تمام کوہ و دشت کو لالہ زار بنائے ہوئے ہوتی ہے تو

اس وقت میں تمہارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں  
مگر افسوس تم نہیں آتے

جب سمندر کی زریں لہروں کا لہجہ مرکز نگاہ بن جاتا ہے اور رنگ شفق کی تابیگی میں تبدیل ہونے لگتا ہے جب چرخ نیلوفر  
اور سمندر کی بسیط سطح میں تاریکی کی وجہ سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور ظلمت نور کے لئے مضطرب نظر آتی ہے تو

اس وقت میں تمہارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں  
مگر افسوس تم نہیں آتے

جب لیلائے شب کی زلف مسلسل منتشر ہو کر تمام کائنات پر چھا جاتی ہے جب نیلوں آسمان کی ضوفاں اختر جگمگ جگمگ  
کر کے بزم ہستی کو روشن کرتے ہیں اور دنیا فیند کی گرم آغوش میں بے خبر ہو جاتی ہے تو

اس وقت میں تمہارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
— جب ماہتاب عالم تاب اپنی بہیم نیا باروں سے مغش شب کو بقرہ نور بنا دیتا ہے اور سچی زریں شاہین غم دل و نشتر کا کام کرتی ہیں اور ہلو میں ایکٹیں اٹھتی ہیں تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
نعلن کے کائنات جب عامر کوٹ میں لبوس ہوتی ہے اور فلکِ اختری پر گنگو گنگائیں چھائی ہوتی ہیں جب مرزا بکر پر دلوں میں سے ڈرنا و تاشا حوں کی چلینیں بٹاتا ہوا جلوہ نگن ہوتا ہے اور اپنے من کی بھلک دکھا کر ہر ایک کو حیران کر دیتا ہے تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
رات خاموش رات میں جب بزمِ فلک آراستہ ہوتی ہے اور شاہانِ فطرت رشتہ محبت میں منسلک ہو کر اپنی کشتِ محبت کا تماشا دکھاتے ہیں جب نور افشاں تاروں کا نظارہ آنکھوں کو خیر کئے ہوئے ہے اور میلے بہیم بوسوں پتیوں میں ارتعاش انگیز کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
جب صبا کے آہستہ خرام کیف آور اور مطرا گیس خوشبوؤں سے شامِ جان کو مطر کئے ہوتی ہے اور طاراںِ سحری اپنے اپنے کاشانوں میں بیٹھے راز و نیاز کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں اور گلاب کے پھولوں کی خوشبودار لہٹ چترہ محبت میں مد و جزر کا سماں پیدا کر دیتی ہے تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
جب اختر و فشاں آسمان کی نور و قدیں تمام رات خاموش کائنات پر سلسلِ ضیاء پاشی کرتے کرتے ٹھک جاتی ہیں اور ان کی غمار کو آلود آکھیں چھپکنے لگتی ہیں اور جب صبحِ زمینی اپنی زہمتِ بخش تازگی سے مردہ دلوں میں حیات تازہ بخشتی ہے تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
جب شفقِ بچھی وطن کو لال جڑا پچھا چکی ہوتی ہے اور جب منادِ اپنی سوختہ جگری کے جگر پاش افسانے سناتا کر درونِ ناک اور دل سوز لہجہ میں فریاد کناں ہوتی ہے تو میرا ننھا اور گزور دل اس کی جگر پاش صداؤں سے پاش پاش ہو جاتا ہے تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے۔  
ملکہ سحر جب نور کی رتھ میں سوار ہو کر اپنی لازوال دولت باہمی ہوئی نکلتی ہے اور مشرق میں نور کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوتے ہیں اور جب باوجود صبح کی آمد کا سند لیسہ سن کر درختِ فطرت سے جھونے لگتے ہیں تو اس وقت میں تمھارے جامِ محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

# اثر

جناب محترمہ صادقہ بیگم صاحبہ

تھوڑی دیر کیلئے تمام کلمتوں سے آزاد کر دیتی تھی۔ مگر سادہ دل صغیہ کو اس والہاء شیفٹنگی کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ ایک اظہار کی تھی جس نے عمر کی صرف چودہ بہاریں دیکھی تھیں۔ صغیہ کی والدہ زادہ کاب واحد مشغلہ عبادت تھا۔ وہ مالک حقیقی سے اپنے محبوب شوہر کی روح کو سکون کے لئے دعا مانگا کرتی تھیں اور ان کو دنیا اور دنیا والوں سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔

ریاض کی موت کو بھی ایک سال گزر گیا۔ ناصر کی بیکاری اس کے لئے انتہائی صبر آزمائی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ بیٹی تلاش کے باوجود اس کو کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوا اسی تسکیم خیالات میں مجھتا کہ یکایک اس کے دوست راشد نے اگر اس تسلسل کو توڑ دیا اور ہر ادھر کی باتوں کے بعد راشد نے موضوع گفتگو بدلا۔

”تمہاری افسردگی حد سے زیادہ ہو گئی اور اسکی وجہ تمہاری بیکاری ہے۔“

”تشخیص تو معقول ہے۔“ ناصر نے کسی قدر بناتے ہوئے کہا۔

”کیا اچھا ہوا اگر کوئی نسخہ بھی تجویز کر دو۔“

”نسخہ یہی ہے کہ تم اپنی تعلیم جاری کر دو۔“

”عزیز دوست، تم کو میری دشواریوں کا شاید علم نہیں ہے۔“

”اپنے چہرہ کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔“

”ہاں مجھ کو علم ہے۔ مگر میں تمہاری ہر طرح کی اعانت کیلئے تیار ہوں۔“

”شکریہ، مجھ کو ایسی ہی توقع ہے۔ میں اس کا تعلق جواب کا دیکھوں گا۔“

”کچھ عرصہ بیٹھنے کے بعد راشد رخصت ہو کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ناصر کو وہ کہہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ وہ صغیہ کو کیونکر جدا کر سکے گا۔ اس کو اسکول تک پہنچانے کوں جایا کر گیا۔ اس کی دلجوئی کی کس کو پروا ہوگی؟ کیا وہ خود اس کی اجازت دیدیگی کہ میں اس کو چھوڑ کر چلا گئوں۔“

ڈاکٹر نے ریاض کو کامل دلچسپی اور اناک سے دیکھا، اس کو اطمینان دلایا اور تیار داروں کو ضروری تدابیر بتا کر واپس چلا گیا مگر اس کی نظریں اس کے تاثرات قلبی کی غماری کر رہی تھیں کہ وہ مریض کے متعلق مایوس ہو چکا ہے۔ چند سکند کا وقفہ گزرا تھا کہ ریاض نے سچکیں لیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ یوں تو وہ سنگمان دان میں سے سچی کو جوتن ہوا وہ ہوا مگر ناصر جھکنے کو اگرچہ چھٹی تھا لیکن لڑکے سے زیادہ پیارا اور جس کی آسندہ کامیابی کا مدار ریاض کی زندگی پر تھا سجدہ متاثر تھا۔ ریاض کی آرزو تھی کہ وہ ناصر کو ایک وکیل کی حیثیت سے دیکھے اور اپنی اکلوتی لڑکی صغیہ کو رشتہ ازدواج کے ذریعہ اس سے منسلک کر دے لیکن آہ، اسے بس آرزو کہ خاکشہ ریاض کی وفات نے ان زریں توقعات کو بھی پامال کر دیا۔ ناصر کے والدین جب وہ صرف ۷ سال کا تھا طاعون کی نذر ہو چکے تھے مگر اس کو کچ نک، ریاض کی شفقتوں کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہوا تھا البتہ کج اس کو معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یتیم ہو گیا ہے۔

ریاض بریلی کے ایک شریف خاندان کا فرد تھا۔ سو روپیہ جو اس کو بطور نیشن ملتے تھے اس کی مالی ضروریات کے بغیر تھے مگر اس کی اچانک موت کیا ہوئی گویا گھر سے برکت بھی اٹھ گئی۔ ناصر کی بھی تین تھی کم از کم گریجویٹ ہو جائے مگر اب اس کے ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ اس سانحہ سے اس کی سنگتلی مزاج اور جادو میانی جو احباب کی گرویدگی کا سبب تھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کو اپنا مستقبل تا ایک معلوم ہوتا تھا اور اس پر تہائی مستزاد البتہ صغیہ اس کی مونس تہائی ہونے کا فخر حاصل کر رہی تھی وہ بریلی کے زنانہ اسکول کے طالبہ تھی اور ذہین ہونے کے ساتھ دولت حسن سے بھی بہرہ ور تھی، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ناصر کی گرویدگی بڑھتی گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی تہاؤں کا مرکز صرف صغیہ ہے۔ اس کی ایک جھلک ناصر کو

چلا جاؤں! شاید ایسا نہ ہو، آہ! میں اس کے عارضی فراق کو بھی برداشت کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتا۔ انہیں خیالات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ رونے لگا۔ مستقبل کے متعلق تصورات، ادھر صغیر کی محبت، نامر کچھ نہ ملے کر سکا کدہ کیا کرے۔ وہ مات بھر ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ صبح کو بھی وہی سوال اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

نامر کو پڑمردہ اور مذہال دیکھ کر زاہرہ نے اس کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور اس سے کبیدگی خاطر کا سبب پوچھا۔ نامر نے دل اول تو کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا مگر چچی کا ہمارا اس کے انکار پر غالب آیا۔ اور اس نے راشد کی گذشتہ روز کی گفتگو کا تذکرہ کر دیا۔

”بیٹا! اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کو تو تمہارا بھی جی چاہا کرتا ہے یہی تو تمہارے چچا کی بھی خواہش تھی۔ اگر کوئی ایسا موقع ہوتا تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا کون سی عقلمندی ہے پھر یہ کہ علی گڑھ کچھ دور نہیں ہے۔“

جھکو اپنے سے زیادہ آپ لوگوں کی تنہائی کا خیال ہے۔ نامر

نے مضطرب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے، لیکن میرے خیال میں تم اس بات کو ترجیح دو۔ نامر نے زور دیتے ہوئے کہا۔

اب نامر نے زیادہ کچھ کہنا لا حاصل سمجھا اور بلاشبہ ایک حقیقی ہی خواہ سے اس طرح کی رائے کے علاوہ اور کسی مشورہ کی امید غلطی ہے۔ صغیر خود دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ان کے نزدیک آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے بھی تمام گفتگو کو سنا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی عزیز ترین چیز اس سے چھینی جا رہی ہے۔ اس پر نامر کی جدائی غیر ارادی طور پر شاق گذر رہی تھی وہ خودیہ نہ سمجھ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ اس نے بڑی جرأت سے کام لیکر کہا۔ ”بھائی صاحب! کیا آپ نے مجھ کو تنہا چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا ہے؟“ نامر اس کے اس سوال پر تڑپ گیا مگر خاموشی ہی کو بہترین جواب سمجھا۔ شام کو راشد پھر اس سے ملنے آیا۔ بڑی رد و کد کے بعد نامر کو بادل ناخواستہ اپنی رضامندی کا اظہار کرنا پڑا۔ راشد نے اس کو یقین دلایا کہ وہ صغیر کا بھی ہر طرح خیال رکھیگا۔ اور اس کی آزدگی کو ارادہ کر گیا۔

## آپ حج کیلئے جا رہے ہیں!

تو امرت ہارا کو ساتھ کھانا بھولے پیچھے دوست کی طرح ہر وقت آپ کے جسم کی حفاظت کر لگی اور آپ کو تکلیف اور مصیبتوں سے بچاؤ گی۔ جناب مولانا اختر علی خان صاحب سر زدا جرنل حضرت مولانا ظفر علی خان صاحب مالک اخبار زمیندار اپنا تجربہ زمیندار میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔

دو مکر دن صبح کے وقت شیخ عبداللہ سلیمان کی ملاقات ہوئی اکی طبیعت کسی قدر خراب تھی پیٹ میں گڑبڑ تھی۔ میں نے کہا میرے پاس ایک عجیب و غریب چیز ہے چنا چنا پڑا ہے وقت اپنے آدمی کے اتھارٹ ہارا کی ایک شیشی منگو اگر ان کی خدمت میں پیش کی شیخ صاحب قہوہ میں ملا کر اسے پیا اور ایک گھنٹہ طبیعت بالکل بحال ہو گئی کہنے لگے مجھے نے کی چیز ہے میں نے کہا اس کے ایجا در کو لالہ کے شہو طبیب پنڈت ٹھاکر دت شرابو ہیں امرت دھارا ہندوستان کے چپ چپ میں مشہور ہے ہر ایک شخص اپنے گھر میں اس کی ایک شیشی ضرور رکھتا ہے مگر جب ہم بدلے دیے ہیں صغیر ثابت ہوئی ہے میں ہمیشہ اپنے ہاں ایک شیشی ضرور رکھتا ہوں شیخ صاحب نے مجھے پنڈت جی کا پتہ لیکر رکھ لیا

امرت دھارا گھر میں بیلا ہر سب جگہ ایک انسان کو کھساں صغیر ہمیشہ اس کو پاس رکھو اور وقت بے وقت کی تکلیف تشویش اور خج سے بچو لاکھوں آدمی آزمائے ہیں، امرت دھارا آزمائش سے گزر چکی ہے سب کی ہی رائے ہے کہ ہمیشہ اس کو قیمت فی شیشی سالم ۱۲ نصف شیشی ۶ نمونہ کی شیشی ۸ احتیاط۔ نقول سے بچو! کیونکہ سخت و دیرینہ امر میں جو کہ دیکر دکھ و تشویش کو بڑا دینی صحت کے مقابل میں کبھی نقول پر اعتبار نہ کرو۔

خط و کتابت اور تار کے لئے پتہ: امٹھ منیجر امرت دھارا اوٹد ہالیہ امرت دھارا بھو۔ امرت دھارا وٹو امرت داکنی نہ۔ لاہور امرت دھارا ۱۶۰ لاہور



جون کا مہینہ ختم ہونے کو آیا۔ ناصر کا اضطراب اور بڑھ گیا وہ رات کے وقت صحن میں تنہا بیٹھا ہوا نہ معلوم کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ کبھی اس کو خیالات راشد سے بدگمان کرتے اور وہ سوچنے لگتا تھا کہ مجھ کو فریب دیا جا رہا ہے مگر پھر وہ یہ بھی خیال کرنے لگتا تھا کہ آخر اس کے پاس اس میں گمانی کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ کبھی اس کو صفیہ کی تنہائی اذیت دہ معلوم ہوتی اور وہ سوچنے لگتا کہ ہرچہ یاد آباد میں اس کو نہ چھوڑوں گا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نامعلوم قوت اس کو اس سے جدا کر رہی ہے۔ وہ انہیں خیالات کی رو میں رہا تھا کہ اس کے کان میں صفیہ کی مترنم آواز آئی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو صفیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”آپ کو کل علی گڑھ جانا ہے، جا کر سو رہے!“

ناصر نے صفیہ کی طرف حسرتناک نظروں سے دیکھا اور کہا: ”میں اپنی کوریجی کا ماتم کر رہا ہوں، سکون ہی اگر قسمت میں ہوتا تو اس طرح تنہا اس آزمائش گاہ میں نہ چھوڑ دیا جاتا۔“

”ناصر بھائی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بہت اور استقلال سے کام لیجئے، خدا ہماری مدد کرے گا۔“

ناصر نے کسی قدر سکوت کے بعد کہا: ”صفیہ! میرا دل خود بخود بیٹھا جا رہا ہے۔ تم سے جدا ہونا بوجہ تکلیف دہ ہے۔ اچھا یہ تو کہو، کیا تم مجھ کو اپنے نازک دل کے کسی گوشے میں جگہ دو گی؟“

یہ کہتے کہتے ناصر نے صفیہ کو ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیا۔ صفیہ کے بدن میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ وہ سیما وار تڑپ گئی۔ مگر فطری حجاب نے اس سے جرأت کلام چھین لی۔ آج اس کو جذبہ الفت کا تجرہ ہوا۔ ناصر نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے استعفا کرتا ہوں کہ تم مجھ کو آئندہ بھائی صاحب وغیرہ ناموں سے مخاطب کرنے کے بجائے میرے نام سے مخاطب کیا کرو۔ یہ میری آرزو ہے۔“ صفیہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی نظروں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو زبان نہ کہہ سکتی تھی۔

بالکل اچانک چچی کی آمد کی وجہ سے یہ صحبت ختم ہو گئی، ناصر نے صفیہ کو خور سے دیکھا اور ایک آہ زیر لبی کے ساتھ جا کر لیٹ رہا۔ ناصر علی گڑھ جا چکا ہے۔ راشد نے ہر طرح صفیہ کی دلجوئی میں حصہ

لینا شروع کر دیا۔ وہ ہر طرح اس کو خوش رکھنے کا سامی رہتا تھا۔ اول اول تو صفیہ کو حجاب رہا اور وہ بے تکلف نہ ہو سکی مگر رفتہ رفتہ اس کی محجوب دور ہو گئی اور گفتگو میں آپ کی جگہ تھنے لگی۔ چونکہ زادہ بھی اپنی لڑکی کو ہمیشہ خوش دیکھنے کی آرزو مند رہتی تھی اور اس کے پاس کوئی دہر راشد سے بدظن ہونے کی بھی نہ تھی اس لئے وہ اس اختلاط میں مانع نہ ہوئی۔ سادہ دل صفیہ راشد کی دعوت محبت کو جس کی پیام رسانی کا ذریعہ اس کی آنکھیں تھیں نہ سمجھ سکتی تھی۔ راشد بھی انیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کی تعلیم صرف انٹرنس تک تھی مگر ایک متول باپ کا بیٹا تھا۔ جاننا اور زمینداری سے اس کی کافی آمدنی تھی۔ اس کے والد کو باغات گولنے میں بہت دلچسپی تھی چنانچہ اس کے مکان سے متصل بھی ایک خوشنما باغ تھا۔

صفیہ جب کبھی راشد کے یہاں آتی تو اس کی ہر چیز کو بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی اور دل ہی دل میں اس کے ذوق کی داد دیا کرتی تھی۔ گاہ گاہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش یہ چیزیں میری ملکیت ہوتیں صفیہ کو رفتہ رفتہ موسیقی سے بھی دلچسپی ہو گئی اور اب راشد کو زیادہ موقع مل گیا کہ وہ اپنا درد دل کا کر بھی اس کو سنا سکتا تھا۔ وہ موسیقی کے محسوس کن اثر سے بیگانہ نہ تھا۔ اگرچہ صفیہ نہیں چاہتی تھی کہ راشد اس کے تعلیمات پر چھاب لے مگر وہ مجبور تھی۔ راشد کے مخالف جو پیش قیمت ہونے کے علاوہ اس کے اعلیٰ ذوق کے شاہد ہوتے تھے۔ صفیہ کو بے اختیار اس کی تعریف پر مجبور کرتے تھے۔ راشد کو ناصر کی عسرت کی بنا پر اپنی کامیابی صاف نظر آ رہی تھی، اب صفیہ کا اظہارِ مناسبت سے بدلنے لگا وہ بھی نشیب و فراز سمجھنے کے قابل ہو گئی۔ وہ اب سوچنے لگی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ناصر بھائی اس کو راشد سے منسلک کر دینے۔

ایک روز صفیہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی ناصر کا خط پڑھ رہی تھی کہ اتفاق سے راشد بھی آ گیا۔ اس کے استفسار پر صفیہ نے خط اس کے دیکر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ناصر بھائی! دسمبر کی تعطیلات میں آ رہے ہیں!“ راشد کا چہرہ یکایک متغیر ہو گیا مگر اس نے اس قلی انتشار کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ کو تو بڑی سرت ہو گی کیونکہ آپ کے منگیتہ تشریف لائے ہیں۔“

یہ سنتے ہی صغیفہ کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہو گئی۔ "ہاں مجھ کو خوشی ضرور ہے جیسا کہ ایک بہن کو خوش ہونا چاہئے۔" ہاشادی کا معاملہ اس میں میں خود کو آزاد سمجھتی تھی، اس کے متعلق جو کچھ آپ نے سمجھا ہے وہ آپ کا حسن ظن ہے میں تو جناب کی سمجھ کی زیادہ داد نہیں دے سکتی۔"

راشد، صغیفہ کے اس جواب کے کچھ شرمندہ ہوا اور اس نے کہا "لیجئے آپ تو ہنسی کی بات میں ناراض ہو گئیں، اچھا معاف کر دو جلتے وقت راشد نے صغیفہ سے فراموشی نہ کرنے کی التجا کی مگر صغیفہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

(۲)

ٹرین آئی اور رک گئی، مسافروں کی سرسیمگی، قلیوں کی چرخ پکار سے تھوڑی دیر کے لئے جو گنگا نہر اسٹیشن پر برپا ہو جاتا ہے وہ متحج بیان نہیں۔ ہماری نظریں ایک عرصہ دراز کے بعد آج پھر ناصر کو بریلی کے اسٹیشن پر

دیکھ ہی ہیں۔ وہ نہایت تیزی سے اسٹیشن سے باہر نکل جانے کیلئے لمبے لمبے قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ تانگوں کے قریب پہنچا کہ یکہ بانوں اور تانگوں کے بے پناہ اور مسلسل سوالات کا نشانہ بن گیا۔ آخر ایک تانگہ میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ تمام راستہ اس نے نہایت بیانی کے ساتھ کاٹا۔ وہ متوقع تھا کہ صغیفہ دروازے پر اس کی منتظر بیٹگی۔ مگر گھر پہنچ کر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ راشد کے ساتھ تفریح کیلئے جا چکی ہے تو اس کی دل شکستگی کا عجیب عالم تھا۔ چند منٹ کے بعد صغیفہ اور راشد بھی آگئے۔ دونوں نے نہایت گرمجوشی سے ناصر کو خوش آمدید کہا اور رسمی مزاج پر سی کے بعد بیٹھ گئے۔ صغیفہ نے کہا۔ "آپ کی آج کی آمد بالکل اچانک ہوئی۔" ناصر نے اس پر لطف صحبت کو شکوے شکایت کی تلقینوں سے بد مزہ کرنا نہ چاہا بلکہ صرف بجا فرماتی ہیں کہ کہہ کر موضوع کلام کو بدل دیا۔ راشد کچھ دیر باتیں کر کے چلا گیا۔ کھانے سے فرصت پا کر ناصر نے صغیفہ کو ایک نفیس ساری اور ایک خوش نما گھڑی پیش کی جس کو اس نے اظہار ممنونیت کے بعد لے لیا۔

ایام تعطیلات گونا گوں مشاغل میں ختم ہو گئے۔ ناصر کو صغیفہ کے متعلق کافی تجربات حاصل ہوئے اس نے بار بار چاہا کہ صغیفہ کے متعلق سخت تنقید کرے مگر اس کی علوتہمتی نے اس کی اجازت نہ دی کہ وہ صغیفہ کے دل کو الفاظ کے شتروں سے چھیڑے۔ آخر ایک دن وہ مردانہ عزم کے ساتھ علی گڑھ روانہ ہو گیا اور انہی کے وقت وہ دونوں سے نہایت اخلاق کے ساتھ ملا اور ناصر و پیام کے وعدے اور عنایتوں کے شکریے کی فرسودہ رسم کو بھی ادا کیا۔ علی گڑھ پہنچ کر وہ اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کر رہا تھا اب وہ روایت کو ایک مہلک مرض سمجھنے لگا تھا اس کا دماغ اخلاقیات کے دقیق مسائل کو سلجھانے کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا نے اپنے زعم باطل کی وجہ سے ظاہری نمائش کو حقیقت سمجھ لیا ہے اس نے خوب سمجھ لیا تھا کہ اب دلوں ہی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔

موسم سرما اپنے شباب پر تھا۔ زاہدہ امکانی احتیاط کے باوجود نمونہ کا شکار ہو گئی۔ حملہ شدید ہوا اس پر تقاضے بن، دیکھتے ہی دیکھتے حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر مری آیا۔

**zacta**

ماہ تصویر کشا لگتے وقت



**RELIABLE, DURABLE**  
اپنے مقامی ڈیلروں سے طلب فرمائیں!  
**ATTRACTIVE**

اے۔ کے جوزف اینڈ بی۔ پوسٹ بکس ۵۶۹، کلکتہ

راشد کے لئے ضبط کرنا محال تھا اور اس نے صفیہ کو گدگدایا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ اچھل پڑی مگر راشد کو کھڑا ہوا دیکھ کر مجبور ہو گئی۔  
”خدا کے لئے اب رونا بند کرو۔“ راشد نے کہا۔

”کیا میں رو رہی ہوں، آپ بھی بڑے پر لطف آدمی ہیں۔“  
”معاف کیجئے گا، آپ صرف رونے کی شوق کر رہی تھیں۔“  
”اچھا خیر جانے دیجئے ان باتوں کو۔ یہ تو کئے آج آپ کو بھٹ لگتی“  
”مجھے اگر فرصت نہ تھی تو آپ کو تو بھی۔“ راشد نے کسی قدر شوخی سے کہا۔

”مجھ کو بھی چند وجوہ نے معذور رکھا۔“

”آہ، صفیہ۔ تم کو میری محبت کا کوئی احساس نہیں۔ میں نے کتنی راتیں تمہاری یاد میں تڑپ کر گزاری ہیں تم کو اس کا کوئی علم نہیں۔“  
”تمہارا آپ ہی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے بلکہ..... اتنا کہ کہ صفیہ خاموش ہو گئی۔

رفتہ رفتہ چار سال گزر گئے اور وہ دن آگیا کہ ناصر بنی۔ اسے، کی ڈگری لیبل گھر واپس آیا۔ مگر اسوس آج کوئی نہ تھا جو اس کی محنت کی داد دیتا توڑی سی سچی کے بعد اسے وہیں ایک ملازمت ساٹھ روپیہ ماہانہ کی مل گئی، جب سے ناصر آیا تھا اس نے صفیہ اور راشد کو کچھ توشہ سا دکھایا تھا۔ وہ نہایت سکون کے ساتھ واقعات کا جائزہ لیتا۔ ہا۔ اس کی نظریں اکثر صفیہ پر پڑ کر ہیک ہیکت تھیں مگر اس کی یہ التجا بارگاہ حسن میں قابل قبول نہ تھی اس کی ناامیدی حد سے بڑھ چکی تھی۔

صفیہ کی آزدگی کو برجیس نے بھی تار لیا اور ایک روز بہت بعد ہو کر معاملات پوچھے صفیہ نے پہلے تو اس کو ٹاننا چاہا مگر آخر مجبوراً اس کو اپنا راز کھدینا پڑا ناصر نے بھی وہ سب کچھ سن لیا۔ اب ناصر کیلئے کوئی وجہ راشد اور صفیہ کی شادی کیلئے مانع نہ تھی۔ دوسرے دن صبح ہی ناصر راشد کے مکان پر گیا۔ راشد اس کے اس طرح اچانک آجانے سے گھبرا گیا اور اس نے پوچھا کیلئے خیریت تو ہے؟ جس کا جواب ناصر نے ثبات میں دیا۔ راشد کے سوال پر کہ اس صبح صبح تکلیف کرنے کی کیا وجہ ہے ناصر نے کہنا شروع کیا۔ راشد تھکے پٹے آٹا مجھ پر اس قدر زیادہ ہیں کہ میں ان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ تم نے میری ابتک اعانت کی۔ آج میں آخری اعانت کیلئے تمہارے پاس آیا ہوں

مگر فطرت سکرار ہی تھی۔ ناصر کو بھی تار سے اطلال دیدی گئی۔ زائدہ خود بایوں ہو چکی تھی اس پر خیالات کا ہجوم، اس کے منہ سے میا خستہ چیخ نکل گئی۔ راشد نے اطمینان دلایا۔ صفیہ نے یہ کیفیت دیکھی تو مال سے لپٹ گئی اور رورو کر کہنے لگی۔ پیاری امی مجھے تنہا نہ چھوڑیے۔ آہ، آپ بھی مجھ سے خفا ہو گئیں زائدہ نے آنکھیں کھولیں اور بہت ہی خفیف آواز میں کہا۔ ”بھائی راشد سب سے پہلے میں تمہارے احسانات کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ خدا تم کو بامراد کرے۔ میری پیاری بیٹی صفیہ رنجیدہ نہ ہو۔ مشیت ربانی میں کسی کو دخل نہیں۔ دیکھو اپنے ناصر بھائی کا خیال کرنا اسوس میں اس کو نہ دیکھ سکی۔ اچھا خدا تمہارا عطا... ف... ظ... ہے“ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں اور وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ صفیہ دلوں کی طرح ہر ایک کا منہ نگ رہی تھی مگر خود غم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ تجیز و تکجین کے اشتغالات پورے تھے کہ ناصر بھی پوچھ گیا۔ صفیہ نے ناصر کو دیکھا تو دھڑکرا اس سے لپٹ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ناصر نے صبر کی تیغین کی گمر جوہ کے قدموں پر گر کر خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ واقعات پرلے پرتے گئے۔ ناصر نے صفیہ کو برجیس کے جو اس کی رشتہ کی بہن تھی حوالے کیا اور ہر طرح صابر و شاکر رہنے کی نصیحت کی اور تعلیم جاری رکھنے پر زور دیا۔ اس کے بعد وہ پھر علی گڑھ چلا گیا۔

رفتہ رفتہ پھر وہی راشد تھا اور وہی صفیہ۔ محبت کی پینگیں بڑھ رہی تھیں۔ صفیہ کو محسوس ہونے لگا کہ اس کو راشد سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے اس کو اکثر اپنے اس فعل پر شرم بھی آتی تھی مگر مجبور تھی اس کو اپنی کمزوری کا امتحان اس وقت ہوا جبکہ اتفاق سے دو تین روز تک نہ وہ خود راشد سے مل سکی اور نہ راشد ہی آسکا۔ اس کے لئے راشد کی جدائی کا ہر لمحہ مضطر کن تھا۔ وہ ایک پوشیدہ قوت کے ماتحت اس کی طرف لپٹتی جاتی تھی وہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی واقعات پر نظر ثانی کر رہی تھی اور اس درجہ کھوئی ہوئی تھی کہ اس کو راشد کی آمد کا غم تک نہ ہوا۔ راشد نے اس سے پہلے کبھی صفیہ کو اس طرح سکون سے بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ آج اس کو صفیہ ایک مرمی مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے رخسار کی تابش سے چاند کسب نور کر رہا تھا۔ بیک ایک اس نے دیکھا کہ صفیہ رو رہی ہے۔ اب

## ”بہار“

مصنف

مولفہ جناب الیاس احمد صاحب لکھنؤ ایل ایل بی۔

گلدستہ بہار فارسی اور اردو شعرا کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یالیوں سمجھئے کہ شعرا کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں جدیدہ و قدیمہ تمام المغانین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستے نے پورے شاعری کی دیوان کی ضرورت ہو۔ علم ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلنشین اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ۶ شہیدہ کے بودا مانند دیدہ۔

اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں قیمت مع محصول اک غیر ضخامت ۴۳۶ صحت۔

ملنے کا پتہ

مینجر صاحب لمصنفین عظم گڑھ یوپی۔

اور امید ہے تم اس کو رد نہ کرو گے۔ وہ اعانت یہ ہے کہ تم صغیرہ کو اپنا بنالو۔ اس کے لئے میں تمہارے بزرگوں سے بھی ملے کروں گا۔ راشد حیرت سے ناصر کو دیکھ رہا تھا اور بالکل سناکت بیٹھا ہوا تھا۔

اگرچہ اہل کو ناصر نے صغیرہ کو نہایت خوشی کے ساتھ راشد کے حوالے کر دیا اب ناصر کو اپنی زندگی و بال معلوم ہو رہی تھی۔ قریب مغرب ناصر راشد کے مکان پر پہنچا اور صغیرہ کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ راشد بھی وہیں آ گیا۔ اس نے راشد کا قرض جو اس پر تھا ادا کر دیا اس کے بعد ناصر نے کہا: میں خیال کر رہا ہوں کہ میری زندگی کا افسانہ بہترین طریق پر انجام پا رہا ہے کیونکہ میں تم دونوں کے احسانات کا حتی الوسع معاوضہ کر دیتا ہوں۔

اس کے بعد وہ وہاں سے چل دیا۔ صغیرہ نے ہر چند اس سے ٹھہرنے کیلئے کہا مگر وہ اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ ناصر کہاں ہے؟

صادقہ بیگم



## تمہارے بچے کو بھی ضرورت ہے ”بالمرٹ“ کی! ڈوگرے بالمرٹ کیا ہے؟

(۱) نینچوں کے سطر نہایت مفید رک ہے! (۲) یہ کمزور و نحیف بچوں کو تندرستی دیتی ہے!  
(۳) یہ کھانسی اور مسمولی بخاروں کو دور کرتی ہے! (۴) نینچوں کے انتوں کو مضبوط رکھتی ہے!

لاہور نمائندہ

بھگت رام پوری ایبٹ سنٹر۔ سنو رمنٹ ڈی۔ لاہور

# لمعات

از نیشتر امرتسری، بی۔ اے۔ بی۔ لیٹ

|                                         |                                        |
|-----------------------------------------|----------------------------------------|
| مچھکو آرام ہے بیگانہ ارماں ہو کر        | خوف لٹنے کا نہیں بے سرو سامان ہو کر    |
| ہم کو برباد کیا اوروں کی غمخواری نے     | راز دل کھول دیا چشم نے گریاں ہو کر     |
| حوصلہ رکھتے اگر ظلم پہ باندھی تھی کمر   | آپ قاتل ہوئے مشہور پیشیاں ہو کر        |
| اللہ اللہ بت کافر ترا حساسِ جمال        | کیا پریرا دے بیٹھے ہو انسان ہو کر      |
| میں نے پایا ہے تصویر ترا کھو کر آنکھیں  | گھریہ آباد ہوا عشق میں ویراں ہو کر     |
| انتہا یہ ہے محبت میں مری حشوت کی        | محل آتے ہے نظر غولِ بیاباں ہو کر       |
| اتک تھامے تھے کہ رہ جائے کسی کا پرہ     | کیا خبر تھی کہ اٹھنگے یہی طُوفان ہو کر |
| کر کے اظہار ہوئے اُن کی نگاہوں میں دلیل | دب گئے اور محبت میں نمایاں ہو کر       |

اپنا انجام بھی معلوم ہے تم کو تیرا  
سجدہ کرتے ہو تبوں کو جو مسلمان ہو کر

# ہندوستان کا لفظی گویا

جناب قاضی محمد رمضان صاحب تبسم گجراتی

کو موسیقی ایسے عظیم الشان آرٹ کی پیچیدگیوں سے واقفیت بہم پہنچائی۔  
تان سین کا قدرتی رجحان اس طرف تھا۔ تھوڑے عرصے میں اس  
نے راگ پر قدرت حاصل کر لی اور علم موسیقی میں ماہر ہو گیا۔ چند سال کے  
بعد جب وہ وطن گیا تو اس کی شہرت اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔  
راجہ شمشیر سنگھ والی اجین نے اس کو درباری گویا کی اسامی پر نوکر رکھ لیا۔  
تان سین کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی اور بہت سے  
بادشاہ اس کا شہرہ من کر اس کو شش میں مصروف ہو گئے کہ کسی طرح  
تان سین ان کے دربار کی زینت بن جائے۔ جب شہنشاہ اکبر اعظم نے تان سین  
کی موسیقی کا شہرہ سنا تو اس نے اس کو لکھا کہ اسے شاہی دربار میں بھیج دیا  
جائے۔ پہلے تو وہ لیت و لعل کرتا رہا لیکن آخر کار شاہی دھیکوں کے  
بعد اس نے تان سین کو دہلی بھیج دیا۔

کئی سال تک وہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں رہا اور مخصوص درباریوں  
میں اس کا شمار تھا۔ وہ خاص طور پر شام کلیان اور کانڑی راگوں کا  
شوقین تھا اور شہنشاہ بھی انھیں راگوں کی فرمائش تان سین سے  
کیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ اکبر نے تان سین سے پوچھا کہ ساری دنیا میں اس سے  
بڑھ کر کوئی علم موسیقی کا ماہر ہے؟ تان سین نے کہا اس وقت سوامی ہری  
داس فن موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ شہنشاہ نے سوامی کو اپنے دربار  
میں بلوانے کی خواہش کا اظہار کیا تو تان سین نے کہا کہ اس نے دنیا سے کنارہ  
کشی اختیار کر لی ہے اور وہ شاہی احکام کی تعمیل سے بھی انکار کر دیگا۔ اس  
خبر نے شہنشاہ کی خواہش کیلئے تازیانہ کا کام کیا اور تان سین کے استاد  
کو دیکھنے کیلئے وہ خود اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ تان سین نے کہا  
کہ اگر سوامی کو اس بات کا علم ہو گیا کہ آپ شہنشاہ اعظم اکبر ہیں تو وہ

تان سین جو ہندوستان کی دنیائے موسیقی میں عظیم الشان شہرت کا  
مالک تھا اس نے اس میں گویا یار میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مکھن داس پانڈے  
گور برہمن خاندان سے تھا جو بد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گیا ان دنوں  
گویا یار ہندوستان بھر میں موسیقی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ جہاں راجہ  
مان سنگھ نے موسیقی کا ایک بہت مشہور سکول قائم کر رکھا تھا۔

ایام طفلی میں تان سین اپنی عجیب غریب قوت حافظہ اور تعالیٰ  
کا اکثر مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ وہ بمشکل آٹھ سال کا ہو گا کہ اس کے والد نے  
اسے شہر سے باہر اپنے آموں کے جمنڈی رکھوا لی پر بھاگ دیا۔ یہ آموں کا جمنڈ  
چاروں طرف سے گھنے جھنگلوں میں گھرا ہوا تھا جن میں شیر اور دوسرے  
دندے بکثرت پائے جاتے تھے۔ رات کی تنہائی میں تان سین اکثر  
شیروں کی چنگھاڑیں سنا کرتا تھا اور بے خوف ہو کر جواب میں شیروں سے  
زیادہ بلند آوازیں چنگھاڑتا۔ اس کی آواز سن کر دیہات والے متعجب ہوتے  
اور جنگلی جانوروں کو بھی یہ آواز آموں کے جمنڈ سے دور رکھتی۔

اتفاق سے ایک دن سیلانی سادھوؤں کا ایک گروہ آموں کے  
جمنڈ کے پاس سے گذر رہا تھا۔ تان سین کی شیرازہ گرج سن کر تمام سادھو  
پر خوف طاری ہو گیا۔ ایک سادھو جو دوسروں سے زیادہ دانشمند تھا جرات  
کر کے آموں کے جمنڈ میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک دیلا پلا  
رک کا دختروں میں چھپا بیٹھا ہے جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ کون چنگھاڑ رہا تھا  
تو اس نے جواب میں اقرار کیا کہ یہ آواز کسی جوانی شجر کی نہ تھی بلکہ  
ایک انسانی شیر کی تھی۔

یہ سادھو ہندوستان کا نامور گویا ہری داس تھا جس نے تان سین  
کی اسکانی قوتوں کا فوراً اندازہ کر لیا۔ وہ تان سین کے والد کے پاس گیا  
اور اس سے اجازت لیکر اسے اپنے ہمراہ متھرائے گیا اور اس کو ہونہار کر کے

آپ کے سامنے گلے پر کبھی آمادہ ہوگا۔ بادشاہ نے نوکر کا بھیس بدلادیا۔ رات انہوں نے  
مٹھار کی ایک سرانے میں سر کی اور صبح سواری کو دیکھنے کیلئے دریائے جمن کے کنارے  
روانہ ہو گئے۔ سواری صبح کی باٹھ پوجا میں مشغول تھا اپنے چیلے کو کچھ کر تعجب ہوا جب  
ساتھی کے متعلق پوچھا تو ان میں سے نے کہا کہ وہ اس کی ساری اٹھانڈالا نوکر ہے  
جب تان میں نے استاد سے کچھ گلے کی خواہش کی تو اس نے کہا اٹھ کر دیا کہ اس کی  
طبیعت ابھی اس طرف مائل نہیں ہے۔

تان میں نے ایک نہایت دانشمندانہ چال چلی۔ وہ خود گلے لگا  
اور وہاں پوچھ کر چند ایک غلطیاں کیں جس پر سواری خاموش نہ رہ سکا پلے  
تو اس پر ناراض ہوا اور تینیس کی۔ پھر خود صبح راک گایا۔ شہنشاہ سواری لگا  
سن کر بہت خوش ہوا۔

جب گلے کے بعد تان میں شہنشاہ عظیم کی صحبت پر سواری کو مطلع کیا تو وہ بڑی  
خاموشی سے پیش آیا اگر نہ سواری کو دبا میں لائے بہت کوشش کی ترغیب پر صبح کا کام  
لیا گیا۔ کلام کیا اگر سواری نے جانے پر غامضی ظاہر کی اس کے بعد جب اگر سواری کے  
شریے اور خیریں لگ سنے کی خواہش ہوتی تو وہ فیض نفیس اس کے پاس مل جاتا۔

تان میں اس وقت تک فقید اشغال ہو سقی دان تسلیم کیا گیا ہے اور ہندوستانی  
ہو سقی میں اس کی روکاوٹ استاد کا درجہ کرتی ہیں اس کے متعلق ابو الفضل لکھتا ہے کہ گند  
ہزار سال میں اس کے پایہ کا گویا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ تان میں گوا لیار  
میں دفن ہوا اس کی قبر پر ہر سال ایک عظیم الشان میلہ ہوتا ہے جس میں ہندوستان کے  
ہر گوشے سے ہجرت گئے ہوئے ہندوستان میں آگئے ہر ایک نیم کا خدمت ہر جس کے متعلق یہ یقین کیا  
جاتا ہے کہ اس کے چنے کھانے سے خوش الحانی حاصل ہوتی ہے (ترجمان انگریزی)

میں نے ایک نہایت دانشمندانہ چال چلی۔ وہ خود گلے لگا اور وہاں پوچھ کر چند ایک غلطیاں کیں جس پر سواری خاموش نہ رہ سکا پلے تو اس پر ناراض ہوا اور تینیس کی۔ پھر خود صبح راک گایا۔ شہنشاہ سواری لگا سن کر بہت خوش ہوا۔

جناب کوئی دلوں دید بھوشن ہندت ٹھا کر دت جی شرمادید، موجد امرت جی مکر غیر ایجادیں۔

## منگو اگر فائدہ اٹھاویں

**پھلو پھلو** جب بچہ دن بدن سوکتا جاتا ہو تو اس کو اس دو کو  
اس کی پیٹھ پر پاشس کریں کہ کپڑوں کا خراج  
ہوگا اور بچہ مٹا ہونے لگے گا۔ قیمت پانچ روپے  
غراب سے ایک روپیہ، امراسے سو روپے (ما)  
**کرن جوانی** بڑھوں کو جوان بنانے والی اور جوانوں کی  
جوانی قائم رکھنے والی اسی ہے اس کے ہوتے  
جانوروں کا غلو کھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔  
قیمت ۲۴ گولی ایک روپیہ

ذیابیطس و کمزوری باہ کا فوری و یقینی علاج ہے۔

**اشوگری** قیمت للعلہ نمونہ ایک روپیہ۔  
**میٹھا بھل** تعجب غیر ایجاد ہے جن کے لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی  
ہوں صرف ایک خوراک کو تیسرے ماہ کے شروع میں  
کھلا دیں۔ پر مائٹ کی کرپاسے لڑکائی ہوگا۔ لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں  
قیمت واپس۔ قیمت دس روپے۔  
**بلا دوز** بلا کسی طبیعت کے اس کا استعمال انیوں کو چھڑا دیتا ہے  
قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنے ہر

ایک کارڈ لکھنے پر کاغذ امرت دھارا کی ضرورت ادویہ مفت بھی جاتی ہے

خط و کتابت امرت دھارا کیلئے پتہ  
امرت دھارا ۱۶۰ لاہور  
امرت دھارا منیجر امرت دھارا بھون امرت دھارا منیجر امرت دھارا دکن لاہور



# مرد کا دل!

ایک مصری افسانہ جو فاضل عالم کی کیسٹیں عربی سے ترجمہ کیا گیا،

جناب مولوی عبدالحییم صاحب ناظم درجہ بنگوی۔ مولوی فاضل

مصطفیٰ۔ نہیں، بتائیے وہ کون تھا؟

عباس۔ وہ آپ کا بیٹا مینب تھا۔

جونہی مصطفیٰ نے اپنے دوست سے یہ جواب سنا اس کا چہرہ تھماٹھا اور خوف و تحیر کی علامات چھا گئیں پھر وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "میرا بیٹا.... م.... میرا.... میرا بیٹا، مینب؟"

عباس بک اس کے قریب آگیا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر سر ہلاتے ہوئے اور نہر نہر کر جواب دینا شروع کیا۔ "ہاں! مصطفیٰ پاشا یہ آپ ہی کا بیٹا مینب مصطفیٰ تھا۔ وہی جس کے متعلق تمام لوگوں کو گمان تھا کہ وہ سوڈان میں مر گیا اور صرف اسی وجہ سے کہ ہم اس کے حالات و اخبار کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ہاں ہاں وہی بیٹا جس کی معمولی تلاش کے بعد آپ نے جس خبر دی کہ وہ مر گیا اور اس کی موت کی خبر بھی طرح تحقیق کر لی گئی ہے۔ مجھ سے آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ اب تم جہاں چاہو اپنی لڑکی تماشہ کی شادی کر لو کیونکہ مینب جس سے وہ منسوب تھی اس جہاں تکمیل لبہ۔"

مصطفیٰ۔ لیکن آپ نے یہ کس طرح تحقیق کر لیا کہ وہ مینب ہی تھا؟ عباس۔ ہاں میں نے بھی طرح تحقیق کر لی ہے۔ سنتے رہے۔ میں نے یہ کمپنی کی لاری دیکھ کر اسی وقت کمپنی میں گیا اور پوچھا کہ کیا اس کمپنی میں کوئی شخص مینب مصطفیٰ نامی بھی کام کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے رجسٹر دیکھ کر مجھے بتایا کہ اس نام کا ایک نوجوان در ایلوری کی جگہ پر ابھی مقرر کیا گیا ہے جس کی خواہ ۵۰ گنی ماہوار ہے انھوں نے مجھ کو اس کا موجودہ پتہ بھی دیدیا ہے۔ مصطفیٰ نے اپنا سر اٹھایا اس پر رنج و خصلت کے آثار بھی نمایاں تھے اس نے غصے سے پوچھا۔

"کیا آپ ارواح اور انسانی سائونکے مستقل وجود کو مانتے ہیں؟ عباس بک نے اتنے ہی اپنے قیدی دوست مصطفیٰ پاشا سے کہا۔ وہ اپنے دوست کی ملاقات کو اس کے وسیع محل میں جو عباس سید میں واقع تھا ہمدرد کو کرکرتا تھا کچھ اتنے ہی اس نے ایسا سوال کیا کہ اس عجیب و غریب سوال نے مصطفیٰ کو حیرت زدہ کر دیا انھوں نے کہا۔ "عباس صاحب آپ نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا؟ عباس۔ میں نے آپ سے اس لئے پوچھا ہے کہ کج جبکہ میں آپ کے یہاں آ رہا تھا ایک شخص کی صورت مجھے نظر پڑی جس کو میں خوب پہچانتا ہوں اور آپ مجھ سے بھی زیادہ اسے پہچانتے ہیں۔ وہ شخص وہی ہے جس کو مرے ہوئے کا ل ایک سال گز گیا ہے۔ لیکن آج اسے میں نے اپنی آنکھوں سے زندہ دیکھا ہے۔ میں اپنی موٹر میں بیٹھا ہوا عمار روڈ سے آ رہا تھا۔ اس چوک پر جہاں یہ سڑک فواد روڈ سے ملتی ہے پولیس نے میری موٹر کو دنا سا ٹھہرایا۔ تاکہ دوسری سڑک کی سواریاں گزر جائیں۔ گزرنے والی موٹروں میں ایک لمبی سی سبز موٹر بھی تھی۔ جس کا ایک جدید انگریزی کمپنی نے اپنی دوسری موٹروں کے ساتھ کرایہ پر جاری کیا ہے۔ یہ بڑی موٹر بالکل میرے سامنے سے گزری۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک ایسے شخص کو بیٹھے دیکھا جسے ہم لوگ ایک سال سے مردہ سمجھے ہوئے تھے لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ موٹر چلا رہا تھا۔ میں نے باوجود اس کے زرد رنگ کے گندے لباس کے جس کو وہ پہنا کرتے ہیں اس کی صورت بھی طرح دیکھ کر پہچان لی۔ قریب تھا کہ میں چرچ پڑتا اور اس سے اپنا تعلق بیان کرتا۔ لیکن وہ بڑی موٹر بہت سے لوگوں کو بھری ہوئی بڑی تیزی سے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے پیارے دوست! کیا آپ جانتے ہیں کہ کون شخص موٹر چلا رہا تھا؟

**مصطفیٰ** - تیرے حاصل کرنے کی کوشش اپنے کیوں کی؟

**عباس** - تاکہ اس کا تیرے آپ کو دیدوں۔

**مصطفیٰ** - میں تیرے کر کیا کروں گا؟

**عباس** - آپ اسے دیکھنے کیلئے جائیگے .... اپنے بیٹے کو۔۔۔

**مصطفیٰ** - وہ میرا لڑکا نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ گشت

سال ہو گیا تو میں نے اس بات پر اس قدر شکراؤ کیا کہ اس نے اسکی روباویوں

اور شرمناک افعال سے مجھے نجات دیکر آرام ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ

دوسری مرتبہ زندہ ہو کر پھر میری زندگی تلخ کر دے۔ چھوڑیے آپ نے جو کچھ دیکھا

ہے جانے دیجئے!

**عباس** - اس نے کون کیا کیا کام کیا ہے جس کی وجہ سے آپ اس قدر

غائب کر رہے ہیں؟ اور شفقت پرانہ سے اپنے سینہ کو غلی گئے ہوئے ہیں۔

**مصطفیٰ** - اس نے جو کچھ کیلئے سبب آپ کو معلوم ہے، آپ جانتے ہیں میں

نے اس کو پالا اس پر پورا خرچ کیا۔ وہ تعلیم سے حد درجہ نفرت کرتا تھا۔ میں نے

اپنی طرف سے گھر میں اس کے لئے مدرسہ کا انتظام کیا لیکن اس پر بھی وہ فلاح کو

نہ پہنچا اور امتحان میں کہیں چھپ جاتا اور شریک نہ ہوتا۔ آخر کار مجھ پر اس کی

نفرت کا راز ظاہر ہو گیا۔ یعنی وہ اپنے اسباق سے غافل ہو کر مختلف برائیوں

اور متعدد دلوں میں گھس گیا تھا اس کا سونا اور جاگ نہایت گندہ پادلوں

اور ذلیل حرکتوں میں گذرتا تھا۔ شراب کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ہر وقت

نیشے میں چور رہتا جب میں اسکی تعلیم سے ناامید ہو گیا تو اسے مدرسے سے

نکال کر عربیہ بھیج دیا تاکہ فنِ دعا مت سیکھ کر میرا قائم مقام بنے کیونکہ میری

عمر بہت گزر چکی ہے لیکن وہ وہاں بھی ان معزز و محترم لوگوں سے نہ ذرا نصیر

میں نے اس پر ننگر مال مقرر کیا تھا۔ بیانی پر کھیتی کرنے والوں سے جتنا مال اس

کے ہاتھ میں پہنچتا سب اپنی عیاشیوں اور سرفروں پر اڑانے لگتا۔ وہ قاہرہ کی

نہایت پست طبقہ کی عورتوں سے دوستی لگا کر انھیں غریہ میں اپنے گھر کے اندر لٹا

تھا کیا بے ساری باتیں ہالے لئے باعث تنگ عمار اور ہاری عزت پر بدنام داغ

دیکھیں بخیر کا اس کی خراشیں بیان تک نہیں کہ وہ حادثہ ہمارے لئے لکھ لکھا گیا۔

**عباس** - گولی چلنے کا واقعہ؟

**مصطفیٰ** - ہاں کیا آپ اس حادثہ کو نہ مٹائی سمجھتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں

کہ میں نے اس کوشش میں اپنی آبرو تک گنوا دی کہ اس نافرمان لڑکے کو رہا

کر اؤں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس نے غریب کو موٹر کے ذریعہ ٹھیک

۳ بجے پہنچا دیا۔ وہ نشے میں تھا اس لئے قاہرہ دو بجے کے بعد پہنچا۔ راستہ

بھر ٹھہرا ہوا اور شراب پیتا ہوا کیا تھا جیسا کہ ان پیشوں سے تیرے چلتا تھا جو

موٹر میں پائے گئے پھر وہ اسی سٹی کی حالت میں اپنی ناپاک عادت کی طرف رعب

ہوا لیکن جب اپنی مطلوبہ کو دوسرے لوگوں کے ساتھ پایا تو اس پر رعب اور سے

ذیر کر دیا۔ گولی لڑکی کے منہ لے پر لگی۔ اگلے کیا ہوا؟ ان تمام تفصیلات کا آپ کو

علم صاف میری کتنی بدنامی ہوئی۔ اپنی پیریم کوششوں کی وجہ سے اس کو قید سے

بچانے کے بعد جو اس کو لازمی تھی میں نے اس سے عذر لیا کہ اب شراب نہ پئے

گالچا پتہ اس پر اس نے نہایت سخت سخت قسمیں کھائیں تب میں نے اس کو

اپنے یہاں آنے دیا۔ اُن میں کانپ اٹھا ہوں جب اس بات کو یاد کرتا ہوں۔

**عباس** - بک نے اس نشے کو سمجھ لیا جو اس کے دوست کے سینے میں اس وقت

اٹھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا: ہاں مجھے وہ رات

خوب یاد ہے۔ میں اپنی بیٹی منیب کی منسوبہ قاسم کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

میں نے اس کو دیکھا کہ وہ بالکل بے ہوش مکان کے اندر داخل ہو رہا ہے اور اس کے

منہ سے شراب کی بدبو نکل کر پھیل رہی ہے جسے وہ جابھی سنا جو وہ آپ کو

بے شرمی سے دے رہا تھا۔ کیا تو میرا مالک ہے؟ میں اپنی طبیعت سے جھجکتا تھا

ہوں جاتا ہوں اور جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ تجھے مجھ سے کیا سروکار ہے۔ لیکن

آپ نے بھی دی کیا جو اس کے لئے کافی تھا۔ اپنے فراموش نہ کیا ہوگا کہ آپ نے

اسے نکال دیا اور کہا کہ غم دار چوڑج کے بعد میرے گھر میں قدم رکھا اور مجھے اپنی

صورت دکھائی اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپ کو راجی کرے مگر آپ نے

اسے بالکل چھوڑ دیا اور ایک دم الگ ہے اس کے بعد وہ سوڈان چلا گیا تاکہ وہاں

کچھ کام کر کے زندگی بسر کرے۔

**مصطفیٰ** - کیا آپ یہ چاہتے تھے کہ میں اس کا سوا کچھ اور کرتا۔

**عباس** - ہرگز نہیں، اس وقت میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر اب اسکی تبدیلی گئی ہے

**مصطفیٰ** - اس سے آپ کا مقصد؟

**عباس** - میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مزدور اپنے لڑکے کے پاس جائیں اور

اس کو دیکھیں۔ مصطفیٰ پائلٹ نے قطع کلام کر کے کہا: میرے دوست آپ کیوں

اپنے میں خواہ مخواہ مشکل میں پھنسلے ہیں میں ہمیشہ ہی یقین رکھتا ہوں کہ میرا بیٹا

مرگیا۔ اب دنیا میں میرا کوئی بیٹا نہیں ہے!

عباس۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے آج اسے دیکھا ہے اور وہ موجود ہے مگر انہیں آپ اس کو جانتے ہیں اور شک کے شبہ کی گمانش باقی نہیں ہے مگر آپ اپنی سختی قلب کے سبب اس کی موت کی خبر پھیلانے پر آمادہ ہیں۔

**مصطفیٰ**۔ عباس سختی کی کوئی بات نہیں فرمیں مگر میرا دل دوسری مرتبہ اس نافرمان لڑکے کے لئے صاف ہو میں نے میری زندگی کو تلخ کر دیا۔

عباس۔ آپ کا موجودہ غم مکن ہے کہ اس کی گذشتہ حالت پر چہاں ہو لیکن مینیب کی حالت بالکل بدل گئی ہے اب وہ شخص ہو گیا ہے وہ صحیح معنوں میں مرد ہو گیا ہے وہ اپنی ذات پر اعتماد کر لے گا اور اپنا پسینہ بہا کر بڑی حال کرتا ہے کون تصور کر سکتا تھا کہ ایک صاحب عزت مرتبہ والد کا بیٹا مینیب کسی دن اس طرح پریشان ہوگا کہ بڑی کیلئے قاہرہ کی سڑکوں پر موٹر ڈرائیوری کرے گا۔ یہی اس کے انقلاب کی نوکست دلیل ہے کیا، ایسا نہیں ہے؟

**مصطفیٰ** پاشا نے اپنی پیشانی پر تیوری چڑھائی۔ اور غم ظہریں سر ہا کر کہا: کیا اس کی حالت بدل گئی ہے، یہ کون جانتا ہے۔

عباس۔ اگر آپ کو شک ہے تو خود اس کی تحقیق کر لیں بغیر تحقیق کے آپ کو شک نہیں کرنا چاہئے۔ لیجئے یہ اس کا پسہ، جسے میں نے کمپنی سے حاصل کیا ہے

**مصطفیٰ** نے کاغذ لے لیا اور اس میں پڑھا: مینیب عبدالرحمن عیفتہ الحیالہ۔ بولاق روڈ۔ **مصطفیٰ** کے چہرہ پر حالت تاثر ظاہر ہوئی اس نے کہا: میں

مینیب وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ عباس نے دیکھا کہ اس کے دوست پر محبت کا جذبہ غالب ہو رہا ہے تو اس نے کہا: محترم دوست! میں آپ ہی کی طرح ایک باپ

ہوں۔ اس قدر سنگدلی سے قہر کا جذبہ پیدا کر لینا عیبتہ ہے آپ نے فوج میں تیس سال زندگی بسر کی ہے بیان تک کہ یہ اعلیٰ منصب حاصل کیا لیکن اس کے معنی

نہیں ہیں کہ آپ اس تک سختی و درستی سے کام لیں اس وقت آپ کو لازم ہے کہ اپنے لڑکے کو دیکھنے کے لئے جائیں۔ خبر نہیں وہ کس بیکیسی وجہ سے یہی حالت

میں ہو گا۔ اس وقت **مصطفیٰ** کی آنکھیں ہلکے آنسوؤں سے تر ہو کر چمک اٹھیں اس نے چاہا کہ یہ کمزوری ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ اس کاغذ کو جس پر تپہ لکھا ہوا

تھا اپنی انگلیوں سے لٹنے لگا۔ پھر رستہ کی طرف توجہ ہو کر اور اپنی پشت پلٹنے دوست کی طرف کرتے ہوئے بولا: میرا بیٹا! کون... مینیب نہیں ہیں؟

عباس نے لٹتے ہوئے جواب دیا: اے پاشا آپ کا بیٹا ہاں آپ کا بیٹا مینیب، اگر وہ اس قابل نہیں کہ اسے دیکھا جائے تو قاسم ہی کے سب سے

اسے دیکھئے جس کو آپ اپنی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں اس کیلئے اس کا ہونا مناسب لے آئیں جس کا وہ ہمیشہ تذکرہ کرتی ہے۔ اور کئی ٹکٹ اسکے لئے اس کو دل میں چھپا رکھا

دوسرے دن نام کو **مصطفیٰ** پاشا بولاق روڈ پر لوگوں کے اوجھن محلہ کا سپرچھ رہا تھا اس نے محلہ اربعین کو ان پرانے آدھنگ محلوں میں سے بلیا جن کی طرف مصلحت سے

کے بعد کبھی اس کا گذر نہ ہوا تھا اس میں تپے بڑے بھروسے کے جو تپے بنے تھے اور کئی کئی منزلوں کے مکانات تھے ان کے دعاؤں کے سانسے عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں

میں مصروف تھیں اور مرغیوں اور بطنوں کی حرکات دیکھ رہی تھیں۔ اس محلہ کی گلی میں پاشا چند قدم آگے بڑھا تھا کہ **مصطفیٰ** خیالہ مل گیا۔ **مصطفیٰ** کو سخت شہ

ہوئی جب اس نے **مصطفیٰ** کو ایک دو منزلہ مکان کا نام پایا اس نے ایک موٹی سی عورت، جو وہاں سے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی مینیب **مصطفیٰ** کے تعلق پر بوجھا۔ عورت

نے کہا کہ میں اس مکان کی مالک ہوں نہایت دوسری منزل لکرا رہے رکھی ہے۔ پاشا دوسری منزل پر چڑھا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک تپیس سالہ جوان لڑکی نے، رواد

محو لا جو گندمی رنگ کی تھی اور چھ لباس میں لباس تھی۔ **مصطفیٰ** نے اس سے پوچھا کہ کیا مینیب کا یہی گھر ہے؟ وہ **مصطفیٰ** کا منہ غور سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی

ہاں اسے محترم حیا عورت کے اس خطاب پر **مصطفیٰ** حیران ہوا لیکن اس کی حیرت زیادہ دیر تک نہ رہی کیونکہ لڑکی اسے ملاقات کے کمرے میں لے کر آئی اور سلسلہ کلام

کو جاری رکھتے ہوئے لے گئی۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے آپ مینیب کے والد بزرگوار ہیں آپ کی عورت یعنی مینیب کی عورت میں ان کی بیوی ہوں۔

جونہی اس نے یہ کہا **مصطفیٰ** پر گویا بجلی سی گزری۔ وہ کمرے میں جلوہ نظر دوڑا لے لگا اور پھر کجخت آواز سے کہا: مینیب کی بیوی؟

لڑکی۔ ہاں مینیب کی بیوی مجھے اس سے شادی کے ہوئے آٹھ ماہ گئے ہیں اس نے اپنی زندگی کے تمام حالات سے خبر دی ہے اپنی نادانی اور اپنی شرافت کی بھی عرض بچے تمام

باتوں سے خبر پڑ چکا ہے۔ پاشا ایک خشک منہی ہنستے ہوئے بولا: شاید یہیں شادی سے قبل بھی اس نے ان باتوں کی خبر دی ہوگی در نہ تو اس کو شوہر بنانے میں غور و فکر کرتیں غالباً تم نے

ہمارے ساتھ رشتہ جوڑنے میں کچھ ہمارے مال و خزانہ کا مایاب ہونے کا گمان کیا ہو گا تو تم قبل اس کے کہ **مصطفیٰ** اپنی بات پوری کرے عورت کا چہرہ تمہارا گیا اس نے قطع کلام

کر کے ایسے لہجہ میں کہ رک کر کہنا شروع کیا جو شرم و جھجکا پڑ تھا۔ ہرگز نہیں اچھا آقا! میں دن میں نے اسے شوہر بنانے پر غور کیا تھا اس کے تعلق ذرا بھی خیال نہ تھا

کو پڑنے کا وقت بالکل قریب تھا میں اسکو بھلا کر تسلی دیتے ہوئے گھر لائی اور مالک مکان کا جو کچھ اس کے ذمہ تھا یاد کر دیا۔ یہی وہ رات تھی جس میں ہم دونوں نے شادی کیلئے گفتگو کی۔ اس رات شادی کی رات میں طلاق ہوئی اور نہ آپکی دولت میں آپکے مرتبہ میں کہ انکی زندگی موت سے بچا لیتی صرف میں نے اسے بچایا ہاں تنہا میں نے بچایا۔ لڑکی بولتی رہی اس کا سینہ دھڑک رہا تھا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

مصطفیٰ اس کی تقریر سے بہت متاثر ہوا اور نہایت اشتیاق سے اس کے اور قریب ہو کر بولا۔ لیکن میری بیٹی تم بغیر شادی کے بھی جو کچھ اس کا ساتھ کرنا چاہا تیس کر سکتی تھیں جبکہ تم اس کے خاندان کو جان بچی تھیں جس کی طرف وہ اپنی نسبت کرتا ہو۔ لڑکی نے جواب دیا۔ میرے قایم آپ کے عرض کرتی ہوں میں نے جس وقت شادی کا مطالبہ کیا اور عاجزی و اجلح سے کہا کہ میں اسے اپنا شوہر بنا لوں تو اس نے صاف طور پر آپ کے متعلق یہ بھی کہا کہ میرا تعلق والدین سے منقطع ہے میں انکی طرف ہرگز ہرگز نہیں لوٹوں گا۔ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا رات و سہرے ہر گھنٹا ہوں جن کو میں ان کی جانب سے پاؤں لگتا۔

مصطفیٰ نے لڑکی کا رخ اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا کیا تم نے اسکی تعریف کر لی؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جیسا نوجوان اس نیک محتاج زندگی کو بہتر اور افضل جانتا ہوں گا وہ بھی ایک خیر اور گندے مکان میں جو بہترین آبادی سے دور ہے اور اسی لڑکی کے ساتھ جو اگرچہ پاک نفس اور شریف ہے مگر وہ عورت غیر ممکن ہے ایسے مقام میں ہے جو میں نے خاندان کی عورت کے شایان ہے کیا میں نے تم سے اپنے بچپن کی منسوبہ قاسم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے، اے میری بیٹی میں تم سے کہتا ہوں کہ قاسم کے باپ عباس بک کی موٹر اس اربعین محلہ سے گزر بھی نہیں سکتی، جہاں یہ مالک عطفہ لگتا ہے۔

لڑکی نے ان فحشہ کلمات کو سنا اور اپنا سر جھکاتے ہوئے نہایت گہری فکرمیں ایک لڑکی اور خیر خیرائی ہوئی آواز میں کہا۔ محرم آقا! آپ کو حق ہے جو کچھ فرمایا لیکن میں صبح عرض کرتی ہوں کہ یہ زندگی جو اس وقت میں بگڑا رہا ہے اس کی گذشتہ حالت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ حقیقت جنت ہے۔ آپ نے اسے دور کر دیا اس کیلئے اپنا دروازہ بند کر دیا اپنی نرمی اور شفقت اس پر حرام کر دی شراب نوشی کی عادت نے اسے یہاں تک پہنچا دیا کہ وہ کبھی بخوش میں نہیں رہتا تھا اور جب سوڈان سے واپس آیا تو کسی کام کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا

یہ تصور بھی اس طرفٹ گیا تھا میں اس وقت ایک کھل سکول میں ملتی تھی اور اپنی تعلیم خواہ میں جہاں گئی تھی نہایت اچھی طرح بکھنیت زندگی بسر کرتی تھی منیب ایک نایا آدمی نے ایک بالاناہ کرایہ پر لیا جس کو اپنے داخل ہوتے وقت اس گھر کے بائیں جانب کھینچا گیا میں اس کے پٹے پٹے گرد آلود لباس اور غمناک سرکستہ چہرہ پر دیکھ کر مجھ پر دھمکی کی حالت میں ہے اور یقیناً اس کی موجودہ زندگی میں کوئی خاص راز نہیں ہے جس نے اسی وقت سے اپنے دل میں اس کیلئے کچھ نرمی اور مہربانی کا جذبہ محسوس کیا میں اس کو دیکھتی کہ رات کے آخری حصے میں شراب کے بدست اپنے گھر میں لے جاتا تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا تب گھر کی مالکہ اس کے لئے دروازہ کھولتی مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیکار ہے اسے کوئی کام ہی نہیں ملتا۔ میں نے غور کیا کہ کاش وہ کسی ایسی بیوی سے ممانعت کرنا جو اس کی مدد کرتی اور اس کا تمام بری عادتوں سے رہائی دلاتی۔ میری فکر کی منشا صرف اسی قدر تھی۔

مصطفیٰ پاشا اس کے قریب آگیا اور اس کی طرف دیر تک دیکھتا رہا پھر اپنے پہلے لہجہ میں کہنے لگا۔ لیکن جب تم نے اس کا خاندان اور میرا نام سُن لیا تو پھر تم اس سے شادی کرنے پر کس طرح تیار ہو گئیں؟

لڑکی نے جواب دیا میں نے اس سے صرف اس لئے شادی کی کہ اس کو بد عادتوں سے بچاؤں نہ اس لئے کہ شرافت کو کھوٹا کر دوں۔ کچھ دیر پھر کر پھر کہنے لگی۔ ایک رات وہ خلاف عدوت سویرے مکان پر آگیا اس نے ابھی بالاناہ کا کاریہ ادا نہیں کیا تھا۔ اس لئے مکان کی مالکہ نے اس سے نہایت خشک اور ذلیل مطالبہ کیا اور بری بری گولیاں بھی دیں۔ وہ تمام باتوں کو سنتا ہوا بالاناہ میں داخل ہو گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں اس وقت اپنے گھر کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سنا، ہاں میں نے سنا کہ وہ نہایت وقت اور تاخیر سے واپس آیا۔ خود ہی دیر بعد میں نے اس کو باہر بکھتے ہوئے دیکھا وہ میرے قریب ہی سے گذرا۔ اس کے چہرے پر کسی خطرناک ارادہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے اس کا بیچھا کرنے کیلئے میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہو رہی تھی میں نے اسے دیکھا کہ وہ دریائے نیل کی طرف جا رہا ہے آپ جانتے ہیں کہ دریائے نیل یہاں سے بالکل قریب ہی ہے۔ بولاق کے پل کے پاس منیب ٹھہر گیا اور پانی پر نظر کرنے لگا۔ وہ ایک غمگین قاتل کی طرح رات کی اندکیوں میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں اس کے پاس آئی اور سلام کرنے کے بعد مختلف قسم کے سوالات کئے بالآخر اس نے مجھ سے اقرار کیا کہ میں خود کشی کرنا چاہتا تھا اور میرے پانی میں

روئے زمین پر کان کی تمام بیماریوں کی ایک منطیغہ و ابلاب سنز (میڈلسٹ) پیلی بھیت کا ایجاد کردہ روغن کرامات ریسٹرفی ہے  
 ملاحظہ ہو دنیا کی ہستی پر اجنبی اکثر نصیحتیں نہایت سولہ سپتال دہائی (برجاء) ارقام فرماتے ہیں کہ یاد آوری کا شکر یہ لفظ کو اس علاج کو کامیابی ہو رہی ہے دو اینس جلد اور رحمت فرمائیں  
 جناب سوار بلونٹ کھمبہ بھی سہلہ جناب، ارقام فرماتے ہیں کہ دوسرے کافی قائمہ پہلے تین شیشی اور پچھریں جناب شربہ ابلاب متعجب سلب کپڑوں لیس بود اسام ارقام فرماتے ہیں روغن کرامات سے مولود  
 کاملاً باکل بند پچھریا پیشانی اور پچھریں جناب شربہ حیدر متعجب سلب کپڑوں لیس بود اسام ارقام فرماتے ہیں روغن کرامات سے مولود  
 چود سال پیشہ آگے مٹن کرامات چنگویا تھا اس مجھے بہت ہی خاندان پچھریا پیشانی اور اسل کریں۔ ارقام فرماتے ہیں روغن کرامات سے مولود  
 بہرین، کہنے سے تمک سے طبع ہر طرح کی آواز بننے۔ دوزخ۔ دم خشکی کھلی۔ پردوں کی کزوی۔ بچوں یا نروک کا کان پانی۔ مواد یا کون وغیرہ بنے۔ پھنی۔ ناسور یا کیرے پڑ جانے اور کان کی  
 تمام بیماریوں کی ایک ایسی منطیغہ و ابلاب سنز (میڈلسٹ) پیلی بھیت کا ایجاد کردہ روغن کرامات ریسٹرفی ہے  
 محمولہ ابلاب سنز (میڈلسٹ) پیلی بھیت کا ایجاد کردہ روغن کرامات ریسٹرفی ہے  
 و پچھریا خود نکال کر لاتی ہے تیت فی شیشی ۸ مراد شامعی مٹن ہتے دانت جادیتا ہے دانت کی ہر ایک بیماری اور گندہ دہی پر خاص صفت چیز ہے فی پیکٹ ۴ رنوٹ کریں  
 محمولہ ابلاب سنز (میڈلسٹ) پیلی بھیت، (یو۔ پی) ہندوستان



ساتھ میرے چھوٹے اور آپ کے یہاں لوٹنے میں ہے تو مجھے منظور ہے آپ اس سے اس کا ذکر کریں۔ وہ مصطفیٰ کو وہیں چھوڑ کر گھر سے نکل گئی۔

مصطفیٰ پاشا اس تنگ بالاخانہ میں تنہا رہ گیا۔ تاریکی گھر میں بھپتی جا رہی تھی۔ کمرے کی تمام چیزیں مردہ جسم کی طرح خوفناک معلوم ہو رہی تھیں پاشا اپنے لڑکے مینیب اور اسکی نوجوان معلمہ بیوی کے متعلق فکر کرنے لگا کہ پہلے اس لڑکی نے اپنی ذات کو بلند کیا اور میرے لڑکے مینیب کو تہہ پر پہنچایا اور اس کو موت کے منہ سے بچایا۔ اسی خاموشی میں چند منٹ گزرے پہنچے کہ پھر دروازہ کھلا اور اسی تاریکی میں ایک شخص اندر داخل ہوا جو دیاسلائی سے اجالا کر رہا تھا مصطفیٰ نہایت تیزی سے چنچا۔ مینیب مینیب گذشتہ تمام باتوں کو بھول گیا اور اپنے باپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان بے اختیار ہو کر دوڑ پڑا۔ باپ اور بیٹا دونوں پسٹ گئے دونوں پر بناڑ کا دورہ تھا۔ دونوں گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ دونوں نے اپنے گذشتہ اور موجودہ حالات کا ذکر کیا۔ اسی درمیان میں پاشا نے بیٹے سے اس عورت کے متعلق پوچھا جو اس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کر رہی تھی مینیب نے جواب دیا کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟

مصطفیٰ۔ ہاں اس نے بات بھی کی ہے۔

مینیب۔ وہ میری بیوی آپ کی بہو ہے۔

مصطفیٰ۔ وہ تمہاری بیوی کس طرح بن سکتی ہے؟

مینیب۔ وہ بیوی سے بڑھ کر ہے۔

مصطفیٰ۔ میں اسے تمہاری بیوی گذشتہ حالت میں سمجھ سکتا ہوں جب تم غریبوں سے مہربانی اور نرمی کے متوجہ تھے جب تم خاندان کی محبت اور الفت کو تلاش کر رہے تھے مگر اسے نہ پاتے تھے۔ لیکن اے مینیب اب تم ایک بڑے گھر میں لوٹ جاؤ گے.... ہاں میرے گھر میں غریب لوٹ جاؤ گے۔ مینیب۔ آپ جو چاہیں کریں لیکن اس کے بغیر میں کسی چیز سے خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مجھے موت سے نجات نہ دلائی اگر وہ میری قیادت اور میری ہدایت نہ کرتی تو آپ بھی مجھے بلانا منظور نہ فرماتے۔ مجھے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیتے۔ آپ نے مجھے اس لئے بھگا دیا اور دور کر دیا تھا کہ میں شہر بھڑا مکینہ۔ بد اخلاق۔ سست۔ گندہ اور بیکار تھا۔ میں یہاں تک ذلیل ہو چکا تھا

کہ مجھے اس عورت نے پہچانا.....“

مصطفیٰ۔ کیا تم اس چیز کو بھول گئے کہ وہ تمہارے طبقے سے نیچے طبقہ کی ہے۔

مینیب۔ لیکن اس نے مجھے اس وقت پہچانا جبکہ میں ذلیل ہو رہا تھا اور اس سے بھی ہست تھا ہاں اس وقت جبکہ میرے طبقہ اور میرے خاندان نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔

مصطفیٰ۔ تمہاری باتوں سے یہ چلتا ہے کہ تم اپنے کو بھول گئے۔ تم یہ فراموش کر گئے کہ تمہاری پہچان سے ایک سو پہنچتی جواب تک تمہاری منتظر ہے اور تمہاری خطا معاف کر چکی ہے۔ کیا تم اپنے چچا عباس بک کی لڑکی کا ہمہ کو بھول گئے؟ اب مینیب سر جھکا کر سوچنے لگا اس وقت ایک کثیف بلی جو چاند کی روشنی پر چھائی ہوئی تھی اٹھ گئی اس کی روشنی بالاخانہ میں پھیل گئی مینیب کا نڈکڑا ظاہر ہو گیا جسے وہ ٹوٹ چلانے کے وقت پس لیا کرتا تھا اور اب بھی اسے پسینے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا سر اٹھایا اعلان ہے باپ سے تھر تھراتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”ہاں! میں تمام چیزوں کو بھول گیا۔“

بوترے نے منبٹ کرتے ہوئے اپنے سر کو ہلایا۔ اس کی سانس نہایت

نور سے جل رہی تھی۔ اس نے طنز کیا۔

”اس کی بات یہ بھی بھول گئے کہ وہاں بہت سی دولت ہے جو صرف تمہیں کو مل سکتی ہے لیکن اب وہ میرے چچا کی اولاد کو ملے گی جنہیں میں بُرا جانتا ہوں اور زندگی بھر ان سے نفرت کرتا رہا ہوں، تم نہ جاؤ تمہاری مرضی..... ہیں اس تنگ اور گندی گلی میں رہو..... ہاں اس قبر میں ہو جس میں کیرے کو زرد کی طرح زندگی بسر کر رہے ہو..... جس طرح چاہو..... میں جا رہا ہوں.....“

یہ کہہ کر پاشا نے چلے جانے کا قصد کیا اور میسرہوں کی طرف چند قدم چلا۔ مینیب بالکل ساکت اور صامت اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر کاپک مصطفیٰ پاشا پیچھے کی طرف مڑا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو روتا دیکھ کر اتھرتی ”ناشر سے جہاں تھا وہیں ٹھک کر رہ گیا بالآخر اپنے بیٹے کے پاس لوٹا اور اپنے ہاتھوں کو اس کے کندھے پر رکھ کر نہایت نرم آواز میں تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”سنو مینیب! اب تک میں اپنے ضمیر کے خلاف کر رہا تھا

پھر باپ بیٹے اس بات پر اتفاق کیا کہ بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ باپ کے بڑے گھر واقع عباسیہ میں لوٹ جائے گا اور باپ کو کھانے کا پہلے سبب تھا کہ وہ شریر، عیاش اور آوارہ لڑکا تھا۔ لیکن اپنی بیوی کے سبب اب وہ کمال مرد ہو گیا تھا۔ ہاں! بیچ معنوں میں مرد جیسا ہونا چاہئے اور اپنے بجا طور پر باپ کے یہاں رہنے کا مستحق تھا۔  
(ترجمہ از عربی)

اے اس پر جو کر کے ہوئے تم سے تھا ناگہاں تھا کہ تم اپنی بیوی سے خیانت کرو اور اس سے الگ ہو جاؤ مگر اس نے سوائے بھلائی کے تم سے کچھ کئی برائی نہیں کی۔ پیارے بیٹے! اس ناقدر شناس نہیں ہوں تم پر لازم ہے کہ اس کے خوبصورت اور اچھے لڑکوت کا اعتراف کرو۔ اگر تمہاری موت کو کہتے اور اسے چھوڑ دیتے تو میں تمہیں دل سے ہاجاتا.... بلاشبہ اس وقت تم کامل مرد ہو۔

## غزل

تمام ترمیری ہستی پہ چھپا گئے ہو تم، نظریں روح میں دل میں سما گئے ہو تم  
بہارِ حسن کی دنیا دکھا گئے ہو تم، فضاے عشق کو رنگیں بنا گئے ہو تم  
کچھ اس نگاہ سے دیکھا کہ اب نہیں خبر بنا گئے ہو کہ مجھ کو مٹا گئے ہو تم  
جہاں عشق کے دلچسپ ہیں نظارے زلزلہ کے کسی کو ہنسا گئے ہو تم  
ہمیشہ اس کے مقدر میں ہوگی ناکامی وہ کیا بنے گا کہ جس کو مٹا گئے ہو تم  
دکھا کے جلوہ رنگیں اٹھا کے رخِ سقائب مجھے حجاب سراپا بنا گئے ہو تم

وہی پھر ایک تبسمِ جیا کے پردے میں  
کہ جس سے بحر کو اپنا بنا گئے ہو تم

بحر الہ آبادی

تین سو روپیہ ماہوار کرنا ہوا تو دس روپیہ بڑھنا نہایت صحیح کیونکہ کسٹمر کو اپنی سہولت کے لئے دی اور ان ٹینک پنی پودہ



